اردو نظم پر اقبال کے اثرات

مقالہ: برائے پی ایچ ڈی

مقالہ نگار: مظہر علی خان

زیرنگرانی: پروفیسر ڈاکٹر ظفر اقبال
رئیس کلیہ فنون، تجارت و قانون
وفاقی اردو یونیورسٹی

شعبہ اردو، جامعہ کراچی

۲۰۰۴ء

بسم الله الرحمن الرحيم

وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنس اور ٹیکنالوجی

عبدالحق کیمپس۔ بابائے اردو روڈ کراچی

مورخہ ۱۲، اپریل ۲۰۰۷ء

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ مظہر علی خان نے میری نگرانی میں مندرجہ ذیل موضوع پر پی ایچ ڈی کی سند کے لیے تحقیقی مقالہ تحریر کیا ہے۔ "اردو نظم پر اقبال کے اثرات"

میں انہیں یہ مقالہ جامعہ کراچی میں جمع کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔

مندرجات

تاریخی وادبی پس منظر

علامہ اقبال ہماری تاریخ کی ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے۔ ان کی شخصیت اور فکر وفن کے اثرات اس وقت سے لے کر آج تک واضح طور پر محسوس کیے جا رہے ہیں۔ عام طور پر ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۷۳ء بیان کی جاتی ہے تاہم اس میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کی کئی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ تو اس کی یہ ہے کہ روزنامہ ''انقلاب'' اشاعت ۷ مئی ۱۹۳۸ء میں اقبال کی پیدائش کا سن ۱۸۷۳ء لکھا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر کتب میں مثلاً ''اقبال کامل'' میں ۱۸۷۶ء درج ہے۔ عبدالمجید سالک نے اپنی کتاب ''ذکر اقبال'' میں ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء تحریر کیا ہے۔ محمد دین فوق نے اپنی کتاب ''تاریخ اقوام کشمیر دوم'' میں اقبال کی تاریخ پیدائش ۱۸۷۵ء تحریر کی تھی بعد میں تصحیح کر کے ۱۸۷۶ء لکھا ہے۔ ''آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا'' کی تیسری اشاعت ۱۹۶۱ء میں، جو کہ صفحہ نمبر ۸۰۵ پر ۱۸۷۶ء تاریخ لکھی ہے۔

۱۹۵۸ء کے یادگاری ٹکٹ پر اقبال کی سن ولادت ۱۸۷۳ء ہے، اس کے بعد ۱۹۶۷ء میں یادگاری ٹکٹ پر سن ولادت ۱۸۷۷ء چھاپا گیا۔

علامہ کی وفات پر سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور نے اپنے نوٹ میں اقبال کی ولادت ۱۸۷۷ء لکھا ہے۔ ۱۸۶۸ء میں ''انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا'' کی بارہویں جلد میں اقبال کی تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء تحریر کی گئی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال اپنی کتاب ''زندہ رود'' میں تاریخ پیدائش کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''اپنے تحقیقی مقالہ کے نوٹ میں اقبال نے خود اپنی تاریخ ولادت ۳ ذی قعد ۱۲۹۴ھ بمطابق ۱۸۷۶ء درج کی ہے۔ ہجری کا سن ۱۲۹۴ھ چونکہ جنوری ۱۸۷۷ء سے شروع ہوا، راقم کی رائے میں ۹ نومبر ۱۸۷۷ء اقبال کی درج کردہ ہجری تاریخ کے عین مطابق ہے اور یہ تاریخ اس لئے بھی درست ہے کہ اقبال کی زندگی کے مختلف تعلیمی مراحل یعنی ان کے کالج یا یونیورسٹی میں امتحانات کی تکمیل کی تواریخ سے اس کی مطابقت بمقابلہ ۱۸۷۳ء زیادہ قرین قیاس اور بہتر معلوم ہوتی ہے۔''[۱]

فقیر سید وحیدالدین نے اپنی کتاب ''روزگار فقیر، اول'' میں تاریخ پیدائش کے بارے میں لکھا ہے:

''علامہ کی اصل تاریخ ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ ہے، اس کا سب سے بڑا ثبوت خود ان کے بیانات ہیں۔ ۱۹۰۸ء میں انہوں نے ایک تحقیقی مقالہ ''ایران میں مابعد الطبعیات کا ارتقاء'' کے موضوع پر لکھا تھا، جس پر جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی۔ مقالہ کی ابتداء میں جو خود نوشت تعارفی نوٹ ہے، اس

۱۔ زندہ رود، ص ۶۶

میں علامہ فرماتے ہیں کہ میں ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ، ۱۸۷۶ء کو پیدا ہوا۔''[۱]

۱۹۳۱ء میں علامہ اقبال نے انٹرنیشنل پاسپورٹ بنوایا تو اس میں سن ولادت ۱۸۷۶ء لکھوایا اور یہ پاسپورٹ جاوید اقبال کے پاس محفوظ ہے۔

تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ علامہ کی تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے۔

اب کسی غلط فہمی کا کوئی شائبہ نہیں۔ اس لئے بھی کہ علامہ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے اقبال سے ۱۸ سال بڑے تھے۔ اس اعتبار سے بھی اقبال کی ولادت ۱۸۷۷ء ہی بنتی ہے۔ اس شہادت کے لئے شیخ عطا محمد کی سروس بک پر جو سن درج ہے وہ ۱۸۵۹ء ہے۔

اقبال کے خاندانی شجرے کے مطابق ان کا تعلق ''سپرو قوم'' سے تھا۔ کشمیری پنڈتوں میں برہمن ذات کو علمی اعتبار سے فوقیت حاصل تھی۔ اقبال کے والد گرامی شیخ نور محمد جو کہ ایک دیندار اور صوفی بزرگ تھے۔ والدہ کا نام امام بی بی تھا۔ اقبال کی ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں ہوئی۔ اقبال کی پرورش صوفیانہ ماحول میں ہوئی۔

اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ والد گرامی شیخ نور محمد اپنے اخلاق اور مذہبی اعتقادات کی بناء پر محترم سمجھے جاتے تھے۔ آپ کی والدہ محترمہ بھی عفیفہ اور عبادت گزار خاتون تھیں۔ آپ کے والدین نہایت شفیق اور محبت کرنے والے تھے۔ ان دو کی خاص مذہبی اور اخلاقی تربیت سے اقبال کی نشو ونما ہوتی۔

اقبال کی ابتدائی تعلیم مکتب سے شروع ہوئی جہاں ان کے استاد سید میر حسن نے ان کی تعلیم و تربیت پر بھرپور توجہ دی۔ یہی وہ تربیت تھی جب اقبال کو ''سر'' کا خطاب انگریز کی طرف سے ملنے والا تھا تو اقبال نے کہا میرے استاد محترم کو بھی اعزاز سے نوازا جائے۔ اقبال کا تاریخی جملہ ملاحظہ کیجئے:

''میں اپنے استاد کی سب سے بڑی تصنیف ہوں۔''

شمس العلماء مولوی سید میر حسن کا انتقال ستمبر ۱۹۲۹ء میں سیالکوٹ میں ہوا۔

اقبال نے اپنے استاد مولوی میر حسن کی صحبت اور فیض سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ شعر و سخن کے ابتدائی دور میں ہی شہرت دور دور جا پہنچی۔ ۱۸۹۳ء میں اسکاچ مشن ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ ۱۸۹۵ء میں اسکاچ مشن کالج سے انٹرمیڈیٹ میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۸۹۷ء میں بی۔ اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا اور اسی کالج سے ۱۸۹۹ء میں ایم۔ اے میں کامیابی حاصل کی۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے کی کامیابی پر طلائی تمغے بھی حاصل کئے۔ ایم۔ اے میں اقبال کا خاص مضمون فلسفہ تھا۔ کالج میں ان کے استاد پروفیسر ٹامس آرنلڈ، اقبال کے اخلاق، ذہانت اور شاعری سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اقبال اور آرنلڈ ایک اچھے دوست بھی تھے۔ عبدالمجید سالک آرنلڈ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''پروفیسر آرنلڈ چند ہی روز میں اقبال کی صلاحیتوں سے ایسے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اقبال سے دوستانہ برتاؤ شروع کر دیا۔ وہ اپنے احباب سے اقبال کی تعریف کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ایسا شاگرد استاد کو محقق اور محقق کو محقق تر بنا دیتا ہے۔''[۲]

۱۔ روزگار فقیر، اول، ص ۲۲۹

۲۔ ذکر اقبال، ص ۱۷

دوران تعلیم شاعری بھی پروان چڑھتی رہی۔ غزل اور نظم دونوں میں شعر کہہ رہے تھے۔ شاعری کی ابتداء غزل سے کی۔ اسکاچ مشن کے جلسہ میں اقبال نے نظم پڑھی جو کہ پسند کی گئی۔ مشاعروں میں بھی شرکت کرنے لگے تھے۔ نظموں میں قومیت اور وطنیت کا جذبہ ابھر رہا تھا۔ شعراء میں حالی، آزاد، شبلی، اکبرالہ آبادی، قومی تناظر کے حوالہ سے شاعری کر رہے تھے۔ غزل میں داغ، دہلی کے آخری نمائندہ شاعر کی حیثیت سے پورے ہندوستان پر چھائے ہوئے تھے۔ اقبال نے داغ دہلوی کو استاد کی حیثیت سے انتخاب کیا۔ اس کی ایک خاص وجہ تو یہ تھی کہ اقبال پنجاب کے قصبہ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے، وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی، اس زمانے میں بہ اعتبار زبان داغ کا طوطی بول رہا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ایک شہرت یافتہ استاد کے دامن سے وابستہ ہونے کا شرف پایا۔ یقیناً اقبال کے اس عمل سے ان کی شہرت میں بھی اضافہ ہوا۔ اقبال نے اس بات کا اعتراف اپنے شعر میں بھی کیا ہے:

جناب داغ کی اقبال یہ ساری کرامت ہے
ترے جیسے کو کر ڈالا سخنداں بھی سخنور بھی

۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک علامہ نے نظمیں کہیں اور یہ نظمیں رسالہ ''مخزن'' میں شائع ہوتی رہیں۔ علم کی جستجو اور کائنات کے پوشیدہ رازوں نے اقبال کو بے چین کیا ہوا تھا۔ اسی شوق کی تکمیل کے لئے بغرض تعلیم ۱۹۰۵ء میں انگلستان روانہ ہوگئے۔ سفر اور تعلیم کے مصارف شیخ عطا محمد نے برداشت کئے۔ نومبر ۱۹۰۷ء میں اقبال نے جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے اپنا مقالہ ''ایران میں فلسفہ الٰہیات کا ارتقاء'' پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ لندن سے ۱۹۰۸ء میں بارایٹ لاء کی ڈگری بھی حاصل کی۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۸ء میں وطن واپس آ کر بیرسٹری شروع کر دی۔

۱۹۱۱ء میں گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دے رہے تھے۔

یورپ کے قیام کے دوران اقبال کی توجہ شعر و شاعری پر کم ہی رہی پھر بھی انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں اپنی نظم بھیج دیا کرتے تھے۔ جسے سر عبدالقادر اپنے رسالہ ''مخزن'' میں شائع کر دیا کرتے تھے۔ اس طرح اقبال کی شہرت وطن میں اقبال سے آگے چل رہی تھی۔

۱۹۱۵ء میں ''مثنوی اسرار خودی'' شائع ہوئی۔ اس مثنوی سے آپ ایک فلسفی شاعر کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔ خودی کا ایک ایسا شعور دیا، جس سے پورے عالم میں اقبال کی شہرت ہوگئی۔ انگلستان میں اسرار خودی کے تراجم ہوئے۔ اہل علم حضرات نے اس طرف توجہ دی اور مثنوی پر انگلستان کے ناقدین نے ریویو لکھے۔

علامہ اقبال نے اسرار خودی و رموز بے خودی لکھ کر اپنے نظریات سے اقوام عالم کو آگاہ کیا اور اپنے نظریہ کی اساس ''انسان کامل'' اور ''مرد مومن'' اسلامی فکر اور فلسفہ کی روشنی پر رکھی۔ ابھی تک اقبال ہندوستان کی سیاست سے دور رہے اس کے باوجود قوم کی بیداری اور اس کے تشخص کے لئے برابر غور و خوض کرتے رہے۔ جب فکر کا دھارا بدلا، وقت نے کروٹ بدلی، سیاست کی بساط درہم برہم ہوگئی۔ اقبال نے اپنی نظموں سے قوم کے جذبات کو ابھارا اور ان کے شعور کو بیدار کرنے میں مصروف ہو گئے۔

۱۹۰۸ء تا ۱۹۲۲ء تک اقبال نے انارکلی میں قیام کیا۔ ۱۹۲۲ء تا ۱۹۳۵ء میکلوڈ روڈ میں قیام کیا۔ ۱۹۲۳ء میں پیام مشرق شائع ہوئی اور ۱۹۲۳ء ہی میں اقبال کو ''سر'' کا خطاب ملا۔ ۱۹۲۶ء میں پنجاب کونسل کے الیکشن میں کامیابی ہوئی۔ اقبال کی عرصہ رکنیت ۱۹۲۶ء تا ۱۹۲۹ء تک جاری رہی۔ ۱۹۲۸ء میں مدراس میں اسلامیات پر لیکچر دیئے۔

۱۴ جنوری ۱۹۲۹ء کو حیدرآباد دکن تشریف لے گئے۔ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس الہ آباد میں اقبال نے تصور پاکستان پیش کیا۔ ۷ ستمبر ۱۹۳۱ء تا یکم دسمبر ۱۹۳۱ء دوسری گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں لندن تشریف لے گئے۔ کانفرنس

سے فارغ ہونے کے بعد فرانس کے نامور فلسفی برگسان سے ملے۔ اس کے ''نظریہ واقعیت زمان'' کو علامہ اقبال اسلامی نظریہ کے قریب سمجھتے تھے۔

''دوران ملاقات میں اس نظریہ پر بحث ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے برگسان کو یہ حدیث سنائی کہ ''زمانہ کو برا مت کہو کیونکہ زمانہ خود خدا ہے'' اس حدیث کو سن کر برگسان کرسی سے اچھل کر آگے بڑھا اور ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کیا یہ سچ ہے۔'' [۱]

روما میں مسولینی سے ملاقات کی۔ ڈاکٹر صاحب مسولینی سے اور مسولینی اقبال سے بے حد متاثر ہوئے۔

''ڈاکٹر صاحب مسولینی کے حسن واخلاق، اس کی ظاہری شان وشوکت، کشادہ سینہ اور مضبوط جسم کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ مسولینی بھی مثنوی اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ پڑھ چکا تھا اور وہ ڈاکٹر صاحب کے خیالات سے بہت متاثر تھا چنانچہ اس نے ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی کہ وہ اٹلی کے نوجوانوں کے لئے کچھ نصیحت کریں۔'' [۲]

علامہ اقبال ۱۹۳۴ء میں ایسے بیمار ہوئے کہ یکے بعد دیگرے بیماریوں کا اضافہ ہوتا گیا۔ گلے کی وجہ سے آواز کا بیٹھ جانا، عید کی نماز کے بعد علامہ نے سویاں دہی ملا کر کھائیں۔ سردی کے موسم میں دہی کے استعمال سے کھانسی ہوگئی۔

''پنجاب میں شیر خرما کا رواج بہت کم ہے۔ عام قاعدہ ہے کہ سویاں ابال کر رکھ دیں اور پھر جب جی چاہا ان میں دودھ اور شکر کا اضافہ کر لیا، لیکن علامہ نے اپنے والد کی تقلید میں دودھ کی بجائے دہی استعمال کیا۔ عید کا دن تو خیر آرام سے گزر گیا لیکن اگلے روز ان کو نزلے کی شکایت ہوگئی۔ حضرت علامہ کا گلا بچپن ہی سے خراب رہتا تھا۔'' [۳]

اس کے علاوہ اقبال جن بیماریوں میں مبتلا تھے، وہ یہ ہیں ضیق النفس کے دورے پڑنا، ان دوروں میں بے خوابی سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ نقرس کی تکلیف، دمہ قلبی، دمے کے اکثر دورے پڑتے جس سے ضعف قلب کی شکایت ہوگئی۔ ساتھ ہی جگر اور گردے بھی متاثر ہوئے۔

۱۹۳۵ء میں ڈاکٹر اقبال بغرض علاج بھوپال تشریف لے گئے، جہاں ان کا بجلی سے علاج کیا گیا لیکن اس سے بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ صحت مسلسل گر رہی تھی۔ حکیم نابینا کا علاج بھی باقاعدگی سے ہو رہا تھا۔ کہیں سے بھی شفا کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

عبدالسلام ندوی، علامہ کی علامت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جنوری ۱۹۳۵ء میں ڈاکٹر صاحب بھوپال تشریف لے گئے اور وہاں ماورا بنفشی شعاعوں کا عمل شروع ہوا اور اس دوران میں حکیم نابینا صاحب کی دوائیں بند کر دی گئیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ چار دفعہ بجلی کے علاج کے بعد آواز میں خفیف سا فرق پیدا

۱۔ اقبال کامل، ص ۲۷

۲۔ اقبال کامل، ص ۲۷

۳۔ اقبال نمبر، رسالہ اردو، ص ۲۷۴

ہوا لیکن بجلی کے علاج اور حکیم نابینا کی دواؤں کے باوجود مرض کا استحصال نہیں ہوا۔‘‘ [۱]

علامہ اقبال کے معالجین میں جو پیش پیش تھے ان میں ڈاکٹر محمد یوسف، ڈاکٹر الٰہی بخش، ڈاکٹر جمعیت سنگھ، حکیم محمد حسن قریشی اور حکیم نابینا۔ علامہ اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ مجھے ڈاکٹری دواؤں کی تلخی پسند نہیں۔ حکمت میں کم از کم میٹھی دوائیں تو کھانے کو ملتی ہیں۔

’’اقبال نامہ‘‘ میں سید نذیر نیازی کے نام جو خطوط علامہ اقبال کے شائع ہوئے ہیں، ان خطوط میں علامہ نے اپنی بیماری کے بارے میں اور مختلف عوارض کے متعلق تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ ’’رسالہ اردو‘‘ میں بھی سید نذیر نیازی نے ’’علامہ اقبال کی آخری علالت‘‘ کے عنوان سے تفصیل بیان کی ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال ’’زندہ رود‘‘ میں لکھتے ہیں:

’’چند دنوں بعد انفلوئنزا اور کھانسی کی شکایت تو دور ہو گئی لیکن گلا بیٹھ گیا اور ایسا بیٹھا کہ ایلو پیتھک، یونانی اور ریڈیائی علاج ہونے کے باوجود تکلیف رفع نہ ہوئی۔ اقبال کو دیگر عارضوں کے ساتھ یہ عارضہ آخر دم تک رہا۔‘‘ [۲]

۱۴ اپریل ۱۹۳۶ء کو علامہ اقبال آخری بار انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں تشریف لائے۔ علامہ کا گلا بیٹھا ہوا تھا آپ کی نظم ’’نغمہ سرمدی‘‘ محمد صدیق اور محمد امین نے چند اشعار گا کر سنائے ؎

خودی کا سر نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الا اللہ

علامہ کو سب سے بڑا غم مسلمانوں کا تھا۔ ہندوستان کی سیاست بعض قومیں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف صف آراء تھیں۔ ان حالات وواقعات کو دیکھتے ہوئے بھی علامہ فکر مند رہتے تھے۔ نواب بہاولپور کے نام مورخہ ۷ ستمبر ۱۹۳۷ء میں علامہ لکھتے ہیں:

’’میں نے اپنی زندگی کے گزشتہ تیس برس اسلام کے بنیادی اصولوں اور اس کے تمدن کی صحیح وضاحت کرنے میں صرف کئے ہیں لیکن اب جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری استعدادیں تھک گئی ہیں تو مجھے اس دردناک حقیقت کا احساس ہو رہا ہے کہ سیاسیات ہند میں بعض ایسی نئی قومیں برسر عمل ہیں جو ہندوستان میں اسلام اور اس کے تمدن کے مستقبل پر بری طرح سے اثر انداز ہوں گی۔‘‘ [۳]

افغانستان سے واپس آنے کے بعد بیماری کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

۱۹۳۸ء کے آغاز ہی سے حالت روز بروز گرتی چلی گئی۔ مختلف عوارض کے ساتھ جسم پر ورم آنا شروع ہو گیا۔ بینائی پہلے ہی رخصت ہو چکی تھی۔ آنکھوں کا آپریشن مارچ ۱۹۳۸ء کو ہونا تھا۔ دمہ کے متواتر دوروں کی وجہ سے ستمبر ۱۹۳۸ء تک التواء میں رکھا۔ اب حالت تشویشناک ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر جمعیت سنگھ کو بلایا گیا۔ اسی حالت میں آپ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے دلاسے اور تسکین کی باتیں کہیں۔ علامہ نے بھائی سے کہا کہ میں مسلمان ہوں اور موت سے نہیں ڈرتا، اور یہ شعر پڑھا ؎

نشان مرد مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم برلب اوست

۱۔ اقبال کامل، ص ۳۹

۲۔ زندہ رود، ص ۸۵۹

۳۔ پاکستان ٹائمز میگزین سیکشن، اشاعت، بحوالہ زندہ رود، ص ۱۰۴۶

اس طویل علالت کے بعد ڈاکٹر علامہ سر محمد اقبال کا انتقال ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہوا- تعزیتی جلسے منعقد کئے گئے- تاریخیں لکھی گئیں- جہاں بھی خبر پہنچی صف ماتم بچھ گئی-

چونکہ ہمارا مقصد وقیع اقبال کے اثرات کا تجزیہ کرنا ہے لہذا اہم ضمنی مباحث سے بچتے ہوئے براہ راست اپنے موضوع سے تعلق رکھیں گے- سوانح اقبال کے ذیل میں بہت سی کتب لکھی گئیں ہیں مثلاً ۱- اقبال کامل ۲- ذکر اقبال ۳- روزگار فقیر ۴- زندہ رُود ۵- فکر اقبال ۶- روح اقبال وغیرہ- متلاشیان کے لئے اس موضوع پر مندرجہ بالا کتب کا مطالعہ نافع ہوگا-

اقبال سے پہلے اردو شاعری کا رنگ

اقبال سے پہلے چار دبستان شاعری اپنے اپنے طرز پر اظہار خیال کر رہے تھے- پہلا دہلی کا دبستان شاعری جس میں شعرائے متاخرین داغؔ دہلوی اور ان کے معاصرین کا رنگ شاعری نمایاں تھا- دوسرا دبستان لکھنوی شاعری کا تھا- تیسرا دبستان رام پور سے وابستہ شعراء کا تھا اور چوتھا دبستان شعرائے پنجاب پر مشتمل تھا- آزادؔ، حالیؔ جس کے روح رواں تھے- یہاں پر ہم الگ الگ دبستانوں کا اجمالی جائزہ لیں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ ان دبستانوں میں رنگ شاعری کیا تھا اور اقبال نے اپنی شاعری کی بنیاد کن منفرد اصولوں پر استوار کی-

دہلی کا دبستان شاعری:

ہندوستان کی تاریخ میں دہلی کو وہی حیثیت حاصل ہے جیسے دل کو دوسرے اعضاء پر حاصل ہے- دہلی کی سرزمین پر معرکۂ خیر و شر بھی ہوا، محبت کے ترانے بھی گائے گئے، عروج کی کہانی بھی آنکھوں کے سامنے ہے اور زوال بھی کسی سے پوشیدہ نہیں- عالمگیر کی وفات کے بعد ہی ہندوستان پر قیامت ٹوٹ پڑی- نہ وہ محفلیں رہیں، نہ وہ احباب رہے، نہ ادب رہا اور نہ شعور لوگوں میں باقی رہا- ایک ایسی بدنظمی پھیلی جس میں سیاسی، معاشی، سماجی اور معاشرتی بدحالی کے نقوش واضح نظر آتے ہیں- فسادات، افراتفری، خوف و ہراس، مایوسی، قتل و غارت ان حالات میں لوگ جائے اماں ڈھونڈتے پھر رہے تھے، جسے دیکھو ایک اضطرابی کیفیت سے دوچار تھا، افلاس کی چکی میں لوگ بری طرح پس رہے تھے، جس چہرے پر نظر پڑتی مرجھایا ہوا نظر آتا، نہ سر پر سائبان اور نہ کوئی روزگار، بس لوگ زندہ تھے اور جینے کی سزا کاٹ رہے تھے-

کہیں چنگ و رباب کی محفلیں گرم تھیں اور کہیں سلاسل کی جھنکاریں زندانوں میں گونج رہی تھیں- کوئی زخموں کے لئے مرہم کا متلاشی تھا تو کوئی زخموں کے انگور دیکھتا تھا- غرض سفید پوش کاسۂ گدائی ہاتھوں میں اٹھائے دہلی کی گلیوں میں گھوم رہے تھے- نواب سراج الدولہ سے بہادر شاہ ظفر تک کا زمانہ ایک صدی پر محیط ہے- اس دوران انگریزوں کی طرف سے کیا کیا سازشیں نہ ہوئیں، انقلاب پر انقلاب آئے، تحریکیں چلائی گئیں- بالآخر ۱۸۵۷ء کی جنگ نتیجہ خیز ثابت ہوئی- انگریزوں کو فتح ہوئی، مغلوں کی حکومت کا سورج ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا- اس جنگ میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے مگر مسلمانوں کو انتقام کا نشانہ بنایا گیا-

انگریز نے دہلی کے لال قلعہ پر برطانیہ کا جھنڈا لہرا دیا اور بہادر شاہ ظفر کو قید کر کے رنگون بھیج دیا- بہادر شاہ ظفر کے خاندان والوں کے ساتھ انگریزوں نے نہایت جابرانہ سلوک روا رکھا- شہزادوں کے سر قلم کئے گئے ظلم و بربریت اس انتہا پر پہنچ چکی

تھی کہ دہلی کے امراء، رؤسا اور دیگر ارباب فن خستہ حالی اور فاقہ زدگی کے دن گزار رہے تھے۔شعراء وأدبا ناقدری زمانہ اور جور وستم سے اس قدر بیزار ہو گئے تھے۔ یہ سب ایک ایسے ذہنی کرب میں مبتلا تھے۔ دہلی میں شعراء کی جو محفلیں آباد تھیں، برباد ہو گئیں، جوادبی گہوارے تھے، اجڑ گئے۔ ڈاکٹر عتیق اللہ دہلی کی تاریخ اور ادبی مرکز کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''دہلی ایک ادبی مرکز ہی نہیں ہے، مراکز کا مرکز ہے۔محوروں کا محور،علم وادب کا لازوال سرچشمہ، ایک ادارہ، ایک دبستان، ایک تحریک۔ وہ طوائف الملو کی کا دور ہو کہ سقوط وزوال کا ثانیہ، دہلی کے سخن پردازوں نے اپنی روایات واقدار کا بہرصورت تحفظ کیا۔ دہلی کی شاعری پورے ہندوستان کی شاعری کے رجحانات کی آئینہ دار ہے۔ نیز آغاز وارتقاء کی ایک مسلسل تاریخ ہے۔'' [1]

داغ دہلوی نے شہرآشوب میں دہلی کے اجڑنے کی داستان رقم کی ہے۔''گلزار داغ'' میں داغ کا یہ آشوب ملاحظہ ہو ؎

فلک جناب و ملایک جناب تھی دلّی بہشت و خلد سے بھی انتخاب تھی دلّی
جواب کا ہیکو تھا لاجواب تھی دلّی مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دلّی

پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

شعراء کی غزلوں میں بھی اس عہد کی عکاسی ملتی ہے۔سیاسی ومعاشی پہلوؤں کا بھی شعری وسعتوں کا پتہ چلتا ہے۔ دہلی کی شاعری میں زیادہ تر تصوف سے کام لیا گیا جو وقت اور حالات کا تقاضا تھا کیونکہ اخلاق اور انسانی قدریں ختم ہو چکی تھیں۔ اس لئے متصوفانہ شاعری سے اخلاق کی درستگی اور مردہ دلوں میں نئی روح پھونکی۔نظریۂ وحدت الوجود ہی کے ذریعہ لوگوں کو یہ بتایا گیا کہ جو اسم ذات ہے وہی تو اللہ ہے اور اسی جذبہ سے سرشار ہو کر مسلمانوں نے اپنے دین اور اسلام کے احیاء کے لئے ٹھوس اقدامات کئے اور شعری سواد میں اس نظریہ کا پرچار کیا۔ ہندوؤں کے ہاں بھی اس نظریہ کا نام ویدانت کے نام سے ہے۔ اسلام میں تصوف کا رنگ حضرت امام غزالیؒ کے ہاتھوں مزید گہرا ہوا۔ شاعری مں آتش واصغر نے متصوفانہ شاعری کو فروغ دیا۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی تصوف کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''تصوف اس زمانے کے تمدن میں شعر وشاعری کے ہنگامے کا بہت بڑا محرک ہے۔صوفیہ اس عہد اور اس تہذیب کا ذہنی طبقہ ہیں اور تصوف ہی معیار عقل، علمیت، تہذیب واخلاق تھا۔لیکن تصوف کے لئے ضروری ہو گیا تھا عشق وعاشقی، اس لئے عشق ومحبت، عشق ومعشوقی ان زمانوں میں نہ صرف عام ہیں بلکہ عقلی صلاحیت، اخلاقی بلندی اور تہذیب نفس کی دلیل سمجھے جاتے ہیں۔'' [2]

میر سے غالب اور غالب سے داغ تک شاعری کا مزاج اور مضامین میں وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔متصوفانہ شاعری کے ساتھ ساتھ دیگر شعراء کے ہاں تصنع، تکلف، معاملہ بندی، صنائع بدائع، عشق کے پیچ وخم وغیرہ شاعری کا امتیاز سمجھا جاتا تھا جبکہ متصوفانہ شاعری میں اخلاق اور تہذیبی اقدار کو پیش نظر رکھا جاتا ہے لیکن داغ نے اپنی شاعری کی بنیاد معاملہ بندی اور محاورہ بندی پر

۱۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظم، ص۱۴

۲۔ دلّی کا دبستان شاعری، ص۲۲

رکھی اور یہی رنگ ان کے شاگردوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ استاد داغ کا تتبع فخریہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ دور خالصتاً غزل کا دور تھا اور اس دور میں اساتذہ کی تقلید اور روایت کو زیادہ دخل تھا۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے اپنی کتاب ''دہلی کا دبستان شاعری'' میں مدلل بحث کرتے ہوئے اس بات کا جائزہ لیا ہے کہ دہلی کی شاعری میں ہر وہ خیال یا وہ مضامین یا پھر واردات مثلاً تشبیہات و استعارات، معاملہ بندی، محاورہ بندی وغیرہ اور اس کے علاوہ دیگر مضامین اردو شاعری میں منتقل ہو چکے ہیں، جو دہلی دبستان شاعری کی خصوصیات کو اجاگر کرتی ہیں۔ اب اس امر کی ضرورت تھی کہ نئے طرز پر شاعری کو استوار کیا جائے۔ مغربی اثرات بھی اردو شاعری پر پڑنا شروع ہو چکے تھے، اس کی واضح مثال انجمن پنجاب کے مشاعرے ہیں۔ نورالحسن ہاشمی شعری انقلاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''غرض کہ مضامین کی ہر صورت سے ضرب و تقسیم کی جا چکی تھی، اس لئے اب ایک شعری انقلاب کی تاریخی ضرورت ہے، صاف اور سپاٹ اور بے برگ و بار زمین کے لئے ضرورت تھی کہ اب پھر کہیں سے نئے پھولوں اور درختوں کے بیج لائے جائیں، جس سے اس اجڑے گلستان میں پھر بہار آ سکے اور نئی چمن بندیاں ہو سکیں۔ اگر انگریزی تمدن اور ادب یہاں ایسے موقع پر بھی نہ پہنچتا تو بھی زمانے نے کروٹ لے لی تھی۔ یہ لازمی تھا کہ بین الاقوامی اثرات کے ماتحت یہاں اور ہی رنگ قائم ہو جاتا لیکن تبدیلی اور انقلاب ضروری تھا۔ ہمارے انگریزی تمدن و ادب کے آنے کی وجہ سے یہ انقلاب اسی کے اثرات کے ماتحت ہوا۔ اس میں وہی غالب اور ذوق کے شاگرد پیش پیش ہیں۔ [۱]

شعری انقلاب سے یہ ضرور ہوا کہ اب شعراء صرف گل و بلبل، لب و رخسار اور کنگھی چوٹی کی شاعری نہیں کر رہے تھے بلکہ شاعری کے دبستان اپنے اپنے رنگ خاص میں شاعری کے وقار اور امتیاز میں اضافہ کر رہے تھے۔ زمانے نے اس تیزی سے کروٹ لی کہ شاعری کا مزاج غزل سے نظم کی طرف منتقل ہونا شروع ہوا۔ یہ نئے امکانات کی روشن دلیل ہے کہ شعراء نے وقت کے مزاج کو سمجھتے ہوئے برصغیر کی حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے شاعری کو نئے سانچے میں ڈھال دیا۔

اگر ہم اس دور کی خصوصیات اور رنگ شاعری پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور کی شاعری کا رنگ و آہنگ اہل کمال کے ہاں جس انداز سے جلوہ گر ہوا، وہ کچھ یوں ہے: شاعری میں شوخی، معاملہ بندی، جذبات نگاری، رنگینی، محاوری بندی، ابتذال آمیز فکر، قافیہ پیمائی اور مبالغہ تاہم اس کے ساتھ زبان کا بھی خیال رکھا گیا۔

دہلی دبستان کی شاعری میں متانت، سنجیدگی، سلاست و صفائی اور متصوفانہ رنگ نمایاں ہیں۔ دہلی کے آخری دور کی شاعری میں مرزا داغ نے اپنی افتاد طبع سے شاعری کے رنگ کو بدلا۔ داغ کا خاص رنگ چلبلا پن، مزاح، طعنہ، چٹکی، گدگدی، جوش، تازگی، چہک، خوش گفتاری، ظرافت، پھبتی غرض سخن میں ایسی چھیڑ چھاڑ ملتی ہے جو کسی اور کے یہاں نہیں۔ شاعری میں ایسی زبان اختیار کی ہے گویا باتیں کر رہے ہیں۔ داغ کے اشعار منظر کشی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ داغ کے یہاں گہرائی و گیرائی یا فلسفہ نہیں ہے۔ وہ تو عشق کی بات کرتے ہیں۔ محبوب سے چھیڑ چھاڑ، ہجر و وصال کے قصے، فرسودہ واقعات جو رسمی طرز پر ہیں جبکہ امیر مینائی کے کلام میں سلاست سادگی، محاورات کا صحیح استعمال محاورے داغ کے ہاں مثالی ہیں۔ دہلوی کے رنگ کے نمائندہ شاعر ہونے کی حیثیت سے داغ نے زبان کی جو خدمت کی ہے وہ سب پر روشن ہے۔

۱۔ دلی کا دبستان شاعری، ص ۱۰۳

زبان کے معاملے میں دہلی اور لکھنؤ میں شروع ہی سے ایک فرق پایا جاتا ہے۔ زبان اور ملکی سیاست ان دونوں کا مرکز دہلی رہا اور زیادہ تر اساتذۂ فن دہلی ہی سے وابستہ رہے اس لئے دہلی کی زبان دیگر دبستان سے زیادہ اہم اور مستند سمجھی جاتی ہے۔

یوں تو دہلی میں متعدد بار قیامت برپا ہوئی۔ اس شکست وریخت کے نتیجہ میں، خاص کر دہلی کا بار بار اجڑنا، اس بربادی سے لوگ بدحال اور بدحواس ہو چکے تھے۔ ملک میں اقتصادی اور معاشی بدحالی کا دور دورہ ہوا تو اہل کمال، اہل فن اور شعراء، ادباء بھی وقت کی چکی میں پس گئے۔ مفلسی ہر ایک دامن پر گہری نیند سو رہی تھی۔ سازشوں اور سیاسی چالوں سے تنگ آ کر لوگوں نے دہلی سے لکھنؤ کی طرف رخ کیا کیونکہ لکھنؤ میں دولت کی فراوانی تھی، لوگ عیش کی زندگی بسر کر رہے تھے، فارغ البالی اور آسودگی کے چراغ ہر گھر میں جل رہے تھے۔ لکھنؤ میں سیاسی بازی گری نہیں تھی، لوگ چین کی زندگی گزار رہے تھے، رقص وسرود کی محفلیں گرم تھیں۔ ایسے میں دہلی کے شعراء جب لکھنؤ پہنچے تو ان کا خیر مقدم کیا گیا، ان کی قدردانی بھی کی گئی، وظیفے دیئے گئے اور معقول روزگار فراہم کیا گیا تاکہ انہیں یہاں پر کسی بات کی تکلیف اور رنج نہ اٹھانا پڑیں۔ لکھنؤ کے نواب کے ساتھ ان شعراء کی صحبتیں اور مشاعروں میں شرکت بھی اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں۔

اس کے علاوہ دہلی کو اگر ہم سیاسی اور معاشی تناظر میں دیکھیں تو ہمارا ادب اس بات کا آئینہ دار ہے۔ شعراء نے ان واقعات وحالات کو قلمبند کیا ہے جبکہ غالبؔ نے اپنے متعدد خطوط میں ان حالات کا ذکر کیا ہے۔ یہ وہ چند وجوہات تھیں جن سے اکتا کر شعراء، ادباء لکھنؤ کی سرزمین پر آباد ہوئے۔ یہاں کے نواب نے ان کی پذیرائی اور قدردانی کی۔ اس طرح یہ طبقہ بھی آسودہ حال ہو گیا۔

دبستان لکھنؤ:

لکھنؤ دبستان شاعری میں جو باتیں اور خصوصیات ہمیں نظر آتی ہیں، ان میں پہلی بات تو یہ ہے کہ معاشرتی بود و باش میں خواتین کا طرز خاص کر زبان میں اپنایا گیا اور ایسی زبان اختیار کی گئی جس میں ابتذال اور معاملہ بندی حدود سے آگے نکل کر سطحی شاعری پر اتر آنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ لکھنؤ کی اس دور کی تہذیب پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ پورا معاشرہ تصنع، تکلف اور عشق مجازی کے رنگ میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ کی شاعری کے جو خدوخال اور رجحان ہمیں ملتے ہیں، وہ سب معاشرت ہی کے اثرات ہیں۔ دراصل پورا لکھنؤ اسی ایک رنگ میں غرق تھا۔ شاعری میں معاملہ بندی، فحش نگاری کو عیب نہ جانتے تھے بلکہ اسے ادب کا حصہ بنایا ہوا تھا۔ شعرائے متاخرین کے ہاں قدیم شعراء کی تقلید بھی ہے اور انحراف بھی۔ دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں جو فرق پایا جاتا ہے، اس کی واضح مثال یہ ہے۔ دہلی کی شاعری میں سادگی، سلاست اور فصاحت کو دیکھا جاسکتا ہے اور لکھنؤ کی شاعری میں بلاغت، رعایت لفظی، معاملہ بندی اور رنگینی پائی جاتی ہے۔ اگر ہم دونوں دبستانوں کی شاعری کا طائرانہ جائزہ لیں تو یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جرأتؔ سے پہلے کی شاعری اور بعد کی شاعری میں وہ تمام مضامین باندھے جا چکے تھے جو ہمیں فارسی ادب کی تاریخ میں ملتے ہیں مثلاً عشق حقیقی، قلبی واردات، تصنع، تکلف، متصوفانہ لب ولہجہ کی شاعری غرض اردو شاعری کا دامن وسیع تر ہو گیا تھا، پھر بھی بہت کچھ کہنے کو باقی تھا۔ معاملہ بندی، بیگمات کے ساتھ گفت وشنید رکھنا، خواتین کے طرز خاص میں شاعری کرنا، عورت کے نقش ونگار اور اعضائے جسم کی مصوری کرنا۔ لکھنؤ میں جرأتؔ نے اس معاملے میں نہایت جرأت سے کام لے کر ایسی شاعری کی جسے ہم عامیانہ شاعری ہی کہہ سکتے ہیں۔

تذکرۂ مصحفی میں شعراء کی کثیر تعداد جو دہلی سے لکھنؤ پہنچی ان شعراء کے رنگ شاعری نے لکھنؤ کی شاعری پر جو اثرات مرتب کیے، اہل لکھنؤ کو اس سے اختلاف ہے کیونکہ وہ خود اپنی ہی شاعری کو مستند قرار دیتے ہیں۔ زبان کے معاملے میں جلال لکھنوی اور ناسخ نے جو اصلاح کا کام کیا ہے، وہ یقیناً اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔

اس کے علاوہ ناسخ کے تلامذہ استاد کی روش قائم نہ رکھ سکے، اس وجہ سے شاعری کا مزاج اور رنگ بد سے بدتر ہوتا گیا۔ کلام میں معائب واضح طور پر دیکھنے میں آرہے تھے اور محاسن ناپید۔ امداد علی بحر، منیر شکوہ آبادی، ارشد علی خاں قلق، مظفر علی اسیر ان شعرائے متاخرین کے ہاں شاعری کا رنگ پھیکا نظر آتا ہے۔ ان شعراء کے کلام میں نہ تو کوئی جان نظر آتی ہے اور نہ ہی فکری اپچ کا پتہ چلتا ہے۔ ہاں البتہ تسلیم لکھنؤ کے تھے مگر رنگ شاعری دہلی کا اپنایا تھا۔

لکھنؤ میں جو شعراء مقیم تھے ان میں نمائندہ شاعر امیر مینائی، جلیل، مضطر، قائم، ریاض خیر آبادی اور تلامذہ وغیرہ۔ ناسخ کے شاگردوں میں سب سے اہم نام علی اوسط رشک کا ہے۔ انہیں استاد نے یہ اعزاز عطا کیا تھا کہ وہ ناسخ کے شاگردوں پر اصلاح بھی دیا کریں۔ زبان کی اصلاح میں جو قانون اور قواعد ناسخ نے مرتب کیے تھے، ان کی مکمل تقلید ہمیں رشک کے ہاں ملتی ہے اور اپنے استاد کے کام کو آگے بڑھانے میں بھی رشک آگے آگے تھے۔ اپنے کلام میں اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ کہیں کوئی متروک الفاظ شاعری میں داخل نہ ہونے پائیں۔ اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ لکھنوی زبان کی صحت درکار ہو تو رشک کا دیوان ہی کافی ہے۔ لکھنؤ کی خاص فضا اور ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھنوی طرز پر شاعری کی بنیاد رکھی ہے۔ ان کے کلام میں واردات قلبی کے نمونے بڑے جاندار اور مستحکم نظر آتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کے کلام میں عہد کی عکاسی کے ساتھ زبان کو نکھارنے کا عمل بھی تیز نظر آتا ہے۔

رشک کے کلام میں رنگینی اور چاشنی نام کو نہیں، بس ایک نظریے کے تحت شاعری کرتے تھے۔ ان کے ہاں جو لفظ جیسے بولا جاتا ہے، اسے اسی طرح وہ نظم بھی کرتے تھے۔ ان کی شاعری میں لفظ کا صحیح استعمال ہی لفظ کی معراج ہے۔

لکھنؤ کا آخری چراغ ضامن علی جلال، رشک کے شاگرد تھے، ان کے ہاں بھی زبان کی اصلاح پر کافی زور دیا۔ اسی لئے ان کے کلام میں دلآویزی اور چاشنی پیدا نہ ہوسکی۔ کلام میں فرسودہ مضامین نام کو نہیں۔ تصنع و تکلف سے بھی گریز کرتے تھے۔ الفاظ و محاورات پر قدرت رکھتے تھے۔ جلال عروض و فن پر کامل دستگاہ رکھتے تھے۔

اسی طرح لکھنوی تہذیب اور معاشرت کی عکاسی محمد اسماعیل منیر شکوہ آبادی کی شاعری میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کے کلام میں تشبیہات و استعارے، رعایت لفظی، کلام میں شوخی سبھی کچھ موجود ہے، مگر متانت اور جاذبیت نظر نہیں آتی۔ ویسے یہ ایک حقیقت ہے کہ ناسخ اور رشک کے تتبع میں لکھنوی رنگ کے شیدا رہے۔ غزل اور قطعات میں لکھنوی رنگ اجاگر ہوا ہے۔ زیادہ تر غزلیں ان کے دیوان میں طویل ہیں۔ ایک غزل میں ستر اور پچھتر اشعار کہنے کی عادت تھی۔ بہت سے اشعار تو فحش نگاری اور عامیانہ نظر آتے ہیں۔ کلام میں کوئی دلآویزی نہیں۔ پھیکا اور بے مزہ شاعری جس میں تشبیہات اور استعارات کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ منیر ایک پر گو شاعر تھے۔ ایک یہی نہیں زیادہ تر شعراء پر لکھنوی تہذیب کا اثر ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت پر ابواللیث صدیقی نے لکھا ہے:

> ''نسائیت اور فحش نگاری سے مل کر ریختی کی بنیاد پڑی، یہ ایسی صنف ہے جو اردو کے سوا دنیا کی کسی اور زبان کی شاعری میں موجود نہیں ہے۔ اس کا سلسلہ کچھ کچھ ہندی شاعری سے ملتا ہے کیونکہ ہندی شاعری میں بھی عورتوں کے جذبات انہی کے محاورہ

میں ادا کئے جاتے ہیں-لیکن ریختی میں صرف عورتوں کی زبان کا لحاظ نہیں رکھا جاتا بلکہ پیشہ ور عورتوں کے مبتذل جذبات، بازاری اور عامیانہ زبان میں ادا ہوتے ہیں-''[۱]

تسلیمؔ کا رنگ شاعری معاصرین میں کچھ زیادہ جاندار نہیں-نسیمؔ کے شاگرد تھے، ان کے کلام میں شیرینی، پرکیف لطافت خاص طور پر زبان بہت میٹھی استعمال کرتے تھے-طبیعت میں بے پناہ عجز و انکسار تھا- ان کا یہی خلوص اور محبت ان کے اشعار میں جلوہ گر ہوا ہے-

ان کے تین دیوان منظر عام پر آ چکے ہیں:

۱-نظم ارجمند ۲-نظم دل افروز ۳-دفتر جمال

ان کے مضامین میں عامیانہ اور ابتذال قطعی نہیں- ان کے ہاں معشوقانہ طرز ہے اور نہ ہی محبوب کی باتیں-مختصر بحروں میں سادگی کو اپناتے ہوئے رنگ دہلی میں فکر و جذبہ سے شاعری کے دامن کو وسیع کیا ہے-

مظفر علی اسیرؔ کی شاعری پر کسی دبستان کا لیبل نہیں، وہ اس لئے کہ ان کی شاعری میں کسی قسم کا کوئی رنگ ظاہر نہیں ہوا- بے کیف اور بے مزہ شاعری، اس دور کے لحاظ سے اسیرؔ کی شاعری میں نہ تو نسائیت ہے اور نہ معاملہ بندی، اسی لئے انہیں وہ شہرت تو نہ مل سکی جو ان کے معاصرین کے حصہ میں آئی، ہاں البتہ ان کے شاگرد امیرؔ مینائی نے اپنے استاد کے نام کو ایک اعتبار بخشا- گو کہ رام پور کی محفلیں اور صحبتیں جس میں برابر شریک ہوئے لیکن ان کی شاعری پر کسی کے اثرات نہیں پائے جاتے- ان کی شاعری داخلی احساسات کی ترجمان ہے- ان کی علمی قابلیت کثیر تصانیف سے بھی ظاہر ہے- ان کی وجۂ شہرت ان کے اپنے شاگرد ہیں، جن میں امیرؔ مینائی، احمد علی شوقؔ اور ریاض خیر آبادی اسیرؔ ایک صاحب فن شاعر تھے-شعرائے متاخرین میں رشکؔ، اسیرؔ، شوقؔ، امیرؔ، جلالؔ، نسیمؔ، منیرؔ اور تسلیمؔ ان کے علاوہ مرثیہ کی صنف میں انیسؔ و دبیرؔ نے مرثیہ کو منتہائے کمال پر پہنچا دیا- لکھنوی تہذیب کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہی شاعری کا ابلاغ اور اس کا فروغ اس عہد کی عکاسی کا آئینہ دار ہے- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی شعرائے متاخرین کے بارے میں لکھتے ہیں:

> متاخرین شعرائے دلّی کا رنگ متقدمین سے مختلف تھا- اپنے مذاق کے مطابق انہوں نے بھی زبان میں تراش خراش کی اور محاورہ کو ایسا درست کیا کہ اب تک اس میں بہت کم فرق آیا ہے لیکن ان کے خیالات بھٹکنے لگے اور جذبات عشق میں عشق حقیقی اور پاک و بے لوث الفت کے خیالات ترک کر کے ہوس پرستی کے جذبات نظم کرنے لگے- جرأتؔ، انشاءؔ اور رنگینؔ نے اس کی ابتداء کی اور چونکہ یہی شعراء اگلے دور میں نمونہ بنے اس لئے جو زہر ان لوگوں نے اگلا تھا، وہ تھوڑے ہی عرصہ میں شعر و ادب کے سارے جسم میں سرائیت کر گیا- انہی لوگوں نے ریختہ کے ساتھ ریختی اختیار کی، جس کے بعض نمونے پہلے بھی تھے لیکن ان میں وہ بے شرمی اور ہوسناکی نہیں جو رنگینؔ اور انشاءؔ سے شروع ہوئی اور لکھنؤ پہنچ کر فن بن گئی-''[۲]

دبستان لکھنؤ کی شاعری میں رنگینی، رعایت لفظی، خارجی مضامین اور عورتوں سے متعلق مواد زیادہ ملتا ہے حتیٰ کہ ان کے

۱- لکھنؤ کا دبستان شاعری، ص ۱۴۱

۲-لکھنؤ کا دبستان شاعری، ص ۵۰

لباس اور زیور تک کو شاعری کا حصہ بنا دیا-لکھنوی شعراء نے جن چیزوں کا اہتمام کیا ہے، وہ کچھ یوں ہے آرائش جمال، لکھنوی محبوب، معاملہ بندی، زبان کا خیال رکھنا، تصوف سے گریز، نئی زمینیں نکالنا اور رعایت لفظی کو شعری پیکر میں ڈھالنا-

لکھنؤ کی شاعری میں ابتذال کا دخل زیادہ رہا-محسن کاکوروی کی شاعری ان شعراء سے مختلف ہے کیونکہ وہ نعت کہتے ہیں-محسن پہلے وہ نعت گو شاعر ہیں جنہوں نے اسے فن کی حیثیت سے بھی اور مذہبی عقیدت کی وجہ سے بھی محبت، شیفتگی اور والہانہ عشق کے طور پر اشعار میں اپنے جذبات کی عکاسی کی ہے-

امیر مینائی کی ولادت ۱۸۲۸ء میں لکھنؤ میں ہوئی-عربی فارسی زبان پر عبور تھا-منشی مظفر علی اسیر سے کلام پر اصلاح لی-طبعیت کی روانی اور زود گوئی سے اپنے استاد سے بھی زیادہ نام کمایا-واجد علی شاہ کے دربار میں جب ان کا تذکرہ ہوا تو انہیں بلا کر ان سے کلام سنا، کلام کو پسند کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا-انہی کے کہنے پر دو کتابیں ''ارشاد السلطان'' اور ''ہدایت السلطان'' لکھیں-ان کا زیادہ تر وقت تصنیف و تالیف اور شعر و شاعری میں گزرتا-شاعر تو اچھے تھے ہی ایک اچھے عالم بھی تھے، اس لئے لوگوں کی نگاہ میں عزت و تکریم بہت زیادہ تھی-ان کا پہلا دیوان ''مراۃ الغیب'' ہے-اس میں کوئی خاص کمال یا رنگ ابھر کر نہیں آیا-دوسرے دیوان ''صنم خانۂ عشق'' میں پختگی بھی ہے اور چاشنی بھی-ابتدائی کلام میں بے جا رعایت لفظی، ابتذال، بدنما تشبیہیں، عورتوں کی باتیں، کنگھی چوٹی کا ذکر ملتا ہے یعنی وہی پرانے مضامین جو کئی بار دہرائے گئے ہیں-دوسرے دیوان ''صنم خانۂ عشق'' میں اعلیٰ تخیل، سلاست روانی اور دلکش عاشقانہ ترکیبیں بکثرت موجود ہیں-

ان کے کلام میں فصاحت، بلاغت، جوش، نزاکت خیال، بلند پروازی، شیرینی، زور بیاں اور تصوف کی چاشنی بدرجۂ اتم موجود ہے-امیر مینائی نے لکھنوی شاعری کو قدیم روایات اور بے جا بندشوں سے آزاد کرایا-انہوں نے ایسے رنگ کی بنیاد ڈالی جس پر ان کے تلامذہ ریاض خیرآبادی، مضطر اور قائم نظر آتے ہیں-''صنم خانۂ عشق'' کے بارے میں امیر مینائی خود کہتے ہیں ؎

پچھلا کلام بھی ہے جو اس میں شریک امیر
دیوان میں اب کا رنگ کہیں ہے کہیں نہیں

امیر مینائی نے وقت کی رفتار کو حال کے آئینے میں دیکھا اور وقت کا ساتھ دیتے ہوئے اپنے شعری آہنگ کو بدلنے پر مجبور ہوئے-ان کے مجموعہ ہائے کلام بھی ان کی اس کاوش کی نشاندہی کرتے ہیں-''جوہر انتخاب''، ''گوہر انتخاب'' اور ''صنم خانۂ عشق'' میں عاشقانہ مضامین ''مرأۃ الغیب'' کی نسبت کثرت سے نظر آتے ہیں-

انہیں ہر صنف سخن پر کامل دسترس حاصل تھی-ان کے حریف بھی ان کی شاعری کے قائل تھے-لکھنؤ کا خاص مزاج جس میں چوما چاٹی، عامیانہ طرز فکر اور ایسی بہت سی مثالیں، جو لکھنوی شاعری کا امتیاز سمجھا جاتا تھا، امیر مینائی نے اس سے بیزاری کا اظہار کیا ہے-لیکن داغ اور نظام کی صحبتوں نے امیر کو نئے آہنگ کا شاعر بنا دیا-

دبستان لکھنؤ کا آخری چراغ ضامن علی جلال، رشک کے شاگرد تھے-ان کے ہاں بھی زبان کی اصلاح پر کافی زور دیا اسی لئے ان کے کلام میں دلآویزی اور چاشنی پیدا نہ ہو سکی-کلام میں تصنع و تکلف جیسے مضامین قطعی نہیں-الفاظ و محاورات پر قدرت رکھتے تھے-معاصرین کی صحبتوں کے اثر سے کلام میں جان اور چاشنی نظر آنے لگی-طبعیتاً اور مزاج کے حوالہ سے جلال اپنے برابر کسی کو نہ گردانتے تھے-مغرور اور انا پرست انسان تھے-اپنے معاصرین کے کلام میں عیب نکالنا اور تنقید کا نشانہ بنانا ان کا مشغلہ تھا-ایک طرف ان کے یہ معائب تھے تو دوسری طرف وہ اپنے تلامذہ سے نہایت شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے-جلال کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے کلام میں قواعد اور محاورہ کا خیال رکھتے تھے-یوں تو وہ ایک منجھے ہوئے استاد تھے-جلال

عروض وفن پر بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ شاعری میں چار دیوان یادگار چھوڑے ہیں:

۱۔ شاہد شوخ طبع ۲۔ کرشمہ گاہ سخن معروف بہ زباں حال ۳۔ مضمون ہائے دلکش خیالات بے مثال ۴۔ نظم نگار میں حسن مقال

یہ تھا لکھنوی تہذیب اور شاعری پر اجمالی جائزہ، جس سے لکھنؤ کے متاخرین شعراء اپنی شاعری کی بنیاد اس عہد کے حوالے سے اپنی ایک شناخت رکھتے ہیں۔

یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ لکھنوی رنگ سخن میں دہلوی شعراء کا بڑا دخل رہا لیکن اس کے باوجود لکھنؤ کا اپنا رنگ شاعری تھا۔ دراصل لکھنؤ کے دبستان شاعری کی بنیاد انشاء، مصحفی اور جرأت کے ہاتھوں رکھی گئی۔ یہ وہ شعراء ہیں جن کا تعلق دہلی سے ہے۔ اس وقت ان شعراء کے ہاں سنگلاخ زمینیں، معاملہ بندی اور نسائیت کے مضامین باندھے گئے۔ یہ بھی ایک زندہ حقیقت ہے کہ شجاع الدولہ کے عہد میں حسین عورتوں کا دخل دربار میں زیادہ رہا۔ اس لئے شاعری میں نسائیت کا رنگ نمایاں ہوتا چلا گیا۔ دہلی کی شاعری میں سوز وگداز اور تصوف ملا جلا رجحان ملتا ہے۔ کیونکہ دہلی کے اجڑنے سے لوگوں کی حالت زار عبرت کا نشانہ بنتی جا رہی تھی۔ یہ شعراء لکھنؤ پہنچ کر سکون واطمینان کا سانس لیتے ہیں اور اس سکون کی دولت سے فیضیاب ہو کر حسن پرستی، مادی عشق اور معاملہ بندی جیسے مضامین شاعری میں جگہ پانے لگے۔ عشق مجازی کی واردات وکیفیات والے مضامین میر جعفر علی حسرت کے کلام میں کثرت سے نظر آتے ہیں۔ آتش وناسخ کے شاگردوں نے لکھنؤ کے رنگ شاعری کو سنبھالے رکھا۔ واجد علی شاہ کے عہد میں لکھنوی شاعری کا رنگ ان شعراء کے ہاتھوں قائم ہوا۔

رند، صبا، رشک پھر ان کے بعد بحر، قلق، جلال وغیرہ نے اس رنگ کو جلا بخشی۔ اس دور میں اصناف سخن کے اعتبار سے بھی شاعری میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ میر وانیس کے مرثیے، نسیم کی مثنوی، معرکے کی غزلیں، قصیدے، رباعیات وغیرہ، شعراء سبھی کچھ کہہ رہے تھے۔

اسیر، جلال، بحر کے شاگردوں نے لکھنؤ کے رنگ شاعری کو تقویت دی۔ ان کے بعد زمانہ نئے تقاضوں کے لئے کروٹ بدل رہا تھا۔ دبستانوں کی آوازیں ماند پڑنا شروع ہو گئی تھیں۔ لیکن ان دبستانوں کے اثرات مستقبل کی شاعری میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اگر ہم صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی اور ثاقب لکھنوی کی شاعری کا مطالعہ کریں تو تغیر کا یہ عمل ہمیں ان کی شاعری میں صاف نظر آئے گا۔

دیگر دبستانوں کی طرح لکھنؤ کا دبستان بھی ایک کامیاب دبستان تھا۔ اس دبستان میں بھی سربرآوردہ شخصیات کے نام آتے ہیں۔ اس دبستان کا ہر شاعر ایک ستون کی حیثیت رکھتا ہے۔

دبستان رام پور:

دہلی اور لکھنؤ کے اجڑنے سے شاعری کی بساط الٹ گئی اور شعراء دل برداشتہ ہو کر مختلف شہروں کی طرف نکل گئے۔ دہلی اور لکھنؤ کے بہت سے شعراء ریاست رام پور پہنچے، جن میں داغ، امیر مینائی، تسلیم، جلال، منیر شکوہ آبادی وغیرہ۔ نواب یوسف علی خاں ادباء، علماء اور شعراء کا پہلے ہی قدردان تھا اور کچھ کو مخصوص طریقہ سے رام پور آنے کی دعوت دی۔ اس طرح یوسف علی خاں کی سرپرستی میں مشاعروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ لکھنوی اور دہلوی رنگ آپس میں مدغم ہو گئے اور ایک نئے رنگ کا اظہار ہونے لگا۔ نواب

یوسف علی خاں خود بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ مومن خاں مومن کو اپنا کلام دکھاتے تھے پھر غالب سے اصلاح لی اور آخر میں مظفر علی اسیر کو اپنا کلام دکھایا۔ اردو میں ناظم تخلص کرتے تھے۔ نواب صاحب صاحب دیوان شاعر تھے۔ انہوں نے شعراء وادباء اور اہل فن کی جو قدردانی اور عزت افزائی کی اس سے ان کی فیاضی کا پتہ چلتا ہے۔ زیادہ تر شعراء آسودہ حال ہو گئے۔ شعراء زیادہ تر غزلیں کہہ رہے تھے اور اپنی اپنی افتاد طبع سے نئے نئے مضامین اور اختراعیں تراش رہے تھے۔ دبستان رام پور کا اپنا ایک خاص رنگ تھا جو یوسف علی خاں کے عہد میں شباب پر تھا۔

نواب یوسف علی خاں کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے کلب علی خاں ۱۸۶۵ء میں مسند نشین ہوئے۔ یہ خود بھی شاعر تھے اور اپنے والد کی طرح ارباب فن کی قدر و منزلت کرتے تھے۔ انہوں نے امیر مینائی سے کلام پر اصلاح لی۔ مولانا فضل حق سے درسیات معقول و منقول پڑھی تھی۔ فارسی میں ان کا دیوان ''تاج فرخی'' کے نام سے مشہور ہے۔

ان کے چار دیوان اردو میں شعری ذوق کا اظہار ہیں۔ کلب علی خان ''نواب'' کا تخلص کرتے تھے۔ رام بابو سکسینہ کلب علی خاں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ان کو تحقیق لفظی کا خاص شوق تھا اور الفاظ کی صحت و عدم صحت کے مناظرے ان کے سامنے اکثر ہوا کرتے تھے جن میں بحر، تسلیم، جلال، امیر اور منیر وغیرہ جو اس فن خاص میں خاص بصیرت اور دلچسپی رکھتے تھے، نمایاں حصہ لیتے تھے۔ اسی وجہ سے نواب صاحب کا بیشتر کلام متروکات اور غیر فصیح الفاظ اور ترکیبوں سے پاک ہے۔''[۱]

نواب کلب علی خاں طبعی میلان کے تحت تحقیق لفظی کے شوق کی تکمیل اور محاوروں کا صحیح استعمال اور مناسب الفاظ کے لئے غور و فکر میں ڈوب جاتے کیونکہ وہ دور از کار تراکیب اور الجھی ہوئی گفتگو کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ زبان میں سادگی اور پرکاری کے قائل تھے۔ اصلاح زبان اردو کے سلسلہ میں ان کی کاوشیں قابل تحسین ہیں۔

رام پور میں شعراء کو جہاں ٹھہرایا جاتا اسے ''مصاحب منزل'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس مصاحب منزل میں ہی شعراء جمع ہوتے اور یہیں نواب رام پور مشاعرے میں شرکت کرتے۔ اس عمارت کا نام نواب نے اپنے ان شعراء کی نسبت سے رکھا جنہیں وہ عزیز رکھتا تھا۔ اس مجلس میں جو شعراء شریک ہوتے تھے، ان میں داغ، تسلیم، امیر مینائی، بحر، جلال لکھنوی۔ یہ تمام شاعر اپنے اپنے فن میں کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ نواب کی صحبت خاص اور مقامی شعراء کے رنگ سے جو رنگ ابھر کر سامنے آیا وہ معاملہ بندی اور ادابندی کا ہے۔ لکھنوی اور دہلوی شعراء نے مقامی رنگ کو اپناتے ہوئے ایک نئے رنگ کو اجاگر کیا۔ مقامی شعراء میں علی بخش بیمار، سید احمد رسا، نظام رامپوری، محمد مظفر خاں گرم، مولوی محمد حیات خاں حیات، صاحبزادہ مہدی علی خاں نحیف وغیرہ۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کلب علی خاں کے زمانے میں جو ادبی ترقی ہوئی ہے اس کی مثال کسی اور ریاست میں نہیں ملتی۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ نواب کی علم پروری اور ارباب فن کی قدر و منزلت ایک طرف تو علمی ترویج میں اضافہ کا باعث ہوئی تو دوسری طرف یہ ذوق عوام میں منتقل ہوا، عوام کی دلچسپی میں بے حد اضافہ ہوا، مشاعروں کا اہتمام ہونے لگا۔ ان مشاعروں سے ریاست میں ایک ادبی فضا پروان چڑھنے لگی اور اس سے یہ فائدہ ہوا کہ معاشرتی، ثقافتی اور تہذیبی فضا سے خوشگوار اثرات مرتب ہونا شروع ہوئے۔ مختلف افکار و خیالات کے ذہن جب ''مصاحب منزل'' میں جمع ہوئے تو ایک نئی فکر، ایک نیا رنگ اور ایک نئے طرز شاعری کی بنیاد پڑی، جس کی بنیاد یوسف علی خاں نے رکھی تھی اور اس میں ترقی اور فروغ کلب علی خاں کے زمانے میں ہوا۔ ان کا دور

۱۔ تاریخ ادب اردو، ص ۲۶۳

خصوصاً شعر و ادب کا سنہری دور تھا۔ ۱۸۷۷ء میں کلب علی خاں کی موت واقع ہوئی تو رام پور کی یہ ادبی بساط بھی الٹ گئی۔ یہاں پر شعراء، ادباء اور دیگر فنون کے اہل کمال آسودگی سے زندگی گزار رہے تھے۔

دبستان رام پور کا اپنا خاص رنگ جو یوسف علی خاں کے عہد میں شباب پر تھا، اس رنگ کو دو آتشہ کرنے والا شاعر نظامؔ رامپوری۔ اس کے کلام میں شوخی، معاملہ بندی، ادا نگاری، معشوقانہ اداؤں کا ذکر، ہجر و وصال کی کیفیات، یہ سب نظامؔ کی شاعری کا خاصہ ہیں۔

نظامؔ نے شاعری میں مصوری کی ہے۔ محاکاتی رنگ ابھر کر آتا ہے۔ تصویر آنکھوں میں گھوم جاتی ہے۔ نظامؔ کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

انداز اپنا دیکھتے ہیں آئینے میں وہ
اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

دینا وہ اس کا ساغر مے یاد ہے نظامؔ
منہ پھیر کے ادھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

یہ ہے وہ رنگ شاعری جو رام پور کے گلی کوچوں اور ایوانوں میں گونج رہا تھا جبکہ داغؔ بھی اسی نوع کی شاعری کر رہے تھے مگر یہ خوبی اور شوخی نہ پیدا کر سکے جو نظامؔ کے ہاں نظر آتی ہے۔ ''مہتاب داغ'' اور ''آفتاب داغ'' کا مطالعہ کر لیں اس میں ان کا طبعی میلان ظاہر ہوا ہے لیکن رام پور آنے کے بعد یہاں کی شاعری سے متاثر ہو کر ''یادگار داغ'' مرتب کی۔ اس میں خالصتاً رام پور دبستان کا رنگ ہے۔

غالبؔ نے نظامؔ کے متعلق کہا تھا کہ نظامؔ رام پور کا ''میرؔ'' ہے۔ لفظ میر غالب نے بہت ہی غور و فکر کے بعد نظام کو تفویض کیا کیونکہ میر کی تمام زندگی رنج و غم میں بسر ہوئی۔ اب آپ حیات نظام کا مطالعہ کریں تو ایک ایسا توازن نظر آئے گا۔

داغؔ نے اس بات کو محسوس ہی نہیں کیا بلکہ تسلیم بھی کیا ہے کہ رام پور میں نظامؔ سے بڑا شاعر کوئی اور نہیں۔ داغؔ نے نظامؔ کی تقلید کرتے ہوئے اپنی شاعری کے رخ کو موڑ دیا۔ رام پور میں ابلاغ شعری، شعری اقدار، جدت طرازی، شوخی بیان اور زبان کی سادگی و پرکاری سے روزمرہ کے الفاظ اور محاورے کی بندش سے شاعری میں نیا رنگ ظاہر ہوا۔ اس نئے رنگ میں زبان کی صفائی، محاورات کا صحیح استعمال، جنسی میلان، عیش و نشاط کا رنگ اور عیاشانہ طرز زندگی کے نقوش شاعری میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ داغؔ نے رام پور میں جو شاعری کی اس سے اردو زبان میں جو وسعت نظر آتی ہے وہ ان کے دواوین سے ظاہر ہے۔

ایک مثنوی ''فریاد داغ'' کے نام سے لکھی۔ مثنوی میں ایک طوائف کے عشق میں اپنی سرگزشت لکھی ہے۔ اسی لئے حالیؔ نے ''مسدس حالی'' میں داغؔ کا نام لئے بغیر ان کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ دراصل حالیؔ نے اس وقت کی شاعری پر تنقید کی ہے۔ شاعری میں ایسے ہی موضوعات کا رجحان عام تھا ؎

طوائف کو ازبر ہیں دیوان ان کے   گویّوں پہ بے حد ہیں احسان ان کے
نکلتے ہیں تکیوں میں ارمان ان کے   ثناء خواں ہیں ابلیس و شیطان ان کے
کہ عقلوں پہ پردے دیئے ڈال انہوں نے
ہمیں کر دیا فارغ البال انہوں نے

نواب کلب علی خاں کی وفات کے بعد رام پور کی یہ ادبی وشعری بساط بھی ختم ہوگئی اور ایک بار پھر شعراء منتشر ہونا شروع ہوئے۔ رام پور کی محفلیں اجڑنے کے بعد شعراء نے حیدرآباد دکن کا رخ کیا۔ یہاں والی ریاست میر محبوب علی خان کی سرپرستی میں پھر سے شعروادب کی محفلیں آباد ہوئیں۔

پنجاب میں اردو شاعری کا پس منظر

محمود غزنوی نے ۴۱۳ھ میں لاہور پر قبضہ کر کے اسے دارالخلافہ بنایا-غزنی حکومت قائم ہونے سے مسلمانوں کی کافی تعداد پنجاب میں آباد ہوگئی تھی- ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان بلند پایہ شاعر لاہور ہی میں مقیم تھے-البیرونی جیسا عالم بھی لاہور میں تھا- ان کے علاوہ سید علی ہجویری، سید اسماعیل بخاری ان حضرات ہی کی وجہ سے پنجاب اور خاص کر لاہور علم وادب کا گہوارہ بن گیا-محمود عادل اور انصاف کرنے والا تھا اور دوسری خوبی یہ تھی کہ وہ علماء وشعراء کی تکریم اور اہل فن کی بڑی قدر کرتا تھا-محمود کا حسن سلوک مثالی تھا- غیر مسلموں کو مذہبی رسمیں ادا کرنے کی اجازت تھی-

محمود غزنوی ہندوؤں کو شکست دیتا ہوا ملتان کی طرف بڑھا- وہاں اسماعیلی فرقے کی حکومت تھی- ملتان کو زیر نگیں کر کے دیگر شہروں کی طرف توجہ دی، ان میں میرٹھ، اٹاوہ، بلند شہر، متھرا، قنوج، ان شہروں کو فتح کرنے کے بعد سومنا تھ کا رخ کیا- یہاں سے بے پناہ دولت حاصل ہوئی-

سبکتگین کی وفات کے بعد ہی سے محمود نے ہندوستان پر اپنے مشہور سترہ حملوں سے ایک نئی تاریخ رقم کی-

معزالدین محمد غوری کا زمانہ ۱۱۸۶ء ۱۳۲۱ء تک کا ہے-اس نے پہلے غزنی فتح کیا- پھر ملتان کا رخ کیا اور اس کے بعد اچھ پھر لاہور پر قبضہ کر لیا- اس کی موجودگی میں ہنگامے، جھڑپیں اور جنگ کے معرکے اسی کے عہد میں راجپوتوں نے ملک کے امن کو تہہ و بالا کیا ہوا تھا- پھر راجپوتوں پر منظم حملہ ہوا- ہندوؤں کو شکست فاش ہوئی - لاہور، دہلی اور پنجاب کے علاوہ اجمیر بھی قلمرو میں شامل ہو گیا-

قطب الدین ایبک کا زمانہ بدنظمی کا زمانہ تھا-لیکن جلد ہی امراء نے التمش کو سلطان بنایا- اس کے دور میں بھی بدنظمی اور افراتفری رہی- ناصرالدین محمود نے حکومت میں اور عوام میں ایک ربط خاص پیدا کیا- دراصل ابتداء میں حکمرانوں کو حکومت کرنے میں کافی مشکلات اور دشواری کا سامنا رہا- میواتی، کھوکھر، جاٹ اور راجپوت بدامنی پھیلانے میں پیش پیش تھے- جہاں کہیں موقع ملا قتل وغارت کر دیتے- ناصرالدین کے عہد میں منگول قوم نے بھی لاہور کو کئی بار نقصان پہنچایا-

خاندان تغلق، سادات اور لودھی کا زمانہ ۱۳۲۱ء سے ۱۵۲۶ء تک کا ہے-غرض ہندوستان کی سرزمین بیرونی حملہ آوروں کے لئے ہموار رہی اور ملک کے اندر آپس کی ریشہ دوانیوں اور حصول اقتدار کے نشہ میں بھائیوں نے تلواریں نکال لیں اور فیصلہ تلوار کو سونپ دیا- غیاث الدین تغلق کے بعد تیمور نے ہندوستان میں قدم رکھا- اس طرح بادشاہتیں بدلتی رہیں- ہندوستان کو برباد کرنے میں سب سے زیادہ تیمور کا ہاتھ تھا ۱۳۹۸ء میں قہر الٰہی بن کر ہندوستان میں وارد ہوا- مال واسباب لوٹنے کے علاوہ قتل عام کیا-

اسلامی تشخص اور اسلامی طرز حکومت کو بھی نقصان تیمور کے حملوں سے ہوا- یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد اب ہندوستان میں

صوبہ جاتی اور خود مختاری نام کی ریاستیں بن چکی تھیں۔ سید خضر خان کو، جس کا تعلق خاندان سادات سے تھا، تیمور نے پنجاب کا نائب مقرر کیا لیکن ملک میں فتنہ وفساد، ابتری، لوٹ مار اپنی جگہ برقرار رہی۔ آخرکار بہلول لودھی جو کہ پنجاب کا حاکم تھا، اپنی جرأت اور ہمت سے دہلی پر ۱۴۵۱ء میں قبضہ کرلیا۔ لودھیوں کے خلاف سرداروں نے بغاوت کردی۔ ۱۵۲۶ء میں اس خاندان پر بھی آفت آئی اور یہ حکومت بھی ختم ہوگئی، یہاں سے پھر دہلی کے زوال کا آغاز ہوتا ہے اور یہیں سے مغل شہنشاہی دور کا بھی آغاز ہوتا ہے۔

۱۵۲۶ء میں پانی پت کے مقام پر گھمسان کی جنگ ہوئی۔ میدان بابر کے ہاتھ رہا۔ اس طرح بابر نے دہلی پر قبضہ کرلیا۔ ۱۵۳۰ء میں ہمایوں کو تخت پر بٹھایا۔ دس سال بعد یعنی ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر پنجاب کی طرف رخ کیا۔ یہاں سے نکالا گیا اور پھر چودہ سال بعد دوبارہ ہندوستان اور پنجاب پر قابض ہوگیا۔ البتہ اکبر کے زمانے میں لاہور پندرہ سال تک پایۂ تخت رہا۔ تاریخ ادبیات پاکستان وہند میں لکھا ہے کہ:

> ''مغلوں کا عہد تہذیب وتمدن اور ادب وثقافت کے لحاظ سے لاہور کے عروج کا زمانہ ہے۔ ڈیلا ت کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سترہویں صدی میں لاہور ایشیاء کا غالباً سب سے بڑا شہر تھا اور اس کی رونق اور وسعت کی انتہا نہ تھی۔ جہانگیر کے زمانے میں شیخ فریدم۔ ۱۶۱۶ء یہاں کے صوبہ دار ہوتے ہیں۔ جو اپنے عدل، اپنی قوت منتظمہ اور اپنی سخاوت اور ذاتی وجاہت کی وجہ سے شیخ جیو کہلاتے تھے۔ جہانگیر کو پنجاب اس قدر پسند تھا کہ لاہور کے مغرب میں شیخوپورہ اپنے نام سے بسایا۔ شاہجہاں نے بھی یہاں کئی سال گزارے اور اپنی رہائش کے لئے لاہور کے قلعہ میں شیش محل، نولکھا اور موتی مسجد تعمیر کی۔ لاہور کی اہمیت اورنگزیب کے دل میں اس قدر تھی کہ ایشیاء بھر کی عظیم ترین جامع مسجد اس نے یہیں بنائی۔''[۱]

مغلیہ دور حکومت میں اردو شاعری کا جو ارتقائی عمل ہمیں ملتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شعراء کی سرپرستی بادشاہوں نے کی۔ اردو شاعری کو عہد بہ عہد دیکھنا ہے کہ پنجاب میں شاعری کا کیا رجحان رہا۔ مختلف صوبوں میں اردو شاعری کی جو تحریکیں کام کررہی تھیں، ان تحریکوں کے ذریعہ شاعری کا جو رجحان سامنے آیا ہے، اس سے اس دور کی معاشرت اور سیاسی ابتری اور زبوں حالی کا پتہ چلتا ہے۔ آٹھویں صدی ہجری کی شاعری میں جو زبان استعمال ہوئی ہے اسے زبان کا عبوری دور ہی کہا جاسکتا ہے۔ چند شعراء کا کلام عہد کی روشنی میں دیا جاتا ہے تاکہ شعری محاسن کا اندازہ ہوسکے۔

پنجاب میں اردو شاعری کا آغاز بابا فریدالدین گنج شکرؒ ۵۶۹ھ۔ ۶۶۴ھ کی شاعری سے ہوتا ہے۔ آپ کی ولادت ملتان کے قصبہ کھوتوال میں ہوئی۔ آپ نے مختلف ممالک اسلامیہ کی سیاحت بھی کی تھی۔ حضرت بختیار کاکیؒ کے مرید ہوکر تمام زندگی پاک پٹن میں گزاری اور یہیں آپ کا مزار ہے۔

فارسی اور پنجابی کی شاعری کے ساتھ اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ ساتویں صدی ہجری میں برج اور پنجابی زبان کے خمیر سے اردو کا یہ پودا پھوٹا، جسے صوفیائے کرام نے اپنے مواعظ اور شاعری سے تناور درخت بنادیا۔

نثر سے پہلے نظم کا یہ پہلا سراغ ملا ہے، پنجاب میں نظم پہلے ہے، نثر بعد میں ہے۔ بابا فریدؒ کا کلام، جس میں فارسی اور

۱۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، تیرہویں جلد، ص ۱۹۶

اردو ملی جلی زبان کے تحت استعمال ہوئی ہے ؎

وقت سحر وت مناجات ہے خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
باتن تنہا چہ روی زیں زمیں نیک عمل کن کہ وہی سات ہے
پند شکر گنج بدل جاں شنو ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

مذکورہ کلام حافظ محمود شیرانی کی کتاب پنجاب میں اردو سے ماخوذ ہے- اس بیان کی حیثیت تاریخی سے زیادہ نہیں- جدید تحقیق کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مذکورہ کلام کا بابا فرید کی طرف انتساب مشکوک ہی نہیں کلیتاً غلط ہے- بابا صاحب نے مذہبی پیغام پھیلانے کا ذریعہ شاعری کو بنایا اور اس شاعری سے یہ بھی پتہ چلا کہ اردو اس وقت ہیت کے اعتبار سے کیا تھی اور پھر وقت کے ساتھ اس زبان میں کسی تیزی سے ترقی ہوئی- بابا صاحب کی شاعری درویش کی شاعری ہے- درویش کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کی تاثیر یہ تھی کہ جو بھی آپ کا کلام سنتا اس کے دل پر اثر کا ہونا لازمی تھا- اردو کی ترقی و اشاعت اور ترویج میں صوفیائے کرام کا گراں قدر حصہ ہے- یہ پہلا نقش تھا جس سے ساتویں صدی ہجری کی شاعری کا پتہ چلتا ہے-

شیخ شرف الدین بو علی قلندرؒ پانی پتی......متوفی ۷۲۴ھ/۱۳۲۳ء:

ان کی شاعری میں وہی پیغام ہمیں ملتا ہے جو بابا فرید گنج شکرؒ کے ہاں نظر آتا ہے- حضرت نظام الدین اولیاؒ آپ کے معاصر تھے- صوفی شعراء جس علاقہ سے بھی شاعری کر رہے تھے، اس شاعری میں علاقہ کی بولی اور زبان کو بڑا دخل تھا- زبان کے اس اثر کو محسوس کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''بابا فرید کی زبان پر سرائیکی کا اثر ہے، بو علی قلندر کی زبان پر پنجابی کا اثر ہے-
> امیر خسرو کی زبان پر دہلی اور یو پی کی زبان کا اثر ہے اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ
> کی زبان پر ماگدھی کا اثر ہے-''[۱]

دراصل زبان عبوری دور سے گزر رہی تھی- زبان کو کسی معیار تک پہنچنے میں ابھی ترقی کی بہت سی منزلیں طے کرنی تھیں- اردو کے ابتدائی نقوش بو علی قلندرؒ کی شاعری میں دیکھیے ؎

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کر بھور کدھی نہ ہوئے

گرونانک......۸۷۴ھ/۹۴۵ء:

سکھوں کے روحانی پیشوا اور پنجابی زبان کے شاعر کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے- ''گرنتھ صاحب'' میں نانک کی شاعری سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے بھی صوفیائے کرام کی طرز پر شاعری اپناتے ہوئے مذہبی پیغام کو پہنچانے کے لئے ذریعۂ اظہار شاعری

۱- تاریخ ادب اردو، ص ۶۲۰

کو بنایا- شاعری میں اردو الفاظ کا استعمال بھی کثرت سے کرتے ہیں- گرونانک کا زمانہ بھی عبوری دور کہلاتا ہے- مغلوں کی آمد سے پہلے کی زبان کو ابھی پھلنے پھولنے کے لئے ایک زمانہ درکار تھا-

''گرنتھ صاحب'' گرونانک کی شاعری کا وہ مجموعہ ہے جس میں عربی و فارسی الفاظ کے ساتھ اردو الفاظ کی بہتات بھی نظر آتی ہے- چند مثالیں شعری پیکر میں دیکھئے ؎

آپے پٹی، قلم آپ، اپر لیکھ بھی توں
ای کو کہئے نانکا، دوجا کا ہے کوں
نانک کہے سہیلیو سہہ کھرا پیارا
ہم سہہ کریاں داسیاں سچا خصم ہمارا

نانک کا کلام ان کے چوتھے جانشین گورو ارجن دیو متوفی ۱۶۰۶ء نے گرنتھ صاحب میں جمع کیا- ایک مثال اور دیکھتے چلیں ؎

نانک کیسی ہوئی سالک مت نہ رہیو کوئی
بھائی بندھی ہیت چکایا دنیا کارن دین گنوایا

ان دوہروں میں ہمیں بابا فرید گنج شکرؒ کی شاعری کا تتبع نظر آتا ہے-

گرونانک تک پہنچتے پہنچتے زبان میں کافی نکھار آ گیا تھا- نانک توحید اور معرفت کے مضامین شعروں میں باندھتے تھے- صوفیانہ طرز میں کہے ہوئے دوہروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ صوفیانہ خیالات کا پرچار کر رہے ہیں- ان کے یہ خیالات و نظریات اور شاعری صرف سکھوں تک محدود ہو کر رہ گئی- سکھوں کا آخری پیشوا گورو گوبند سنگھ نے سکھ مت کو ہندو مذہب میں ضم کر دیا- ہندوؤں کی تہذیب کے خلاف نانک نے آواز ہی نہیں اٹھائی بلکہ سراپا احتجاج بن گئے تھے- نانک کے بعد شاہ حسین پنجاب کی سرزمین پر اپنا چراغ جلاتے ہیں-

مادھولال شاہ حسین جالندھری......۹۴۵ھ/ ۱۰۰۸ھ:

ان کی شاعری میں موسیقیت، روانی، سلاست، انکسار اور بے خودی پائی جاتی ہے- پنجاب میں ان کے کلام کو بہت زیادہ پسند کیا جاتا ہے- انہیں کافی کا موجد کہا جاتا ہے- سندھ و پنجاب میں اس صنف کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی-

> ''ان کی کافیوں میں موت کا بار بار ذکر ہے- نیک اعمال کی بھی بڑی تلقین ہے اور وقت کے ضیاع پر اظہار افسوس بھی بڑا شدید ہے- جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے وہ حلیمی اور نرمی کا درس دیتے ہیں-''[۱]

شاہ حسین نے پنجابی زبان کو جس انداز سے برتا ہے، اس میں سے اردو جھانکتی نظر آتی ہے- ان کا کلام قدیم اردو کا ایسا نمونہ ہے جو قدیم و جدید کو علیحدہ کرتا ہے- شاہ حسین کی اس کافی میں اردو کے الفاظ ملاحظہ ہوں ؎

جہاں دیکھو تہاں کپٹ ہے کہوں نہ ہیو چین
دغاباز سنسار تے گوشہ پکڑ حسین

۱- تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، تیرہویں جلد، ص ۲۹۲

من چاہے محبوب کو تن چاہے سکھ چین
دوئے راجے کی سیدھ میں کیسے بنے حسین

گیارہویں صدی ہجری کے شیخ عثمان ولادت کا سن اور وفات کا سن نہیں دیا گیا -- اس دور میں نظمیں اور غزلیں، مسمط بھی جاری تھیں- قافیہ کو ضروری نہیں سمجھتے تھے- صرف ردیف ہی سے اپنا مطلب ادا کر لیتے تھے- شیخ عثمان کی مندرجہ ذیل غزل جس میں ردیف کو اردو میں لکھا گیا ہے، کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

عاشق دیوانہ ام آؤ پیارے حبیب   از ہمہ بیگانہ ام آؤ پیارے حبیب
اے دل دویں جان من درد تو درمان من   ذکر تو ساماں من آؤ پیارے حبیب

بقول حافظ شیرانی ''اس غزل میں ہم دیکھتے ہیں کہ اردو نے صرف انگلی پکڑی ہے، آئندہ چل کر وہ پونچا بھی پکڑ لے گی-''

یہاں تک اردو شاعری کا جو رجحان اور ترقی سامنے آتی ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کو ابھی ایک طویل سفر طے کرنا ہے- اس کے لئے ہمیں صوفیا کا احسان مند ہونا چاہئے-

احمد گجراتی......۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء:

قلی قطب شاہ کے عہد میں ان کی دو مثنویاں، جو عشق و محبت کی داستان پر ہیں، بے حد مقبول ہوئیں- پہلی مثنوی ''لیلیٰ مجنوں'' اور دوسری ''یوسف زلیخا'' -۱۵۸۰ء سے ۱۵۸۸ء کے عرصے میں یہ قصے نظم کئے-

ان مثنویوں میں بھی پنجابی لہجہ و زبان کو برتا گیا ہے پھر بھی اردو قدیم کا سراغ ان مثنویوں سے مل جاتا ہے-

موضوعات و اسلوب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور کی شاعری میں عشق و عاشقی کے مضامین مذہبی رنگ اور سیاسی انتشار کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے- مثنویوں کی ابتداء میں حمد، نعت، مناجات کے نمونے بھی ملتے ہیں- مثنوی کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

اس اللہ کے نانوں سو کے سب جگت
جو دانی دیاونت اس کی صفت

مناجات کے یہ شعر دیکھئے ؎

رحیمی سوں رحمت کرے سو رحیم   کریمی کے سب گن دھرے سو کریم
نہ وہ کچھ کسی ہاتھ حاجت کرے   جو عالم سب اس کی عبادت کرے
دلے سب جگت کوں ہدایت دکھائے   کرم ساتھ اپنے عبادت سکھائے

مولانا محمد افضل پانی پتی......۱۰۳۵ھ:

قطب شاہی دور کے شاعر ہیں-

غزلیں، نظمیں کافی تعداد میں ہیں- ان کے کلام میں اس دور کی عکاسی کے ساتھ مناظر فطرت پر بڑی جاندار نظمیں ملتی

ہیں- ان کی ایک بکٹ کہانی بھی بہت مشہور ہے- اس میں ایسی نظمیں کہی ہیں جو مناظر فطرت کی جان ہیں مثلاً ساون، بھادوں، اسوج وغیرہ پر نظمیں کہی ہیں- اس سے پہلے کی شاعری میں مذہبی رنگ نمایاں تھا- اہل غزنہ نے پنجاب پر ایک سو ستر سال حکومت کی- غزنی عہد حکومت میں لاہور کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور علمی و تہذیبی گہوارہ بھی بن گیا تھا-

علماء اور صوفیائے کرام کی خاصی تعداد رشد و ہدایت کی محفلیں سجانے میں مصروف تھے- مسلمانوں کے ذہن میں صرف ایک بات تھی وہ یہ کہ پنجاب ہمارا وطن ہے-

صوفیائے کرام نے عوام کو محبت کی نگاہ سے دیکھا- ان کی مجلس میں امیر و غریب سب جمع ہوتے اور فیضیاب ہوتے- ان صوفیائے کرام کی چوکھٹ پر مسلم، غیر مسلم، خواہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، حاضر ہو کر ادب سے کسی بھی جگہ بیٹھ جاتا اور مرشد کی باتیں سنتا- یہ باتیں ان کے دل پر اثر کرتیں اور یہ مسلمان ہو جاتے- ان صوفیائے کرام نے نظم میں ''کافی'' اور ''دوہروں'' کو رواج دیا- خانقاہوں سے اردو کی ترقی کا آغاز ہوتا ہے-

افضل پانی پتی نے بکٹ کہانی ایک طویل نظم مثنوی کی بحر میں لکھی ہے-

ہندی صنف ہے اور ہندوؤں میں بہت مشہور ہے- فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے- تدریسی پیشہ سے وابستہ تھے، ہندو لڑکی سے عشق ہوا، پھر ہجر و وصال کا مزہ چکھا- حافظ محمود شیرانی بکٹ کہانی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''محمد افضل کی بکٹ کہانی درحقیقت ایک بارہ ماسہ یا دوازدہ ماہہ ہے، جس میں ایک فراق دیدہ عورت اپنے خاوند کی جدائی میں اپنی سکھیوں یعنی سہیلیوں سے خطاب کر کے اپنی بے تابی اور درد جدائی کی داستان الم سناتی ہے اور جیسا کہ ہمارے ملک میں بارہ ماسوں کا دستور ہے-''[1]

افضل کی بکٹ کہانی میں سے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

سنوں سکھیو بکٹ میری کہانی　　پھٹی ہوں عشق کے غم سوں نمانی
نہ مجھ کو سوکھ دن نہ نیند راتا　　ہر ہوں کی آگ سیں سینہ جراتا

بکٹ کہانی میں ساون، بادھوں، اسوج پر بھی علیحدہ علیحدہ عنوان سے بھی نظمیں کہی ہیں ؎

چرا ساون بجا مارو نکارا　　سجن بن کون ہے ساتھی ہمارا
اری جب کوک کوئل میں سونا ہی　　تمام تن بدن میں آگ لاہی

بکٹ کہانی کے ہر شعر میں اثر انگیزی موجود ہے- اس نظم سے بھی اردو نظم کے ارتقاء کا پتہ چلتا ہے-

حضرت سلطان باہوؒ، ولادت ۱۰۳۹ھ/ م ۱۱۰۲ھ:

آپ کی ولادت جھنگ میں ہوئی- ابتداء ہی سے مزاج میں درویشی تھی- رسمی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے معرفت و سلوک کا راستہ اختیار کیا- راہ حق میں قدم رکھنے کے بعد تصنیف و تالیف میں مشغول ہوئے اور ایک سو چالیس کتابیں مذہبی اور

۱- پنجاب میں اردو، ص ۲۵۶

متصوفانہ طرز پر لکھیں- آپ کا شعری کلام ''ابیات باہو'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے- چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

الف
الله چنبے دی بوٹی مرشد تن میرے وچہ لائی ہو
اند بوٹی مشک مچایا جاں پھلن وچہ آئی ہو

ب
بسم الله اسم الله دا ایہہ بھی رہتا بھارا ہو
ناں شفاعت سرور عالم چھٹ سی عالم سارا ہو

ث
ثابت عشق تنہاں نے لدھا جنہاں ترٹی چوڑ چاکیتی ہو
نہ اوہ صوفی نہ وہ بھنگھی نہ سجدہ کرن ہستی ہو

حضرت باہوؒ عشق حقیقی کی منزل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

ہو دا جامہ پہن کے آیا اسم کماون ذاتی ہو
نہ اوتھے کفر اسلام دی منزل نہ اوتھے موت حیاتی ہو
نہ اوتھے مشرق نہ اوتھے مغرب نہ اوتھے دیہہ تے راتی ہو
شاہ رگ توں نزدیک سنیندا باہو پا اندرونی جھاتی ہو

ان صوفی شعراء کے متعلق صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تمام شاعری عشق حقیقی اور عارفانہ فکر کلام میں پائی جاتی ہے- ویسے بھی ان کا کلام بلند مقام حاصل کر چکا ہے- باہوؒ کا کلام ایک ایسی سچائی ہے جس میں ریا اور بے ریا کو الگ الگ کر دکھایا- باہوؒ کی شاعری ایک سچی قلبی واردات کا آئینہ دار ہے-

گیارہویں صدی ہجری میں زیادہ تر شعراء نے جو نظمیں کہی ہیں ان میں قدیم ریختہ کے نمونے زیادہ ملتے ہیں- قدیم ریختہ میں سب سے پہلے بابا فرید الدین گنج شکرؒ ان کے بعد شیخ عثمان، شیخ جنید اور منشی ولی رام، ان شعراء کے ہاں قافیہ سے آزاد غزلیں اور نظمیں ملتی ہیں- ان نظموں کا تعلق زیادہ تر ہندی اوزان پر ہے- فارسی زبان کا بھی زیادہ رجحان رہا ہے- ناصر علی سرہندی کی شاعری میں بھی ریختہ کے نمونے ملتے ہیں-

ناصر علی سرہندی......۱۰۴۸ھ-۱۱۰۸ھ/ ۱۶۳۸ء-۱۶۹۶ء:

ولی دکنی کے معاصر تھے- ان کی شاعری پر فارسی زبان کا اثر زیادہ ہے- انہوں نے دکنی شاعری کی پیروی کرتے ہوئے اپنی شاعری کو مستحکم کیا-

شعراء میں چشمکیں ہوتی آئی ہیں- ولی دکنی نے ناصر علی کو ایک شعر میں اپنی برتری کا احساس دلایا تھا، وہ شعر یہ ہے ؎

اچھل کر جا پڑے جوں مصرع برق اگر مصرع لکھوں ناصر علی کو

یہ تھا دکنی انداز، اب پنجاب کی شاعری میں ناصر علی کی یہ غزل دیکھئے، جسے حافظ شیرانی نے ''پنجاب میں اردو'' میں بھی نقل

کیا ہے ؎

سجن کے حسن کا قرآن پڑھیا ہے میں نظر کر کر
نہیں پائی غلط اوس میں دیکھا زیر و زبر کر کر
معانی اور بیاں بھیتر بدیع اس کو سمجھتا ہوں
پڑھی ہے حسن تیرے کی مطول جس فکر کر کر
اصول اور ہندسہ کب لک پھروں تکمیل اے یاراں
ہدایہ عشق کا غالب ہو یا مجھ پر اثر کر کر

ناصر علی کی شاعری میں عشق و عاشقی محبوب کے حسن و جمال، ناز و ادا، خد و خال کی تعریف اور جمالیاتی رنگ کی آمیزش نے شاعری کی ترقی میں مدد دی۔ مرزا عبدالقادر بیدلؔ صوفیانہ اور فلسفیانہ خیالات کو نظم کر رہے تھے۔ وہ بھی جمالیاتی شاعری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

مولانا عبداللہ عبدی انصاری لاہوری......

یوسفی صاحب نے پنجاب کے قدیم اردو شعراء میں یہی نام لکھا ہے جبکہ حافظ شیرانی نے صرف مولانا عبدی تحریر کیا ہے۔ ان کی ولادت کا سن نہیں معلوم ہو سکا۔ ان کی پہلی تصنیف ''تحفہ'' ۱۰۲۵ھ میں لکھی گئی اور آخری تصنیف ''خیر العاشقین'' ۱۰۶۵ھ میں لکھی۔ فقہ کے عالم تھے۔ چالیس سال تک مذہبی تصانیف تحریر کیں۔ بارہ رسالے فقہ پر بھی لکھے۔ ۱۰۷۴ھ میں اردو میں ''فقہ ہندی'' کے نام سے رسالہ بھی لکھا۔ فقہ ہندی مین حمد و ثناء، ایمان، مختلف فرقوں کے بارے میں نماز کے متعلق اہم باتیں پیرایہ نظم میں ادا کی ہیں۔ مختلف عنوان کے تحت ایک ایک شعر درج کیا جاتا ہے ؎

حمد

حمد و ثنا سب کوں خالق کل جہان
لائق حمد و ثناء کے اور نہ کوئی جان

ایمان

سر نیکی ایمان ہے اصل عبادت سوئے
نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج بن ایمان نہ ہوئے

فرقوں کے بارے میں

تس کے پیچھے مومنا تہتر فرقہ جان
بہتر فرقہ دوزخی سو تابع شیطان

خاتمہ

فقہ ہندی کو مومناں آنو زباں پر یاد
مسلہ آوے دین کا مول نہ ہووے فساد

پنجابی زبان وادب کی تاریخ میں ''عبدی'' ایک پنجابی شاعر بھی گزرا ہے- اس نے ایک ''رسالہ مبتدی'' کے نام سے لکھا ہے-مولانا عبدی کے اشعار میں پنجابی اور اردو الفاظ استعمال ہوئے ہیں-مذہبی شاعری کے اس رجحان سے شاعر کی ذہنی کیفیت اور اس دور کے انسانوں کا فرقوں میں تقسیم ہو جانا ظاہر ہو رہا ہے-اسی مقصد کو سامنے رکھ کر مولانا عبدی نے فقہ ہندی میں مسلمانوں کو صحیح راستے کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے ایک طویل نظم قلمبند کی-

قطبی رہتکی......ولادت ۱۱۰۵ھ:

''پریم قصہ'' لکھ کر شہرت حاصل کی- پنجاب میں ہریانہ دبستان سے بھی وابستہ تھے- قصہ میں ہندی، پنجابی اور اردو زبان استعمال کی ہے-چند شعر نمونے کے طور پر دیکھئے، یوسفی صاحب نے اسی قصہ کو ''تیراماسہ'' بھی لکھا ہے ؎

پریم قصہ ہوا ہے آخر یارو
تیرا ماسہ بھی اس کے تاں بچارو
بارہ ماسہ ہوئے تھا اور سب کے
تیرا ماسہ ہوا جا کر قطب کے
کہا محبوب میں تیں کیا بھولانا
تیں نے اس کا فکر اب کچھ نہ جانا

شاہ مراد خانپوری......ولادت ۱۰۳۷ھ-وفات ۱۱۱۴ھ:

صوفیانہ شاعری کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں- اردو مجلس چکوال نے شاہ مراد کا کلام راولپنڈی سے شائع کرا دیا ہے- فارسی، پنجابی اور اردو زبان کے شاعر تھے- حافظ شیرانی نے انہیں شاہ مراد لکھا ہے-یوسفی صاحب نے شاہ مراد خان پوری اور جمیل جالبی صاحب نے ان کا نام شاہ مراد بن قاضی لکھا ہے جبکہ یہ تینوں نام ایک ہی شخصیت کے ہیں- اردو کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

وہ زلف جو جھوٹے گال پڑی یا سانپ نگہباں مال پڑی
یا بسمل کاغذ لال پڑی یا لیل قدر ہے نور ہو یا
کہیں عاشق ہو مشتاق ہو یا کہیں دلبر ہو کر عاق ہو یا
کہیں جفت ہو یا کہیں طاق ہو یا مغموم ہو یا مسرور ہو یا

جمیل جالبی صاحب نے ''تاریخ ادب اردو'' میں ان کا نام شاہ مراد بن قاضی جان محمد لکھا ہے-

ایک مراد شاہ لاہوری ہیں، ان کا تعلق لاہور سے ہے اور یہ اٹھارویں صدی عیسوی کے شاعر ہیں- حافظ شیرانی نے ان کا نام حضرت مراد شاہ تحریر کیا ہے-

اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء میں ہوئی- وفات کے دو سال بعد سکھوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا- اس فتنہ کو فوراً ہی دبا دیا گیا لیکن سکھوں نے پنجاب کے کئی حصوں میں خونریزی کا بازار گرم رکھا- ایسے میں نادر شاہ بھپرے ہوئے طوفان کی صورت جوہر

چیز کو خاشاک کی طرح اپنے ساتھ بہالے جاتے-۱۷۳۸ء میں پنجاب کو تباہ و برباد کر کے دہلی پہنچا- دہلی میں بھی زیر و زبر معرکے رہے-مغلوں کے زوال کا یہ پہلا سانحہ تھا-ابھی نادر شاہ کے حملوں سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے یا صحیح طرح سنبھالا بھی نہ لیا تھا کہ کچھ عرصہ بعد احمد شاہ ابدالی نے اپنے حملوں کا آغاز کیا-ان متواتر حملوں سے پورے برصغیر میں حکومت کی جڑیں کمزور ہوگئیں اور مرکز میں چند دیئے جھلملا رہے تھے-ابھی احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے عوام سنبھلے بھی نہ تھے کہ پھر ایک بار سکھوں کو قتل و غارت، کشت وخون کا موقع مل گیا-

۱۷۷۰ء سے ۱۸۰۰ء کے زمانے تک پنجاب میں کوئی حکومت اور کوئی نظام نہیں تھا- پنجاب میں ہر طرف افراتفری، خانہ جنگی، انتشار اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا-سکھوں نے مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا تھا-انسانی قدریں پامال ہو رہی تھیں-

مذہبی اور اخلاقی اقدار نہ ہونے کے برابر تھا- ایسے میں مذہبی اور اخلاقی پستی کے اس حصار کو توڑنے میں بھلّے شاہ، وارث شاہ، غلام قادری، مراد شاہ، محمد غوث بٹالوی وغیرہ ان شعراء نے اپنی شاعری میں پیغام کی صورت متصوفانہ شاعری میں اخلاقیات کو داخل کیا اور لوگوں کے بگڑے ہوئے اخلاق درست کیے- یہ کام انہوں نے مختلف اصناف کے ذریعہ کیا ہے-کافیاں بھی کہی جا رہی تھیں-مخمس، مرثیہ، رباعی، نظم، غزل وغیرہ بھی اظہار کا ذریعہ رہا-اس دور کی شاعری کو مصلحانہ شاعری کہا جا سکتا ہے-

میر جعفر زٹلی ۱۱۲۵ھ/۱۷۱۳ء:

میر جعفر کی ولادت اور اورنگ زیب کی تخت نشینی کا واقعہ ایک ہی سال میں رونما ہوا-زیادہ تر ناقدین نے انہیں فحش نگار قرار دیا ہے- معاشرتی اور جمالیاتی فکر بہت تیز تھی، جو دیکھا نظم اور مثنوی کے پیرایہ میں ادا کر دیا- ان کے کلام میں ابتذال اپنے عروج پر نظر آتا ہے-ہجو کی تعداد کچھ زیادہ نہیں- ان کی ہجو میں نڈر مجاہد کی آن بان ہوتی ہے-میر جعفر کا دور دراصل انتشار کا دور تھا-اقتصادی حالات نہایت خراب ہو چکے تھے-ہر جگہ فتنہ و فساد سر اٹھائے ہوئے تھے-بدنظمی، افراتفری اور بادشاہوں کی کشمکش، آئے دن بادشاہ کا بدلنا یعنی اورنگ زیب سے لے کر فرخ سیر تک کئی بادشاہ لقمۂ اجمل بن گئے-

میر جعفر نے اپنی شاعری میں سیاسی رجحانات اور عہد کی تصویر کو شعروں میں ڈھال کر پیش کیا ہے-میر جعفر کے عہد میں مغل سلطنت مرکزیت متزلزل ہونا شروع ہوگئی تھی-عدل و انصاف اور قانون نام کی چیزیں ختم ہو چکی تھیں- اخلاص اور اخلاق اٹھتا جا رہا تھا-عہد کی عکاسی کے لئے یہ دو شعر ہی کافی ہیں ؎

چغل کرتے پھریں چغلے، بھکل کرتے پھریں بھکل
دغل کرتے پھریں دغلے عجب یہ دور آیا ہے
گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے
ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے
نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائی میں وفاداری
محبت اٹھ گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے

کہاں پایئے، ایسا شہنشاہ مکمل، اکمل و کامل دل آگاہ
رکت کے آنسوؤں جگ روتا ہے نہ میٹھی نیند کوئی سوتا ہے

ڈاکٹر جمیل جالبی جعفر زٹلی کے متعلق لکھتے ہیں:

''جعفر زٹلی اپنے فن کا پہلا اور آخری آدمی تھا- اس کے فن کی سب نے داد دی ہے- اس زمانے میں جب انتشار چاروں طرف پھیلا ہوا تھا، روز روز بادشاہ بدل رہے تھے، صدیوں پرانی تہذیب کی بنیادیں ہل چکی تھیں، میر جعفر زٹلی نے ہجو، طنز اور زٹل کے ذریعہ اس معاشرے کو متوجہ کرنے اور زوال کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے- اس سطح پر اس نے کسی کو نہیں بخشا-'' [1]

میر جعفر زٹلی وہ نمائندہ شاعر ہے جو اپنے عہد کا ترجمان بھی ہے اور مصلح بھی-

فارسی اور اردو میں جو کلام ہمیں ملتا ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ میر جعفر نے اپنی شاعری کے ذریعہ قوم میں بیداری کا جذبہ پیدا کیا اس لئے کہ وہ خود ایک بہادر انسان تھا- بہادر وہی شخص ہوتا ہے جو اپنی ذات میں سچا ہو- غرض جعفر کی شاعری میں آنسو بھی ہیں، قہقہے بھی ہیں- ان کی شاعری ایک مکمل تاریخ بھی ہے- فارسی، پنجابی اور اردو زبان کے الفاظ سے قصر شاعری جگمگا رہا ہے- ہجو اور تعریف میں یکساں قدرت رکھتے ہیں- عالمگیر کے بعد محمد اعظم بہادر شاہ اول کی تخت نشینی کے بعد مدح میں چند شعر ؎

گزشتہ عہد عالم گیر، اعظم شاہ آیا ہے
بہادر شاہ غازی نے پلک میں جل مٹایا ہے
جو عبدالصمد غازی نے لیا ہے گھیر کافر کو
پکڑ بیگار کاری گر سکھوں کا سر منڈایا ہے

عبدالصمد لاہور میں صوبہ دار تھے- سکھوں کی سرکوبی کرنے میں پیش پیش تھے-

شیخ ابوالفرج محمد فاضل الدین بٹالوی......متوفی ۱۱۵۱ھ:

گیارہویں صدی ہجری کے آخر اور بارہویں صدی ہجری کے اوائل میں پنجاب کے شہر بٹالہ میں اردو زبان وادب کی ایک تحریک وجود میں آئی، جو بعد میں ایک شناخت اور حوالہ بن گئی- ''ولی کا یہ نیا معیار ریختہ پوری طرح جڑ پکڑ چکا تھا-''

جمیل جالبی کا یہ کہنا درست ہے کہ ریختہ اپنی جڑ پکڑ چکا تھا- وہ اس لئے کہ اس کے اثرات شاعری پر منعکس ہونا شروع ہو گئے تھی- ولی کی شاعری سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اردو شاعری کس رنگ اور کس خطوط پر چل رہی تھی- محمد فاضل الدین نے پنجاب میں تصوف کو اپنی شاعری میں اجاگر کیا اور خود بھی تصوف میں رنگے ہوئے تھے- دراصل بٹالہ اردو تحریک کے روح رواں محمد فاضل الدین بٹالوی ہی تھے لیکن اس تحریک کو آگے بڑھانے میں اور کامیاب بنانے میں ان کے صاحبزادے غلام قادر شاہ- ان کی ایک مثنوی ''رمز العاشقین'' اس مثنوی میں رموز تصوف کو شعر میں بیان کیا ہے- یہ ایک حقیقت ہے کہ فاضل بٹالوی نے اپنی شاعری کے ذریعہ تصوف کو فروغ دیا تو دوسری طرف زبان کے خط متعین کئے- زبان کے اس تبدل سے جو زبان قدیم سے جدید میں وجود میں آ رہی ہو وہ نقوش فاضل الدین بٹالوی کی شاعری میں دیکھے جا سکتے ہیں- تصوف اور نئے ریختہ پر آپ کے صاحبزادے اور آپ کے مریدین نے بٹالہ تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا- یہی وہ دور ہے جس میں شاعری، لہجہ اور اسالیب اور اردو کا نکھرا ہوا چہرہ

۱- تاریخ ادب اردو، ص ۶۷۱

دیکھا جا سکتا ہے۔مناجات کے دو شعر، جو عربی اور اردو میں ہیں ؎

میں ہوں خرابی میں پڑا کا لطفل سوء الخلق حیف
اس غم ستی چھاتی سڑی انظر بحالی یا نبی
برقع شریعت سوں رکھو حق کون بنور کم
اس عشق سوں کر پھل جڑی انظر بحالی یا نبی

بلّھے شاہؒ......متوفی ۱۱۷۱ھ/ ۱۷۵۷ء:

صاحب دل بزرگ تھے۔ ہمہ وقت عشق حقیقی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کے اشعار میں عرفان خودی، عرفان خدا کا ادراک ملتا ہے۔توحید وتصوف کی بات کرتے تھے۔ زیادہ تر شاعری پنجابی زبان میں ہے لیکن اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی کافیاں اور گیت پنجاب بھر میں مقبول ہیں۔ آنے والے شعراء نے ان کے گیتوں کی تقلید میں اپنی شاعری کی بنیاد رکھی اور وہ شعراء اپنے دور کے نامور ممتاز شعراء کہلائے۔

جمیل جالبی نے بلّھے شاہ کی شاعری پر سیر حاصل بحث کی ہے:

"بلّھے شاہ کے ہاں خالص پنجابی کلام میں ایسے الفاظ وتراکیب کا بڑا ذخیرہ ملتا ہے، جو اردو اور پنجابی دونوں میں مشترک ہے۔ پنجابی کلام کے بیچ بیچ میں اردو مصرعے اور بند اس طرح ملے جلے سامنے آتے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے گویا اردو اور پنجابی دونوں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔"[1]

کافی کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے ؎

بلّھے شاہ نے شاہاں دا مکھڑا گھنگھٹ کھول دکھائیں
اپنے سنگ رلائیں پیارے اپنے سنگ رلائیں

ایک شعر دوہرے کا بھی دیکھئے ؎

ان کو مکھ دکھلائے ہے جن سے اس کی پیت
ان کو ہی ملتا ہے وہ جو اس کے ہیں مہمیت

ایک پنجابی شاعر ہونے کی حیثیت سے اردو کا استعمال، جس میں اثر بھی ہے اور کیف بھی، ویسے ان کی شاعری کا موضوع توحید ہے کیونکہ وہ خود ایک درویش صفت انسان تھے۔ ان کی شاعری گیت، کافی اور دوہرے ہی کے گرد گھومتی ہے۔

غلام قادر شاہ......متوفی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء:

شیخ محمد فاضل الدین بٹالوی کے صاحبزادے اور جانشین تھے۔ ان کی مثنوی "رمز العاشقین" اس میں تصوف کے رموز

۱- تاریخ ادب اردو، ص ۶۵۱

شعری زبان میں بیان ہوئے ہیں- اس کے علاوہ تصوف پر متعدد کتابیں تحریر کی ہیں- رمز العاشقین کے بارے میں حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں:

> ''اس مثنوی کا وزن عروضی خالص ہندی ہے- پنجابی لہجہ کی تمام خصوصیات اس میں موجود ہیں- رمز العشق میں عربی الفاظ کا استعمال کثرت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے- ایک وجہ تو اس کی یہ ہے کہ تصوف کی تمام اصطلاحات عربی ہیں، دوسرے حضرت غلام قادر شاہ صاحب خود عربی کے فاضل ہیں اور اس زبان سے زیادہ مزاولت رکھتے ہیں-''[1]

مثنوی ایک عالمانہ طرز پر لکھی گئی ہے اور اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ عبادت کی روح کیا ہے- شرک اور شک سے کیسے محفوظ رہا جاسکتا ہے- غرض مثنوی کا ہر شعر اپنی جگہ اصلاح کا ایک پیغام ہے- اسی مثنوی میں اپنے والد سے عقیدت کا اظہار بھی ملتا ہے- مثنوی کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

اول آخر باطن ظاہر ناہیں اس سے کو یو باہر
فاضل کشاہ کا لے کر نام سنو حقیقت کہے غلام
سیما شیخی عبدالقادر نعم المولیٰ نعمہ الناصر
ظاہر موں ہے وحدت کثرت باطن موں ہے کثرت وحدت
کرو عبادت شرع آئین حاصل ہووے نور یقین
کرو عبادت دن اور رات شرک اور شک سوں ہووے نجات
اپنے شہ کا لے کر نام کہیا رمز العشق تمام
رمز العشق کوں جس نے جانا بے شک حق کوں دیکھ پچھانا

مثنوی کیا ہے، توحید کا ایسا گلدستہ ہے جس کی خوشبو عالم میں آج بھی مہک رہی ہے- آپ کا کلام صوفی ولی محمد قادری نے ''مجموعۂ قادری'' کے نام سے شائع کرا دیا ہے-

وارث شاہؒ......:

کی تاریخ ولادت اور وفات کے بارے میں اب تک معلوم نہ ہوسکا- انہوں نے اپنی شاہکار نظم ''ہیر'' ۱۱۸۰ھ میں لکھی- گو کہ یہ پنجابی زبان میں لکھی ہے پھر بھی اشعار میں اردو الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں- وارث شاہ نے اپنی ''ہیر'' کی وجہ سے اس قدر شہرت پائی کہ آپ کی دیگر اصناف اور تصنیفات اخفا میں چلی گئیں- پنجاب بھر میں اس نظم کا بڑا چرچا ہوا- نظم میں سوز غم دل اور ساز رگ جاں کے امتزاج سے جو اثر پیدا ہوا ہے، اس کیفیت کو نغمگی، موسیقیت اور قلبی واردات کا نام ہی دیا جاسکتا ہے- وہ اس لئے کہ وارث شاہ خود ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہوگئے تھے- انشاء اللہ خاں انشاء ''ہیر رانجھا'' کے متعلق ایک شعر میں اس طرح داد

۱- پنجاب میں اردو، ص ۲۳۶

دیتے ہیں:-

سنایا رات کو قصہ جو ہیر و رانجھے کا تو اہل درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

حالانکہ وارث شاہ سے پہلے بھی عشق ومحبت پر قصے نظم ہوئے مثلاً شاہ حسین، احمد گجراتی اور عقیل ان کے علاوہ اور بھی شاعر ہیں- ان سب نے عشق کے پیچ وخم پر بات کی ہے- بہر کیف وارث شاہ کی ''ہیر'' اپنی نوع کی واحد نظم ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گی- اس نظم کے علاوہ غزلیں بھی کہی ہیں لیکن غزل میں وہ بات پیدا نہ کر سکے-

نظم ''ہیر'' میں عورت کے بارے میں دو شعر ملاحظہ ہوں:-

مارو مار پکارتے پکڑ چھمک پری آدمی تے قہر دان ہوئی
رانجھے اٹھ کے آکھیا واہ سجن ہیر ہس کے تے مہربان ہوئی
بھلے نین چوٹی متھا چن رانجھا نین کجلے دی گھمسان ہوئی
صورت یوسف دی دیکھ طاموس بیٹی سنے مال تے ملک قربان ہوئی

وارث شاہ رومانی شاعری کے تاجدار کہلائے، غزل کے دو شعر بھی دیکھیے:-

جس دن کے ساجن وچھڑے ہیں تس دن دا دل بیمار ہویا
اب کتھی بناں کیا فکر کروں گھر بار سبھی بے زار ہویا
جب وارث شاہ کر لایا نے تب روح سو روح ملایا تے
تب سہج سہاگ لے آیا نے جی جان محزون اسرار ہویا

غزل کے یہ دو شعر ''پنجاب میں اردو'' میں اور ''تاریخ ادب اردو'' میں بھی ہیں- یہ اشعار پنجابی زبان کی تاریخ سے لئے ہیں-

مراد شاہ.......:

لاہور کے رہنے والے تھے- آپ کا مزار ڈیرہ اسماعیل خان کے قریب ''لونڈا پھنڈ'' میں ہے- ۱۱۹۶ھ میں اپنے والد صاحب کے ساتھ لاہور آ رہے تھے، دوران سفر ڈاکوؤں سے مقابلہ ہوا، مراد شاہ کے والد کو ڈاکوؤں نے مار دیا-

غزل اور مثنوی خوب کہتے تھے- بقول شیرانی ''ان کی طبیعت غزل سے بہتر مثنوی پر جمتی ہے-'' ان کا ایک خط ''نامۂ مراد'' کے نام سے منظوم پیرایہ میں ہے- اس میں انہوں نے اردو زبان کی ترقی، ترویج، واشاعت اور اردو زبان پر زور دیا ہے- مثنوی کی بحر میں منظوم خط کے چار شعر پر اکتفا کرتا ہوں:-

وہ اردو کیا ہے یہ ہندی زباں ہے کہ جس کا قائل اب سارا جہاں ہے
کلام اب تجھ سے میں ہندی زبان میں کرو شہرت ہوتا سارے جہاں میں
کہ اب وسعت میں اس کی سب سخنداں سمند طبع کو کرتے ہیں جولاں
لطافت یہ نکالی ہے اسی میں کہ فرماتے نہیں کچھ فارسی میں

مراد شاہ کے اس خط سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مغلیہ سلطنت کا چراغ گل ہونے کو ہے-

مراد شاہ کا ریختہ ملاحظہ ہو۔

اب کیا کرے کوئی رے جیا جب آنکھوں سے پیا دور ہوئیا
تن لکڑی ہو جل راکھ بھیا، یہ سینہ گرم تنور ہوئیا
اوہ مجنوں آپے لیلیٰ ہے اوہ یوسف آپ زلیخا ہے
اوہ وامق آپے عذرا ہے مشتاق ہو خود مغرور ہوئیا
ایہہ شعر عجب استاد سوں ہے ایہہ دلبر حسن آباد سوں ہے
ایہہ ریختہ شاہ مراد سوں ہے مقبول ہوئیا منظور ہوئیا

محمد غوث بٹالوی......۱۱۹۸ھ:

محمد غوث بٹالوی کا ایک مرثیہ، جو مثنوی کی بحر میں ہے، حافظ شیرانی اس نظم کے متعلق لکھتے ہیں:

''بوڑھا جے سنگھ اپنے نوجوان اکلوتے بیٹے کی وفات دیکھ کر بالکل بددل ہو گیا۔ اس نے تیر و ترکش پھینک دیئے۔ گھوڑے سے اترا اور زار و قطار روتا ہوا دشمن کی گولیوں کی زد میں جا کھڑا ہوا۔ غنیم اس بوڑھے جنگ آزما کی نوحہ وشیون سے بے حد متاثر ہوا اور کسی نے اس پر حملہ نہیں کیا۔ گوربخش سنگھ کی وفات کے موقع پر بٹالہ کا ایک شاعر محمد غوث بٹالوی جو بٹالہ کی کچہری میں گوربخش سنگھ کی فوجداری میں ملازم تھا، اس کا مرثیہ لکھتا ہے۔''[1]

محمد غوث بٹالوی کے مرثیہ کی زبان میں سلاست و سادگی، ہر شعر اپنی جگہ پر سوز اور درد سے بھرا ہوا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

پڑا شور ماتم کا ہر سو بہ سو زمانہ موں ہوتی ہے یہ گفتگو
جوانی کے جوبن کا تھا وہ رتن نچھوڑا اجل نے کئے سو جتن
خزینے دفینے پڑے ہی رہے دو شالا اور لاچی دھرے ہی رہے
طویلہ میں گھوڑے کھڑے ہی رہے شتر باز، زر کے گڑے ہی رہے
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں
کدھر موتیاں والا ہے نوجواں

فقیر نورالدین منور بخاری......:

آپ لاہور میں ۱۲۰۴ھ/۸۹-۱۷۸ء میں پیدا ہوئے۔ فقیر نورالدین کی شاعری جو کہ اٹھارہویں صدی عیسوی کی شاعری ہے، ان میں سے چند شعراء کا کلام اختصار کے ساتھ دیا جاتا ہے تا کہ یہ اندازہ ہو سکے کہ شاعری کا کیا رجحان رہا۔ ہیئت و اسلوب میں

۱۔ پنجاب میں اردو، ص ۳۶۲

کیا فرق آیا۔ اردو نے جس تیزی سے اپنے قدم جمائے ہیں، لسانیات کے ماہر بھی اس کی ترقی پر حیران ہیں۔ فقیر نورالدین صاحب کی یہ نعت دیکھیے، جسے یوسفی صاحب نے بھی نقل کیا ہے ؎

حضرت خیر الورا مالک قدر و قضا
سید ہر دوسرا ڈھونڈھے تری یہ رضا
جزو سے لے تا بہ کل خار سے لے تا بہ گل
عام سے لے تا رسل خلق سے لے تا خدا
عرض کرے نور دیں سجدے میں رکھ کر جبیں
اے شہ دنیا و دیں سید حاجت روا

احمد سرہندی......۱۲۳۱ھ:

مثنوی ''چمن سیر'' عرف (قصہ مرغ زریں) اس مثنوی کی وجہ سے کافی شہرت ملی۔ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

اول اللہ کوں پھر یاد کر کر
تمامی خوف دل برباد کر کر
تو رکھ دے جام اے آہو شتابی
والا تجھ کوں ہو بہتی خرابی

میر ساجد علی فنائی......شہادت ۱۲۳۳ھ:

''عاقبت بخیر'' کے نام سے مثنوی لکھی ہے۔ اس مثنوی میں نواب ملتان مظفر خاں کے اوصاف کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ نیک دل انصاف پسند اور عوام کے لئے سراپا شفقت تھے۔ خود بھی عبادت گزار تھا۔

خورشید احمد یوسفی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس کے وقت میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پے در پے حملے ملتان پر کئے اور ہر ایک حملے میں لاکھوں روپے نواب سے لیتا رہا، آخر حملے میں جب نواب بہت تنگ آ گیا تو شہادت کا جامہ پہن کر مقابل ہوا۔ بہت سے سکھوں کو تہ تیغ کر کے خود بھی مع پانچ فرزندان دلپسند کے شہید ہوا۔'' [۱]

میر ساجد علی فنائی نے اس مثنوی میں ان واقعات کو نظم کے پیرائے میں ادا کیا ہے۔ مثنوی کے چند شعر ملاحظہ ہوں، مثنوی کے اشعار کی تعداد کم و بیش ۹۰۰ سے زاید ہیں ؎

مہینہ رجب کا تھا خاطر فروز
و تاریخ دسویں سنیچر کا روز

۱۔ پنجاب کے قدیم اردو شعراء، ص ۱۹۸

مظفر کو آخر شہادت ملی
اسے دو جہاں میں سعادت ملی
کہ جوں صید پر جست کرتا عقاب
زمیں سے نکلتا ہے جوں آفتاب
الٰہی بہ حق نبی زماں
رہے مثنوی بہ بحفظ امان

خلیفہ عارف قصوری......۱۲۳۸ھ:

''قائم نامہ'' کے نام سے ایک قصہ نظم کیا ہے- اس دور میں اردو کی ہیت اور اسلوب دیکھئے- اٹھارویں صدی عیسوی کی پنجاب کی شاعری میں اردو کا اتنا واضح استعمال- اس قصہ میں حمد کے بعد نعت اور پھر قصہ کا آغاز اس قصہ میں حاتم طائی کی سخاوت اور دریا دلی کی تعریف میں دو شعر دیکھئے ؎

سنی عارف قصوی یہ حکایت
حاتم کی ہے روایت با کفایت
حاتم نامہ کتب ایس نام رکھیا
سخاوت پیشہ حاتم حور لکھا

فیض لاہوری......۱۲۳۴ھ:

قلمی بیاض میں تقریباً پچاس شعرا کا انتخاب دیا ہے- دوسری کتابوں میں ان کا نام فیض بخش لکھا ہے- فارسی اور اردو غزلیات شائع ہو چکی ہیں-غزل کے دو شعر ؎

تیرے ہی انتظار میں تا صبح میری جاں
ایک پل بھی مجھ کو نیند نہ آئی تمام رات
سن کر مری فغاں کو تجاہل سے بولا یوں
دیتا رہا ہے کون دہائی تمام رات

فیض لاہوری کے مخمس میں سے ایک بند دیکھئے اور پنجاب کی اردو شاعری کا مزاج دیکھئے ؎

جو پڑھا تھا علم کے باب میں مری یاد سے وہ بسر گیا
نہ وہ صرف نحو ہی کچھ رہا نہ فروع اصول ہی کچھ رہا
اسی واسطے میں نے ایک دن وہاں ہم سبق ستی یوں کہا
وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
جو کتاب عقل کی طاق پر جہاں تھی دھری وہاں دھری رہی

احمد بخش یکدل:

لاہور میں ۱۸۶۷ء میں فالج کی وجہ سے انتقال ہوا۔ غزل کے دو شعر ۔

وہ میں ہی تھا کہ خود کو رکھا تھام اب تلک
ورنہ تو کر چکی تھی قضا کام اب تلک
شور جنوں میں عشق میں تھا روز و شب غریق
میں نے نہیں سنا تھا ترا نام اب تلک
یکدل جو بول چال ہے اردو زبان کی
کرتا ہوں شاہ دہلی سے میں وام اب تلک

تاریخ ادبیات میں ہے:

''علاوہ ازیں ان نظموں کے انداز بیان میں کسی ایک واقعہ کا بھی اظہار نہیں ہوتا بلکہ اس میں کسی معاشرہ کی پوری تصویر بیان کی جاتی ہے اور اس دور کے معاشرتی اور تمدنی حالات کی عکاسی کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر پیلو اکبر کا زمانہ ۱۶۰۵ء۔۱۶۵۶ء، وارث کی ہیر ۱۷۶۶ء، ہاشم ۱۷۵۲ء کی سسی پنوں، امام بخش ۱۷۷۸ء کی شاہ بہرام گل وصنوبر اور چندر بدن مولوی غلام ۱۸۹۲ء کی احسن القصص فضل شاہ ۱۸۲۷ء کی سوہنی مہینوال۔'' [۱]

پنجاب میں اردو شاعری پر اسلامی معاشرے کے اثرات صوفیائے کرام کی بدولت مرتب ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اسلامی روایات، اسالیب بیان اور محاورے حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس کی واضح مثال شاعری میں دیکھی جا سکتی ہے مثلاً حمد، نعت، منقبت، معراج نامے، نور نامے، سی حرفیاں، کافیاں، بارہ ماسے دوہرے، ماہیے اور شلوک وغیرہ۔ یہ وہ شاعری ہے جو معاشرہ اور ماحول سے مربوط ہے۔

پنجاب کے شعراء نے نظم میں تاریخی واقعات کو بھی موضوع سخن بنایا ہے۔ وارث شاہ کی ہیر رانجھا میں رومانی قصہ کے علاوہ اس دور کی تاریخ بھی ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔

اگر ہم بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی شاعری کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے شاعری میں اسلامی نظریات اور انسان کے عمل و کردار پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی ہے۔ موضوعات و اسالیب کے لحاظ سے اس دور کی شاعری میں جو نظمیں ہمیں ملتی ہیں وہ زیادہ تر مسمط پر ہیں۔ یہ نظمیں زیادہ تر ہندی اور فارسی اوزان میں لکھی گئی ہیں۔

البتہ شاہجہاں کے دور میں غزل اور مثنوی کے نقوش ملتے ہیں۔ مولانا عبدی کی ''فقہ ہندی'' میں جو موضوعات نظم کی صورت میں قلمبند ہوئے ان میں علم توحید، نماز، روزہ، علم شریعت، احکام دین اور مسائل شرعیہ وغیرہ۔ صوفیائے کرام نے ایک طرف اردو زبان کو ترقی دی تو دوسری طرف شعری محاسن اور اسالیب پر بھی توجہ دی۔ ہئیت کے لحاظ سے بعد کے دور میں ترجیع بند میں بھی جو نظم کہی ہے۔ اس میں بھی اسلامی فکر کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ بارہویں صدی ہجری میں جو مثنویاں کہی گئی ہیں ان میں بھی

۱۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، تیرہویں جلد، ص ۲۴۷

تصوف کارفرما ہے- غلام قادر شاہ اور شیخ نصیر الحق کی شاعری ثبوت کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے- اردو شاعری کے متعلق حافظ شیرانی کا کہنا ہے:

''اردو شاعری میں فارسی کا پرتو ہے- فارسی کے تمام قواعد وضوابط عروض و اقسام شعر کو اس میں مستقل کرلیا گیا ہے- وہی بحریں، وہی ردیف و قافیہ کی پابندی، وہی خیالات و جذبات، صنائع، بدایع، تشبیہات، استعارات و تلمیحات وغیرہ لیکن پنجاب کی نظموں کے گزشتہ نمونے کئی امور میں مختلف ہیں- [1]

بارہویں صدی ہجری میں مخمس اور مرثیہ کے نقوش ملے ہیں جس میں میر صابر اور نامدار خاں دت انہوں نے چڑت سنگھ کا مرثیہ لکھا ہے-

مغلیہ سلطنت کے زوال کا آنکھوں دیکھا حال دل محمد دلشاد پسروری کی شاعری میں دیکھا جاسکتا ہے- اس دور کو تاریخ کا بدترین دور کہا گیا ہے- اس دور میں قتل وخونریزی، لوٹ مار، بدنظمی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی- سیاسی اعتبار سے پنجاب جس قیامت سے گزرا رد عمل کے طور پر دلشاد کی شاعری میں منقبت، غوث پاک کی شان میں اشعار اور وطن سے محبت پر جو نظمیں کہی ہیں وہ تاریخی اثاثہ ہیں-

شاعری میں قصیدہ اور ہجو کا بھی رواج ہو چلا تھا- اس کی مثال فدوی لاہوری اور مرزا سودا اور شاگردوں کی تلخ کلامی یہاں سے ہجو کا رواج شروع ہوتا ہے-

تیرہویں صدی میں مثنوی کو پھر عروج ہوا- مثنوی دو موضوعات پر کثرت سے لکھی جارہی تھیں- ایک تو تصوف و معرفت پر دوسرے عشقیہ قصے مثلاً فقیر اللہ کی مثنوی ''در مکنون'' یہ تصوف پر ہے- دوسری طرف ''شیریں فرہاد'' اس مثنوی میں دوہرے بھی نظم کیے ہیں- دوہرے دراصل ہندی صنف ہے- اس صدی میں غزلیں بھی زیادہ کہی گئیں اور ان میں زیادہ تر فارسی ترکیبیں استعمال ہوئیں- غلام قادر جلال پوریہ کی غزل سے اس بات کی تائید ہوتی ہے- ان کے علاوہ جن شعراء نے پنجاب میں اردو شاعری کو جو اعتبار بخشا ان میں مرزا پانی پتی، محمد علی سید میرک، حیدر لاہوری، سید محمد شاہ بٹالوی، خادم پانی پتی، حافظ امام بخش زار تھانیسری، عبدالقادر توقیر اور مخمور فریدآبادی وغیرہ-

ان شعراء کی غزلوں میں محبوب کے خدوخال بھی ہیں اور صنعتی تصورات بھی- سائنسی تعلیمات کا اظہار بھی ہے اور وطن سے سچی محبت میں سرشار بھی- پنجاب کی شاعری تمام اصناف سخن کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے خالصتاً جب غزل کی مشاطگی میں شب و روز کی ریاضت سے یہ بات سامنے آئی کہ اب غزل میں نئے نئے خیالات اور نئی تحریکوں کے ساتھ ساتھ نئے الفاظ بھی جذب کر رہی تھی-

انیسویں صدی عیسویں میں پنجاب کی اردو شاعری میں جو نمایاں فرق واقع ہوا، اس سے بتدریج ارتقاء کا بہ آسانی اندازہ ہوتا ہے- تیرہویں صدی عیسویں سے اٹھارہویں صدی عیسویں تک کے جائزے سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پنجاب ایک دبستان کی صورت میں خاصا نمایاں رہا ہے-

بالخصوص یہاں چند شعراء کے کلام واحوال کے حوالے سے اس کا جائزہ لیا جائے گا تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ انجمن پنجاب کے قیام سے پہلے پنجاب میں کس نوع کی شاعری ہو رہی تھی-

---

۱- پنجاب میں اردو، ص ۳۴۴

آدینہ بیگ کامل:

ان کی ولادت کا سن معلوم نہیں ہوسکا، البتہ وفات ۱۲۴۵ھ سے قبل فرخ آباد میں ہوئی - یوسفی نے ان کے دیوان کا نام ''انتخاب دیوان کامل'' دریافت کیا ہے، اسی میں سے چند شعر غزل کے نمونے کے طور پر دیئے جاتے ہیں ؎

گو فنا مجھ سے تند خو تو ہے
پرے دل کی آرزو تو ہے
نام یوسف کا ہم تو سنتے تھے
جب کہ دیکھا تو ہو بہو تو ہے
آب کوثر سے پاک کر تو زباں
کامل اس کا جو مدح گو تو ہے

صفدر سونی پتی:

ان کا تعلق بھی تیرہویں صدی ہجری سے ہے، غزل کا شعر دیکھئے ؎

برقع کو اٹھا منہ سے جو تم کرتی ہو باتیں
اب میں ہمہ تن گوش بنوں یا ہمہ تن چشم

غزل کا یہ مطلع بھی خوب کہا ہے ؎

شجر سوختہ، شمع سے جب گل نکلے
چاہئے بیضۂ فانوس سے بلبل نکلے

پیر قلندر شاہ......م ۱۲۴۸ھ:

فارسی اور اردو میں کئی کتابیں تصنیف کیں- فارسی اور اردو میں شعر بھی بہت اچھا کہتے تھے-شعر ملاحظہ ہو ؎

دل نکل پہلو سے تب کو زلف میں جاتا رہا
بارہا ہر چند اس کو روز سمجھاتا رہا

شاہ نیاز سرہندی......م ۱۲۵۰ھ:

آپ کا کلام ''دیوان شاہ نیاز'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے- فارسی اور اردو میں صاحب دیوان شاعر تھے، اردو کلام دیکھئے ؎

کیا ہی پھولی بہار آنکھوں میں
ہے جہاں لالہ زار آنکھوں میں

احمد بخش یکدل......م ۱۸۶۷ء:

غزل کے بہت اچھے شاعر تھے- انیسویں صدی عیسوی میں پنجاب کی شاعری اپنے انتہائے کمال پر نظر آتی ہے- یہ شعر دیکھیے-

وہ میں ہی تھا کہ خود کو رکھا تھام اب تلک
ورنہ تو کرچکی تھی قضا کام اب تلک

فیض لاہوری......۱۲۶۸ھ:

کتابت کا آبائی پیشہ تھا- دوسری کتابوں میں ان کا نام فیض بخش لکھا ہے، فارسی اور اردو کے شاعر تھے-

کر یاد اس کے دست حنائی تمام رات
آنکھوں نے نہر خوں کی بہائی تمام رات

حافظ امام بخش زار تھانیسری......م ۱۲۷۰ھ:

مذہبی ذہن رکھتے تھے- زبان میں قواعد کا خاص خیال رکھتے تھے- صرف ونحو علم سے بہت کم لوگ واقف ہوتے ہیں لیکن حافظ صاحب اس علم کے ساتھ منطق کا علم بھی جانتے تھے- مختلف علوم حاصل کرنے کے بعد میں شاعری کی طرف متوجہ ہوئے، کلام میں طنز کے نشتر بھی ہیں اور ظرافت کی چاشنی بھی ہے-

دکھلا ہی چارہ گر کو جو زخم جگر تو وہ
رو رو کے یوں کہے ہے کہ اس کا نہیں علاج

عبدالقادر توقیر......م ۱۲۷۰ھ:

شاہجہاں آباد سے آکر پنجاب میں مستقل قیام کیا- زبان صاف اور تراکیب نئی استعمال کرتے تھے- اشعار معیاری ہوتے تھے- یوسفی صاحب فکر سخن کے بارے میں لکھتے ہیں:

''فکر سخن بلند، زبان شستہ وپاکیزہ، طبع نہایت رسا-''

چند شعر ملاحظہ کیجیے، مختلف غزلیات میں سے-

توقیر دل رمیدہ پھر آوارہ ہوگیا
کس نے سنا دیا اسے مژدہ بہار کا
ہم تو خاطر سے تری غیروں کو بھی تعظیم دیں

رشک پر کہتا ہے بیٹھو، اپنی یہ عادت نہیں
مجھ کو کیوں دیکھا بت نا آشنا کو دیکھ کر
ناصحو دیکھیں کہ کچھ کہنا خدا کو دیکھ کر[1]

عبدالرحمٰن خلدی......

حافظ شیرانی نے تیرہویں صدی عیسوی کا زمانہ لکھا ہے- جبکہ کلام قدیمی رنگ میں نظر آتا ہے- قدیم رنگ پر حافظ نے اشارہ درست دیا ہے ؎

گھونگھٹ دور کر لکھ دکھا رے سجن دل عاشقاں نا ستارے سجن
دیا جن نے جو بن کرم سے تجھے خدا کا کرم نا چھپارے سجن

کئی کتابوں کے خالق ہیں-علم وعرفاں ،تصوف اور حقیقت ومعرفت پر کلام عشق حقیقی کی گواہی دے رہا ہے-

پنجاب میں اردو شاعری کے ارتقائی عمل[2] سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ پنجاب نے نہ صرف دوسرے دبستانوں کے اثرات قبول کئے بلکہ عبوری دور سے لے کر انیسویں صدی عیسوی تک زبان اور شعری آہنگ میں عہد بہ عہد جو اضافہ ہوا ہے، ملتہائے کمال پر نظر آتا ہے-

اس ضمن میں جمیل جالبی رقمطراز ہیں:

> ''یہاں یہ بات بے محل نہ ہوگی کہ پنجاب اور اہل پنجاب سے اس زبان کا رشتہ ناتا روز اول ہی سے قائم ہے اور اہل پنجاب نے شروع ہی سے اس زبان کو بنانے، سنوارنے میں حصہ لیا ہے- وہ زبان جو عبوری دور میں دہلی سے دکن، گجرات، مالوہ اور دوسرے صوبوں میں پہنچی- اس کی ساخت، اس کے مزاج، لہجے اور آہنگ پر پنجاب ہی کا اثر سب سے زیادہ اور گہرا تھا- قدیم گجری و دکنی ادب کے آہنگ پر پنجاب ہی کا اثر سب سے زیادہ اور گہرا تھا- قدیم گجری و دکنی ادب کے نمونوں میں جب ہم پنجابی اثر مزاج کو دیکھتے ہیں تو ذرا دیر کو حیرت ضرور کرتے ہیں لیکن ہماری حیرت اس وقت دور ہو جاتی ہے جب ہم اردو اور پنجابی کے اثر و رشتہ کو تاریخ کی روشنی میں دیکھ کر ان نمونوں کا مطالعہ کرتے ہیں-''[3]

۱- بحوالہ ''پیسہ'' اخبار، پنجاب میں اردو، حافظ شیرانی ،ص۴۰۲

۲- آدینہ بیگ کامل سے عبدالرحمٰن خلدی تک کا کلام خورشید احمد خاں یوسفی کی کتاب ''پنجاب کے قدیم اردو شعراء'' سے لیا گیا ہے- مقتدرہ نے ۱۹۹۲ء میں یہ کتاب شائع کی- اس کتاب سے تحقیق کے نئے دروازے وا ہوئے ہیں- پنجاب کے ان قدیم شعراء کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں شعراء کے مختلف حالات پنجاب کی تہذیبی، معاسرتی اور سیاسی کیفیات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے- دراصل ان کی یہ کتاب حافظ شیرانی کی تقلید وتتبع میں ہی ترتیب دی گئی ہے-

۳- تاریخ ادب اردو، ص۶۲

پنجاب کے جن قدیم شعراء کا کلام دیا گیا ہے یہ حضرات انجمن پنجاب کے قیام سے پہلے پنجاب کو علمی و ادبی گہوارہ بنانے میں پیش پیش تھے۔ اردو شاعری کی ترویج و اشاعت میں بھرپور حصہ لیا۔ حافظ شیرانی اس بات کو وضاحت سے بیان کرتے ہیں:

> ''چونکہ پنجاب سے مسلمانوں کے تعلقات دہلی کے مقابلے میں زیادہ قدیم ہیں اسی لئے مسلمانوں نے اسی ملک کی زبان میں سب سے پہلے شعر گوئی کی بنا رکھی۔ مشائخ و صوفیاء نے سب سے پیشتر دہلی و پنجاب میں ہندی کی سرپرستی کی ہے۔ ان کا تعل عوام الناس سے براہ راست تھا۔ اس لئے دیسی زبانوں کی تربیت انہی سے شروع ہوتی ہے۔'' [۱]

شاعری میں تمام موضوعات آئے جو ضروری سمجھے گئے۔ مختلف موضوعات کی بنا پر شعری آہنگ میں وسعت بھی ہوئی۔ شاعری میں سائنسی و صنعتی فکر کو بھی اجاگر کیا گیا۔ غرض شاعری میں تصوف، عشق و محبت کے ترانے اور معاشرتی و سماجی انحطاط کو بھی داخل شعر کیا گیا تاکہ صحیح تصویر ابھر کر سامنے آئے۔ گرونانک کے عہد تک شاعری کا مزاج بدلا جا چکا تھا۔ ڈاکٹر صفیہ بانو نے گرونانک کی زبان کے بارے میں لکھا ہے:

> ''گرونانک کی زبان اردو اور پنجاب کی مخلوط زبان ہے۔ ان کی ''جنم ساکھی'' کی زبان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد تک اردو کا ڈھانچہ بالکل تیار ہو چکا تھا۔ انہوں نے وا، وے، دی کی بجائے کا، کے، کی استعمال کیا ہے۔ ہور کے بجائے ''اور'' کا لفظ اردو کے نکھرنے کا بین ثبوت ہے۔'' [۲]

گرونانک کے بعد اردو شاعری ارتقاء کی منازل طے کرتی ہوئی شیخ محمد فاضل بٹالوی کی تحریک تک نہایت کامیابی سے پہنچی۔ ان کے بعد شاعری میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا۔ اردو شاعری نے اپنے اندر کافی وسعت پیدا کر لی تھی۔ آخر کار پنجاب میں ایک انجمن قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ بالآخر انجمن پنجاب کا قیام ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو عمل میں آیا۔

انجمن پنجاب:

پنجاب میں دیگر صوبوں کی طرح انگریز حکام نے دیگر علوم و فنون کی طرف توجہ دیتے ہوئے شعر و ادب پر بھی خاص نگاہ رکھی۔ ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء میں سکھشا سبھا کے مکان میں یہ طے پایا کہ ایک انجمن کا قیام لازمی ہے۔ ڈاکٹر صفیہ بانو کی تحقیق کے مطابق انجمن پنجاب کا قیام ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء ہے، بالکل درست ہے۔ جدید اردو غزل میں ۲۱ فروری ۱۸۶۵ء بتایا گیا ہے جو کسی بھی لحاظ سے درست نہیں۔ پہلے انجمن کا نام ''انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب'' رکھا گیا۔ بعد میں اسے انجمن پنجاب کا نام دیا گیا۔ انجمن کے تحت کمیٹیاں بنائی گئیں، جلسے منعقد کیے گئے۔

انجمن پنجاب ایک تحریک کے طور پر سامنے آئی، گو کہ اس کی مدت بہت کم ہے، اس کے کل ۹ جلسے منعقد ہوئے۔

جدید مشاعروں کی بنیاد ۱۹ اپریل ۱۸۷۴ء بتائی جاتی ہے، مشاعرے کی تاریخ پر اختلاف پایا جاتا ہے۔ محمد باقر کے شاگرد

۱۔ پنجاب میں اردو، ص ۱۶۸

۲۔ انجمن پنجاب، تاریخ و خدمات، ص ۲۳

حیدر نثار نے ۸ مئی ۱۸۷۴ء مشاعرے کی تاریخ تحریر کی ہے۔ ڈاکٹر صفیہ بانو نے بھی اسی تاریخ پر اتفاق کیا ہے۔ اس بارے میں ان کا کہنا ہے کہ:

''ان مشاعروں کے انعقاد کی تاریخ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ پنڈت کیفی اور ڈاکٹر محمد صادق نے اس جلسے کی تاریخ ۱۹ اپریل ۱۸۷۴ء لکھی ہے۔ آغا محمد باقر اور آزاد کے شاگرد غلام حیدر نثار اس جلسہ کی تاریخ ۸ مئی ۱۸۷۴ء قرار دیتے ہیں۔'' [۱]

ان جدید مشاعروں سے طرحیہ شاعری کا خاتمہ ہوا۔ غزل اور دیگر اصناف سے گریز کرتے ہوئے خالصتاً نظم کو فروغ ہوا۔ نئے موضوعات کے علاوہ ہیئت اور اسالیب سے بھی شاعری میں انقلاب برپا ہو گیا اور یہیں سے نیچرل شاعری کا بھی آغاز ہوتا ہے۔ شاعری کے اس نئے رجحان کو عوام نے بہت زیادہ پسند کیا۔

انجمن پنجاب کے جلسوں میں پڑھی گئیں نظموں سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ تحریکی نظمیں تھیں۔ شعراء نے نئے موضوعات اور نئے زاویوں سے سوچنا شروع کر دیا تھا۔ حالی نے ۱۹۰۳ء میں ''ہماری معاشرت کی اصلاح'' پر مضمون لکھا، ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں لکھتے ہیں:

''شاعری کائنات کی تمام اشیائے خارجی اور ذہنی کا نقشہ اتار سکتی ہے۔ عالم محسوسات، دولت کے انقلابات، سیرت انسانی، معاشرت، نوع انسانی تمام چیزیں جو فی الحقیقت موجود ہیں اور تمام وہ چیزیں جن کا تصور مختلف اشیائے اجزاء کی ایک دوسرے سے ملا کر کیا جا سکتا ہے۔ سب شاعری کی سلطنت میں محصور ہیں۔ شاعری ایک سلطنت ہے جس کی قلمرو اس قدر وسیع ہے جس قدر خیال کی قلمرو۔'' [۲]

انجمن پنجاب کے تحت جو نظمیں لکھی گئیں وہ دراصل قدیم سے جدید کی طرف ایک خوش آئند قدم تھا۔ شاعری میں مقصدیت کو اہمیت دی گئی، سیاسی و اقتصادی بحران کو نظموں میں اجاگر کیا گیا۔ حالی نے سرسید کے کہنے پر قوم کا نوحہ ''مسدس'' کی صورت میں پیش کیا۔ انور سدید ''مسدس'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''چنانچہ سرسید نے بہتے پانی کی طرح نرم اور رواں حالی کو اپنی زوال آمادہ قوم کا نوحہ لکھنے کی ترغیب دی اور فطری شاعری کا رخ قومی شاعری کی طرف موڑ دیا۔ حالی کا مسدس اردو کی مقصدی شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طویل نظم میں حالی نے قوم کی دکھتی ہوئی رگ کو ایک ماہر نباض کی طرح پکڑا ہے اور اسے موثر انداز میں شعر و ادب کا روپ دے دیا ہے۔'' [۳]

انجمن پنجاب کے مشاعروں سے قبل قدیم شاعری جو کہ تقلید اور روایت یا پھر فارسی کے زیر اثر خیالات کو غزل کے پیرایہ میں ادا کر رہے تھے۔ اجتناب برتا گیا اور نئے مزاج اور نئے رنگ کی شاعری کو فروغ دیا۔ اس طرح انجمن پنجاب سے جدید

۱۔ انجمن پنجاب، تاریخ و خدمات، ص ۲۲۸

۲۔ مقدمہ شعر و شاعری، ص ۴۸

۳۔ اردو ادب کی تحریکیں، ص ۴۰۰

مشاعروں کا آغاز ہوتا ہے- ڈاکٹر صفیہ بانو جدید مشاعروں کے بارے میں لکھتی ہیں:

''جدید مشاعرے کے پہلے اعلان نے ہیجان پیدا کر دیا- ان حیرت زدہ سامعین کے مجمع کا بھی آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے، جو اس مشاعرے میں شرکت کے لئے آئے تھے- انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان جدید مشاعروں کے بانیوں کی یہ کوشش قدیم حزنیہ شاعری کی بساط ہی الٹ دے گی اور یہ ایک عہد آفرین کوشش ہوگی- نئے اصناف سخن، نئے موضوع اور نئے اسالیب محض شاعروں کی وجہ سے اردو شاعری میں ایک نئے عہد کا آغاز کریں گے- مولانا آزاد کو حالی جیسے سنجیدہ اور پرخلوص معاون و مددگار ملے جنہوں نے ان کی کوشش کو بارآور ہونے میں مدد دی- سرسید نے اپنے خط کے ذریعہ ان کی حوصلہ افزائی کی- خود حاکم وقت کا مقصد بھی یہی تھا لہذا یہ جدید مشاعرے، جدید اردو شاعری کے بانی و مبانی کی حیثیت رکھتے ہیں-''[۱]

انجمن پنجاب خالصتاً ایک ادبی تحریک تھی اس طرح دیگر شہروں میں انجمنوں کا قیام عمل میں آیا- یہ انجمنیں بھی ادبی تحریک کے زور پر ابھریں- ان ادبی تحریکوں نے اردو شاعری میں گراں بہا اضافہ کیا- دہلی، لکھنؤ اور پنجاب میں انجمن کا قیام عمل میں آچکا تھا- ادبی تحریکوں میں فورٹ ولیم کالج کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا- ان تحریکی انجمنوں کی خدمات اور اثرات سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اردو نظم میں یہ تحریکیں فعال ثابت ہوئیں-

پنجاب کے مشاعروں کے سیاسی پس منظر سے بھی اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے- لاہور کے مشاعروں نے نظم کو متعارف کرایا- یہ موضوعاتی مشاعرے اس قدر مقبول ہوئے- ان مشاعروں سے سیاسی رجحان بھی اجاگر ہوا ہے- ۱۸۵۷ء کے بعد کی شاعری میں جو رنگ و آہنگ ہمیں ملتا ہے- اس میں ہندی طرز کو خاص اہمیت دی گئی ہے- بحریں اور زحافات فارسی کی ہیں اور افکار و خیالات انگریزی ادب سے ماخوذ ہیں- آزاد اور حالی نے شاعری کے کچھ اصول مرتب کر دیئے تھے جس سے اردو شاعری کا مزاج بدلنے میں کافی مدد ملی- انجمن پنجاب کا پہلا مشاعرہ ۳۰ مئی ۱۸۷۴ء کو منعقد ہوا اور آخری مشاعرہ ۱۳ مارچ ۱۸۷۵ء کو ہوا- اس طرح ان مشاعروں کی تعداد ۹ ہے-

آزاد نے شاعری سے زیادہ اپنی تقریروں پر زور دے کر نظم کی طرف راغب کیا- ان کی یہ مساعی سودمند ثابت ہوئی- عبدالقادر سروری آزاد کا شاعری میں مقام، مرتبہ اور کوششوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آزاد کا رتبہ اردو شاعری میں وہی ہے جو اسکاٹ کا انگریز شاعری میں ہے- کسی نئے خیال کے پیدا کرنے والے اور کسی نئی تحریک کے بانی کو دنیا جس وقعت کی نظر سے دیکھ سکتی ہے، آزاد بھی اس کے پوری طرح مستحق ہیں- انہوں نے قدیم شاعری کی اصلاح کا سب سے پہلے بیڑا اٹھایا اور انہوں ہی نے جدید تصور کو سینچا- آزاد ہی کی بدولت نیچرل شاعری کے مفہوم سے لوگ آشنا ہوئے اور آزاد ہی کی ڈالی ہوئی بنیادوں پر جدید دور کے سخن طرازوں نے اپنی اپنی عمارتیں تعمیر کیں-'' [۲]

۱- انجمن پنجاب، تاریخ و خدمات، ص ۲۲۸

۲- جدید اردو شاعری، ص ۸۵

غرض انجمن پنجاب کے تحت ہونے والے مشاعروں نے راہ ہموار کر دی تھی- حالی اور آزاد کی نظموں کے عنوانات یہ ہیں، جو انجمن پنجاب کے مشاعروں میں پڑھی گئیں، حالی کی نظموں کے عنوان مندرجہ ذیل ہیں:

برکھارت، نشاط امید، حب وطن، مناظرہ رحم و انصاف-

محمد حسین آزاد کی نظمیں:

ابر کرم، صبح امید، شب قدر، باقی نظمیں، مجموعۂ نظم آزاد میں ہیں-

حالی نے نظم ''شکوۂ ہند'' ۱۸۸۸ء میں لکھی اس نظم میں برصغیر کے مسلمانوں کی سماجی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی حالت پر پر کیف اور پر درد انداز میں دلی کیفیات کا اظہار کیا ہے- اس دور میں غزل اپنے شباب پر تھی- غزل کو ارباب فن معراج شاعری بلکہ فخر و امتیاز سمجھتے تھے- انجمن پنجاب کے قیام سے یہ ہوا کہ قدیم شعری روایت سے منہ موڑ کر ایک نئی راہ نکالی اور اس کا اظہار اردو نظم کے پیرایہ میں ہوا- تغیر و تبدل کا یہ عمل انگریزوں کے سیاسی تسلط کی بناء پر ظہور پذیر ہوا- کیونکہ مغربی فکر کا دھارا اس سرعت سے لوگوں کے ذہنوں پر اپنے نقش ثبت کر رہا تھا-

اس میں فلسفہ، سائنس اور تحقیق نے ہماری تہذیب اور ادب پر گہرے نقوش چھوڑے- ہمارا قدیم ادب اپنے اندر محدود اور محرومی کی اس منزل پر آ پہنچا تھا جسے ہم اس دور کی تنزلی ہی کہہ سکتے ہیں- انجمن پنجاب نے اس گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیا اور شاعری میں اصلاحی، اخلاقی، قومی و ملی، سیاسی و سماجی پہلوؤں کو نظموں میں اجاگر کیا- انجمن پنجاب کے مشاعروں سے شعری آہنگ بدل چکا تھا اور زمین خاصی ہموار ہو چکی تھی، ایسے میں اقبال نے اس جدید رجحان کو قبول کرتے ہوئے اپنے آپ کو حالی کی شاعری سے قریب تر کر لیا- حالی کی شاعری میں مسلمانوں سے ہمدردی اور ان سے محبت کا جو جذبہ نظموں میں اجاگر ہوا ہے ''نشاط امید'' اس کا منہ بولتا ثبوت ہے- اس کے علاوہ حب وطن اور مناظرہ رحم و انصاف وہ موضوعاتی نظمیں ہیں جو انجمن پنجاب کے تحت مشاعروں میں پڑھی گئیں- ''نشاط امید'' ایک ایسی قوم کا مرثیہ ہے جس میں صرف مایوسی ہی مایوسی نظر آتی ہے- اس نظم میں بغاوت کی ناکامی سے جو سیاسی و اقتصادی بحران پیدا ہوا، اس کی خاص وجہ انگریزوں کی اس پالیسی کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں کے خلاف بنائی گئی تھی- ایک طرف انگریز اور دوسری طرف ہندوؤں کا بڑھتا ہوا زور یہ دونوں مسلمانوں کے سخت خلاف تھے، اس لئے اقبال نے حالی کے راستے کو اپناتے ہوئے ان کے مشن کو تکمیل تک پہنچایا-

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اقبال نے انجمن پنجاب کے مشاعروں کے رجحان کو پیش نظر رکھتے ہوئے حالی کا انتخاب کیا کیونکہ اقبال کی فکر اور حالی کا احساس آپس میں مطابقت رکھتا تھا- اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ حالی کی نظمیں ہی اس بات کی غماز ہیں کہ اقبال نے حالی کے نظریات و اثرات قبول کیے ہیں- نظم ''شکوۂ ہند'' دیکھ لیجئے، یہ نظم ۱۸۸۸ء میں لکھی گئی-

چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

آج گو شکوؤں سے ہیں لبریز ہم اے خاک ہند
ہیں مگر احسان اگلے تیرے سب خاطر نشاں
تو نے بیگانوں کی خاطر کی یگانوں سے سوا
میہمان تھے پر بنایا تو نے ہم کو میزباں
ضرب کاری و حرب خالدی رکھتے تھے ہم
سطوت حمزی و فاروقی عدالت ہم میں تھی

ہم شتر بانی سے پہنچے تھے جہاں بانی تلک
اس لئے باقی شتر بانوں کی خصلت ہم میں تھی

ہئیت واسلوب کے لحاظ سے ''شکوۂ ہند'' واسوخت کے پیرایہ میں ادا ہوئی ہے جبکہ اقبال کا شکوہ ''مسدس'' میں ادا ہوا ہے۔ اقبال نے جدید طرز پر نظمیں لکھیں اور رسالہ ''مخزن'' کی زینت بنتی رہیں۔ اس طرح اقبال کا شہرہ پورے برصغیر میں ہوگیا۔ اقبال کی نظموں پر ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے:

> ''اقبال کی طویل نظموں میں وحدت اور تناسب اجزاء کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اقبال کے ذہن کا یہ خاصہ ہے کہ وہ متجانس اجزاء سے اپنی نظم کو مرتب نہیں کرتے بلکہ متناسب اجزاء سے مرتب کرتے ہیں یعنی وہ الگ الگ عناصر کا جائزہ لیتے ہیں اور ان کو رشتۂ وحدت میں پرو دیتے ہیں۔ نظم ''خضر راہ'' اور نظم ''مسجد قرطبہ'' اس کی بہترین مثالیں ہیں۔'' [۱]

بازار حکیماں کے مشاعرے:

بازار حکیماں کے مشاعرے بھی اقبال کی شاعری پر اثر انداز ہوئے۔ یہ مشاعرے حکیم امین الدین کے مکان پر ہوتے تھے۔ پھر باقاعدہ ایک انجمن مشاعرہ کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۸۹۰ء میں انجمن کی بنیاد حکیم شجاع الدین نے رکھی۔ جاوید اقبال ''زندہ رود'' میں لکھتے ہیں:

> ''اقبال کی آمد لاہور سے پیشتر بھاٹی دروازے کے اندر بازار حکیماں میں ایک انجمن مشاعرہ قائم ہوئی۔ جس کی نشستیں حکیم امین الدین کے مکان میں منعقد ہوا کرتیں۔ امین الدین اسی خاندان حکیماں سے تعلق رکھتے تھے، جس کے نام پر بازار مشہور ہے۔'' [۲]

بازار حکیماں کے مشاعروں میں مرزا ارشد گورگانی، میر ناظر حسین ناظم لکھنوی، حکیم شجاع الدین، حکیم امین الدین، شریک بزم ہوتے۔ ان مشاعروں میں ابھی تک اقبال شریک نہ ہوئے تھی۔ چند طالب علم ۱۸۹۵ء میں اقبال کو زبردستی مشاعرے میں لے آئے۔ اس مشاعرے میں دیگر اساتذہ کے شاگرد بھی کثرت سے موجود تھے۔ بازار حکیماں کے اس مشاعرے میں اقبال نے اپنی غزل پڑھی، دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے
اقبالؔ لکھنؤ سے نہ دلّی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خم زلف کمال کے

۱۔ اقبال ریویو، مجلہ اقبال، ص ۱۶

۲۔ زندہ رود، ص ۱۲۷

ارشد گورگانی نے بے ساختہ داد دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''نوجوان تمہارا مستقبل روشن ہی نہیں تابناک بھی ہے-'' پھر اقبال مشاعروں میں باقاعدہ شریک ہونے لگے-

لاہور میں دراصل حالی اور آزاد کی نئی طرز کی شاعری رواج پا چکی تھی- اقبال بھی اس نئے طرز کے پہلے نمائندہ شاعر کی حیثیت سے شہرت پا رہے تھے- اقبال کو جب مشاعروں میں بھرپور داد اور پذیرائی ملی تو ان کی فکر رسا اور تخیل کی پرواز بلند سے بلندتر ہوتی گئی- سر عبدالقادر نے بھی اقبال کو بازار حکیماں کے مشاعرے میں سنا تھا اور خاصا پسند کیا- سر عبدالقادر کے کہنے کے مطابق کہ ''ایک نوجوان طالب علم اپنے چند ہم عصروں کے ساتھ شریک ہوا، اس نے سادہ سی غزل پڑھی، جس کا مقطع یہ تھا ۔

شعر کہنا نہیں اقبال کو آتا لیکن

آپ کہتے ہیں سخنور تو سخنور ہی سہی

بازار حکیماں کے مشاعروں سے یہ ضرور ہوا کہ اقبال کا تعلق دیگر شعراء سے بھی ہونے لگا- ان میں محمد دین فوق، یہ بھی شاعر تھے، اقبال کی شاعری کو پسند کرنے لگے تھے- فوق صاحب نے اقبال کو اپنا دوست بنا لیا- بازار حکیماں کے علاوہ لاہور میں ایک اور انجمن، جس میں کشمیری مسلمان تھے، یہ انجمن پہلے ہی سے مشاعرے کرا رہی تھی، اس انجمن کا نام ''انجمن حمایت اسلام'' تھا-

طالب علمی کے زمانے سے اقبال نے اپنی شاعری اور فکر کو غزل سے ہٹا کر نظم کی طرف موڑا- مغربی ادب نے بھی اقبال کو متاثر کیا اور نئے رجحان شاعری فروغ پانے لگے- سرسید کے دور کو دیکھا جائے تو انداز ہوتا ہے کہ مغربی رجحانات ادب پر مرتسم ہونا شروع ہوگئے تھے- غرض اقبال کے سامنے فارسی، اردو اور انگریزی شاعری کے بہترین نمونے تھے- اقبال کی ابتدائی شاعری کے نمونے رسالہ ''زبان دہلی'' اور ''شور محشر'' میں ملتے ہیں-

انجمن حمایت اسلام:

انجمن حمایت اسلام کا قیام ۱۸۸۴ء میں عمل میں آیا- اس انجمن کے تحت سالانہ جلسہ ہوا کرتا تھا- اس جلسہ میں مقامی اور بیرونی شعراء کافی تعداد میں شرکت کرتے- معروف اور غیر معروف شعراء کی گہما گہمی انجمن حمایت اسلام کے تحت شروع ہوئی- جلسہ میں جو حضرات شریک ہوئے، ان میں الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، خواجہ حسن نظامی، سر عبدالقادر، مولانا نذیر احمد دہلوی، ارشد گورگانی، سائل دہلوی، سر محمد شفیع، سیماب اکبر آبادی، اکبر الہ آبادی اور بہت سی اہم شخصیات- یہ جلسہ ۲۴ فروری ۱۹۰۰ء کو منعقد ہوا- اس جلسہ میں اقبال نے اپنی نظم ''نالۂ یتیم'' پڑھی- ۱۹۰۱ء میں ''ایک یتیم کا خواب ہلال عید سے'' اور ۱۹۰۲ء کے جلسہ میں ''خیر مقدم''، ''دین و دنیا اور اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے'' ۱۹۰۳ء کے جلسہ میں ''فریاد امت'' پڑھی- اقبال کی شہرت انہی جلسوں اور مشاعروں سے پورے ہندوستان میں پھیل گئی-

انجمن حمایت اسلام کے قائم کرنے کا مقصد صرف اور صرف یہ تھا کہ مسلمانوں اور ان کے بچوں کے لئے فلاحی کام کئے جائیں اور ایسے ادارے قائم کئے جائیں تاکہ مسلمانوں کی محرومی اور مایوسی کا ازالہ ہو سکے-

انجمن حمایت اسلام کے مقاصد پر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''عیسائی مشنریوں کی تبلیغ کا سدباب کرنا، مسلمانوں کی تعلیم کے لئے اسکول اور کالج قائم کرنا، جن میں جدید و قدیم علوم پڑھائے جاسکیں، مسلمانوں کے یتیم اور

لاوارث بچوں کے لئے ایسے ادارے قائم کرنا جن میں نگہداشت کے علاوہ انہیں تعلیم و
تربیت بھی دی جا سکے۔"[۱]

اقبال کی وطنی شاعری کا یہ روشن پہلو ہے جس میں ان کا نظریۂ سیاسی انقلاب اور قومی تشخص ان کے پیش نظر تھا۔ انہوں نے اپنے افکار و خیالات سے مسلمان قوم کو زندہ رہنے کا عمل اور اقوام عالم میں سر اٹھا کر چلنے کا سلیقہ سکھایا۔ اردو نظم کو ایک نئے آہنگ اور اسلامی فکر سے اقبال نے روشناس کرایا۔

انجمن حمایت اسلام کے پلیٹ فارم سے دیگر شعراء نے بھی شہرت کا جام پیا۔ ان میں ابوالکلام آزاد، عبدالقادر گرامی، خوشی محمد، سر فضل حسین، مولانا عبداللہ ٹونکی، مولانا ثناء اللہ وغیرہ۔

رفتہ رفتہ اقبال نے ترقی کے زینہ کو تیزی سے طے کیا اور ہندوستان کے نامور شعراء میں اپنی جگہ بنوانے میں کامیاب ہو گئے۔

اساتذہ کی موجودگی اور شعراء کی ہمرکابی سے اقبال کو یہ فائدہ ہوا کہ انہوں نے شاعری میں اسلامی رنگ کی آمیزش سے مسلمانوں کے دل میں آزادی اور بیداری کی لہر دوڑا دی۔ اقبال کے دور میں مسلم قومیت زبوں حالی کا شکار تھی۔ اس لئے اقبال نے فطرت نگاری اور اسلامی فلسفہ کو نئے آہنگ سے پیش کیا۔ علامہ کے سامنے ہندوستان کی سیاست بھی تھی اور مسلمانوں کی شاندار تاریخ بھی۔

اقبال نے ایک نظم "پرندے کی فریاد" لکھی جس میں انہوں نے غلامی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس جیسی اور بھی کئی نظمیں ہیں جس میں "ترانۂ ہندی"، "تصویر درد"، "نیا شوالہ"، "ہمالہ" ان نظموں میں اقبال کا وطنیت کا جذبہ اجاگر ہوا ہے۔

سیاسی اعتبار سے یہ دور انتشار کی آگ میں جل رہا تھا ایسے میں ایک مسیحا کی ضرورت تھی اور وہ مسیحا اقبال کی صورت میں ہمیں ملا۔ اقبال کو اقبال بنانے میں انجمن حمایت اسلام کا بہت بڑا ہاتھ ہے اور وہ اساتذہ بھی قابل احترام ہیں جنہوں نے اقبال کی شاعری کو سراہا۔ اس طرح اقبال اپنے معاصرین کی نظر میں محترم ہو گئے۔

اقبال انجمن حمایت اسلام کے لئے خصوصی طور پر نظم کہتے۔ ان کی نظموں کو پسند کیا جاتا تھا۔ اقبال کو سننے کے لئے لوگ جوق در جوق جلسہ میں شریک ہوتے۔ معاصرین کے علاوہ اساتذہ میں شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد وغیرہ جلسے میں شرکت کرتے۔ یہ حضرات اقبال کی شاعری اور ذہنی ارتقاء پر دل کی گہرائیوں سے داد دیتے۔ علامہ شبلی کی یہ داد ملاحظہ کیجئے:

"انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں اقبال نے ایک طویل نظم پڑھی جس کے ہر شعر میں فکر و تخیل کا انوکھا پن تھا۔ مولانا شبلی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے داد دیتے ہوئے فرمایا کہ جب حالی اور آزاد کی کرسیاں خالی ہوں گی تو لوگ اقبال کو ڈھونڈھیں گے۔"[۲]

اقبال سے پہلے کی شاعری میں جو رجحانات اور رنگ شاعری کا ذکر پس منظر میں کر دیا گیا ہے، اس روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کا ذہن ان شعراء کے رنگ شاعری سے مطابقت نہیں کھاتا تھا۔ اسی لئے اقبال نے اپنی راہ الگ نکالی۔ حالی کی فکر کو محسوس اور اثرات کو قبول کرتے ہوئے مقصدی شاعری میں قدم رکھا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ اقبال کے ہاں ذات

۱۔ زندہ رود، ص ۱۵۴

۲۔ فکر اقبال، ص ۵۷

اثبات میں ہے- وہ عشق کی پیچیدگیوں سے تعلق نہیں رکھتے اور نہ ہی ان کے ہاں محبوب کا فراق ہے- ان کا ذہنی افق بہت وسیع اور بہت مختلف ہے-

اقبال کے ابتدائی کلام سے قطع نظر ۱۹۰۰ء سے جس شاعری کا آغاز ہوا، وہ نظمیں ہیں جن میں اپنے پیغام کو عالم انسانی تک پہنچایا- کلیات اقبال میں اس کی مثالیں موجود ہیں- طبعی میلان کے تحت اقبال نے خود کو اسلامی، ملی، قومی، حب الوطنی، سیاسی و معاشرتی اور مناظر فطرت جیسے موضوعات کے لئے وقف کر دیا- اقبال نے کائنات کے سربستہ رازوں پر غور و فکر کر کے کامیاب نظمیں لکھیں- اپنی شاعری سے پورے ہندوستان کو چونکایا- اقبال کی شاعری اور ذہنی ارتقاء کا معیار وہاں سے بنتا ہے جہاں اقبال سے پہلے شعراء نے نقطۂ عروج دے کر آگے کی راہ ہموار کر دی تھی- اقبال نے شاعری میں بیداری قوم کو اولیت دی- حقیقت کی تلاش، مشرق کا جمود اور نفی خودی پر غور کرنا شروع کیا- آخر کار انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعہ اس جمود کو توڑا- اقبال کا یہ طرز شاعری بے حد مقبول ہوا- اقبال کی شاعری روح کو بیدار کرنے کی شاعری ہے- خودی کے فلسفے میں اس بات پر زور دیا کہ میرا یہ نظریہ کسی ایک قوم کے لئے نہیں بلکہ عالم انسانی کے لئے ہے- اقبال کی شاعری میں جو آفاقیت اور ہمہ جہتی پائی جاتی ہے، یہ وہ شاعری ہے جس پر اقبال نے خود اپنی انفرادیت کی مہر ثبت کی ہے-

اس پس منظر میں یہ وہ سنہرا دور تھا جسے ہم اردو شاعری کا افق کہتے ہیں- یہ دراصل تین سو سال کا ادبی و شعری سرمایہ ہے- اس لئے جستہ جستہ نمونوں کے ساتھ اخذ مطالب و نظریات کی سعی کی گئی ہے-

باب اول

اقبال کے معاصرین

میر غلام بھیک نیرنگ......۱۸۷۶ء-۱۹۵۲ء:

اصل نام غلام محی الدین، نیرنگ تخلص کرتے تھے- ۱۸۷۶ء، بمقام انبالہ میں پیدا ہوئے- دینی گھرانے سے تعلق تھا- وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد وکالت کے پیشے سے منسلک ہوگئے- سیاسی ذہن رکھتے تھے- زندگی کا بیشتر حصہ قومی اور ملی خدمات میں گزارا- نیرنگ علامہ اقبال کے ہم جماعت اور بہت اچھے دوست تھے- نیرنگ کی آواز شاعری میں انقلابی آواز بن کر ابھری- انقلاب کے بعد جو اثرات ہماری شاعری پر مرتب ہو رہے تھے، وہ اس وقت کے شعراء کے موضوعات تھے- نیرنگ کی نظموں میں بھی وہی بازگشت سنائی دیتی ہے، جو حالات و واقعات اس وقت درپیش تھے مثلاً ان کی نظموں کے عنوانات ''شرط زندگی''، ''درد پنہاں''، ''آہنگ عمل''، ''نوائے انقلاب''، ''پیغام عمل''، ''کارزار ہستی'' اور ''صدائے اسلام''- ان نظموں کو پڑھ کر ان کی مسلمانوں سے محبت اور اسلامی تہذیب کا پتا چلتا ہے- نیرنگ کی شاعری میں تنوع، ہمہ جہتی، انقلاب آفریں خیالات، قومی دلی جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے- نیرنگ کی نظم ''درد پنہاں'' میں اقبال کی نظم ''تصویر درد'' کے نقوش نمایاں ہیں- قومی تشخص اور احساس کی آنچ درد پنہاں میں نظر آتی ہے- اس تقابل میں اقبال کی نظم ''تصویر درد'' کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری[1]

نیرنگ کی نظم ''درد پنہاں'' کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ان کے اسلوب اور تشبیہات میں وہی بات پائی جاتی ہے جو اقبال کے مزاج کا خاصہ ہے- نیرنگ کی نظم پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی فکر اقبال کی فکر سے کس حد تک متاثر تھی- دونوں کا ایک ہی درد ہے ؎

ہم نشیں مجھ سے نہ سن درد دروں کا ماجرا
پھر نہ کہنا تو نے محفل کو مکدر کر دیا
تجھ کو یارائے شنیدن مجھ کو تاب گفتگو
جب تک دونوں نہ ہوں بے سود عرض مدعا

۱- بانگ درا، ص ۶۲

ساز غم ہوں مجھ سے نکلیں گی صدائے درد کی
دل میں جو کچھ ہے وہی آخر زباں پر آئے گا
سوز غم سے لفظ و مضموں ہوگئے خاک سیاہ
داستان درد پنہاں کس طرح کیجئے ادا
خوب موضوعات مغرب کی کھلیں گی منڈیاں
اب ہزاروں ہی بنیں گے آڑھتی تاجر نما
بادۂ مغرب کی آئیں گی کروڑوں بوتلیں
کوچہ و بازار میں بکتی پھریں گی برملا

(درد پنہاں)[1]

نیرنگ کی شاعری قوم کا نوحہ بن کر ابھری۔ ان کی دیگر نظموں میں بھی اقبال کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں مثلاً ''حالت قوم''، ''راحت یاس''، ''مرجھایا ہوا پھول''، قوم کے غم میں دونوں اضطرابی کیفیت سے دوچار ہیں۔ مداوائے غم میں جو تدبیریں اور قلبی احساس نظموں میں پیش کیا ہے، اس سے حب الوطنی کا جذبہ ابھر کر سامنے آیا ہے۔ اقبال نے طریقۂ اضافت اور حرف عطف کی مدد سے تراکیب سازی کی ہے۔ تراکیب لفظوں کا ایک ایسا ملاپ ہے جس سے نئے نئے معنی وجود میں آتے ہیں۔ ساحل احمد اقبال کی تراکیب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اقبال نے تراکیب و بندش کی اختراع میں اپنی طبع زاد، جودت طبع کی بھی نمائش کی ہے اور نامقبول لفظوں یا ترکیبوں کو چمکانے کی عمدہ کوشش کی ہے اور جن کے ذریعہ سیاسی، تہذیبی، تمدنی، اقتصادی اور سماجی مسائل کو حل کرنے یا مظہور کرنے میں استعمال کیا ہے۔ کلام میں صرف فارسی کی ڈھلی ڈھلائی ترکیبیں یا جملے ہی نہیں نئی روز مرائی ترکیبیں بھی موجود ہیں۔''[2]

نیرنگ کی نظم ''صدائے اسلام'' پر اقبال کی نظم ''طلوع اسلام'' کے اثرات نمایاں ہیں۔ اقبال کی نظم میں امید اور احساس کے ملے جلے رجحان ملتے ہیں ؎

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دور گراں خوابی

نیرنگ کی نظم ''صدائے اسلام'' ملاحظہ کیجئے ؎

گلشن عرفاں کو دینے رنگ و بو آیا ہوں میں — اس چمن میں بن کے آئین نمو آیا ہوں میں
درد دل ہی حضرت انساں کے دکھ کی ہے دوا — دل میں بن کر درد دل کی آرزو آیا ہوں میں
سب رسولوں کی زبانوں پر مرا افسانہ تھا — شمع بزم راز تھا میں، ہر نبی پروانہ تھا
اختلاف فرع کی گو ڈال رکھی تھی نقاب — جلوہ گر اوّل سے میرا عارض جانانہ تھا

۱۔ کلام نیرنگ، ص ۱۵۸

۲۔ اقبال اور غزل، ص ۱۳۵

تم سے خود اپنا علاج دردِ نکہت ہو تو ہو　　نسخۂ امداد خود کردن سے صحت ہو تو ہو
پھوٹ کی تلوار نے زخمی کیا جس قوم کو　　اس کا درماں نوشِ داروئے اخوت ہو تو ہو
عزت و ذلت کا کیا احساس جب غیرت نہیں
جوشِ غیرت رہنمائے راہ ہمت ہو تو ہو

(صدائے اسلام)[1]

''طلوعِ اسلام'' اور ''صدائے اسلام'' دونوں نظمیں ترکیب بند میں کہی گئی ہیں۔ اسلوب اور طرزِ فکر میں بھی مماثلت ہے۔ نیرنگ کے ہاں وہی ترکیبیں ہیں جو اقبال کا خاصہ ہیں۔

نیرنگ کی تراکیب لفظ دیکھئے، آئین نمو، شمعِ بزمِ راز، نسخۂ امداد، داروئے اخوت وغیرہ۔

''طلوعِ اسلام'' کے بارے میں اسلوب احمد انصاری رقمطراز ہیں:

> ''طلوعِ اسلام'' میں وہ امید کے گیت الاپ رہا ہے۔ اس کا دل مسرت سے لبریز ہے۔ اس کی لے میں ترنگ ہے اور انداز میں مستی، ترانوں میں تازگی ہے اور موسیقیت۔ وہ شرابِ زندگی سے مدہوش کیف و سرور کے عالم میں گائے جا رہا ہے اور نغموں کے روح پرور ارتعاش سے جذبات کو چھیڑ رہا ہے۔ اس کی آواز میں سحر ہے اور اندازِ بیان میں بے پناہ دلکشی، احساسات میں خوشی مسکرا رہی ہے۔ نواؤں میں زندگی ہے اور زندگی میں حسن اس کے ہر لفظ سے امرت کے رس کی بوندیں ٹپک رہی ہیں اور اس کا دل انبساط کی لہروں کے ساتھ رقص کر رہا ہے۔ یہی کیفیت اس کے ساز کے ہر تار سے نکل کر صفحۂ قرطاس پر نمایاں ہوگئی ہیں۔''[2]

اقبال کی نظم ''خطاب بہ جوانانِ اسلام'' میں جو تلمیحات استعمال ہوئی ہیں، وہ تاریخی ہیں مثلاً

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں　　کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

''تاجِ سرِ دارا'' تلمیح استعمال کی ہے۔ ''دارا'' جو کیانی خاندان کا نواں بادشاہ تھا، اس کا تعلق ۳۳۱ ق۔م سے ہے۔ اس نظم کے اثرات نیرنگ کی نظم ''شرطِ زندگی'' میں ملاحظہ کیجئے

تجھ کو اے مسلم ہے اپنے حال کا کچھ بھی پتا　　کس طرف جانا تھا تجھ کو اور کدھر ہے جا رہا
کون سی دولت کا تو وارث تھا اور وہ کیا ہوئی　　کس نے لوٹا کارواں کو تیرے اور کیا کیا لٹا
آہ اے مسلم! تری غفلت کو کیا کیا روئیے　　کیسی تیری ابتداء تھی! کیا ہے تیری انتہا
کون ہے رہبر تیرا؟ اور اس کا کیا فرمان ہے　　کیا ہوئی تعمیلِ فرماں اور ہوا انجام کیا
تیرا رہبر وہ ہے جو ہے مقتدائے جن و انس　　تیرا رہبر وہ ہے جو ہے رہبروں کا رہنما

(شرطِ زندگی)[3]

۱- کلامِ نیرنگ، ص ۱۰۹

۲- اقبال شاعرِ صد رنگ، ص ۹۰

۳- کلامِ نیرنگ، ص ۱۶۵

تلمیحات اور ہیئت کے اعتبار سے یہ مسلسل نظم ہے۔ ''آہ اے مسلم''، ''رہبروں کا رہنما''، ''مقتدائے جن و انس'' مسلمانوں کی زبوں حالی کا جو نقشہ نیرنگ نے کھینچا ہے، یہی وہ اسلوب ہے جسے ہم اقبال کا اسلوب کہتے ہیں۔ رنگ و آہنگ کے اعتبار سے بھی نیرنگ کی نظموں پر اقبال کی فکر اور اثرات نمایاں ہیں۔

ظفر علی خاں......۱۸۷۰ء-۱۹۵۹ء:

کرم آباد ضلع گجرانوالہ میں ۱۸۷۰ء کو پیدا ہوئے، نظم گو کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ اقبال سے ذہنی ہم آہنگی اور باطنی مطابقت سے شاعری میں فطری طور پر اثرات مرتب ہوئے۔ ان دونوں کے ہاں مقاصد اور فکری اپج ایک ہے۔ ایک بات جو غور طلب ہے وہ یہ کہ اقبال کی نظر مستقبل پر تھی اور ظفر علی خاں کی حال پر نئے عہد کے مزاج میں خود کو ڈھالنے کی جو کوشش نظر آتی ہے، ان میں نئی علامتیں جہتیں اور مختلف النوع موضوعات اور تہذیبی اقدار کو موضوع سخن بنا کر نظم کے وقار کو منتہا تک پہنچا دیا۔ حب وطن، حب قوم اور فطرت نگاری پر جو نظمیں ہیں ان میں فکر بھی ہے اور اثر پذیری سے بھی لبریز ہیں۔

ظفر علی خاں نے طنز و مزاح کے نشتر سے بھی بیداری کا کام لیا ہے۔ ان کی شاعری میں سنگلاخ زمینیں بھی ملتی ہیں، خاص طور پر ان کا موضوع سیاست ہے، اس کے علاوہ اخلاقیات، تاریخ اور معاشرت پر بھی اچھی نظمیں ملتی ہیں۔ سیاست ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ سیاسی شاعر ہونے کی حیثیت سے موجودہ تقاضوں کو بھی خوب نبھایا ہے۔ عبدالقادر سروری ان کی سیاسی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''بحیثیت مجموعی مولانا ظفر علی خاں کی شاعری ان کی سیاسی کشمکش کی تاریخ ہے۔ سیاست شاعری کے لئے بہت زیادہ دلکش موضوع تو نہیں لیکن مولانا کے انداز بیان نے اسے دلکش بنا دیا ہے۔ سیاست ان کی زندگی کا لاینفک جزو ہے اور شاعری ان کے لئے ایک ذریعہ اور حربہ۔'' [۱]

ان کی انگریزی نظموں کے ترجمے اس بات کے غماز ہیں کہ یہ ادبی ذوق شاعری کا نقطۂ آغاز ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ملکی حالات اور مسلمانوں کی تنزلی کو پیش نظر رکھتے ہوئے شاعری کے رخ کو سیاست کی طرف موڑ دیا۔ اس طرح ادیب، صحافی اور سیاست داں کے علاوہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ جس طرح اقبال نے انگریزی ترجمہ کر کے نظمیں لکھی ہیں مثلاً ''ایک گائے اور بکری''، جین ٹیلر کی نظم ''گائے اور گدھا'' سے ماخوذ ہے۔ ''ایک پہاڑ اور گلہری'' ایمرسن کی نظم سے ماخوذ ہے۔ ان نظموں میں بیانیہ طرز اختیار کیا ہے۔ ''ایک مکڑا اور مکھی'' میری ہووٹ کی نظم "The Spider and the Fly" سے ماخوذ ہے۔ ظفر علی خاں نے بھی اسی طرح کے ترجمے کئے ہیں۔ ظفر علی خاں کی نظم ''پھولوں کا تار بلبل کے نام'' پر اقبال کی نظم ''پھول'' کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں ؎

تجھے کیوں فکر ہے اے گل دل صد چاک بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے

۱- جدید اردو شاعری، ص ۲۴۹

سے مل کر ان ہیجانی لمحات کی تصویر بن گئی۔'' [1]

جہاں اقبالؔ آرٹ کے حیاتاتی پہلوؤں پر زور دیتے ہیں وہاں ظفرؔعلی خاں نے بھی ڈرامائی طرز پر نظمیں لکھ کر درد واثر اور سوز وگداز جس میں قومی جذبہ اور مسلمانوں سے ہمدردی کا جذبہ نظر آتا ہے۔ یہی ان کے فن اور شاعری کی اساس ہے۔ اقبالؔ نے ''تہذیب حاضر'' کے عنوان سے جو نظم کہی ہے، اس میں تاریخی وسیاسی تلمیحات کا التزام ملتا ہے ؎

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیب حاضر میں　　بھڑک اٹھا بھبھوکا بن کے مسلم کا تن خاکی

ظفرؔ کی نظم ''ایک بیرسٹر کی آپ بیتی'' پر اقبالؔ کی نظم کے اثرات دیکھیے ؎

لٹائی خوب ہی باوا کی دولت ہم نے لندن میں　　گیا تھا چھوڑ تنہا باغباں گلچیں کو گلشن میں
خریدار متاع جلوہ تھا یاں حسن بے پردہ　　بھرے تھے پھول رنگا رنگ بیبا کی کے دامن میں
نہ تھی پنہاں نقابوں میں یہاں عارض کی رنگینی　　نہ تھے ناز و ادا مخفی یہاں پردہ کی چلمن میں
نظر آیا یہاں پریوں کا ایسا جمگھٹا ہم کو　　لگا دی آگ جس نے صبر اور دانش کے خرمن میں
کبھی گرجا میں جا کر ہم نے گھورا ماہ رویوں کو　　کبھی تاک آئے ہم جا کر کسی گلرو کو گلشن میں

(ایک بیرسٹر کی آپ بیتی) [2]

اس نظم میں استعمال ہونے والی تراکیب ملاحظہ ہوں: بیبا کی کے دامن، دانش کے خرمن، ماہ رویوں، گلرو، اقبالؔ نے دانش حاضر کی ترکیب وضع کی ہے۔

صوری اور معنوی لحاظ سے اس نظم کو مکمل آرٹ کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ نظم میں نوجوانوں کی اصلاح مقصود ہے، مغربی تہذیب کی برائیوں کو اجاگر کیا ہے اور مشرقی تہذیب کی خوبیاں بیان کی ہیں، مغرب کی بے حیاء زندگی کا نقشہ کھینچا ہے اور پردہ کی اہمیت پر اور اس کی افادیت پر زور قلم صرف کیا ہے۔

اقبالؔ کی نظم ''بلال'' اس میں تاریخی تلمیحات ہیں مثلاً سکندر، رومی،، پورس، دارا، بلالؓ، یہ نظم اقبال کی ترکیب بند پر مشتمل ہے۔ ظفرعلی خان نے اپنی نظم ''آزادی'' میں تاریخی تلمیحات استعمال کی ہیں مثلاً عمرو العاص، قیصرو پاپا، قبطی فاروق اعظم، ان تلمیحات سے اقبال کے اثرات واضح ہو جاتے ہیں۔ اقبال کا شعر دیکھیے ؎

تاریخ کہہ رہی ہے کہ رومی کے سامنے　　دعویٰ کیا جو پورس و دارا نے خام تھا

اس روشنی میں ظفرؔعلی خاں کی نظم ''آزادی'' کے چند اشعار بطور نمونہ ؎

عمرو بن العاص کے بیٹے نے مارا بے خطا　　مصر کے بازار میں اک قبطی ناشاد کو
کوئی طاقت دستگیری اس کی کر سکتی نہ تھی　　قیصر و پاپا بھی آسکتے نہ تھے امداد کو
جس کی نظروں میں مسیحی اور مسلم ایک تھے　　جس نے قرباں کر دیا ایمان پر اولاد کو
لوح دل پر نقش ہے فاروق اعظم کا یہ قول　　ہم نہ بھولیں گے کبھی اس آپ کے ارشاد کو

(آزادی) [3]

۱۔ اقبال، ایک مطالعہ، ص ۱۷۴

۲۔ نگارستان، ص ۴۴

۳۔ خیالستان، ص ۳۱

اقبالؔ کے اثرات ظفر علی خاں کی نظموں پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کی شاعری میں سیاسی، تاریخی اور سماجی پس منظر کا جو رجحان پایا جاتا ہے، اس میں اقبالؔ کی فکر کے واضح نقوش ہیں۔

نظم ''آزادی'' میں قانون کی بالادستی کی طرف اشارہ ہے یعنی امیر اور غریب سب کے لئے قانون یکساں ہے۔ یہ نظم مذہبی رنگ لئے ہوئے ہے اور اس میں تاریخی کردار بھی ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ظفر علی خاں کی صنعت گری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ظفر علی خاں اپنی صنعت گری کے لئے اختراع اور ندرت کی خاص ضرورت محسوس کرتے ہیں چنانچہ وہ خاص موقعوں کے لئے خاص ترکیبیں گھڑتے اور سنگلاخ الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں۔ ظفر علی خاں کی اس ندرت پسندی کو ان کی الفاظ دانی نے بڑی تقویت پہنچائی ہے چنانچہ ان کی بعض نظموں میں الفاظ کی فراوانی کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، اس طرح مشکل قوانی اور ردیفوں پر ظفر علی خاں کو خاص قدرت حاصل تھی۔'' [1]

غرض یہ کہ ظفر علی خاں کی شاعری میں صنعتوں کا استعمال بڑی چابک دستی سے ہوا ہے۔ نظموں میں صنعت طباق ایجابی، یعنی دو ایسے لفظ کلام میں استعمال کرنا جو معنی میں ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ ان کے کلام میں تلمیح بھی کثرت سے استعمال ہوئی ہے۔ کلام میں تاریخی واقعہ، حدیث، قرآن یا کوئی مشہور قصہ تلمیح کہلاتی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر صنعتوں سے بھی کام لیا گیا ہے۔ ظفر علی خاں کی شاعری کی خصوصیت پر ڈاکٹر عبداللہ رقمطراز ہیں:

> ''ظفر علی خاں کی شاعری کی خصوصیتیں چند در چند ہیں۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ ظفر علی خاں کی شاعری میں بیک وقت کئی رنگ یا کئی ذائقے ملتے ہیں۔ ان کے کلام میں یک رنگی اور یکسانیت کی اداسی اور اکتاہٹ موجود نہیں۔ اس میں کہیں شبلیؔ کا رنگ ہے جو ان کی تاریخی اور سیاسی نظموں میں ظاہر ہوا ہے۔ کہیں اکبرؔ کا ڈھنگ ہے، جو ان کی طنزیات و مضحکات میں نظر آتا ہے۔ کہیں وہ چکبستؔ کی نرم سیاسی نظم گوئی کو اپنے تیز اور تند لہجوں میں بدل دیتے ہیں اور پھر کہیں وہ اقبالؔ کی رجزیہ نظموں کی اپنے خاص انداز میں پیروی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔'' [2]

اس اقتباس کی روشنی میں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ظفر علی خاں کی شاعری میں تاریخی میلانات اور سیاسی رجحانات کا جو عمل ہمیں نظر آتا ہے، وہ اقبالؔ کی تاریخی بصیرت کا انعکاس ہے کیونکہ اقبالؔ نے تصویر کشی میں تراکیب سے کام لیا ہے۔ اسی طرح ظفر علی خاں نے تراکیب اختراع کر کے شاعری میں نئے صنم تراشے ہیں۔ ان کی تراکیب اور تضامین سے بھی بیکراں وسعتیں شاعری میں ہوئیں۔

پنڈت برج نرائن چکبستؔ ۱۸۸۲ء-۱۹۲۶ء:

چکبستؔ ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ اقبالؔ کی شاعری کے پیش نظر ان کی شاعری میں تاریخی واقعات اور جذبہ

۱۔ چند نئے اور پرانے شاعر، ص ۱۷۷

۲۔ چند نئے اور پرانے شاعر، ص ۱۶۸

حب وطن نظر آتا ہے۔ ''حب قومی'' میں اقبال کی نظم ''ترانۂ ہندی'' کے اثرات نمایاں ہیں ۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا　　ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

چکبست کی نظم ''حب قومی'' ملاحظہ کیجئے ۔

حب قومی کا زباں پر ان دنوں افسانہ ہے　　بادۂ الفت سے پُر دل کا مرے پیمانہ ہے
جس جگہ دیکھو محبت کا وہاں افسانہ ہے　　عشق میں اپنے وطن کے ہر بشر دیوانہ ہے
درفشاں ہے ہر زباں حب وطن کے وصف میں　　جوش زن ہر سمت بحر ہمت مردانہ ہے
جمع ہیں قومی ترقی کے لئے ارباب قوم　　رشک فردوس ان کے قدموں سے یہ شادی خانہ ہے

(حب قومی)[1]

اس نظم میں اقبال کی ترکیبیں، جن سے استفادہ کیا گیا ہے، مثلاً بادۂ الفت، جوش زن، بحر ہمت، ارباب قوم، رشک فردوس، یہ وہ علامتیں ہیں جو اقبال کی عطا ہیں۔ اقبال کے ہاں جو اضافتیں ہیں، وہی اسلوب چکبست نے اپنایا ہے۔ چکبست نے یہ نظم خالصتاً قومی جذبہ سے سرشار ہو کر لکھی ہے۔

محاکات، تخیل اور جدت آمیز طریق پر نظموں میں اظہار کر رہے تھے۔ پوری نظم میں مجموعی تاثر یہ ہے کہ وطن کی محبت، سیاسی آزادی اور حصول آزادی کی جنگ، ان کی شاعری کو تحریکی شاعری کہا جا سکتا ہے۔ وطن سے عشق کا یہ جذبہ ان کی اکثر نظموں میں ملتا ہے۔ رنگ و آہنگ کے اعتبار سے بھی چکبست کا ذہنی افق وہی ہے جو اقبال کا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اقبال کی فکر لامحدود ہے جبکہ چکبست صرف ہندوستان کے بارے میں سوچتے ہیں۔

چکبست کی نظم ''وطن کا راگ'' اس نظم میں وطنیت کے اثرات اور قوم سے محبت کا جذبہ نظر آتا ہے۔ اقبال کی نظم ''وطنیت'' کے اثرات چکبست کی نظم میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اقبال کی نظم کا شعر دیکھئے ۔

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور　　ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور

چکبست کی نظم ''وطن کا راگ'' میں اقبال کی ترکیبیں ملاحظہ کیجئے ۔

وطن پرست شہیدوں کی خاک لائیں گے　　ہم اپنی آنکھ کا سرمہ اسے بنائیں گے
غریب ماں کے لئے درد دکھ اٹھائیں گے　　یہی پیام وفا قوم کو سنائیں گے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

''شہیدوں کی خاک''، ''آنکھ کا سرمہ'' ''غریب ماں کو زمین سے تشبیہ دی ہے۔ چکبست کی نظم ہیئت کے اعتبار سے مسدس میں ہے۔ اقبال کی وہ نظمیں جو یورپ جانے سے پہلے کی ہیں، اقبال کے ہاں یہ جذبہ زیادہ قوی ہے۔ چکبست نے ان موضوعات کا انتخاب کیا جو قوم و ملک کی ترقی کے لئے سودمند ہو مثلاً چکبست کی نظم ''برسات'' پر اقبال کی نظم ''ابر'' کے واضح اثرات ملتے ہیں ۔

اٹھی پھر آج وہ یورپ سے کالی کالی گھٹا　　سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سر بن کا
نہاں ہوا جو رخ مہر زیر دامن ابر　　ہوائے سرد بھی آئی سوار توسن ابر

(ابر)

۱۔ کلیات چکبست، ص ۱۷۲

چکبست کی نظم ملاحظہ کیجئے ۔

یاد دلواتی ہے مے نوشی فضا برسات کی
دل بڑھا جاتی ہے آ آ کر گھٹا برسات کی
بندھ گئی ہے رحمت حق سے ہوا برسات کی
نام کھلنے کا نہیں لیتی گھٹا برسات کی
اگ رہا ہے ہر طرف سبزہ در و دیوار پر
انتہا گرمی کی ہے اور ابتداء برسات کی
دیکھنا سوکھی ہوئی شاخوں میں بھی جان آ گئی
حق میں پودوں کے مسیحا ہے ہوا برسات کی
وہ پپیہوں کی صدائیں اور وہ موروں کا رقص
وہ ہوائے سرد اور کالی گھٹا برسات کی

(برسات) [1]

اس نظم میں زیادہ تر وہی ترکیبیں استعمال ہوئی ہیں جنہیں اقبالؔ اپنی نظموں میں استعمال کر چکے ہیں۔ نظم ''برسات'' میں چکبستؔ نے مناظر فطرت کی جو عکاسی کی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ نظم میں تاریخی تلمیحات بھی استعمال ہوئی ہیں مثلاً مصر، شام، روم، سرزمین ہند، اس نظم کو پڑھنے کے بعد طبیعت خود بخود وجد میں آ جاتی ہے۔ عبدالشکور چکبستؔ کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''چکبستؔ کے کلام میں متانت اور پختگی بندش کے علاوہ استادانہ رنگ کی جھلک موجود ہے۔ قومی درد ان کے اشعار کی نمایاں خصوصیت ہے اور کیا اس سے انکار ہوسکتا ہے کہ ہندوستان کو اس وقت ایسے ہی شعراء کی ضرورت ہے۔ گل و بلبل کے افسانے، زلف و چوٹی کے قصے ہم ضرورت سے زیادہ عرصے تک دہرا چکے ہیں اور اب تک ہم نے شاعری سے قوی کام بہت کم لیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اب شاعری کا رنگ بدلے اور پبلک کے دلوں کو گرمایا جائے۔ چکبستؔ اور اقبالؔ اس وادی کے امام ہیں لیکن جس قدر زمانہ گزرتا جاتا ہے اقبال کے کلام میں فلسفہ غالب ہوتا جاتا ہے۔ یہ امر یقینی ہے کہ اس دور کا کوئی ہندو شاعر لطافت بیان، نازک خیالی، پختگی اور اسلوب کی صفائی میں چکبستؔ کا مدمقابل نہیں۔'' [2]

چکبستؔ کی شاعری میں ہند کی بازگشت زیادہ ہے جبکہ اقبالؔ کی شاعری میں آفاقیت ہے اور چکبستؔ کی شاعری ہندوستان کی سرحدوں تک محدود ہے۔ چکبستؔ کی نظم ''خاک ہند'' پر اقبالؔ کی نظم ترانہ ہندی کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ الفاظ کی بندش، فکری میلانات اور تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ چکبستؔ نے اقبالؔ سے کلی طور پر کسب فیض کیا ہے۔ اس بات کی شہادت خود ان کا اپنا کلام ہے۔

چکبستؔ کی نظم ''مرقع عبرت'' کے مطالعہ کے بعد اقبالؔ کی نظم ''سرمایہ و محنت'' پڑھ جائیے۔ ایک سی اصطلاحیں ملیں گی مثلاً نسل، قومی، کلیسا، سلطنت، تہذیب، مغربی تہذیب اور سرمایہ داری نظام، جس نے قوم کی حالت تباہ و برباد کر دی۔ اقبال کی مغرب پر تنقیدیں اور ان کے اثرات دیگر شعراء کے ہاں بھی پائے جاتے ہیں۔

۱۔ دور جدید کے چند منتخب ہندو شعراء، ص ۷۲

۲۔ دور جدید کے چند منتخب ہندو شعراء، ص ۷۳

"مرقع عبرت" کے چند شعر ملاحظہ کیجئے —

جو صاحب تہذیب ہیں اور صاحب جوہر ان میں بھی نہیں قوم کے ہمدرد میسّر
ہے سر میں ہوا حرص کی، دل میں ہوس زر نے فلک کے حامی ہیں نہ ہیں قوم کے رہبر
بس زر کی پرستش انہیں فرض ازلی ہے
بت ہے تو یہی ہے، جو خدا ہے تو یہی ہے
بالعکس یہاں قوم کی ہمت میں ہے پستی وہ مرد کہاں ہیچ سمجھتے ہیں جو ہستی
یہ جوش فقط جہل و تکبر کی ہے مستی اصلاح کے پردے میں ہے بس نفس پرستی
(مرقع عبرت)[1]

اس نظم میں چکبستؔ نے قومی تنزلی، اخلاقی پستی اور نفس پرستی کا جو نقشہ اصلیت اور سادگی سے کھینچا ہے اس کے متعلق صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ یہ کسی خاص مذہب یا فرقہ کے لئے نہیں بلکہ وطن میں رہنے والے ہر شخص کے لئے ایک تازیانہ ہے- جو ترجمانی چکبستؔ کی اس نظم سے ہو رہی ہے وہ قوم کو بیدار کرنے کا جذبہ ہے- چکبستؔ نے تشبیہات و استعارات سے نظم کو مزین کیا ہے- دراصل ان کے استعارے اور تشبیہات، تجربے اور مشاہدات کی عکاسی کرتے ہیں- استعارے کے بارے میں ساحل احمد رقمطراز ہیں:

"شخصی تجربوں سے ماخوذ استعارے، جن سے ایک مخصوص طرز فکر یا حرمت و تہذیب ذریعہ ثابت ہوتی ہیں- تہذیبی و ثقافتی رجحانات و میلانات کی وضع کاری اور دنیوی تبدیلی کا سورج طلوع ہوتا ہے، مکر و جھوٹ اور فریب کاری سے آراستہ پیکروں کی چوراہی خصلت مشتہر ہوتی ہے اور ان کی جگہ نئے پیکروں کی عمل داری شروع ہوتی ہے جو زیادہ موقر اور پرشکوہ ہوتے ہیں، جن سے مطالعۂ فطرت کی نئی راہیں کھلتی ہیں- انسانی تجربہ، دنیوی احساس اور فطرت سے ہم رشتہ ان پیکروں میں جو سچی مشابہت یا رمزیت یا ہنریت ملتی ہیں وہ عصری سچائی اور تجربے سے زیادہ قریب و متصل ہے-"[2]

سیمابؔ اکبرآبادی......۱۸۸۰ء-۱۹۵۲ء:

سیمابؔ کی ولادت آگرہ میں ہوئی- انہوں نے شاعری کی ابتداء غزل سے کی لیکن زور طبع نظموں میں آکر کھلا- اقبالؔ کا شہرہ پورے برصغیر میں تھا- ان کی شاعری سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اخلاقیات، سیاست اور تہذیبی اقدار پر نہایت عمدہ نظمیں لکھیں- وطنیت کے جذبے سے سرشار ہو کر جو نظمیں سیمابؔ نے کہیں ان میں اقبالؔ کی فکر کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں- اقبالؔ کی نظم "مرزا داغ" جو کہ "بانگ درا" میں ہے، اسی طرز کو ملحوظ رکھتے ہوئے سیمابؔ نے بھی داغ پر نظم کہی- اقبالؔ کی

۱- کلیات چکبست، ص ۱۰۱

۲- اقبال اور غزل، ص ۶۸

نظم کا شعر ملاحظہ کیجئے ؎

چل بسا داغ، آہ! میّت اس کی زیب دوش ہے
آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے

سیمابؔ کی نظم مرزا داغ پر بطور نمونہ ؎

بلبل شیریں نوا خود بن کے ملہم آگیا
راز حسن و عاشقی اک بات میں سمجھا گیا
وصل کی تفسیر یوں لکھی کہ سر خوش کر دیا
ہجر کی تصویر وہ کھینچی کہ دل گھبرا گیا
جس کا ہر نغمہ نشاط روح کا پیغام تھا
وہ نواسنج چمن، سارے چمن پر چھا گیا
تشنگی جام و بادہ اب ہے میخانے میں عام
تھا وہ ساقی اور ہی جو میکدے برسا گیا
خاک دہلی ہوں تیری تقدیس پر لاکھوں سلام
تیرا اک ذرّہ ہزاروں بجلیاں چمکا گیا
روح اس کی آج تک صرف بہار و باغ ہے
سینۂ ماہ و گل و لالہ میں اس کا داغ ہے

(مرزا داغ)[1]

نظم ترکیب بند میں ہے۔ سیمابؔ نے اقبال کی سی ترکیبیں وضع کی ہیں۔ اس میں ترکیب اضافت اور عطف سے نئے الفاظ تراشے ہیں مثلاً بلبل شیریں، نواسنج چمن، جام و بادہ، سینۂ ماہ وگل و لالہ۔ ان تراکیب سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیمابؔ نے اسلوب بھی وہی اختیار کیا ہے جس طرز میں اقبال نے نظمیں کہی ہیں "مرزا داغ" میں دونوں کا آہنگ ایک ہے۔

سیمابؔ کی شاعری کا آہنگ اور عنوانات اقبال سے ملتے جلتے ہیں۔ موضوعات و مضامین بھی ایک جیسے ہیں مثلاً سیمابؔ کی نظموں کے عنوانات دیکھئے "سرگزشت" تو اقبال نے "سرگزشت آدم" کے عنوان سے نظم کہی ہے۔ سیمابؔ نے "رسول کائنات" کے عنوان سے نظم کہی تو اقبال نے "حضور رسالت مآبؐ میں" کے عنوان سے ایک نظم "بانگ درا" میں ہے۔ سیمابؔ نے "بساط سیاست" میں بڑے بڑے بین الاقوامی سیاست دانوں کا ذکر کیا ہے تو اقبال نے "لینین خدا کے حضور میں"، "دین و سیاست" اور "سیاست" جیسی نظمیں پہلے ہی کہہ چکے تھے۔ بساط سیاست پر بلکہ پوری شاعری میں اقبال کی ترکیبیں، تشبیہات و استعارات نظر آتے ہیں۔ "لینین خدا کے حضور میں" اقبال کی نظم ہے سیمابؔ کی نظم "بساط سیاست" میں اس کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ سیمابؔ نے تاریخی تلمیحات سے نظم کو آراستہ کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے ؎

مست ہو کر اک نئی انگڑائی لی یونان نے
جنگ کی دیوی کو دیں قربانیاں انسان نے
روم سے آیا جو اک طوفان رود نیل میں
حسن یوسف جاگ اٹھا مصر کی تخئیل میں
غازی ملت نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا
آسماں پر پائے حرّیت اٹھا کر رکھ دیا
جذب وحدت ہوگیا طوفان موّاج صلیب
یعنی کثرت آگئی خود اپنے مرکز کے قریب
عزم سے سرشار نکلے عیش کامان فرانس
چبھ گئی ان کے دلوں میں نازنین پلکوں کی پھانس
مرد بیمار ایک تخئیل گراں میں کھو گیا
موت یہ سمجھی مرا ٹرکی پہ قبضہ ہوگیا
اس نے ثابت کر دیا یہ سب فریب کار ہے
ترک ابھی زندہ ہے، ترکی قوم ابھی بیدار ہے

۱۔ کارامروز، ص ۱۳۸

کرشن کی جس سرزمین سے کی گئی صورت گری — خاک گوتم کی امانت سے جسے تھی برتری
اپنی آزادی کے چرچے جا بجا ہونے لگے — ملک کی وسعت میں پیدا رہنما ہونے لگے
سرزمین روس سے آخر وہ دل پیدا ہوا — جس میں درد انسانیت کا مستقل پیدا ہوا
ایک جسم حریت، اک پیکر ملت نواز — کارواں میں صورت یوسف ہوا جلوہ طراز
سطوت ضحاک و کسریٰ کی دبی چنگاریاں — بزم جمشید و فریدوں کی تعیش کاریاں
جیل کی تنہائی میں نفس آزمائی اس نے کی — ہم غلاموں کے لئے سعی رہائی اس نے کی
ایک قائد اور اٹھا خطۂ پنجاب سے — ناخدا پیدا ہوا اقوام کے گرداب سے

(بساط سیاست)[1]

سیمابؔ کی نظم ''بساط سیاست'' ایک طویل نظم ہے- اس نظم میں ملکی حالات، سیاست کے پیچ، حکمرانوں کے کارنامے اور تہذیب وتمدن کی عکاسی ہمیں ملتی ہے- اس کے علاوہ تراکیب وتلمیحات، جو کہ تاریخی تلمیحات کہلاتی ہیں، کثرت سے استعمال ہوئی ہیں، جو اقبال کا طرۂ امتیاز ہے- ساحل احمد اقبال کی تلمیحات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اقبالؔ نے تلمیحات کو جو دائرو ی حیثیت دی ہے، وہ ان کی تاریخ بینی، متصوفانہ فکر اور دنیوی انہماک کی صحت مند علامت ہیں اور جس طرح انہوں نے وسیع بنیادوں پر ان کے برتنے کا اصول ملحوظ رکھا ہے، وہ ان کی قادرانہ بصیرت اور عالمانہ شعور وآگہی کے مظاہری اوصاف ہیں-''[2]

اقبالؔ کی تلمیحات کی روشنی میں سیمابؔ نے جو اثر قبول کیا ہے، وہ ان کی تاریخی تلمیحات کی عکاسی کرتی ہیں- بساط سیاست میں جو تلمیحات استعمال ہوئی ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

''انگڑائی لی یونان نے'' سکندر اعظم کی طرف اشارہ ہے، ''قیصر روم'' شہنشاہ کا نام ہے، ۱۸۵۹ء میں برلن میں پیدا ہوا، ''غازی ملت'' کی تلمیح حضرت خالد بن ولیدؓ سے اخذ کی ہے، ''طوفان مواج صلیب'' سلطان صلاح الدین ایوبی کی مناسبت سے ہے، ''کامان فرانس'' نپولین کی طرف اشارہ ہے، ''مرد بیمار'' انور پاشا کو کہا گیا ہے ''ترک ابھی زندہ ہے'' مصطفیٰ کمال پاشا کی جرأت اور بہادری کی طرف اشارہ ہے ''کرشن'' ہندوؤں میں بڑا نام، ''خاک گوتم'' ان کا اصل نام سدھارتی تھا، سال ولادت ۵۶۸ ق م ہے- بدھ مذہب کے بانی، ''سی آر داس'' آزادی کا رہنما، ''سرزمین روس'' سے مراد لینین سے ہے جو ۱۸۹۷ء سے اشتراکیت کے پرچار کو اپنا نظریہ قرار دیا، ''بزم جمشید'' ایران کا مشہور بادشاہ، ''جیل کی تنہائی'' حسرتؔ موہانی مراد ہیں، ''ایک قائد'' مولانا ظفر علی خاں کی مناسبت سے ہے- ان تلمیحات اور تراکیب شعری سے یہ انداز ہو جاتا ہے کہ سیمابؔ کی نظموں پر اقبال کے اثرات خاصی حد تک پائے جاتے ہیں-

تلوک چند محرومؔ......۱۸۸۷ء-۱۹۶۵ء:

محرومؔ عیسیٰ خیل گاؤں میں پیدا ہوئے- اصلاحی، اخلاقی اور نیچرل نظمیں کثرت سے کہی ہیں- ان کے ہاں زیادہ تر وہی

۱- کارامروز، ص ۱۳۸

۲- اقبال اور غزل، ص ۱۴۷

عنوانات ملتے ہیں جن پر اقبال پہلے ہی نظمیں کہہ چکے تھے مثلاً اقبال کی نظموں کے عنوانات یہ ہیں: کنار راوی، مرزا غالب، ہلال عید، نوید صبح، صبح کا ستارہ، طفل شیر خوار اور نالۂ یتیم۔

محرومؔ کی نظموں کے عنوانات ملاحظہ کیجئے: کنار راوی، مرزا غالب، ہلال عید، وقت سحر، صبح کے ستارے، بچہ اور فریاد یتیم۔

اقبال کی تشبیہات واستعارات، تراکیب، اسلوب، ہیئت، اور تلمیحات محرومؔ کے ہاں من وعن پائے جاتے ہیں۔فکری اور ذہنی ہم آہنگی سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں کے ہاں منظر نگاری، واقعہ نگاری، اخلاقیات کا درس اور جذبات نگاری منتہائے کمال پر نظر آتی ہے۔سر عبدالقادر نے ''گنج معانی'' کے مقدمہ میں لکھا ہے:

''ایک اور چیز جو ان کے کلام میں پائی جاتی ہے وہ کیفیت غم ہے، بہار ہو یا خزاں، قدرت کے ہر منظر کو دیکھ کر ان کا کوئی نہ کوئی زخم تازہ ہو جاتا ہے۔معلوم ہوتا ہے، قدرت نے درد و گداز طبیعت میں حد سے زیادہ رکھا تھا۔ اس پر بعض ذاتی صدمات ایسے پیش آئے کہ شاعر سراپا درد ہو گیا۔''[1]

علامہ اقبالؔ اور محرومؔ میں جو ایک خاص تعلق تھا وہ دیگر معاصرین سے مختلف ہے کیونکہ یہ اقبال کی شاعری کو بے حد پسند کرتے تھے اور اکثر اپنے بیٹے جگن ناتھ آزاد سے اقبال کی نظمیں سنتے تھے۔محرومؔ، اقبالؔ کے عاشقوں میں سر فہرست تھے۔اس کا اظہار اپنے شعر میں کیا ہے ؎

خوش ہوئے لاہور میں محرومؔ ہم
حضرت اقبال کے دیدار سے

اقبال کی نظم ''کنار وادی'' جو کہ ''بانگ درا'' میں ہے ؎

سکوت شام میں محو سرود ہے راوی
نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی

اقبال کی نظم فطرت نگاری پر ایک معیاری نظم ہے۔محرومؔ کی نظم ''کنار راوی'' ملاحظہ کیجئے ؎

غم دل آفت سماوی ہے زندگی موت کے مساوی ہے
زخم پنہاں جگر پہ حاوی ہے اشک ریزی جگر تراوی ہے
شام غم ہے، کنار راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

ہم کہاں اور سیر باغ کہاں ذوق و شوق و دل و دماغ کہاں
گلشن دہر میں فراغ کہاں چین دیتے ہیں دل کے داغ کہاں
شام غم ہے کنار راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

(کنار راوی)[2]

۱۔ گنج معانی، ص۳

۲۔ گنج معانی، ص۱۷۶

محرومؔ نے نظم میں ترکیب اضافی اور عطف سے کام لیا ہے۔ 'وْ' عطف کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔ اقبال کے ہاں ایسی مثالیں اکثر نظموں میں ملتی ہیں۔ منظر نگاری اور فطرت نگاری کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ نظموں میں روانی اور سادگی ہے۔ محرومؔ کی شاعری کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ تراکیب، صنائع، بدائع، تلمیحات زیادہ تر اقبال سے ماخوذ ہیں۔

اقبالؔ کی نظم ''طفل شیر خوار''، جس میں بچے کی فطرت اور معصومیت کی جو عکاسی کی ہے، اس سے اقبال کے قدرت کلام کا اندازہ ہوتا ہے۔ محرومؔ کی نظم میں بھی یہی تاثر ہے۔ اقبال کا شعر ملاحظہ کیجیے ؎

میں نے چاقو تجھ سے چھینا ہے تو چلاتا ہے تو
مہرباں ہوں میں، مجھے نا مہرباں سمجھا ہے تو

مندرجہ ذیل نظم کی ہیئت بدلی ہوئی ہے لیکن خیالات ایک سے ہیں۔ تراکیب و علامات بھی ایک سی ہیں۔ محرومؔ کی نظم ''بچہ'' ملاحظہ کیجیے ؎

ایک اپنے ساتھ گھر بھر کی خوشی لایا ہے تو — کس وطن کی یاد میں روتا ہوا آیا ہے تو
کون سی دنیائے خنداں یاد آتی ہے تجھے — رونے والے! یاد کس کس کی رلاتی ہے تجھے
کیا کوئی زرّیں جزیرہ چھوڑ کر آیا ہے تو — گلشن فردوس سے منہ موڑ کر آیا ہے تو
ہم کو بھی معلوم ہے، تو ہے مسافر دور کا — مطلقاً اس دیس کی بولی سے ہے ناآشنا

ہاں بتا! وہ سرزمین عافیت تھی کون سی
بستی ہے دل میں ترے دلخواہ بستی کون سی

(بچہ)[۱]

تراکیب شعری ملاحظہ کیجیے جو محروم نے استعمال کی ہیں: ''دنیائے خنداں''، ''زرّیں جزیرہ''، ''گلشن فردوس''، ''سرزمین عافیت''، ''دلخواہ بستی'' یہی وہ صنائع لفظی ہیں جنہیں اقبال نے اپنی فکر اور کاوش سے نئے نئے معنی متعارف کرائے۔ ادبی روایت سے ہٹ کر صنائع سے جو کام لیا گیا ہے۔ اس سے یہ ضرور فائدہ ہوا ہے کہ نئے موضوعات کو متعارف کرانے میں بے حد مدد ملی ہے۔ اقبال کے بعد اور معاصرین میں یہ تبدیلی دیکھی جاسکتی ہے اور یہ تبدیلی مغرب سے منتقل ہوئی کیونکہ علامہ اقبال نے مغرب اور مشرق کے علم سے استفادہ کیا تھا۔

ڈاکٹر ساجد امجد صنائع شعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اوزان و بحور، موضوعات، اصناف اور اسالیب کی طرح آرائش و زیبائی شعر کے لئے بھی اردو شعراء کو کہیں دور جانا نہیں پڑا۔ فارسی میں ایک ترقی یافتہ نظام پہلے سے موجود تھا، صنعت گری کے تمام حربے یہ شعراء پہلے ہی آزما چکے تھے، جن کی مثالیں اہل اردو کے سامنے تھیں۔''[۲]

۱۔ گنج معانی، ص ۱۳۴

۲۔ اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، ص ۱۸۲

تقابلی جائزے کے پیشِ نظر وہ نظم ملاحظہ کیجئے جس میں اقبالؔ اور محرومؔ کے خیالات اور افکار میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ محرومؔ کی نظم ''ہلال عید'' پر اقبال کی نظم ''غرۂ شوال یا ہلال عید'' کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں ؎

غرۂ شوال! اے نور نگاہ روزہ دار
آ کہ تھے تیرے لئے مسلم سراپا انتظار

اب محرومؔ کی نظم ''ہلال عید'' دیکھئے ؎

دیکھو دیکھو! وہ میں نے دیکھ لیا قلعۂ کوہ سے ذرا اونچا
چھپ گیا! چھپ گیا! کہیں دیکھو پھر نظر آئے گا وہیں دیکھو
وہ جو ہے سامنے شجر دیکھو اس سے اوپر اٹھا نظر دیکھو
اے لو! اے لو! وہیں نظر آیا
مژدہ! اے شائقیں نظر آیا

(ہلال عید) [1]

نظم میں عید کے چاند کی خوشی کا جو منظر کھینچا ہے، منظر نگاری میں محرومؔ نے جزویات کو بھی شامل نظم کیا ہے۔ اس نظم کو ترکیب اضافی سے سجایا ہے، جسے اقبال کے اثرات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ محاکات پر یہ ایک اچھی نظم کہی جاسکتی ہے۔

جگت موہن لال رواںؔ......۱۸۸۹ء-۱۹۳۴ء:

رواںؔ موراواں ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے، ہندو شعراء میں جو مقام انہوں نے بنایا ہے۔ وہ ان کی اپنی مشق سخن اور علم و ادب سے ذوق وشوق کا ثمر ہے۔ مشاعرون کے نہایت شوقین تھے، آواز بھی اچھی پائی تھی۔ مزاجاً خوش طبع تھے۔ اصناف میں غزل، رباعی اور نظم میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ رواںؔ کے کلام میں فلسفہ، تازگی، نیا پن، رعنائی خیال، نشاط و غم کی ہم آہنگی اور سوز و گداز کے اثرات جا بجا شاعری میں نظر آتے ہیں۔ امجد حیدرآبادی کی رباعیات کے بعد رواںؔ نے نہایت عمدہ رباعیات کہی ہیں۔ رواںؔ کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت ندرت بیان اور نغمگی ہے۔ تراکیب کے علاوہ رواںؔ نے محاوروں کو بھی برتا ہے۔ محاوروں سے مختلف گوشے شاعری میں اجاگر ہوئے ہیں۔ محاوروں کے بارے میں ساحل احمد نے لکھا ہے:

> ''محاورے کے لئے مشہور ہے کہ پیٹ سے پاؤں نکالتے ہی چل پڑتا ہے۔ اردو غزل گویوں نے ان محاوروں کے توسط سے سماجی مسائل، زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی ہے اور حیوانی محاورہ، نباتاتی محاورہ، خورد ونوشی محاورہ، پوشاکی محاورہ، صنعتی محاورہ، گھریلو محاورہ، تعلیمی محاورہ، مبتذل محاورہ، نسوانی محاورہ، صنفی اور مثلی اور تاریخی مسلوں، حقیقتوں اور وصیتوں کی عقدہ کشائی کی اقبال کے کلام میں نظر آتی ہے۔'' [2]

۱- گنج معانی، ص ۱۸۴

۲- اقبال اور غزل، ص ۱۴۱

اسالیب کے لحاظ سے جو اثرات ہمیں ملتے ہیں وہ اقبال کی سی جرأت رندانہ، جد و جہد اور حرکت والی علامتیں ہیں۔ رواںؔ کی نظم ''لاوارث بچہ'' اور اقبال کی نظم ''عہد طفلی'' ایک آہنگ کا اظہار ہے ؎

تھے دیار نو زمین و آسماں میرے لئے　　وسعت آغوش مادر اک جہاں میرے لئے

(عہد طفلی)

رواںؔ کی نظم ''لاوارث بچہ'' ملاحظہ کیجئے ؎

آہ اے نو وارد بزم رباط روزگار　　آہ اے تازہ اسیر گردش لیل و نہار
آہ اے دیباچۂ شرح کتاب درد دل　　آہ اے عنوان باب اضطراب جانگسل
سچ بتا بچے ترا وارث ترا والی ہے کون　　پھول ہے تو کس چمن کا اور ترا مالی ہے کون
زینت آغوش ہے تو جس کا وہ مادر ہے کون　　نور ہے جس گھر کا تو بچے بتا وہ گھر ہے کون
اختصار طول آزار نہانی سچ بتا　　اے خمار بادۂ جوش جوانی سچ بتا
کیا اڑا لائی کسی گلزار سے تجھ کو ہوا　　پھول ہوتے ہیں جہاں ایسے ہی پیدا خوشنما
یا عناصر میں ہوئی ترتیب پیدا اس قدر　　خود مرکب ہوگئے اور بن گئے شکل بشر

(لاوارث بچہ)

تراکیب دراصل الفاظ، حرف اور مصادر ہی کے ذریعہ تشکیل پاتی ہیں کیونکہ اس میں کسر اضافت اور عطف و ہمزہ کی مدد سے جو ربط خاص پیدا کیا جاتا ہے، اس سے کلام میں حسن اور لطافت پیدا ہو جاتا ہے۔ ''لاوارث بچہ'' میں کسر اضافت کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔ تراکیب و علامات میں اقبال کا کلام اس اعتبار سے انفرادی ہے کہ انہوں نے نئی نئی تراکیب وضع کی ہیں۔ یہ اقبال ہی کے اثرات ہیں جو معاصرین شعراء کی نظموں میں نظر آ رہے ہیں۔ رواںؔ کے کلام کے متعلق عبدالشکور لکھتے ہیں:

> ''رواںؔ کے کلام میں روانی، ترنم، فلسفہ کی آمیزش، سوز گداز اور رنگینی کے نمایاں اثرات جابجا موجود ہیں اور ہمیں ذرا بھی شک نہیں کہ ان کی رباعیات اپنی دلکشی میں آپ اپنی نظیر ہیں۔'' [۱]

رواںؔ نے رباعیات بھی بے شمار لکھی ہیں، جس سے ان کا تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ رباعی نظم میں وہ مشکل صنف ہے جسے صرف اساتذہ اپنے تصرف میں لاتے ہیں کیونکہ رباعی کہنے کے لئے پرمغز ہونا اور تجربہ و مشاہدہ میں طاق ہونا نہایت ضروری ہے۔

رواںؔ کی چند رباعیات ملاحظہ کیجئے جس میں اقبال کی فکر اور ان کی رباعیات کا عکس نظر آتا ہے ؎

ملنا کس کام کا اگر دل نہ ملے　　چلنا بے کار ہے جو منزل نہ ملے
وسط دریا میں غرق ہونا بہتر　　اس سے کہ نظر میں آ کے ساحل نہ ملے

پھولوں سے تمیز خار پیدا کر لیں　　یک رنگی اعتبار پیدا کر لیں
ٹھہرو چلتے ہیں سیر گلشن کو رواںؔ　　پہلے دل میں بہار پیدا کر لیں

۱- دور جدید کے چند منتخب ہندو شعراء، ص ۸۱

اب دشمن جاں ہے کلفت غم ساقی فریاد لبوں پر آگیا دم ساقی
کیا دور نہ ہوگی یہ میری تشنہ لبی میرے مولا میرے مکرم ساقی

انداز جفا بدل کے دیکھو تو سہی پاؤں سے یہ پھول مل کے دیکھو تو سہی
رنگ گلکاری جبین سجدہ اک دن گھر سے نکل کے دیکھو تو سہی

رباعیات میں نشاط غم کی ہم آہنگی کے علاوہ شگفتگی اور دلآویزی پائی جاتی ہے۔ ان رباعیات میں محبوب کی نزاکت کو بڑے تیکھے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔تصوف کی چاشنی بھی ہے اور فطرت کی عکاسی بھی۔ رباعیات کی روشنی میں اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اقبالؔ کی رباعیات سے بھی استفادہ کیا ہے اور وہی رنگ آہنگ اپنایا ہے جو اقبال کا اپنا خاصہ ہے۔ رواںؔ کی رباعیات میں بھی اقبالؔ کی فکر نظر آتی ہے۔ جمالیاتی پہلو کے ساتھ خودی و بے خودی کے رموز واضح طور پر نظر آتے ہیں۔نظموں میں سرمایہ داری اور دانش فرنگ، مذہب و سیاست جیسے موضوعات کو نظم کے پیرائے میں ادا کیا۔ اب رواںؔ کی وہ نظم دیکھئے جس میں انہوں نے اقبال کے آہنگ کو نبھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی نظم بعنوان ''شاعری'' اور اقبالؔ کی نظم ''شاعر'' میں وہی تاثر ملے گا جو رواںؔ کی نظم میں ہے ؎

مرحبا، مشاطۂ، زلف مضامین بلند رہبر راہ خدا ہادی جان درد مند
راز دار ضبط دل اے پردۂ دار راز نفس کاشف اسرار باطن عکس سوز و ساز نفس
اے بہار بے خزاں، اے آفتاب لازوال کر نہیں سکتا تجھے جور زمانہ پائمال
اے نشان رفتگاں اے رنگ خوناب جگر نور قلب باصفا تعبیر جذب پر اثر
اے زبان غیب، اے نیچر کی سچی ترجماں نیر افلاک شہرت یادگار جاوداں
کب ترا معراج کے ہمسر ہے معراج شہی تیرے قدموں پر نچھاور سینکڑوں تاج شہی

(شاعری)

رواںؔ کی تراکیب شعری میں وہی علامتیں وضع ہوئی ہیں جنہیں اقبال نے اپنی نظموں میں متعدد جگہ استعمال کیا ہے۔نظم ''شاعری'' میں رواںؔ نے اپنے کلام کی تعریف کرتے ہوئے ''معراج شاعری'' گردانا ہے اور اپنی زبان کو اہمیت کے ساتھ مستند بھی جانا ہے۔لفظوں کا ظاہر و باطن اور ان کا ادراک ہر ایک پر نہیں کھلتا۔ یہ اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ ان کے ہاں صنائع بدائع کا التزام اقبال کے اسلوب اور اجتہادی فکر سے ملتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب شاعر الفاظ اور ترکیب اور بعد کے شعراء نے تقلید میں نظمیں کہی ہیں، جو اقبال کے اثرات کہے جاتے ہیں۔

سید حامد الفاظ اور تراکیب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''الفاظ اور تراکیب کثرت استعمال سے گھس جاتی ہیں۔ ان میں دم باقی نہیں رہتا۔ جن خیالات، احساسات اور جذبات کو ادا کرنے کے لئے یہ وجود میں آئی تھیں، ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ان ہی کا گلا یہ گھونٹ دیتی ہے۔ لغات کی اس بے حیاتی کا مداوا کوئی بڑا شاعر ہی کرسکتا ہے۔ عمل تجدید و احیاء و تخلیق سے اقبال نے یہی عمل

فرسودہ، واماندہ، مضمحل، نیم مردہ اور بے سدھ الفاظ اور تراکیب کے ساتھ کیا ہے۔ اس کی تضمین بھی اسی پہلو عمل کی رہین منت ہیں۔ اقبال نے تضامین اور تراکیب کو رفعت، وسعت، گہرائی اور نئی معنویت عطا کی ہے۔''[۱]

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی......۱۸٦٦ء-۱۹۵۵ء:

کیفی کی ولادت دہلی میں ہوئی، تعلیم کے ساتھ شعروشاعری کا بھی شوق تھا۔ غزل سے ابتداء کی کئی زبانوں پر عبور تھا۔ اردو زبان سے والہانہ عشق تھا۔ اردو کے علاوہ فارسی، ہندی، انگریزی، عربی زبان میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ غزل ترک کر کے نظم کی طرف آئے۔ بہ اعتبار تصانیف نثر و نظم اشاعت کے لمس سے آشنا ہو چکے ہیں۔ خمخانہء کیفی، پریم ترنگنی، بھارت درپن یہ مجموعۂ کلام نظم میں ہیں۔ اس کے علاوہ نثر میں پریم دیوی، راج دلاری، ڈراما، کیفیہ چراغ ہدایت وغیرہ۔ کیفی نے اردو زبان کی خدمت کے لئے خود کو وقف کر رکھا تھا، اس کا واضح ثبوت ان کا انجمن ترقی ہند سے وابستہ ہونا ہے۔

مسلم شعراء کے علاوہ ہندو شعراء کی نظموں میں بھی اقبالؔ کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں کیونکہ اقبال کی فکر اور خیالات اوج ثریا کے ہمدوش تھے۔ اقبال کی شاعری کے اس افق میں کسی شاعر کا اقبال کے اثرات سے بچ کر نکلنا نہایت مشکل تھا۔ اقبال کے ہاں تشبیہات و استعارات کا استعمال اس کثرت سے ہوا ہے۔ معاصرین میں اقبال کے ہاں اثرات بہ آسانی تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ کیفی کی شاعری کا خاص وصف یہ بھی ہے کہ انہوں نے نظموں میں منظر نگاری اور قومی و ملی شاعری کو اولیت دیتے ہوئے نہایت عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔ ادبی حوالہ سے کیفی کا مزاج شاعرانہ تھا اور یہ انہیں ورثہ میں ملا تھا کیونکہ گھر کا ادبی ماحول اور ملک کی سیاست نے شاعری کی آبیاری کے لئے فطری موضوعات کو ہی نظم میں ادا کیا۔

کیفی کا یہ شعر دیکھئے اقبالؔ کی فکر سے کس قدر قریب ہے ؎

سمجھ کے زیست کو دو روزہ کیوں ہوا مایوس
جہاں ہے تیرے لئے اور تو جہاں کے لئے

کیفی کی شاعری میں اقبالؔ کے اسلوب کا گہرا اثر ہے مثلاً ''بے خودی کی رمزیت''، ''شان دلبری''، ''طالب دیدار''، بت تصویر''، ''گفتگوئے بے زبانی''۔

ان لفظوں سے معنی کے نئے باب کھولے گئے ہیں۔ بے خودی کا اشارہ انسان کے اپنے عرفان کی طرف ہے۔ ''طالب دیدار'' موسیٰ کلیم اللہ کی تلمیح ہے۔ ''بت تصویر'' سومنات کا بت۔ غرض تلمیحات و اشارات اور تراکیب لفظی پر اقبال کے اثرات کیفی کی شاعری پر مرتسم ہوئے ہیں۔ کیفی کے چند شعروں سے اس بات کی تائید ہو جاتی ہے، مثلاً ؎

بے خودی نے محو حیرت کر دیا آپ میں اپنا تماشا ہو گیا
آدمی بت اور بت تصویر ہو گفتگوئے بے زبانی اور ہے
کیا ہوا مرکز ہستی اگر انساں نہ ہوا آبرو خاک ہے، قطرہ کی جو طوفاں نہ ہوا
گل کیا؟ ہے پتے پتے میں اک شان دلبری آنکھیں تمہاری طالب دیدار ہی نہیں

۱- اقبال کا فن، ص ٦٨

ان اشعار کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کیفی کی نظریں اقبال کے کلام کو دیکھ رہی تھیں کیونکہ اقبال کے کلام میں دو چیزیں نہایت اہم ہیں، ایک تو ان کا اسلوب، طرز ادا اور دوسرے افکار و خیالات - کلام میں جو وسعت تہہ در تہہ پہلو ہمیں نظر آتے ہیں، وہی کچھ ہمیں کیفی کی شاعری میں صنائع بدائع کی صورت میں یا پھر تراکیب لفظی کی نوعیت سے شاعری میں نظر آتا ہے- جس طرح اقبال نے غزل کو ایک نیا طرز اور نئی فکر عطا کی، اسی فکری آئینے میں کیفی نے حسن و عشق، چوما چاٹی اور عامیانہ مضامین سے گریز کیا ہے- کیفی کی نظم ''باغ دل'' پر اقبال کی نظم ''تخلیق'' کے جو اثرات نمایاں ہیں، اس میں کیفی نے جو تراکیب وضع کی ہیں ''چشم بینا''، ''بحر عرفاں''، ''عشق حقیقی''، ''تصور اور عمل'' وغیرہ-

اقبال کی نظم ''تخلیق'' دیکھیے ؎

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود | کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے | اس آب جو سے کیے بحر بے کراں پیدا
وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے | جو ہر نفس سے کرے عمر جاوداں پیدا
خودی کی موت سے مشرق کی سرزمینوں میں | ہوا نہ کوئی خدائی کا رازداں پیدا
ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آتی ہے | عجب نہیں ہے کہ ہوں میرے ہم عناں پیدا

(تخلیق) [۱]

کیفی کی نظم میں یہی کیفیات، تراکیب اور اسلوب ہمیں ملتا ہے، جسے ہم اقبال کا رنگ کہتے ہیں-

کیفی کی نظم ''باغ دل'' ملاحظہ کیجئے ؎

طلب سچی خوشی کی ہے تو اس گلزار میں آ کر | رگ گل میں تو موج بحر عرفاں کا تماشا کر
یہ باغ دل ہے اس میں ہے عمل عشق حقیقی کا | نظارہ اس کا جب ہوا پہلے حاصل چشم بینا کر
نہیں گر تاب ہجراں کی تو خواہش وصل کی مت کر | جو ہاتھ آ کر نکل جائے کبھی اس کا نہ پیچھا کر
انانیت نہ ہو تجھ میں تو کیا دھڑکا رقیبوں کا | جو منظور یار اپنا ہو تو غیروں کو اپنا کر
یہ کہہ دنیا تو ہے اک بات میں تو دو نہیں ذاتیں | تصور اور عمل میں اپنے تو یہ رنگ پیدا کر

(باغ دل) [۲]

کیفی اور اقبال میں جو ذہنی ہم آہنگی پائی جاتی ہے، اس کی خاص وجہ اقبال کا فکری اجتہاد ہے، جس سے انہوں نے غزل اور نظم کو اوج ثریا پر پہنچا دیا-

کیفی کے ہاں جو تراکیب استعمال ہوئی ہیں، انہیں اقبال کے اثرات سے تعبیر کریں گے مثلاً انانیت، مستانہ آبشاروں،، والہانہ لنک، حسن جلباب، جہاں گیر ضیاء پاشی، غازہ و عطر، نظر قلب، سہانی لغزشیں، کوہسار کا دل، وہ راگ چشموں کے اور ترانے نہروں کے- کیفی کی نظموں میں اقبال کے تخیل کا یہ رنگ غالب ہے، جس میں منظر کشی، مناظر فطرت اور ڈرامائی اور رزمیہ طرز جھلکتا دکھائی دیتا ہے- جب تک الفاظ میں تنسیخ اور ترتیب کا ہنر شاعر کے پاس نہ ہو، تو شعر میں حسن لطافت مفقود ہو جاتا ہے- شعری لطافت بڑھانے کے لئے روایتی لفظوں ہی سے نئے لفظوں کی ترتیب دینا ہی تراکیب لفظی کا ہنر ہے اور یہ ہنر اقبال کے ہاں بہت

۱- کلیات اقبال، ص ۵۲۷

۲- دور جدید کے چند منتخب ہندو شعراء، ص ۹۷

ہی توانا صورت میں نظر آتا ہے- اقبال کی شاعری ایک ایسا سورج ہے جس کی روشنی سے بقدر ظرف ہر شاعر نے استفادہ کیا- انہی میں سے ایک کیفی ہیں، جو اردو شاعری میں اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں اور ان کی شاعری زندہ رہنے والی شاعری ہے اس لئے کہ کیفی کے لفظوں میں نئے معنی کی بازگشت بھی ہے اور اسلوب کی چاشنی بھی، اس لئے ان کے الفاظ بے ڈھب اور خشکی سے قطعی پاک ہیں-

اقبال اور کیفی میں ذہنی ہم آہنگی کا پایا جانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں مناظر فطرت کے شیدائی ہیں- یوں تو اقبال کے ہاں مناظر فطرت پر نہایت عمدہ نظمیں موجود ہیں- یہ انہی نظموں کا کرشمہ ہے کہ کیفی جیسا شاعر بھی اقبال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا- جبکہ یہ خود بھی نباض وقت تھا، جو ذرّے میں بھی دل دھڑکنے کی صدا سنتا تھا- کیفی کی نظم میں جو کیفیت پائی جاتی ہے اس میں داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں پر بڑی چابکدستی سے اظہار خیال کیا ہے- کیفی کی '' حسن فطرت '' ایک ایسی نظم ہے جس پر اقبال کی فکر ''اختر صبح'' میں ظاہر ہوئی ہے ؎

حسن جلباب عدم سے جو درخشاں نکلا — وجد میں کون و مکاں بے خود و رقصاں نکلا
ہے جہاں گیر ضیا پاشی حسن تکویں — اب تو ارماں ترا عالم امکاں نکلا
حسن فطرت سے ہے انسان کی حسن آرائی — غازی و عطر کا گل بوٹے پہ ساماں نکلا
حسن کا یہ وفور اس کو نہ کہہ دل تنگی — رنگ بھی سینے سے غنچے کے پر افشاں نکلا

ہے گل حسن سے لبریز یہ دنیا کیفی
نظر قلب کا بھی تنگ ہی داماں نکلا

(حسن فطرت) [1]

کیفی کی نظم '' ایک منظر جگ بیتی '' پر اقبال کی نظم '' ہمالہ '' کا پرتو دیکھئے ؎

سہانی لغزشیں مستانہ آبشاروں کی — وہ والہانہ لٹک چال جوئباروں کی
تھیں سبز وادیاں پیروں میں سر پہ اونچے پہاڑ — لدی پھندی ہوئی پھولوں سے جھاڑیاں اور جھاڑ
وہ کہکشاں کی سی پانی کی سبزے میں لہریں — کہ سبز چل پہ تھیں سیماب کی چھٹی لہریں
تھا کوہسار کا دلچسپ یوں نشیب و فراز — کہ جیسے شیر و شکر ہوگئے ہوں ناز و نیاز
وہ راگ چشموں کے اور وہ ترانے نہروں کے — کہ پانی پانی تھے نغمے ہزاروں لہروں کے
وہ جھٹ پٹا بھی انوکھا تھا کوہساروں کا — وہاں تھا ہونے کو اب رت جگا بہاروں کا

(ایک منظر جگ بیتی) [2]

منشی دُرگا سہائے سرور جہان آبادی......۱۸۷۲ء-۱۹۱۰ء:

سرور کی پیدائش ضلع پیلی بھیت کا مشہور قصبہ '' جہان آباد '' میں ہوئی- ان کی مشہور نظم '' مزار دوست '' جو کہ

۱- انتخاب جدید، ص ۲۲۶

۲- انتخاب جدید، ص ۲۲۷

اقبآل کی نظم '' خفتگان خاک سے استفسار '' سے متاثر ہو کر کہی ہے۔اسی طرح ''دعائے سرور'' پر اقبال کی نظم ''التجائے مسافر'' کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔سرور کی نظم ''نظم گل خزاں دیدہ'' میں ''گل پژمردہ'' کا نمایاں اثر ہے۔سرور جہاں آبادی کی نظموں میں قومی وسماجی تقاضوں کی عکاسی کے علاوہ حب الوطنی کا جذبہ بھی ملتا ہے۔نظموں کے عنوانات سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سرور اقبآل کی فکر سے کتنے قریب اور متاثر ہیں مثلاً '' خاک وطن''، ''عروس حب وطن''،''حسرت وطن''،''یاد وطن''۔سرور کی نظم ''بچہ اور ہلال'' میں مکالماتی طرز اپنایا ہے،جس طرح اقبال نے''شمع وشاعر''،''پہاڑ اور گلہری''،''ایک گائے اور بکری'' میں مکالماتی اسلوب اختیار کیا ہے۔سرور کی نظم ''بچہ اور ہلال'' ملاحظہ کیجئے ؎

رنگیں ادا ہیں دونوں، رنگیں جمال دونوں   نورس ثمر ہیں دونوں اور نونہال دونوں

بچے ابھی اگرچہ ہیں خورد سال دونوں   بڑھ کر کریں گے اک دن کسب کمال دونوں

آ مل کے ساتھ کھیلیں، ہم تم ہلال دونوں

تو بڑھ کے بدر ہوگا جس طرح آسماں پر   ڈالے گا اپنی کرنیں اس تیرہ خاک داں پر

میرا شباب یونہی آئے گا عنفواں پر   شفقت کا نور میں برساؤں گا جہاں پر

آ مل کے ساتھ کھیلیں، ہم تم ہلال دونوں

(بچہ اور ہلال) [۱]

تراکیب لفظی کا ہنر سرور نے اقبال سے اخذ کیا ہے مثلاً نورس ثمر، رنگیں جمال، خورد سال، کسب کمال، تیرہ خاک داں، شفقت کا نور۔یہ وہ تراکیب لفظی ہیں جن سے الفاظ اور کلام میں خوبی پیدا ہوتی ہے اور معنوی اعتبار سے بھی کلام میں وسعت نظر آتی ہے۔

سرور کی شاعری میں ہندوستان کی تہذیب وتمدن کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔اخلاقی اور فطری شاعری کے فروغ میں پیش پیش رہے۔ہندوستان کے حسین مناظر پر بھی انہوں نے نہایت عمدہ نظمیں کہی ہیں۔ان میں ''رامائن''،''مہابھارت''،''گنگا جی''،''جمنا جی''،''پدمنی کی چتا'' اور ''پریاگ کا سنگم''۔ان نظموں میں سرور کا حب الوطنی کا جذبہ ابھر کر سامنے آیا ہے۔اقبال کے معاصر کی حیثیت سے اور ان سے متاثر ہو کر ایک نظم ''بیر بہوٹی'' اس نظم میں اقبال کی نظم ''جگنو'' کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔اقبال نے یہ نظم ترکیب بند میں کہی ہے جبکہ سرور نے مسدس ہیئت میں کہی ہے۔خیالات اور طرز ادا دونوں کا ایک سا ہے۔''جگنو'' کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں   یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ   یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

(جگنو) [۲]

سرور کی نظم ''بیر بہوٹی'' ملاحظہ کیجئے ؎

ہے عجب انداز تیرے حسن بے انداز کا   سرخ ڈورا ہے کسی چشم فسوں پرداز کا

قطرۂ مضطر ہے خون کشتگان ناز کا   قلب خون گشتہ ہے مژگاں پر کسی جانباز کا

۱- تعارف تاریخ اردو،ص ۱۵۷

۲- بانگ درا،ص ۸۳

یا شفق کا کوئی ٹکڑا ہے زمیں پہ جلوہ گر
جام زریں میں ہے صہبائے احمر جلوہ گر

گل بداماں ہے شفق میں شعلۂ تنویر حسن   خون عاشق یا زمیں پہ ہے گریباں گر حسن
یا عقیق سرخ کی چھوٹی سی ہے تعمیر حسن   نقش نیرنگ فسوں ہے یا کوئی تصویر حسن

جلوۂ گل ہے فضائے وادی پر خار میں
سرخ تکمہ ہے قبائے سباۂ کہسار میں

وادی پرخار میں اک مجمر سوزاں ہے تو   دامن کہسار میں اک شعلۂ عریاں ہے تو
کشت زار حسن میں اک دانہ، مرجاں ہے تو   یا کسی گلگوں قبا کا گوشۂ داماں ہے تو

ناز ہے صحرا کو تیری شوخی رفتار پر
دوڑتا ہے خوں کا قطرۂ سبزۂ کہسار پر

(بیر بہوٹی)[1]

سرور کی نظم ''بیر بہوٹی'' میں تشبیہات، استعارات، تراکیب لفظی اور معنی کو جس انداز سے برتا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرور نے اپنی نظموں میں اقبال کے اثرات اور فکر کو پیش نظر رکھا ہے۔ سرور کی تشبیہات ملاحظہ فرمایئے: ''سرخ ڈورا'' کہہ کر جادو بھری آنکھ سے تشبیہ دی ہے، ''قطرۂ مضطر'' کہہ کر کسی کے قتل کی طرف اشارہ ہے، ''جام زریں'' جمشید کے جام سے تشبیہ دی ہے۔ ''عقیق سرخ''، ''نقش نیرنگ فسوں'' اور ''سرخ تکمہ'' کی ترکیبیں خالصتاً اقبال کی سی ترکیبیں ہیں۔ اقبال کے صنائع لفظی کے بارے میں سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

> ''اقبال کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے صنائع لفظی و معنی سے اس طرح کام لیا ہے کہ پڑھنے والے کی توجہ مطالب و مفہوم کی طرف رہتی ہے لیکن یوسف حسین خاں کے الفاظ میں صنعتوں کے استعمال سے کلام کی رمزی تاثیر میں اور خیال افروزی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اقبال کے کلام میں کم و بیش تمام صنائع معنوی بڑی ہنرمندی اور چابکدستی سے استعمال ہوئی ہیں لیکن تضاد، حشو ملیح، مراعات النظیر، حسن تعلیل، ایہام، تضاد اور ابہام تناسب سے انہوں نے زیادہ کام لیا ہے کہ ان کی مدد سے معانی کی تمام دلالتیں روشن ہو جاتی ہیں۔''[2]

سرور نے استعارے کی زبان میں ایک نظم ''بھونرے کی بے قراری'' عنوان کے تحت لکھی ہے۔

نہ وہ کیتکی کی چبھن رہی نہ وہ موتیا کی ادا رہی
نہ وہ نسترن کی سمن رہی نہ وہ گل رہے نہ فضا رہی
نہ گلوں کے اب ہیں وہ قہقہے نہ وہ بلبلوں کے ہیں چہچہے
نہ وہ سرور ہے نہ وہ آب جو نہ وہ ہم صفیر ہیں خوش گلو

۱- دور جدید کے چند منتخب ہندو شعراء، ص ۶۰

۲- شعر اقبال، ص ۵۶۸

نہ وہ صبح کی ہیں تجلیاں نہ شفق کی آہ وہ جھلکیاں
نہ وہ اودی اودی ہیں بدلیاں
نہ وہ بھینی بھینی ہوا رہی

(بھونرے کی بے قراری) [1]

سرور کی اس نظم میں ہندوستان کی تنزلی کی طرف اشارہ ہے۔ خاص طور پر دلی کے اجڑنے کی داستان، جس سے بے چینی کی فضا عام ہوگئی، ہر شخص اپنی جگہ مظلوم دکھائی دیتا تھا۔

علی حیدر نظم طباطبائی......۱۸۵۳ء-۱۹۳۳ء:

نظم طباطبائی لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ شاعری میں ایک ایسا اسلوب اختیار کیا جو صرف انہی سے مخصوص ہے مثلاً حضور اکرمؐ کی حیات طیبہ پر جس خوبصورت انداز سے قصیدے میں تشبیب کی بنیاد رکھی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔قصیدے میں نئے افکار اور جدتیں پیدا کیں، اس کے علاوہ اخلاقی نظمیں ''ساقی نامہ شقشقیہ'' اس میں قوم کی محبت اور مذہبی عقائد کا پتا چلتا ہے۔نظم میں نئی طرز اور نئے فکری میلانات اور عصری گونج سے شاعری میں ایک نیا باب کھولا۔نظم ''گور غریباں''، ''گرے کی ایلجی'' کا ترجمہ ہے۔ اس نظم میں اقبال کے اسلوب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ جدت اور مضامین کی وسعت سے پتا چلتا ہے کہ یہ نظم آگے چل کر اردو اسٹیزا کہلائی۔ بحر کیف ''گور غریباں'' ایک مثالی نظم ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں، اقبال کی نظم ''گورستان شاہی'' کے اثرات اور تراکیب واضح نظر آتی ہیں۔

اندھیرا چھا گیا دنیا نظر سے چھپتی جاتی ہے
جدھر دیکھو اٹھا کر آنکھ ادھر اک ہو کا عالم ہے
مگس لیکن کسی جا بھیر وہیں بے وقت گاتی ہے
جرس کی دور سے آواز آتی ہے کبھی پیہم
خدا جانے تھے ان لوگوں میں کیا کیا جوہر قابل
خدا معلوم ہوں گے بازوئے زور آزما کیسے
خدا ہی کو خبر ہے کیسے کیسے ہوں گے صاحب دل
خدا معلوم ہوں گے بازوئے زور آزما کیسے
یہ صاحب عزم میں گو رزم کی نوبت نہیں آتی
حکومت اپنے قریہ میں کی لیکن دوست دشمن پر
وہ فردوسی یہ ہیں جن کی زباں کھلنے نہیں پاتی
وہ رستم ہیں نہیں سہراب کا خون جن کی گردن پر

(گور غریباں) [2]

''گور غریباں'' میں مسلمانوں کے طرز حکومت اور ہندوستان کی شان وشوکت کو یاد کرتے ہوئے مناظر فطری اور تاریخی تلمیحات سے یہ بات واضح کرنا چاہتے ہیں کہ کیسے کیسے لوگ اس سرزمین پر حکومت کر گئے اور کیا اعلیٰ کردار کے حامل تھے۔تشبیہات اور تلمیحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظم نے ان نقوش کو بھی اجاگر کیا ہے، جو پردہ اخفا میں تھے۔ چند تشبیہات اور تلمیحات ملاحظہ کیجئے ''صاحب دل''، جوہر قابل مسلمان حکمرانوں کی طرف اشارہ ہے،''فردوسی'' ایران کا مشہور زمانہ شاعر جس نے شاہنامہ لکھا، اس میں ایران کی مکمل تاریخ ہے۔''رستم وسہراب'' باپ اور بیٹا، ان کا تعلق ایران سے تھا۔

۱۔ انتخاب جدید، ص ۱۵۸

۲۔ انتخاب جدید، ص ۲۴۷

نظم طباطبائی نے محاوروں کو جس سلیقے سے برتا ہے[1] وہ طرز انہی سے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ روانی اور برجستگی نے نظموں کو اور بھی خوبصورت بنا دیا ہے۔ الفاظ کا انتخاب اور صنائع لفظی و معنوی نے بھی ایک حسن مرقع بنا دیا ہے۔ اس عمل سے نظموں میں ایک دلکش ترنم پیدا ہو گیا ہے۔ پیروی اقبال میں تشبیہات و استعارات سے جو کام لیا ہے وہ ندرت اور شگفتگی کا آئینہ دار ہے۔ طباطبائی نے ''طلوع آفتاب'' میں وہی تراکیب وضع کی ہیں، جو اقبال نے ''آفتاب صبح'' میں استعمال کی ہیں۔ نظم طباطبائی کی نظم فطرت نگاری پر ایک اچھی نظم ہے۔ نظم طباطبائی محاکات کا بے حد خیال کرتے ہیں۔ تصویر کشی اور منظر نگاری اس خوبی سے کرتے ہیں کہ منظر آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔ اس کی مثال ان کی نظم جسے قومی نظم کہتے ہیں ''خطاب بہ اہل اسلام'' قوم کی اصلاح کے لئے لکھی گئی۔ اقبال کی نظم کے بھی وہی تیور ہیں اور عنوان بھی ایک جیسے ہیں۔ بانگ درا کی نظم ''خطاب بہ جوانان اسلام'' رنگ و آہنگ ایک جیسا نظر آتا ہے مثلاً عنوانات دیکھیے، ''برسات کی فصل''، ''بے ثباتی دنیا''، ''پھول'' اور ''آہ سرد'' ان نظموں میں اقبال کے افکار بہ آسانی تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ ان جمالیاتی پیکروں میں اقبال کی روشن خیالی بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔ شکیل الرحمٰن، اقبال کے جمالیاتی پیکروں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اقبال کے کلام میں جمالیاتی پیکروں کی ایک صورت تو یہ ہے کہ وہ روشن، تابناک اور تاب کار کائناتی اور زمینی صورتوں کو دیکھتے ہیں، ان کا پورا شعور ان کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ ان روشن، تابناک اور تاب کار کائنات صورتوں کے اثرات ان پر ہوتے ہیں۔ ان سے ایک ذہنی فضا بنتی ہے۔ ان کے کلام میں ''امیج'' کا شعور نمایاں ہوتا ہے۔ ''بانگ درا'' میں ایسی کئی نظمیں ہیں جن میں جمالیاتی پیکروں کی یہ صورت موجود ہے۔ آفتاب، ستارے، ابر کہسار اور جگنو وغیرہ سے جہاں وہ مخاطب ہیں وہاں روشنی کے پیکر اسی انداز سے سامنے آتے ہیں۔ پیکروں سے ایک ذہنی رشتہ اور ایک جذباتی تعلق قائم ہے۔'' [2]

نظم طباطبائی نے قصیدے بھی بڑے جاندار کہے ہیں۔ قصیدوں میں زیادہ تر اخلاقی مضامین باندھے ہیں۔ ان قصیدوں کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ ان میں تلمیحات کی کثرت پائی جاتی ہے۔ نظموں اور قصیدوں میں فلسفیانہ رنگ بھی نمایاں ہے۔ قصیدے کی تشبیب میں صبح کا منظر کس خوبصورتی سے نظم کیا ہے، ملاحظہ کیجیے ؎

ہے پیر فلک کے ہاتھ میں جام شراب ۔۔۔ یا کوزۂ مشرق میں ہے یاقوت مذاب
یا کھا کے ہوائے صبح پھولا ہے گلاب ۔۔۔ یا چہرے سے خورشید نے الٹی ہے نقاب
ظلمت میں نظر آئی سپیدہ کی لکیر ۔۔۔ پھر پھیل گئی سارے افق پر تنویر
کیا نہر سے بے ستون کی چھلکا ہے یہ شیر ۔۔۔ یا چاہ سے نکلا ہے اچھل کر سیماب

۱۔ نظم کئی کتابوں کے مصنف ہیں، ان میں ''شرح دیوان غالب''، ''صوت تغزل''، ''شرح امراء القیس'' جیسی وقیع کتابیں اردو ادب میں گراں بہا اضافہ ہیں۔ اس کے علاوہ نظم نے جو ترجمے کئے ہیں، وہ اپنی نوعیت کی عمدہ نظمیں ہیں۔ جیسے اقبال نے مغربی شعراء کی نظموں کے ترجمے کئے ہیں مثلاً ''ہمدردی'' یہ نظم ولیم کوپر کی نظم سے ماخوذ ہے۔ ''رخصت اے بزم جہاں'' یہ نظم ایمرسن کی نظم سے ماخوذ ہے۔ اقبال کی متعدد نظمیں جو ترجمہ کی گئی ہیں۔ ان نظموں پر طبعزاد ہونے کا گماں ہوتا ہے۔

۲۔ اقبال کا فن، ص ۲۹۰

''کوزۂ مشرق'' کیا خوبصورت ترکیب ہے- پیر فلک کہہ کر جام شراب کا استعمال نہایت عمدہ ہے- ظلمت میں روشنی کا ظہور اور رفتہ رفتہ پورے عالم پر اس کی کرنوں کا پھیلنا- طلوع آفتاب کے نکلنے کو سیماب سے تشبیہ دینا، یہ وہ انوکھی تشبیہ ہے جسے تصویر کاری ہی کہا جا سکتا ہے-

نظم نے ''قصیدۂ احزاب'' میں بھی ایسی تشبیب باندھی ہے جسے ہم منظر کشی کا اعلیٰ نمونہ کہہ سکتے ہیں- اقبال کی نظموں میں یہ انداز ''بال جبریل'' میں ''ساقی نامہ'' میں دیکھا جا سکتا ہے- ''ساقی نامہ'' کی ابتداء بہاریہ سے ہے- اقبال کا یہی وہ تصورِ فن ہے جسے وحید اختر نے یوں بیان کیا ہے:

> ''فن کا یہ تصور اقبال کے فلسفۂ حیات کا منطقی نتیجہ ہے- وہ کائنات کو حرکی ارتقاء اور مسلسل تخلیقی عمل مانتے ہیں- زماں کائنات کی اسی تخلیقی قوت کا مظہر ہے جو انائے مطلق کے ارادے کا اظہار ہے- مکاں بھی اسی کا اظہار ہے- انسان اپنی اصل میں خدا کی صفت تخلیق کا مظہر ہے- نہ کائنات میں میکانکی جبر ہے، نہ انسان کے ارادہ وعمل میں ارتقاء تخلیقی یا نجاتی ہے- میکانکی نہیں- انساں زمان اور ارتقاء کے عمل میں شریک فاعل ہے- وہ آزاد ہے، خلاق ہے اور اپنی خودی کے اثبات ونشوونما کے وسیلے سے نفس لامحدود سے رشتہ قائم کرتا ہے- جو عینیت نہیں مگر اسے اپنی تقدیر کا معمار بنا دیتا ہے اور ابدیت سے ہمکنار کرتا ہے-'' [۱]

احمد علی شوقؔ قدوائی......۱۸۵۳ء-۱۹۲۸ء:

شوقؔ قدوائی قصبہ جگور ضلع بارہ بنکوی میں پیدا ہوئے- ان کی نظموں میں بڑی جان ہے- کہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کی نظمیں پڑھ رہے ہیں- ان کی نظم ''لیل ونہار'' جو کہ مسدس میں ہے، ''شکوہ اور جواب شکوہ'' کے اثرات نمایاں ہیں- ایک بند ملاحظہ کیجئے ؎

ضعف ہے دل کو جگر کو جان کو اک روگ ہے   ایشیائی شاعری انسان کو اک روگ ہے
کعبے کو اک روگ ہے ایمان کو اک روگ ہے   دین کو پیغمبروں کی شان کو اک روگ ہے
عقل سے ہٹ کے کوسوں جا پڑا شاعر بنا
جو بڑا جھوٹا بنا گو بڑا شاعر بنا

(مسدس لیل ونہار)

قدیم اور کلاسیکی شاعری کے بارے میں شوقؔ نے جس خوبصورت انداز میں تنقید کی ہے، ایسی شاعری جو فائدہ نہ پہنچائے اور جس کا کوئی حاصل نہیں، ترک کر دینا زیادہ اچھا ہے- اقبال کی شاعری میں ہمیں جو پیغام ملتا ہے، یہ وہی اثرات ہیں جو شوقؔ کی نظموں میں ظاہر ہوئے ہیں- قدیم طرز کی شاعری سے اقبال نے بھی اجتناب برتا ہے- نئے آہنگ اور نئی تراکیب سے الفاظ کو استعمال کر کے شاعری کی بطن میں ایک نئی روح پھونک دی- اس عمل سے معاصر شعراء پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں، وہ ان کے کلام

۱- اقبال کا فن، ص ۲۲۲

سے ظاہر ہے۔شوق کی نظم ''اکل حلال'' جس میں مذہبی رنگ، خیالات کی پاکیزگی اور الفاظ کا انتخاب ان کیفیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اقبال کی نظم ''سرود حلال'' جو ضرب کلیم میں ہے، اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ دو شعر اقبال کے ملاحظہ کیجیے ؎

کھل تو جاتا ہے مغنّی کے بم و زیر سے دل
نہ رہا زندہ و پائندہ تو کیا دل کی کشود

ہے ابھی سینۂ افلاک میں پنہاں وہ نوا
جس کی گرمی سے پگھل جائے ستاروں کا وجود

(سرود حلال) [۱]

بطور نمونہ شوق کی نظم ''اکل حلال'' ملاحظہ کیجیے ؎

نکلے ابراہیم ادہم طالب اکل حلال
چھان ڈالا سب عراق آیا نہ ہاتھ ان کو کہیں

پھرتے پھرتے ہوگئے وہ جب وہاں سے نا امید
تب گئے طرطوس کو دلکش تھی جس کی سرزمیں

دس درہم طے پا گئی تنخواہ ان کو ماہوار
باغبانوں میں وہ نوکر ہوگئے آخر وہیں

باغ کے مالک نے مانگا ایک دن شیریں انار
توڑ لائے وہ ترش تو جھڑکیاں خوب ان کو دیں

پھر انہیں بھیجا کہ لاؤ اب کے شیریں ڈھونڈھ کے
لائے تو پھر بھی ترش، پا کر ہوا وہ خشمگیں

تب دیا ان کو یہ ابراہیم ادہم نے جواب
میں تو میوں کو رکھاتا ہوں فقط کھاتا نہیں

(اکل حلال)

اس نظم میں ابراہیم ادہم تلمیح کے طور پر آیا ہے، یہ بلخ کے بادشاہ تھے۔ بادشاہت چھوڑ کر فقیری اختیار کر لی تھی۔ طرطوس جگہ کا نام ہے، اسی شہر کی مناسبت سے نظام طرطوسی مشہور شخصیت تھے۔ نظم میں اکل حلال کو موضوع بنا کر اس کی افادیت پر زور دیا ہے اور جو خیال افروزی شعروں سے جھلک رہی ہے، اسی طرح اقبال کی نظموں میں خیال افروزی کو اہمیت دی گئی ہے۔ سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

> ''بالفاظ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ خیال افروزی شعر کی وہ صفت خاص ہے جس سے کام لے کر شاعر گنتی کے الفاظ میں کبھی ان کی صوتی ہم آہنگی سے، کبھی ان کے معنوی ربط سے، کبھی ان دونوں کے امتزاج سے، کبھی دوسرے تلازموں سے کام لے کر ایسی رمزی اور ایمائی کیفیتیں پیدا کر دیتا ہے جن کی دلالتیں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ جو معانی الفاظ سے مترشح نہیں ہوتے، پڑھنے والا ان کی جھلک بھی ان رمزی اور ایمائی کیفیتوں کے ذریعہ دیکھتا ہے۔ شعر کے الفاظ کی ترتیب، ان کا اتار چڑھاؤ اور ان کے تلازمے سننے والے کے خیال پر یوں اثر انداز ہوتے ہیں کہ وہ اپنے ذوق سلیم سے مدد لے کر اور اپنے ہنگامی تاثرات کی رہنمائی میں نئی منزلوں کی طرف چل نکلتا ہے۔ الفاظ بہت پیچھے رہ جاتے ہیں، معانی بہت آگے نکل جاتے ہیں۔'' [۲]

شوق کی نظم ''برسات اور بہار'' بہت ہی عمدہ نظم ہے۔ شوق سے پہلے آزاد نے مثنوی ہئیت میں نظم برسات لکھی، جو انجمن پنجاب

۱۔ ضرب کلیم، ص ۱۲۴

۲۔ شعر اقبال، ص ۵۹۹

کے جلسے میں پڑھی گئی- اسی جلسے میں حالی نے ''برکھارت'' نظم پڑھی- اقبال نے ''ابر کہسار'' کے عنوان سے نظم لکھی- لیکن شوق کی نظم میں اقبال کی فکر اور منظر کشی نمایاں ہے- ''ابر کہسار'' کا ایک بند ملاحظہ کیجئے ؎

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا — ابر کہسار ہوں گل پاش ہے دامن میرا
کبھی صحرا کبھی گلزار ہے مسکن میرا — شہر و ویرانہ میرا، بحر مرا بن میرا
کسی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھ کو
سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو

(ابر کہسار)[1]

شوق کی نظم ''برسات اور بہار'' دیکھیے ؎

ہو چلے تالاب لبریز اور نہریں بھر چلیں — ندیاں اپنی حدوں سے بڑھ کے قبضہ کر چلیں
پیچ و خم کے ساتھ بہنے سے کھلا مستی کا حال — ندیاں چلتی ہیں میدانوں میں متوالوں کی چال
کس لئے غصے کی حالت ان پہ طاری ہوگئی — کف لبوں پر آگیا آواز بھاری ہوگئی
کیوں بھنور چکر میں ہیں، موجوں کو کیوں ہے پیچ وتاب — کیوں غضب کے جوش میں آنکھیں دکھاتے ہیں جناب
مفت پا کر، کی زمیں نے ابر کی دولت تلف — کس قدر پگھلی ہوئی چاندی بہائی ہر طرف
ندیوں کو لے کے یوں دریا سمندر سے ملے
لے کے ارمانوں کو عاشق جیسے دلبر سے ملے

(برسات اور بہار)

اس نظم کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ شوق نے منظر کشی نہایت عمدہ طریقہ سے کی ہے- فطری عکاسی کے ساتھ ساتھ جمالیاتی رنگ کو بھی اپنایا ہے- تراکیب سازی اور تشبیہات واستعارات سے بھی کام لیا ہے- اس اسلوب سے محاکاتی رنگ واضح ہوا ہے- محاکات دراصل وہ منظر کشی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم یہ منظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں- اقبال کے یہی وہ اثرات ہیں جو شوق کی نظموں میں دیکھے جاسکتے ہیں- شوق کی شاعری پر عبدالقادر سروری کے تاثرات ملاحظہ کیجئے:

> ''شوق کی شاعری میں خاصا تنوع ہے- ان کے موضوع شاعرانہ اور علمی دونوں تھے- ''حسن''، ''بہار'' اور ''ہندوستان کی برسات'' کی نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ جس طرح جذبات کی صورت کشی پر شوق کو قابو حاصل تھا، اسی طرح منظر اور سماں پر بھی وہ کامیابی سے قلم اٹھا سکتے تھے-''[2]

شوق کی نظم ''حسن'' اور اقبال کی نظم ''جلوۂ حسن'' میں کس قدر مماثلت ہے- دونوں نظمیں ترکیب بند میں کہی گئی ہیں- اقبال کی

۱- بانگ درا، ص ۱۱

۲- جدید اردو شاعری، ص ۱۳۶

نظم کے دو شعر ملاحظہ کیجئے، جو ''بانگ درا'' میں ہیں ؂

جلوۂ حسن کہ ہے جس سے تمنا بے تاب　　پالتا ہے جسے آغوش تخیل میں شباب
ابدی بنتا ہے یہ عالم فانی جس سے　　ایک افسانۂ رنگیں ہے جوانی جس سے

(جلوۂ حسن) [۱]

اب شوق کی نظم حسن ملاحظہ کیجئے ؂

اللہ رے حسن! تیرے نیرنگ　　تو جس میں ہو، لاتی ہے وہ شئے رنگ
گلشن کی ہوا، پیام ترا　　پھولوں میں بہار نام ترا
پردے سے خزاں کے تنگ ہو کر　　باہر نکلا جو رنگ ہو کر
کی تو نے لگا کے ہر طرف گشت　　گلکاری صحن و گلشن و دشت
سبزی، سبزے کی خوب تجھ سے　　رنگت پاتی ہے دوب تجھ سے
دھانوں میں ترا لباس دھانی　　ایسی پھولے تو آسمانی

(حُسن)

رنگ و آہنگ کے اعتبار سے اور ہیئت کے اعتبار سے دونوں نظموں کا مزاج ایک جیسا ہے۔ اس نظم میں اقبال کے اثرات جو دیکھے جاسکتے ہیں، وہ یہ ہیں، تراکیب عطف سے لفظوں کو ملا کر جو شعری حسن میں اضافہ کیا ہے مثلاً ''گلکاری صحن و گلشن و دشت''، ''و'' عطف ہے اور اس ترکیب سے اقبال کی فکر اور اجتہاد ظاہر ہو رہا ہے۔ صفت تضاد سے بھی کام لے کر شعر کو خوبصورت بنا دیا۔ شوق کی یہ نظم بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہے۔

مولوی وحید الدین سلیم......۱۸۶۹ء۔ ۱۹۲۷ء:

سلیم پانی پت میں پیدا ہوئے۔ جدید طرز پر جو نظمیں انہوں نے کہی ہیں، وہ ان کی طبیعت اور مزاج کے مطابق ہیں۔ نظموں میں ایک رنگینی پائی جاتی ہے۔ ''افکار سلیم'' میں جذبات و خیالات کے اعلیٰ نمونے نظر آتے ہیں۔ فطرت نگاری، منظر نگاری اور مرقع سازی میں کمال رکھتے تھے۔ ان کی ایک نظم ''آریوں کی پہلی آمد ہندوستان میں'' اقبال کی نظم ''موج دریا'' جو ''بانگ درا'' میں ہے، ایک ہی سے تیور نظر آتے ہیں۔ ''موج دریا'' مسدس ہیئت میں ہے ؂

مضطرب رکھتا ہے میرا دل بے تاب مجھے　　عین ہستی ہے تڑپ صورت سیماب مجھے
موج ہے نام مرا، بحر ہے پایاب مجھے　　ہو نہ زنجیر کبھی حلقۂ گرداب مجھے
آب میں مثل ہوا جاتا ہے توسن میرا
خار ماہی سے نہ اٹکا کبھی دامن میرا

(موج دریا) [۲]

۱۔ بانگ درا، ص ۱۳۵

۲۔ بانگ درا، ص ۵۵

سلیمؔ کی نظم ملاحظہ کیجئے ؎

وہ دیکھ کہ موجیں رقص کناں ہیں سطح زمیں پر گنگا کی
نو وارد آریہ حیرت میں ہیں دیکھ کے شان اس دریا کی
گنگو تری آتی ہے چلی اٹھکھلیاں کرتی دھار اس کی
آزادی ہے تیور سے عیاں، متوالی ہے رفتار اس کی
اتر کی طرف جب اٹھتی ہے اس قافلۂ مغرب کی نظر
پڑتی ہوئی کرنیں سورج کی، ہیں دیکھتے برف کے تودوں پر
برکلۂ کوہ ہمالیہ پر، عظمت کے بادل چھائے ہوئے
سینوں کو ہیں تانے دیو کھڑے، امبر سے سروں کو ملائے ہوئے

(آریوں کی پہلی آمد ہندوستان میں)[1]

اس نظم میں ہندوستان کی خوبصورتی کو منظر نگاری کے ذریعہ اجاگر کیا ہے۔ تشبیہات واستعارات اور علامات سے آزادی کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ موجیں رقص کناں تشبیہہ ہے ہندوستان کے رہنے والوں سے ''قافلۂ مغرب''، تلمیح ہے۔ یعنی انگریز، ''کوہ ہمالہ'' ہمالہ کی عظمت پر اقبال نے پہلے ''بانگ درا'' میں نظم کہہ رکھی ہے، جو اپنی نوعیت کی مثالی نظم ہے۔ سلیمؔ نے اپنی نظم میں ہندی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ سلیمؔ کی نظم ''زندگی'' اور اقبال کی نظم ''انسان اور بزم قدرت'' میں مماثلت دیکھئے ؎

صبح خورشید درخشاں کو جو دیکھا میں نے ؎ بزم معمورۂ ہستی سے یہ پوچھا میں نے
پرتو مہر کے دم سے ہے اجالا تیرا ؎ سیم سیال ہے پانی ترے دریاؤں کا

(انسان اور بزم قدرت)[2]

سلیمؔ کی نظم ''زندگی'' ملاحظہ کیجئے ؎

ذرّے ذرّے میں دواں، روح رواں پاتا ہوں میں ؎ زندگی کو ایک بحر بیکراں پاتا ہوں میں
غنچہ غنچہ نطق پر آمادہ آتا ہے نظر ؎ پتے پتے کی زباں کو نغمہ خواں پاتا ہوں میں
زندہ ہستی کی خبر دیتی ہے رفتار نفس ؎ بوئے گل کو زندگی کا ترجماں پاتا ہوں میں
برق کو جنبش ہو یا باد صبا کا ہو خرام ؎ زندگی کا ہر تموج میں نشاں پاتا ہوں میں
الغرض سمجھے ہو جن کو موت کی بربادیاں! ؎ زندگی کے انقلاب ان میں نہاں پاتا ہوں میں

(زندگی)[3]

نظم ''زندگی''، صنائع بدائع کے لحاظ سے تراکیب سازی کی گئی ہے۔ کائنات کی ہر شئے کا عمیق مشاہدہ اور اپنے خاص اسلوب

۱- انتخاب جدید، ص ۱۵۱

۲- بانگ درا، ص ۴۵

۳- انتخاب جدید، ص ۱۵۴

سے نظم کو نئے آہنگ میں ڈھالا ہے۔ اقبال کے عکس نظم میں کچھ اس طرح واضح ہوئے ہیں جیسے زندگی کو بحر بیکراں سے تشبیہ دینا۔ ''رفتار بس''، ترکیب لفظی ہے۔ بوئے گل، ''زندگی کا ہر تموج'' سلیم نے زندگی کو کئی زاویے سے دیکھا ہے۔ ان کی اس محسوسات کو اقبال کا اثر ہی کہہ سکتے ہیں۔

سلیم کی شاعری میں فکر و فلسفہ کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ اس میں اقبال کے فلسفے اور فکر کو بھی بڑا دخل ہے۔ غزل اور قصیدے سے ہٹ کر نظموں میں جو غور و خوض ہمیں نظر آتا ہے۔ اس میں انہوں نے فلسفہ سے کام لیتے ہوئے ایسی نظمیں تخلیق کی ہیں جو اقبال کی فکر کا ثمر ہیں۔ عبدالقادر سروری نے لکھا ہے کہ ''اس حقیقت کے مشاہدے سے شاعر فلسفیانہ غور و فکر میں پڑ جاتا ہے۔ یہی اقبال کی شاعری کا بھی مخصوص وصف ہے۔'' سلیم کے چند شعر فلسفیانہ، جس پر اقبال کی فکر اور فلسفہ کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔ اقبال کی نظم ''شعاعِ آفتاب'' کے اثرات سلیم کی نظم میں ملاحظہ کیجئے ؎

کیا فیضِ الٰہی کی کرنیں پڑتی نہیں مجھ پر شام و سحر
کیا موجِ نسیمِ رحمتِ حق چلتی نہیں مجھ پر آٹھ پہر
پھر کیا ہے کہ نیم کا جوشِ نمو پاتا نہیں اپنے سینے میں
دل مردہ ہے افسردہ ہے، مشغول نہیں رس پینے میں
محروم ہے فیض سے دل میرا فیضان میں تم غرقاب رہو
اے نیم کے متوالے چتو! سرسبز رہو شاداب رہو

یہ اقبال کی دین تھی کہ سلیم کے ہاں بھی تعمق کے گہرے سلسلے ملتے ہیں۔ تشبیہات اور استعاروں سے نظموں میں ایک ترنم اور فکری عنصر پایا جاتا ہے۔ فطرت نگاری اور فلسفۂ حیات پر اقبال نے جس انداز سے نظمیں کہی ہیں، اس سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ ان کا فکری پھیلاؤ زیادہ ہے۔ اس لئے سلیم کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان کے خیالات میں وسعت اور فکر میں رفعت اس درجہ پائی جاتی ہے، جہاں دیگر معاصرین کی فکر کا زاویہ مختلف ہے۔ اس لئے سلیم کی شاعری کو کائنات اور زندگی کی شاعری کہا جا سکتا ہے۔ چند شعر سلیم کے ملاحظہ ہوں ؎

ہے مرے جذبات کا ہنگامہ برپا دہر میں
ظالم و جاہل ہوں، لیکن رونقِ محفل ہوں میں
فلسفہ نے میری ہستی پر نظر ڈالی مگر
حل نہ ہوگی جو کسی صورت سے وہ مشکل ہوں میں
دشت میں کرتا ہے خود ابرِ کرم میری تلاش
ناز ہے مجھ کو ایسا تشنہ لب ساحل ہوں میں

آنند نرائن ملّا......۱۹۰۱ء:

ملّا کی شاعری دراصل وہ مجموعہ ہے جس میں انیس، غالب، اقبال اور چکبست کے افکار و خیالات گردش کرتے نظر آتے ہیں۔

ابتداء میں انہوں نے ان شعراء کے رنگ کو اپنانے میں جونمایاں کردارادا کیا ہے، وہ یہ کہ حب وطن، انسان دوستی اور مناظر فطرت کو شاعری کا موضوع بنایا- ملاّ کی غزلوں میں بھی ایک متانت اور سنجیدگی ہے- یہی حال ان کی نظموں کا ہے- ان کا مجموعۂ کلام ''جوئے شیر'' میں اقبال کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں- سب سے زیادہ قابل تعریف بات یہ ہے کہ ملاّ کا حافظہ اس قدر قوی تھا کہ جو غزل اور نظم کہتے ذہن میں محفوظ رہتی- آنند نرائن ملاّ رسالہ ''نگار'' میں اپنا ایک واقعہ قلم بند کرتے ہیں، ملاحظہ کیجئے:

> ۱۹۲۷ء میں میری صحت کچھ خراب ہوگئی اور ڈاکٹروں نے ایک مہینہ تک بستر پر لٹا رکھا- کوئی ایسی بیماری نہ تھی کہ میں اور کام نہ کرسکوں صرف شام کو حرارت ہو جاتی تھی- پڑے پڑے جی گھبراتا تھا تو زیادہ تر وقت کتابیں پڑھنے میں صرف ہوتا تھا- اسی زمانہ میں میں نے اقبال کے فارسی کلام کا مجموعہ جو''پیام مشرق'' کے نام سے شائع ہوا تھا، پڑھا- اس کی پہلی نظم ''لالۂ طور'' پڑھی...... یہ نظم اس قدر زیادہ پسند آئی کہ میں نے پڑے پڑے قریب ۱۰۰ قطعات کا انگریزی میں ترجمہ کر ڈالا، جب میرے احباب نے یہ ترجمہ دیکھا تو انہوں نے اسے بے انتہا پسند کیا-''[۱]

ملاّ کے اس اقتباس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ انہیں اقبال کی شاعری سے کس قدر عشق تھا- اس لئے ان کی نظموں میں ایک ایسا تاثر ملتا ہے جس میں سیاسی، سماجی، معاشرتی اور جمالیاتی رنگ اور فکری میلانات، جو اقبال کا خاصہ ہیں، ملاّ کی شاعری میں تلاش کیا جا سکتا ہے- تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ملاّ نے عالمی ادب کا مطالعہ عمیق نظر سے کیا تھا- یہی وہ وجہ ہے کہ شاعری میں مشرق و مغرب کے وہ افکار ہیں جو عالمی تناظر میں اقبال کے ہاں ملتے ہیں، وہیں سے ملاّ نے بھی اپنے چراغ جلائے ہیں-

جس طرح اقبال نے داغ، غالب، مسولینی، آرنلڈ پر نظمیں کہیں ہیں، اسی طرح ملاّ نے ٹیگور پر نظم کہہ کر اقبال کی تقلید کا ثبوت دیا ہے- جدید دور کے شعراء میں انہیں وہی مقام حاصل ہے جیسے دیگر ہندو شعراء میں رواں، دتاتریہ کیفی کو حاصل ہے- کیونکہ ان شعراء نے براہ راست اقبال کے اثرات قبول کئے ہیں- ملاّ نے ''نذر ٹیگور''، ''نالۂ فراق'' سے متاثر ہو کر کہی ہے ؎

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں
آہ! مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمیں
آگیا آج اس صداقت کا مرے دل کو یقیں
ظلمت شب سے ضیائے روز فرقت کم نہیں
(نالۂ فراق) [۲]

ملاّ کی نظم ''نذر ٹیگور'' ملاحظہ کیجئے ؎

خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام ترا
وطن کے شاعر اعظم تجھے سلام مرا

۱- نگار، جنوری- فروری، ص ۱۷۲

۲- بانگ درا، ص ۷۴

تجھے چمن کی فضائیں سلام کہتی ہیں
سحر کی مست ہوائیں سلام کہتی ہیں
یہ اودی اودی گھٹائیں سلام کہتی ہیں
کہ ذرے ذرے پہ برسا ہے ابر جام ترا خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام تیرا
تجھے فروغ بصیرت سے دیکھنا چاہا
ابھر کے عقل کی ظلمت سے دیکھنا چاہا
تجھے حیات کی رفعت سے دیکھنا چاہا
نظر کو مل نہ سکا پھر بھی اوج بام ترا خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام ترا

(نذر ٹیگور)

اقبال کی سی تشبیہات اور استعارے ان کی نظم کا وصف خاص ہے۔ملاؔ کی نظم ''ترانۂ گنہگار'' میں اقبال کی نظم ''سرگزشت آدم'' کے نقوش واضح ہیں ؎

سنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے
بھلایا قصۂ پیمان اولیں میں نے
لگی نہ میری طبیعت ریاض جنت میں
پیا شعور کا جب جام آتشیں میں نے

(سرگزشت آدم) [۱]

اقبالؔ نے تلمیح ''جام آتشیں'' استعمال کی ہے۔اس سے مراد جمشید کا جام ہے۔''ترانۂ گنہگار'' کے چند شعر ملاحظہ کیجئے ؎

لذت درد کون دے لطف وصال کے لئے میں نے تو چھوڑ دی بہشت تاب خیال کے لئے
روح مری ہے مضطرب اپنے جمال کے لئے جلوۂ دو جہاں ہے کم چشم سوال کے لئے
آرزوئے کلیم کی دہر میں یاد گار ہوں

(ترانۂ گنہگار)

جس طرح اقبالؔ نے تلمیحات استعمال کی ہیں، اسی طرح ملاؔ نے بھی اپنی شاعری میں تلمیحات استعمال کی ہیں۔''آرزوئے کلیم''، تلمیح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے۔اسی طرح ''روح مری ہے مضطرب'' خودی کی طرف لطیف اشارہ ہے، جسے ''خودی کا عرفان'' کہتے ہیں۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اقبال کے معاصرین بھی اقبال کی فکر سے متاثر تھے کیونکہ یہ چیزیں پہلے شاعری میں متعارف نہ تھیں۔اسے ہم اقبال کا اجتہاد کہہ سکتے ہیں۔ان کے یہ اثرات معاصرین میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

''دوشیزہ کا راز''، نظم میں ملاؔ نے تشبیہات اور استعاروں سے جو کیفیت پیدا کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ملاؔ کی نظم پر اقبال

۱۔ بانگ درا، ص ۸۰

کی نظم ''عورت'' کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں، دو شعر ملاحظہ کیجئے ؎

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ ۔۔۔ اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی ۔۔۔ کہ ہر شرف ہے اسی دُرج کا دُر مکنوں
(عورت) [1]

ملاؔ کی نظم ملاحظہ کیجئے ؎

بے خبر فطرت سے اپنی خاطر معصوم تھی ۔۔۔ یہ جو اک دل میں تڑپ ہے کل تلک معدوم تھی
آرزو اپنی مجھے اتنی فقط معلوم تھی ۔۔۔ کوئی لذت تھی کہ جس سے زندگی محروم تھی
اب حقیقت زیست کی مجھ پر ہویدا ہوگئی
کل تلک انگور تھی جو آج صہبا ہوگئی
کل بھی دل سینے میں تھا پر یہ دل پر خوں نہ تھا ۔۔۔ کل تلک بطن صدف میں یہ در مکنوں نہ تھا
کل بھی تھا مجھ کو مذاق زیست لیکن یوں نہ تھا ۔۔۔ کوئی جادو تھا، پیام دیدۂ مجنوں نہ تھا
دل میں ہوک اٹھی لبوں پر مسکراہٹ آگئی
رخ پہ رنگ آیا، نگاہوں میں لگاوٹ آگئی
(دوشیزہ کا راز)

ملاؔ نے تراکیب لفظی بھی تراشی ہیں اور پھر ان کے نئے نئے معنی وجود میں لائے مثلاً 'بطن صدف'، ''در مکنوں''، ''دیدۂ مجنوں'' یہ ایسی تشبیہات ہیں جو اقبال کی شاعری سے پہلے نظر نہیں آتیں۔ اقبال نے تراکیب لفظی سے کام لے کر زبان کی وسعت میں اضافہ کیا ہے۔ صدف کے پیٹ میں موتی کا پایہ جانا، مجنوں کی آنکھ کو سحر سے تشبیہہ دینا، بڑی نازک تشبیہہ ہے۔ اس سے ملاؔ کی باریک بینی کا پتہ چلتا ہے۔

ملاؔ کی اس نظم میں اقبال کی سی تشبیہات اور استعارات کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔ فکری پھیلاؤ میں دلکشی کے ساتھ اقبال کے اس طرز کو اپنایا ہے جس میں اقبال کا فلسفہ جھلکتا ہے۔ آنند نرائن ملاؔ نے کسب فیض کرتے ہوئے ان افکار کو پیش نظر رکھا ہے جو اقبال کی علامتیں بن کر ابھری ہیں۔ ان کی نظموں میں تخیل کی بلند پروازی بھی ہے اور طنز کے لطیف نشتر بھی، جس سے شاعری دو آتشہ ہوگئی ہے۔ نظم میں ملاؔ امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے کلام کی تازگی ہی ان کے نام کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

نرائن ملاؔ کی نظم ''کام کی باتیں'' اقبال کے اس نظریہ سے متاثر ہو کر کہی گئی ہے جس میں اقبال نے ملائیت کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ اقبال کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوز مشتاقی ۔۔۔ فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی
خراب کوشک سلطان و خانقاہ فقیر ۔۔۔ فغاں کہ تخت و مصلّٰی کمال زرّاقی

۱۔ ضرب کلیم، ص ۹۲

ملاؔ کی نظم ''کام کی باتیں'' ملاحظہ کیجئے ؎

وقت آیا کام کا کچھ کام کی باتیں کریں
تابہ کے اپنے دل ناکام کی باتیں کریں

پھر افق ہے ایک صبح نو سے رشک لالہ زار
شمع افسردہ لئے کیا شام کی باتیں کریں

کارواں انساں کا ہے پھر زندگی کے موڑ پر
کب تک آخر سجدۂ ہر گام کی باتیں کریں

خون انساں سے لبالب آج ہے جام حیات
کس زباں سے حافظ و خیام کی باتیں کریں

شیخ جی ملاؔ پہ لعنت بھیجئے کافر ہے وہ
آیئے ہم آپ کچھ اسلام کی باتیں کریں

(کام کی باتیں)

ملاؔ کی تراکیب لفظی ملاحظہ کیجئے: ''رشک لالہ زار'' سرخ رنگ کے ایک پھول کو لالہ کہتے ہیں، ''جام حیات'' آب حیواں سے تشبیہہ دی گئی ہے، جسے پی کر انسان مرتا نہیں ہے۔ حافظ اور خیام، مشہور شاعر، اپنے تخلص سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملاؔ پہ جو لعنت بھیجی ہے، اسے ہنر ہی کہا جاسکتا ہے۔ ''اسلام'' دین حنیف، وہ دین جو حضرت ابراہیمؑ نے تبلیغ کے ذریعہ پھیلایا۔

مولانا ابوالحسن ناطق......۱۸۸۶ء-۱۹۶۹ء:

آپ نے اپنے شعری سفر میں جن کو اپنا رہبر و رہنما اور استاد بنایا، ان میں حضرت بیاؔن یزدانی میرٹھی اور داغؔ دہلوی ہیں۔ ۱۹۰۴ء میں داغؔ کے تلامذہ میں شامل ہوئے، شاعری کی ابتداء نیچرل نظم سے کی لیکن بعد میں غزل کی طرف رجحان ہوگیا۔ یوں تو ہر صنف سخن میں قدرت کاملہ رکھتے تھے، لیکن اصلی جوہر غزل میں آکر کھلے۔ ان کی شاعری مین سیاسی عنصر بھی موجود ہے، اس حوالہ سے ان کے قطعات بہت اہم ہیں۔ بہ اعتبار مزاج آپ خوش طبع، بذلہ سنج اور طنز و مزاح والا ذہن رکھتے تھے۔ نیچرل نظموں کا مجموعہ ''نطق ناطق'' مارچ ۱۹۱۳ء، کو ''مطبع شمس المطابع'' میرٹھ نے شائع کیا ہے۔ ''دیوان ناطق'' میں چند نظمیں اس مجموعہ کی بطور نمونہ دے دی گئی ہیں۔ ناطق نے داغؔ کو اس قدر پڑھا کہ ''آفتاب داغ'' آپ کو زبانی یاد ہوگیا۔ داغؔ کی وفات کے بعد ان کا دیوان ہمہ وقت اپنے ساتھ رکھتے اور اسی کو اپنا رہنما بن کر اپنے کلام کی اصلاح کرتے۔ اسی طرح ان کی شاعری میں داغؔ کے اثرات اور بعد میں اقباؔل کے معاصر کی حیثیت سے ابتدائی رجحان نیچرل نظموں میں ظاہر ہوا کیونکہ ملک کی فضا میں اس قدر گھٹن پیدا ہوگئی تھی۔ ادھر کانگریس، ادھر مسلم لیگ اور پھر تحریک خلافت۔ سیاسیات حاضرہ سے متاثر ہو کر بھی نظمیں لکھیں۔ ناطق کو زبان پر عبور تھا۔ تراکیب کی خوبصورتی اور روایت کی پاسداری کا خیال رکھتے تھے۔ جذباتی خلوص کے ساتھ مضمون آفرینی نے بھی کلام کو منتہا پر پہنچا دیا۔ ان کے ہاں حرارت عشق و محبت اور فکر و نظر کی تازگی سے جو ندرت نغمگی اور نیا پن ہمیں ملتا ہے، اس سے وسعت فکر اور پرواز تخیل خالصتاً جامعیت کا آئینہ دار ہے۔

ناطق کی نظم ''پروانہ و شمع'' میں اقبال کے خیالات کی ترسیل بھی ہے اور تتبع بھی۔ اقبال کی نظم ''شمع و پروانہ'' پڑھ ڈالئے دونوں کی فکر میں ذرا برابر بھی فرق نہ پائیں گے۔ اقبال کی نظم کے چند شعر ملاحظہ کیجئے ؎

پروانہ تجھ سے کرتا ہے اے شمع! پیار کیوں
یہ جان بے قرار ہے تجھ پر نثار کیوں
سیماب وار رکھتی ہے تیری ادا اسے

آداب عشق تو نے سکھائے ہیں کیا اسے
کرتا ہے یہ طواف تری جلوہ گاہ کا
پھونکا ہوا ہے کیا تری برق نگاہ کا

(شمع و پروانہ)

ناطق کی نظم ''پروانہ و شمع'' ملاحظہ کیجئے ؂

میری پیاری شمع محفل، میری اچھی شمع رو — میری دلبر اور میری جان، میری آرزو
سن میں اپنی داستان غم سناتا ہوں تجھے — سن کے اے بے درد، میرے درد دل کی داد دے
ہے خودی کیا، میں نے اس کو جان کر سمجھا نہیں — آگ میں الفت کی کودا اور کچھ دیکھا نہیں
اس طرح مرتا ہوں، گویا مجھ پہ مرنا فرض ہے — جان کو میں یہ سمجھتا ہوں کہ تیرا قرض ہے
میں چلا جب تیرے گھر، مرنے کا ساماں ہوگیا — قرب حاصل ہوگیا تیرا کہ قرباں ہوگیا

نیست کر دیتا ہے ظالم، آخرش تیرا خیال
وصل سے حاصل نہیں ہوتا مجھے کچھ، جز وصال

(پروانہ و شمع) [1]

یہ طویل نظم ہے اس میں اقبال کا آہنگ اور موضوع دونوں میں مماثلت ہے- یہ مماثلت ہی اس بات کی عکاس ہے کہ ناطق نے اقبال کا اثر قبول کیا- اقبال کی طرح ناطق نے بھی اپنی نظم میں فلسفہ خودی کی طرف اشارہ کیا ہے- تلمیحات بھی استعمال ہوئی ہیں مثلاً ''آگ میں الفت کی کودا'' حضرت ابراہیم علیہ السلام مراد ہیں- ''آتش نمرود''، مرنا، فنافی الذات سے مراد ہے- عقل و عشق کے فلسفہ کو ناطق نے کس خوبصورتی سے سمجھایا ہے یعنی عشق انسان کو حیات جاودانی بخشتا ہے اور عقل ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھلواتی ہے یعنی عشق کی راہ میں جو فنا ہوتا ہے وہ مرتا نہیں، امر ہو جاتا ہے- غرض اس نظم کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ انسان اپنے اندر پروانہ کی سی خو پیدا کرے- اپنی ذات کے عرفان کے ساتھ عشق میں اتنا اکمل ہو جائے کہ ہر طرف اس کا جلوہ ہی جلوہ نظر آئے- خود کو فنا کرنے کے بعد ہی زندگی کا آغاز ہوتا ہے اور یہ زندگی ہمیشہ عیش و آرام کی زندگی کہلاتی ہے-

اس کے علاوہ ناطق نے شاعری میں نئے موضوعات بھی متعارف کرائے ہیں جسے ہم اقبال کے اثرات کا پرتو کہہ سکتے ہیں مثلاً اشتراکیت، جمہوریت، سیاسی مسائل، تعلیم کا مقصد، فقر و قلندری، خودی و بے خودی وغیرہ- ان موضوعات کی روشنی میں ناطق کی نظم کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کس قدر اقبال سے کسب فیض کیا ہے- ناطق کی نظم ''پھول'' پر اقبال کی نظم ''گل رنگیں'' کا آہنگ اور اسلوب ایک جیسا ہے، ملاحظہ کیجئے ؂

تو شناسائے خراش عقدۂ مشکل نہیں — اے گل رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
زیب محفل ہے، شریک شورش محفل نہیں — یہ فراغت بزم ہستی میں مجھے حاصل نہیں

اس چمن میں سراپا سوز و ساز آرزو
اور تیری زندگانی بے گداز آرزو

(گل رنگیں)

۱- دیوان ناطق، ص ۲۱۲

ناطق کی نظم ''پھول'' ملاحظہ کیجیے ؎

باغ میں پھول بہت کھلتے ہیں، کملاتے ہیں　　آتے ہیں، رہ کے وہ گم نام چلے جاتے ہیں
شاخ سے ٹوٹ کے، تم تک جو نہیں آتا میں　　جانے کیا آئی بلا مجھ پہ کہاں جاتا نہیں
اب کہو تم ہی کہ ہر پھول کو ہوتی کب ہے　　ایسی عزت جو مجھے بخت سے حاصل اب ہے
حسن کے باغ کو پھولوں سے ملاتی ہو تم　　لب سے، گالوں سے اور آنکھوں سے لگاتی ہو تم

باغ باغ اب ہوں کہ ہر فکر سے آزاد ہوں میں
اور نظارگیٔ حسن خداداد ہوں میں

(پھول) [۱]

نظم ''پھول'' میں ''کہاں جاتا نہیں'' کہہ کر قبرستان کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا اشارہ سہرے کی لڑیوں کی طرف ہے یعنی کہیں پامال کیا جاتا ہوں اور کہیں عزت و توقیر بخشی جاتی ہے-''حسن کے باغ'' کتنی خوبصورت تشبیہ دی ہے- قدرت نے جو حسن عطا کیا ہے، اس حسن کی تعریف میں ناطق نے بڑی چابکدستی سے کام لیا ہے- یہی وہ آہنگ ہے جو اقبال کے اثرات کو نمایاں کرتا ہے- ناطق کی نظم ترکیب بند میں ہے جبکہ اقبال نے اپنی نظم ''گل رنگین'' مسدس میں کہی ہے- ایک معاصر کی حیثیت سے ناطق نے اقبال سے کافی حد تک اثر قبول کیا ہے- اس ثبوت کے لئے ان کی نظمیں خاصی تعداد میں موجود ہیں-

ناطق نے ''ترانۂ وطن'' کے عنوان سے جو نظم کہی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ نظم اقبال نے کہی ہے- اقبال کی نظم ''ترانۂ ہندی'' ان دونوں کی نظم ایک ہی بحر میں ہے اور اس میں قافیہ اور ردیف کا وہی التزام ہمیں ملتا ہے- یہ دونوں نظمیں وطنیت کے جذبے سے سرشار ہو کر لکھی گئی ہیں- اقبال کی نظم کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا　　ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں　　سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

(ترانۂ ہندی)

ناطق گلاؤٹھوی کی نظم ''ترانۂ وطن'' ملاحظہ کیجیے ؎

ہم جاں نثار اس کے، یہ مہرباں ہمارا　　ہندوستاں کے ہم ہیں، ہندوستاں ہمارا
دنیا کی نعمتیں سب، ہندوستان میں ہیں　　سارا جہاں ہے گویا ہندوستاں ہمارا
موسم یہاں کے اچھے فصلیں یہاں کی اچھی　　یاور زمیں ہماری، یار آسماں ہمارا
سارے جہاں سے بالا ہے اپنی سر بلندی　　چوٹی ہمالیہ کی، قومی نشاں ہمارا
ہیں دلفریب منظر، پہلو میں نربدا کے　　روح رواں ہے گنگا، آب رواں ہمارا
پیران پارسا کی، دنیا ہماری دنیا　　سہراب، گیو، رستم، ہر نوجواں ہمارا
ہندو ہیں اور مسلماں، عیسائی، پارسی، سکھ　　مل جل کے ہم سفر ہے یہ کارواں ہمارا
یہ سادھوؤں کی بستی، یہ صوفیوں کی بستی　　کردار سے تقدس، ناطق یہاں ہمارا

(ترانۂ وطن) [۲]

۱- دیوان ناطق، ص ۲۱۶

۲- دیوان ناطق، ص ۱۶

اس نظم میں تشبیہات کے علاوہ تلمیحات بھی استعمال ہوئی ہیں مثلاً ''انسانیت کے وقار'' کو چوٹی ہمالہ سے تشبیہ دی ہے- ''روح رواں ہے گنگا'' کہہ کر فطری مناظر کی تصویر کھینچی ہے- سہراب، رستم، ایران کے دو مشہور پہلوان اور فوج کے اعلیٰ عہدیدار، رستم او سہراب کی طاقت مشہور ہے- سہراب رستم کا بیٹا تھا- خاص طور پر اس نظم میں اقبال کے اثرات واضح دکھائی دے رہے ہیں-

عظمت اللہ خان......۱۸۸۷ء-۱۹۲۷ء:

عظمت اللہ خان ذہنی اور قلبی لحاظ سے انقلابی فکر رکھتے تھے- ان کی نظم میں لفظوں سے شعلے نکلتے دکھائی دیتے ہیں- انہوں نے روایت اور تقلید سے گریز کیا بلکہ اسے مسترد کر کے اپنے قاعدے پر شاعری کی بنیاد رکھی- شاعری کے عنوان اردو جنوری ۱۹۲۴ء صفحہ ۸۹ میں موجود ہیں- اس میں انہوں نے یہ بتانا ضروری سمجھا ہے کہ شاعر کے لئے اس کائنات میں اس قدر موضوعات ہیں، اب ان کو برتنے اور واضح منظر کشی کا ہنر آنا چاہئے تاکہ شاعروں میں وقت کے ساتھ وقت کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے علاوہ عالمی تناظر میں ادب کا مطالعہ ہی سے اردو زبان اور شاعری میں وسعت پیدا کی جاسکتی ہے-

عظمت اللہ خان نے غزل کی کھلی مخالفت کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا:

> شاعری کو قافیہ کے استبداد سے نجات دلوائی جائے- قافیہ کی اس بدعنوانی اور بدکرداری، جبر و استبداد کو غزل نے اپنی گود میں پالا- اس قدر پال پوس بلوان کر دیا کہ قافیہ نے تخیل اور خیال کو اپنے شکنجے میں پھانس لیا اور اپنا مطیع کر لیا- اس سے خیال کی آزادی اور نشو و نما کو جو صدمہ پہنچا اور اردو شاعری جس حد تک بے جان ہوئی، اس کی مثال ہمارے شعراء کی غزلوں سے بھرے ہوئے محض لفظی طلسمات والے دیوان ہیں- اب وقت آ گیا ہے کہ خیال کے گلے سے قافیہ کے پھندے کو نکالا جائے-''[1]

عظمت اللہ خان کے خیال میں جو چیزیں بہ اعتبار مزاج گردش کر رہی تھیں اس کا انہوں نے برملا اظہار کر دیا اور اس اظہار کے ردعمل میں جو کامیابی انہیں نصیب ہوئی وہ ہمیں ان کے معاصرین اور بعد کے شعراء کے کلام میں نظر آتی ہیں-

عظمت اللہ خان کا اپنا ایک عروضی نظام تھا، جس میں انہوں نے شاعری تو کی مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکے- ہیئت کا نیا تجربہ جو اقبال کی نظم اور روایت سے ہٹ کر ہے، لیکن الفاظ کا در و بست تراکیب لفظی، صنائع و بدائع کو پیش نظر اور ان سے کام لیتے ہوئے نظم کی آبیاری کی، چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہائے وہ صورت پیاری پیاری بڑی بڑی آنکھیں کالی
چکنے چکنے بال بھی کالے

ہونٹ رسیلے امرت والے وہ تندرستی کی لالی
گال گلابی روئی کے گالے

اٹھتا جوبن گدرا گدرا آپ ہی من میں کھب جائے
لوچ بدن میں پھولوں کی ڈالی

۱- سریلے بول، ص ۴۶

چال نشیلی جھومتا بادل یا کوئی ندی لہرائی
چور جوانی میں اٹھلاتی

(موہنی مورت) [۱]

ہیئت اور تکنیک کے اعتبار سے نظم کا فارم بدل دیا ہے لیکن خیالات کی ترسیل سے پتا چلتا ہے کہ تشبیہات اور استعارات وہی کچھ استعمال کی ہیں، جنہیں اقبال نے نظموں میں پہلے ہی متعارف کرا دیا تھا۔عظمت اللہ خان نے اپنے گیتوں میں ہندی زبان کو زیادہ اہمیت دی ہے اور لوک گیتوں کی زبان میں گراں بہا اضافہ کیا ہے۔

اقبال نے اپنی نظموں میں ''ابر'' اور ''ابر کہسار'' میں جو منظر کشی کی ہے، اسی طرح عظمت اللہ خان نے ''برسات کی رات دکن میں'' وہی کچھ اقبال سے اخذ کیا ہے، جسے ہم فطری منظر کشی کا نام دیتے ہیں۔نظم ملاحظہ کیجیے ؎

برکھا رت کی گھٹا چائی ہے بالوں کو کھولے رات آئی ہے
اندھیاری میں گہرائی ہے جھڑی لگی ہے ہلکی ہلکی
جانوروں نے لیا بسیرا تاریکی نے جگ کو گھیرا
اور ہوا بھی اٹھلاتی ہے بوندوں کے پگو کی بھی چھم چھم
جھینگر کے سروں سے ملتی ہے لیمپ کی لو پون سے ہلتی ہے
نیند پپوٹوں پر ملتی ہے زور کیا ہے مینھ نے تھم تھم

(برسات کی رات دکن میں) [۲]

عظمت اللہ خان کی نظم ''وطن'' حب وطن میں سرشار ہو کر لکھی گئی۔جس طرح اقبال نے ''ترانۂ ہندی''، ''صدائے درد''، ''ہندوستانی بچوں کا گیت''، ''نیا شوالہ'' یہ وہ نظمیں ہیں جو وطن کی محبت میں ڈوب کر لکھی گئی ہیں۔عظمت اللہ نے نظم کی ہیئت کو بدل ڈالا، ملاحظہ کیجیے ؎

مری جان ہو کہ مرا بدن ترا جلوہ گاہ ہے اے وطن تری خاک ان کا خمیر ہے
مرے خون میں یہ جھلک تری مری نبض میں یہ چپک تری مری سانس تیری صفیر ہے
تجھے ماسوا سے گرا دیا ہمیں ماسوا نے مٹا دیا ہوئے تفرقوں سے تمام ہم
تجھے جب تلک کہ بھلا دیا تمہیں نے بھی مٹا رکھا بنے گھر میں اپنے غلام ہم

(وطن) [۳]

انگریزی عروض کی آزادی سے عظمت اللہ نے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اردو گیت کو فروغ دیا۔ان کے دور میں طویل نظم یا پھر مسلسل نظم کا رجحان تھا۔

۱۔ سریلے بول،ص ۱۵۴

۲۔ سریلے بول،ص ۱۵۰

۳۔ سریلے بول،ص ۱۳۸

باب دوم

معاصرین پر اثرات

اقبالؔ کی شاعری، فکر و فلسفہ کے علاوہ بھی کئی جہتیں لئے ہوئے ہے- کلام میں وسعت اور نیا آہنگ جس کے بے شمار پہلو ہیں، اقبال سے پہلے کی شاعری میں تغزل اپنے شباب پر تھا- ان کا ذہن غزل سے مطابقت نہیں رکھتا تھا اس لئے اپنا راستہ علیحدہ بنایا- نظم کو اپنی وسعت فکر اور تخیل سے اوج ثریا پر پہنچا دیا- آزادؔ اور حالیؔ کی شاعری کے نمونے اور ان کی بازگشت فضا میں گونج رہی تھی- اقبال کے ذہن میں جو انتشار اور اضطرابی کیفیت تھی وہ یورپ جا کر کافور ہو گئی-

۱۹۰۸ء میں جب یہ وطن پہنچے تو اب ان کے پاس ایک لائحہ عمل تھا، پہلے ہی وطن پرست شاعر کی حیثیت سے مشخص ہو چکے تھے- اب وہ کائنات اور فطرت کے سربستہ راز منکشف کرنا چاہتے تھے- وطن پرستی کے جذبے سے سرشار ہو کر جو نظمیں لکھیں ان میں ''ہمالہ''، ''صدائے درد''، ''تصویر درد''، ''ترانۂ ہندی''، ''نیا شوالہ'' وغیرہ- اگر ہم اقبالؔ کی قومی شاعری جس میں وطن کی محبت کارفرما ہے، کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے وہی کچھ محسوس کیا جسے حالیؔ پہلے ہی محسوس کر چکے تھے- اقبال کی شاعری میں فکر، رفعت خیال اور فلسفیانہ بلند آہنگی کے گہرے نقوش ملتے ہیں- اس کے علاوہ افکار کے مختلف انداز شاعری میں نظر آتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اقبال اپنے معاصرین کی نظر میں منفرد اور ممتاز مقام سے پہچانے جاتے ہیں-

معاصرین میں جو شعراء اقبال سے متاثر ہوئے یا براہ راست ان کی شاعری پر اثرات مرتب ہوئے- یہ ایک ضروری امر تھا جس سے دامن بچائے رکھنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا کیونکہ اقبال کا کلام اور نثر دونوں میں ایک پیغام ہے خودی کا، عشق اور شعور کا- اقبال کے دور کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور کلام کی افادیت کو دیکھتے ہوئے معاصرین میں اس کا ادراک ہونا یا کسی بھی زاویے سے فکری جہت کو اپنانا اثرات کہلائیں گے-

اقبال کی ابتدائی تعلیم مذہبی طرز پر ہوئی اور اسی احساس سے وہ خودی اور خدا تک پہنچے- خودی کے عرفان پر اتنا کچھ لکھا کہ خود خودی میں ڈوب گئے- تصوف کے نکات دلآویز طریقے سے پیش کئے- لفظوں کا انتخاب اور سادگی کو اپناتے ہوئے ایسی نظمیں کہیں جو سنتے ہی دل میں اتر جائیں- خود بھی تصوف کے شیدائی تھے، فقیری طرز اختیار کئے ہوئے تھے اور عشق رسولؐ میں سرشار تھے-

ہر کہ عشق مصطفیٰ سامان اوست
بحر و بر در گوشۂ دامان اوست

''ایک خاص بات جو اقبال کے کلام کو اور ادبی مصوروں سے جدا کرتی ہے- یہ ہے کہ اس کے کلام میں موسیقی کو بڑا دخل ہے- اس کے اشعار پڑھ کر ناچنے کو جی چاہتا ہے اور یہ صنعت کبھی اس کے کلام سے، خواہ وہ اسرار خودی کے ضبط نفس جیسا خشک مضمون ہی کیوں نہ ہو، دل اچاٹ نہیں ہونے دیتی- مثنوی اسرار و رموز میں تقریباً ہر شعر میں قافیہ اور ردیف دونوں موجود ہیں اور بعض کو تو ترنم کے بغیر پڑھا بھی نہیں جا سکتا-''[۱]

۱- اقبال معاصرین کی نظر میں، ص۳۰۲

اقبال کے کلام میں دریا کی سی روانی اور دلوں کو گرمانے والی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مزید یہ کہ اظہار بیان شستہ اور دلآویز، ایک اچھوتا اسلوب اور تخیل کی پرواز منتہائے کمال پر نظر آتی ہے۔ شاعری کے اس پھیلاؤ میں لازم تھا کہ شاعر اپنی انفرادیت بھی قائم رکھے اور ان موضوعات سے بچ کر تخلیقی کام کرے۔ اقبال کے کلام کی یہ خوبی کتنی طاقتور ہے کہ پیغام ہی پیغام، تبلیغ ہی تبلیغ اس کے علاوہ فلسفہ اور سائنس کا ادراک اور اس امتزاج سے شاعری میں نئے انکشافات ہی سے انسان کو آگاہ کیا۔ یہ ظاہر کیا کہ اپنی خودی کا ادراک کر کے اپنے مذہب اور رسولؐ کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر دنیوی اور اخروی زندگی میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

تخیل اور افکار ہی سے انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اسلام کے زرّیں اصول اور اس کی شرح واضح طور پر پیغام کی صورت میں دی۔ ان کے نزدیک اسلام اور انسان کی خدمت ہی اولین درجہ رکھتی ہے۔ یہی ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ اس کی مثال ''طلوع اسلام'' نظم سے مل سکتی ہے۔ اسلوب احمد انصاری اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''نظم ''طلوع اسلام'' ایک ترانہ سرمدی، ایک نغمۂ اہتزاز اور ایک پیغمبرانہ بشارت کی حیثیت رکھتی ہے۔ پہلے بند کا آغاز کائنات فطرت کے مشاہدے پر مبنی ایک اشارے سے ہوتا ہے جو بدلے ہوئے حالات سے پورے طور پر ہم آہنگ ہے ؎
>
> دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
> افق سے آفتاب ابھرا، گیا دور گراں خوابی
>
> یہی استعاراتی زبان ان حالات کی تصویر کشی کے سلسلے میں استعمال کی گئی ہے جنہوں نے مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور ان پر عرصۂ زیست تنگ کر دیا تھا۔ مگر اسی اضطراب اور تہلکہ خیزی نے ان کے اندر حیات نو کے آثار بھی پیدا کئے تھے۔''[۱]

اقبال کی شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جس میں دور کی تصویر کو بھی دیکھا جا سکتا ہے اور انسان اپنی عملی زندگی کا بھی بغور مطالعہ کر سکتا ہے۔ زندگی میں تجربات و مشاہدات شب و روز رونما ہوتے رہتے ہیں اور انسان کو ان سے گزرنا پڑتا ہے۔ اقبال کا مشاہدہ محاسبہ کی صورت میں ہے۔ اقبال کی شاعری کے ان عوامل کو سامنے رکھتے ہوئے شعراء نے نئی جہتوں کا سراغ بھی لگایا ہے۔ کیونکہ اقبال شاعری کا ایک ایسا درخت ہے جس کے سائے سے بچ کر گزرنا محال ہے۔ بیسویں صدی میں اقبال جیسا شاعر اور اس جیسی فکر کا حامل دور دور تک نظر نہیں آتا ؎

''دگر دانائے راز آید کہ ناید''

ہئیت:

شرر اور رسالہ ''دلگداز'' جدید اردو نظم میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہیئت کا پہلا تجربہ انہی کے ہاتھوں ہوا۔ جو ہیئتیں پہلے سے روایتی طور پر اردو نظم میں مستعمل تھیں، ان سے ہٹ کر ایک نیا فارم اختیار کیا گیا۔ ان تجربوں سے اردو نظم کو نیا رنگ و آہنگ دیا گیا۔ اس مساعی میں شرر اور سر عبدالقادر سرفہرست ہیں۔ انگریزی ادب میں آزاد ہو کر قیود کی پروا کئے بغیر خیال کی ترسیل ہوتی ہے جبکہ اردو شاعری میں قافیہ، ردیف اور اوزان کے تحت اور جدید رجحان پر بھرپور توجہ دی۔ بدلتے ہوئے رجحانات اور نئے

۱۔ اقبال کی تیرہ نظمیں، ص ۹۱

تقاضوں ں سے شعراء میں فکری وفنی شعور پیدا ہوا جبکہ اصلاحی دور کے اثر سے شاعری وعظ ونصیحت کا ذریعہ بن گئی تھی:

''معاشرہ پے بہ پے معاشی اور معاشرتی شکست وریخت کے سیلاب سے گزر کر اقتصادی استحصال کے پھندوں میں جکڑے گئے۔ ادیب اور شاعر کے لئے اب یا خانقاہ اور حُجرہ جائے پناہ تھے یا جاگیروار کی ڈیوڑھی۔ چنانچہ ادب کچھ خانقاہی خرابوں کی نذر ہوا اور کچھ جاگیردارانہ عیاشیوں ں کا آئینہ دار بن گیا۔''[۱]

ملکی حالات کے ساتھ ساتھ شعراء نے بھی اپنی فکر کو حالات کے تابع کر لیا۔ ادب اور سیاست کی ہم آہنگی اور اس کے نشیب وفراز سے جو رجحانات وضع ہوئے، ان میں جاگیردارانہ نظام اور صنعتی رجحان نے انسان کو اپنے ہی خول میں مقید کر دیا۔ انقلابی تحریکیں اس المیہ اور داستان کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ سیاست کی بساط پر ادب وزیر بن کر اترا اور نئے موضوع تلاش کرنے میں سرگرداں رہا۔ سیاسی واقتصادی سطح پر جو انقلاب دیکھنے میں آیا وہ ادب میں موضوعات کی صورت میں نمودار ہوا۔ ہمارے شعراء نے ان موضوعات کو تاریخی اہمیت دیتے ہوئے شعوری اور فکری لحاظ سے اردو نظم کا وقار بڑھا دیا۔ نظم کے پھیلاؤ میں مغربی شاعری کے منظوم تراجم زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ہیئت کی صحیح اقتدا اور پیروی انہی نظموں کے ذریعے ہوئی، جسے آج ہم آزاد نظم کہتے ہیں۔

آزادؔ، حالیؔ اور اسماعیلؔ میرٹھی کا مقصد صرف اتنا تھا کہ وہ شاعری کے ذریعہ قوم کی اصلاح چاہتے تھے اور وہ اس میں کامیاب رہے جبکہ حالیؔ نے ''مقدمۂ شعروشاعری'' میں وزن اور قافیہ کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے اس پر بحث کی ہے اور اسے شعر کی ماہیئت سے خارج کرنے کی تلقین اور بلینک ورس کی حمایت کی ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے ان تینوں شعراء کے ہاں جو فکری اور موضوعاتی وسعت پائی جاتی ہے، آگے چل کر بلکہ ان کے زیر اثر اس مشن کی تکمیل ہمیں اقبال کے ہاں نظر آتی ہے۔ آزادؔ نے اس کی ابتداء ایک معریٰ نظم ''جذب دوری'' سے کی۔ ویسے بہ نظر غائر دیکھا جائے تو حالیؔ کی کوششوں سے شعراء میں نئے موضوعات اور ہیئت کے نئے تجربوں کا زیادہ رجحان پایا جاتا ہے۔ اگر ہم ہیئت کی تبدیلی یا اس میں نئے تجربوں کا ذکر حالیؔ سے کریں تو زیادہ مناسب اور درست ہوگا۔ ہیئت کے نئے تجربوں میں کیفی اعظمی کا نام اہم ہے۔ انہوں نے ملکہ وکٹوریہ کی سنہری جوبلی پر ایک نظم لکھی جو ہیئت کے اعتبار سے نقش اول قرار پاتی ہے۔ یہ نظم پچیس بند پر لکھی گئی۔ اس نظم کا ایک بند چار مصرعوں پر ہے ؎

جگ گزرے ہیں مینہ کو برستے
لاکھوں بار آئی ہیں گھٹائیں
قرن ہوئے کلیوں کو بکستے
اور چلتے جاں بخش ہوائیں

ہیئت کے یہ تجربے دراصل مغربی شاعری کا وہ ردعمل ہیں، اس تغیر کے عمل میں شعراء نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان میں جوشؔ، علی سردار جعفریؔ، پروفیسر شورؔ علیگ، مجازؔ، فیضؔ، ندیمؔ نے نظم میں ہیئت اسالیب اور موضوعات میں بے پناہ اضافہ کیا۔ یہی وہ تجربات تھے جن سے آج ہماری اردو شاعری ہیئت اور اسالیب سے مالا مال ہے۔ فنی سانچے کی تخلیق کو ہیئت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اظہار کی تبدیلی مختلف ادوار میں مختلف النوع رہی ہے۔ اگر ہم قدیم روایات کو آج کے دور میں منطبق کریں تو اس کا اطلاق ادبی روایات کا آئینہ دار تو ہوسکتا ہے، سیاسی وسماجی اعتبار سے نہیں ہوسکتا۔ موضوعات کی کثرت اور خیال کی فراوانی اس بات کی متقاضی ہوتی ہے۔ شعری اصناف میں سے کس کا انتخاب کیا جائے۔ اب یہ شاعر کی ذہنی اپج ہوتی ہے کہ وہ اپنی بات اور اپنے خیال اور اظہار

۱۔ سیپ، کراچی ص ۴۵۳

کو جس سانچے میں ڈھالے گا- وہ ہیئت کہلائے گی- دراصل موضوعات اس عہد کے ترجمان ہوتے ہیں- جب بھی تاریخی اعتبار سے کہیں انقلاب آیا ہے، وہاں کی معاشرتی وسماجی زندگی پر اس کے اثرات مرتب ہوئے ہیں- شاعر جس خیال کو پیش کرنا چاہتا ہے، اسے اظہار کا سانچہ بھی درکار ہے- اس طرح وہ اپنے الفاظ کے پیچ وخم کو خوبصورتی سے پیش کرنے کے لئے اپنے خاص رنگ اور اسلوب سے مدد لے گا- ہیئت کو نبھانے کی بھی پوری کوشش ہوگی تاکہ خیال اور سانچے میں تصادم نہ ہو سکے-

> ''موضوع جس کے لئے بالعموم انگریزی کا لفظ Content بروئے کار لایا جاتا ہے، وہ خیال (بشمول جذبہ) ہے، جس کی ہم دوسروں تک ترسیل کرنا چاہتے ہیں اور ہیئت جس کا بدل انگریزی لفظ Form میں تلاش کیا جا چکا ہے، ابلاغ کی وہ مخصوص طرز ہے، جسے ہم اپنے مذکورہ مقصد کے حصول کے لئے برتتے ہیں اور واضح ہے کہ اس میں اظہاری سانچے کے طور پر کسی خاص صنف ادب کا انتخاب، اس کے لئے موزوں الفاظ کا چناؤ، احسن تکنیک کی تجویز اور منفرد اسلوب کی تعین کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا-''[۱]

ہیئت وہ تجربہ ہے جسے شاعری کے لباس سے تعبیر کیا جاسکتا ہے- جیسے ایک لباس مستقل طور پر نہیں پہنا جاسکتا، اسی طرح شاعری میں تغیر بھی فطری عمل ہے- اس تغیر کی مختلف صورتیں ہیں- ہیئت طرز نگارش میں وہ جدت ہے، جو نئی بھی ہے اور اچھوتی بھی مثلاً ''اسلامی تصوف'' اس موضوع کے لئے مثنوی کا انتخاب کیا- یہی وہ ہیئت کا سانچہ ہے جو فارسی میں پہلے سے مروج تھا- ''شاہنامہ فردوسی'' مثنوی ہیئت میں ہے- برصغیر میں قطب شاہی عہد میں مثنوی کی مثالیں ملتی ہیں جن میں عشقیہ اور متصوفانہ موضوعات پر خاصی طویل مثنویاں موجود ہیں- قلی قطب شاہ، محمود بحری، غواصی، نشاطی، ملاوجہی وغیرہ نے اس صنف میں خاصا اضافہ کیا- وقت بدلنے کے ساتھ اسی ہیئت میں موضوعات اور خیالات میں تغیر تیزی سے آتا رہا- اس پس منظر میں وہ انقلابات ہیں جو مختلف عہد کی عکاسی کے ساتھ ان رجحانات کی بازیابی بھی شاعری کا حصہ کہلاتی ہیں- اس تناظر میں جدید شاعری نے نئے موضوعات متعارف کرائے، جس میں مظاہر قدرت اور فطرت پرستی کا اظہار ملتا ہے- جدید شاعری میں تغزل اور عاشقانہ شاعری کا رجحان کم ہوتا گیا- اب تک شاعری میں جو رجحان عام تھے مثلاً رزم اور بزم، طنز وظرافت، تغزل میں عاشقانہ رنگ وغیرہ موضوعات کی کثرت نظر آتی ہے لیکن جدید شاعری نے ان روایات سے انحراف نہیں کیا بلکہ تخیل کی باگ کو مادیئت، جنس، مظاہر قدرت، نیچرل شاعری کی طرف موڑ دیا- سائنس اور ٹیکنالوجی نے خیالات کی وسعت میں اضافہ کیا- معاشرتی اور سماجی، اقتصادی اور مذہبی لحاظ سے جو شکست وریخت کے بعد ناہمواری کا پایا جانا، انتشاری کیفیت کا آئینہ دار ہے- اس کے علاوہ اردو شاعری میں قوافی، ردیف اور مروجہ بحریں جن کو تبدیل کر کے نئے تجربوں کے ساتھ شاعری میں اظہار کرنا- ہیئت کے تجربوں میں نیا اضافہ ہے- اظہار کا یہ سانچہ ملاحظہ کیجئے -

نئی آگ، دل
دل ناتواں کی نئی آگ سب کا سرور
نئی آگ سب سے مقدس ہمیں
اسے آج کس کس آنکھوں کے معبد پہ جا کر چڑھائیں؟

۱- امکانات، ص ۱۴۹

نئی آگ کے کس کو معنی سمجھائیں
نئی آگ ہر چشم ولب کا سرور
نئی آگ سب کا سرور (نیا آدمی)

ن-م راشد نے اپنی نظم میں ہیئت کے تجربے کے ساتھ ماضی کو بھی اپنی نگاہ میں رکھا ہے- اس دور کے انسان ہی کی بات نہیں کی بلکہ ان مصرعوں میں پورا عہد سمٹ آیا ہے- یعنی سامراجی تسلط اور اسلامی اقدار کا محدود ہو جانا- اس سے ان کے ہاں مادی و معاشرتی بحران کا پایا جانا، جس میں انسان کا مضمحل ہونا، مایوس اور نا امید ہونا پایا جاتا ہے- آگے چل کر اسی نظم میں کہتے ہیں —

درختوں کی شاخوں کو اتنی خبر ہے
کہ ان کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں
مگر ان میں ہر شاخ بز دل ہے
یا مبتلا خود فریبی میں شاید
کہ کرم خوردہ جڑوں سے
وہ اپنے لئے تازہ نم ڈھونڈتی ہے (نیا آدمی)

اس نئے آدمی کی زندگی میں جو مصائب، آلام، رنج والم اور اس کے علاوہ فکر ہستی، فکر معاش، فکر وطن، ایک قلب مضطر میں کتنے غم لئے پھرتا ہے- بے بسی و بے چارگی اس دور کی عکاسی ہے جس میں انسان انقلاب کے بعد سے اب تک مبتلا ہے- لیکن راشد نے امید کی کرن تلاش کر ہی لی- وہ اپنی قوم کو مژدہ دیتے ہوئے کہتے ہیں —

مگر اے مری تیرہ راتوں کی ساتھی
یہ شہنائیاں سن رہی ہو
یہ شاید کسی نے مسرت کی پہلی کرن دیکھ پائی
نہیں اس دریچے کے باہر تو جھانکو
خدا کا جنازہ لئے جا رہے ہیں فرشتے
اسی ساحر بے نشان کا
جو مغرب کا آقا تھا مشرق کا آقا نہیں تھا
یہ انسان کی برتری کے نئے دور کے شادیانے ہیں سن لو!
یہی ہے نئے دور کا پرتو اولیں بھی
اٹھو اور ہم بھی زمانے کی تازہ ولادت کے اس جشن میں
مل کے دھومیں مچائیں (نیا آدمی)

مجید امجد نے بھی راشد کی طرح اسی ہیئت کو اپنایا ہے لیکن اس کے ساتھ موضوع اور خیال کی ہم آہنگی کا پایا جانا بھی مشترک اظہار کا وہ سانچہ ہے جو اس دور کی روایت بن چکا تھا- مجید امجد نے پرآشوب دور کو موضوع بنا کر انسان کے کرب کا اظہار کیا ہے —

اور اب یہ اک سنبھلا سنبھلا، تھکا تھکا سا شخص
اب بھی جس کے جھریوں والے چہرے پر اک پیلی سوچ کا

بچپن ہے اور اب یہ اک شخص

اک جانب کو اس کے قد کا جھکاؤ......

(آشوب زیست اور مقامی وجود کا تجزیہ)

مجید امجد نے جس شخص کو دریافت کیا ہے، وہ معاشرتی لحاظ سے خود کو تنہا سمجھتا ہے- کیونکہ اس کا ذہن سماجی اور سامراجی نظام کے خلاف ہے- ان کے ہاں یہ بیزاری انسان سے انسان کی نہیں بلکہ نظام واقدار سے ہے- مجید امجد نے ہیئت کا وہی سانچہ اختیار کیا، جسے ڈاکٹر تصدق حسین نے اپنی کتاب ''سرودنو'' میں برتا ہے- خیالات وموضوعات بھی ایک جیسے ہیں- راشد اور میراجی نے اس میں جنسی میلانات اور معاشرتی ناہمواری کو بھی ملحوظ رکھا ہے لیکن ان سب سے پہلے اسماعیل میرٹھی نے ''بلینک ورس'' ہیئت اختیار کر کے نئے آنے والوں کے لئے راستہ ہموار کر دیا:

> ''اردو میں طرز نگارش کا پہلا تجربہ مولوی اسماعیل میرٹھی کی بلینک ورس ایک کمزور اور ناتمام کوشش سہی لیکن آج بھی ہماری شاعری میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے، گو کہ اس سلسلے میں عبدالحلیم شرر کا نام بھی کم اہمیت نہیں رکھتا- شرر نے شیکسپیر کے انداز میں ڈرامہ لکھنے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے آزاد نظم کی ابتدائی صورت پیدا کی اور اپنے رسالے ''دلگداز'' کے ذریعہ اس کی ترجمانی کر کے کئی ماہ تک اس سلسلے کو جاری رکھا-''[۱]

شرر کا تجربہ تو ناکام رہا لیکن آزاد نظم کی ہیئت کو موجودہ دور میں کمزور نہیں کہا جا سکتا- آج کے شاعر نے اس ہیئت میں خاصا مواد اور موضوعات سے اردو نظم کا دامن وسیع کر دیا- ڈاکٹر تصدق حسین خالد نے اپنی نظموں میں مغربی تاثر کو زیادہ اہمیت دی ہے- پر کیف مناظر، مظاہر قدرت کے کرشمے اور مختلف مناظر کو تصویری رنگ میں پیش کرتے ہیں ؎

مغرب کی ہوائیں چیخیں گی، بحر اپنا راگ الاپے گا

سائیں، سائیں

تاریکی میں چپکے، سنسان، بھیانک رقبے پر بڑھنا

بڑھتا ہی جائے گا

موجوں کی مسلسل یورش میں

وہ گیت برابر گاتے ہوئے

جو کوئی نہیں سمجھا اب تک

بھیڑیں سر نیچے ڈالے ہوئے

چپ چاپ آنکھوں کو بند کئے

میداں کی اداس خموشی میں، فطرت کی کھلی چھت کے نیچے

کیوں سہمی سہمی پھرتی ہیں

اور باہم سمٹتی جاتی ہیں

(چاند آج کی رات نہیں نکلا)

۱- سوغات- جدید نظم نمبر، ص ۱۶۸

''احتجاج زندگی سے مجسم ہونے والا یہ شاعر اسی زندگی کے منفی رویوں کے خلاف بغاوت کے طور پر تاریکیوں کو اپنی ذات میں اتار لینا چاہتا ہے- ڈاکٹر خالد اور ن.م. راشد جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں، یہ نسل معاشرتی شعور کے عمل سے گزر رہی تھی- یہ نسل اپنی معروضیت کے آشوب کا گہرا احساس تو رکھتی تھی مگر اس آشوب کے سامنے وہ بے بسی کا اظہار کرتی ہے-'' [۱]

اقبال اور ان کے معاصرین کی زیادہ تعداد اس ہیئت کے تجربوں میں نہ الجھی کیونکہ اقبال صرف ہیئت کا شاعر نہیں بننا چاہتے تھے، ان کے ذہن میں مقصدیت اور روایت کے اصول تھے- انہوں نے مروجہ اصناف ہی میں اپنے پیغام کی ترسیل کی جبکہ حفیظ اور عظمت اللہ خان نے مزید نئے تجربے کئے- ان دونوں کے ہاں اردو کی بحروں میں ہندی خیالات اور روح کو دیکھا جاسکتا ہے-عظمت اللہ خان نے ہندی بحروں میں طبع آزمائی کی لیکن ان کا یہ تجربہ زیادہ کامیاب نہ ہوسکا، البتہ حفیظ نے اپنے گیتوں میں نیا آہنگ اور ہیئت کے نئے تجربوں سے اپنی نظموں میں جو اضافہ کیا ہے، وہ حفیظ کا بہت بڑا کارنامہ ہے، ان کے علاوہ اختر شیرانی نے بھی نئے تجربے کئے ہیں، جن میں ان کی مستزاد نظمیں ہیں لیکن ان تجربوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ نظم میں انسان کی داخلی کیفیات کا سراغ لگایا گیا ہے- وجودی نظریے کے تحت ان کی شاعری میں وسعت پائی جاتی ہے- اس دور کے شعراء میں عجمی لے کے ساتھ خطیبانہ طرز میں بھی نظمیں لکھی گئی ہیں-نمونے کے طور پر یہ اشعار دیکھئے ؎

پارۂ نان جویں کے لئے محتاج ہیں ہم
میں، مرے دوست، مرے سینکڑوں ارباب وطن
یعنی افرنگ کے گلزاروں کے پھول (ن.م. راشد)

ان نظموں کا زیادہ تر میلان اقتصادی، سیاسی اور سماجی بھی ہے- سرمایہ داری نظام کے بعد صنعتی انقلاب آجائے تو معاشرتی سطح پر کچھ تبدیلیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں- سائنسی ایجادات نے انسان کو جو تحریک دی ہے، تصورات اور خیالات میں انقلاب آنا ناگزیر تھا- یہی وہ وجہ ہے کہ آج اُردو شعر وادب میں جو چھاپ ہمیں نظر آتی ہے، اس میں مغربیت اور ان کی جدید ایجادات سے جو موضوعات واضح شکل میں سامنے آتے ہیں، انہی وجوہات کی بناء پر وہ اثرات شعر کی بنیادی تخلیق پر مرتسم ہوئے ہیں- آج کے شاعر میں جذبہ اور ادراک کے علاوہ ہمت اور جرأت کا اظہار بھی پایا جاتا ہے- مثلاً فیض کی نظم ''انتساب''، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی یہ نظم جو دیگر نظموں کے آہنگ سے مختلف ہے، یہ نظم ''پابلو نرودا'' کے زیر اثر لکھی گئی ہے-

نظم ''انتساب'' میں سے یہ بند ملاحظہ کیجئے جو ہیئت کے اعتبار سے ایک تجربہ ہے ؎

آج کے نام اور آج کے غم کے نام
آج کا غم جو ہے زندگی کے بھرے گلستاں سے خفا
زرد پتوں کا بن جو مرا دیس ہے
درد کی انجمن جو مرا دیس ہے
کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام
کرم خوردہ دلوں اور زبانوں کے نام

۱- نئے شعری تجربے، ص ۱۰۱

پوسٹ مینوں کے نام
تانگے والوں کے نام
ریل بانوں کے نام
کارخانے کے بھولے جیالوں کے نام
بادشاہ جہاں، والی ماسوا، نائب اللہ فی الارض دہقاں کے نام
جن کے ڈھوروں کو ظالم ہنکا لے گئے ہیں
جن کی بیٹی کو ڈاکو اٹھا لے گئے ہیں (انتساب)

محولا بالا نظم میں انسانی اقدار اور بشریت کش حادثات، جو انسانی تہذیب کے درپے ہے، جو امن کی دشمن ہے، انسان کو اس بھٹی میں جھونکنا چاہتے ہیں جہاں راکھ کے علاوہ کچھ نہ ملے- انسانیت کا یہ بھیانک روپ جو فیض نے نظم میں پیش کیا ہے، اس سامراجی نظام پر ایک تازیانہ ہے- وہ دہقان کو معاشرے میں اعلیٰ مقام دینا چاہتا ہے- اس کے نزدیک دہقان ہی اس سرزمین پر اللہ کا خلیفہ ہے، جو ہم سب کے لئے تنہا دھوپ میں اناج اگاتا ہے- ان نظموں میں ایک طرف سماجی و معاشرتی ناہمواریوں کا تذکرہ ہے، تو دوسری طرف جمالیات کی دھنک بھی نظموں میں دیکھی جاسکتی ہے- شاذ تمکنت نے رومانیت میں نظم ''تماشہ'' لکھی ہے ؎

رات جگمگاتی ہے
بھیڑ، شور، ہنگامے
زرق برق پہناوے
سرخ سیم گوں دھانی
روشنی کے فوارے
دو عورتیں بچے
آڑی ترچھی صف باندھے
ایک خط نوریں کے
نقطۂ عمودی کو
سر اٹھائے تکتے ہیں
لوکا جاگ اٹھتا ہے
ایک لاٹ گرتی ہے
مرد، عورتیں، بچے
تالیاں بجاتے ہیں
صرف ایک ہی عورت
چیخ روک لیتی ہے
صرف ایک ہی بچہ
تلملا کے روتا ہے (تماشہ) شاذ تمکنت

اگر ہم جنسی میلان کو تاریخ شعر و ادب میں دیکھیں تو اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے کی شاعری میں معاملہ بندی، ہزل گوئی، فحاشی کو خاصہ فروغ ہوا۔ اس دور کے شاعروں میں جرأت، رند، داغ، چرکین وغیرہ نے اردو شاعری کے مزاج اور رنگ و آہنگ میں رومانیت کے ساتھ جنسیات کو شامل کر کے اخلاقی اقدار کو نقصان پہنچایا۔ مشرقی معاشرہ میں یہ بے راہ روی برداشت نہیں کی جا سکتی۔ اس کے برعکس میراجی نے جنسیات پر جو نظمیں کہی ہیں، ان میں آریائی تہذیب و ثقافت کا پرچار ہے:

> ''میراجی کے ذہنی پس منظر کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم نے دیکھا تھا کہ وہ بچپن ہی سے جنس کی طرف لاشعوری طور پر مائل تھے اور خاص طور پر جس فضا میں ان کا بچپن گزرا، وہ اشتعال انگیز جنس کے مختلف تصورات ان کے ذہن پر قائم ہوتے رہے۔'' [۱]

میراجی کی نظموں میں جو تصورات کا پیغام ہمیں ملتا ہے، وہ اسے دیو مالا کی شکل میں پیش کرتے ہیں جبکہ ان کی نظم کا یہ تصور کچھ اور تاثر رکھتی ہے ؎

اے پیارے لوگو
تم دور کیوں ہو
کچھ پاس آؤ
آؤ کہ مل لیں
یہ سب ستارے
تاریکیوں کے
اس پار ہوں گے (میراجی)

میراجی کی جنسی محرکات جو مادی تصور لئے ہوئے ہے ؎

بانہوں میں پھنس پھنس کر آئی ہوئی انگیا کی سلوٹ کو
جب میں دیکھوں دل میں زور کی دھڑکن ہو
اور تیزی سے سانس چلے
لمبے، ڈھیلے ڈھالے دامن میں لہروں کے بہنے سے
اور گھومر کے پڑنے سے
ذہن کی لہر ایک رگ تھر کے
آہوں کا نغمہ نکلے

میراجی کے ہاں یہی وہ جنسی محرکات ہیں جس سے ہیجانات کے بھڑکنے میں مدد ملتی ہے لیکن اس نظم کی باطنی کیفیت کچھ یوں ہے کہ میراجی نے برائیوں میں اچھائی کو نکالا ہے یعنی چار اطراف شر ہی شر ہے، انہوں نے اس میں سے بھی ''خیر'' کو تلاش کر لیا۔ ان کی شاعری کے اس رجحان کو آزاد شاعری ہی ان کا ساتھ دے سکتی تھی۔

۱۔ جدید اردو شاعری میں علامت نگاری، ص ۱۹۱

ہیئت کے اس آئینہ خانے میں سرمد صہبائی نے بھی اپنے کچھ نقش عشق کی کتاب میں لکھے ہیں۔ ان کی نظم ''استعارے ڈھونڈتا رہتا ہوں میں'' ایک ایسی مستی، جسے حسیات سے تعبیر کیا گیا ہے، نظم ہیئت کے اعتبار سے آزاد طرز پر ہے ۔

استعارے ڈھونڈتا رہتا ہوں میں
کھولتا ہوں خواب کی رنگیں کتاب
دیکھتا ہوں یاد کا کالا گلاب
سانس میں اڑتی ہے خوشبو کی سراب
گھل رہا ہے جسم میں اک ماہتاب
تیرے اجلے پاؤں کی مدھم دھمک
دھیان کی دہلیز پر سنتا ہوں میں

سرمد صہبائی

(استعارے ڈھونڈتا رہتا ہوں میں)

ہیئت کے اس نئے تجربے میں دیگر شعراء کی نظمیں ملاحظہ کیجئے، جنھوں نے اس رجحان کو قبول کرتے ہوئے جمالیات کے نئے در وا کئے ہیں۔ ان نظموں میں جمالیات کے علاوہ سائنسی اور اک اور صنعتی رجحان جو معاشرتی اور سماجی لحاظ سے رگ و پے میں تخلیقات کے ساتھ نئی ہیئتوں کو اپنے دامن میں لئے چار سو گھومتا ہے اور انسان کو عمل، جہد، پیہم کوشش پر آمادہ کرتا ہے ۔

اے خدا! ریت کو فردوس بنا دے! ہم پر
ریت کی قید کڑی ہے!
اے خدا! آگ کو فردوس بنا دے! ہم پر
آگ کا ظلم کڑا ہے!
اے خدا! ناک کو فردوس بنا دے! ہم پر
جسم کی قید کڑی ہے (جیلانی کامران)

پیلے منہ اور وحشی آنکھیں
گلے میں زہری ناگ
لب پر سرخ لہو کے دھبے
سر پر جلتی آگ
دل ہے ان بھوتوں کا یا کوئی
بے آباد مکان
چھوٹی چھوٹی خواہشوں کا
اک لمبا قبرستان (منیر نیازی)

آ رہی ہے نرالی بہار
جی میں جو کچھ ہے وہ کوئی کیسے کہے
میری رگ رگ میں نس نس میں مدرا بہے
بج رہے ہیں خوشی کے ستار (مجاز)

راستے پر کئی سنسان، سبک سر آئے
مری آہٹ پہ اچک کر مجھے یوں دیکھتے ہیں
جس طرح گھات میں دشمن کو گھبرا جائے (یوسف ظفر)

کبھی تم جو دیکھو تو ان پتلیوں کے سمندر میں
اس ٹوٹے پھوٹے ہوئے آئینے میں
تمہیں اپنی بکھری ہوئی ریزہ ریزہ ہوئی ذات کا اک
ہیولیٰ ابھر کر بلائے
اجڑتے ہوئے شہر کا اک منظر دکھائے (وزیر آغا)

افتخار جالب نے شاعری میں صنعتی تصور کے علاوہ ماضی کی روایات کو سراہتے ہوئے نئی راہوں کو تلاش کیا ہے

لیکن میں تو اب تک خواب زدہ تصوریں
دیکھ رہا ہوں
اور سمندر کے پربت پر ٹھہرا جنگل
بیتے گیتوں سے پر جنگل
ازلی خاموشی کے ہالے میں تھر تھر کانپ رہا ہے
صدیاں، سائے، سوچ، فصیلیں

(افتخار جالب)

ہوا تیز تر ہوگئی
سرافراختہ پیڑ کے گرد پھیلے سمندر میں طوفاں لپکنے لگا
سرافراختہ پیڑ تھرا اٹھا - نرم شاخوں کی چیخوں سے افلاک کا سینہ پھٹنے لگا
سمندر کا طوفاں اچھوتی بلندی سے آنکھیں ملانے لگا
سرافراختہ پیڑ کے پاؤں، اکھڑے تو وہ سرنگوں ہوگیا
سیل میں کھو گیا عارف عبدالمتین

(طوفان سے پہلے طوفان کے بعد)

یہ تیرگی
اور ہر گھڑی بڑھتی ہوئی
اس کی انوکھی دلکشی
جیسے سکوں کے بحرِ بے پایاں کی حامل ہے یہی
دنیا کی منزل ہے یہی

قیوم نظر
(الجھن)

آئے گا آئے گا کوئی تو شہاب ثاقب
اس کے دامن میں دہکتے ہوئے انگاروں کی چادر کا اک آنچل ہی سہی
میں تماشائی سہی آج تیری خلوت کا
میری اس حیرت طفلی پہ نہ جا
ماں! تجھے گھورتے رہنے کا خطا کار ہوں میں

عزیز حامد مدنی
(مادر گیتی سے)

کب تلک خشک ساحل پہ بیٹھے ہوئے
آتی جاتی صداؤں کے نوحے سنیں
کیوں نہ اتریں سمندر کے غاروں میں ہم
کیوں نہ یہ خاک کی سرزمین چھوڑ دیں

شہزاد احمد
(کیمیا)

یہ قلزم بیکراں،، یہ موجیں
یہ وقت کا دھیرے دھیرے آغوش نیستی میں سمیٹتے جانا
میں ہر گھڑی دور ہوتا جاتا ہوں، اپنی دنیائے آرزو سے

منیب الرحمٰن
(سمندر)

آسماں صدیوں پرانی رہگزر
میں مگر اس رہگزر کے موڑ پر
سنگ خارا کی طرح
وقت کے آغاز سے انجام تک موجود ہوں
دیکھتی آنکھوں سے ہر شے دیکھتا ہوں روز و شب
مضطرب ہوں جانے والوں کے لئے
منتظر ہوں آنے والوں کے لئے

بلراج کومل
(عالم کل)

نظم میں غزل کی کیفیت اور تاثر جو داخلی اور جذباتی ردعمل کا حسین اظہار ہے-نظموں کے آہنگ میں مترنم بحریں اور داخلیت کا اظہار، اس داخلی شاعری میں رومانیت کا ابلاغ ضروری تھا-مغربی تقلید میں جو دو نظریے کارفرما ہیں ان میں فرائڈ کا "تحلیل نفسی" اور دوسرا کارل مارکس کا "اشتراکی" نظریہ-بیسویں صدی کے اوائل میں شاعری میں جو نئے رجحانات ہمیں ملتے ہیں، وہ مغربی نظریات کی ترسیل ہیں-

فرانسیسی شاعری کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملٹن کی شاعری میں غیر مساوی مصرعے نظر آتے ہیں لیکن ان نظموں میں وزن پایا جاتا ہے اور یہ ایک ہی بحر میں کہی ہوئی نظمیں ہیں-آزاد نظم کے فروغ میں مغرب کے کئی شاعر ایسے نظر آتے ہیں جنہوں نے ہیئت اور تکنیک کا بھی خیال رکھا ہے-ان میں میتھو آرنلڈ، ہنلی، پٹیمو اور وکٹر ہیوگو نے آزاد نظم کی بنیاد رکھی-آزاد نظم کے فروغ میں انگریز شاعر "گستاو کان" کا نام نہایت اہم ہے-مغربی شعراء نے عروضی اوزان کی پابندی کے بجائے آہنگ و ایقاع کو فوقیت دی-فرانسیسی ادب کے جدید اردو نظم پر گہرے اثرات پائے جاتے ہیں-

تکنیک کے لحاظ سے نظم میں نئے امکانات:

اردو نظم میں تکنیک کی خصوصیات کو سمجھنے کے لئے ہمیں آزاد شاعری اور معریٰ نظم کا مطالعہ کرنا پڑے گا-دیکھنا یہ ہے کہ "آزاد" نظم کن معنی میں استعمال ہوئی ہے-جس طرح پابند نظم قیود بحر میں ہوا کرتی ہے، قافیہ اور ردیف کا التزام کیا جاتا ہے، جبکہ پابند نظم کی خصوصیات کچھ اور ہیں مثلاً موضوعاتی اور عنوان کے تحت جس میں منظر کشی کو اولیت اور فوقیت دی جاتی ہے-آزاد نظم بحر میں تو ہوتی ہے مگر مصرعوں کے چھوٹے بڑے ہونے میں آزاد ہے-اس میں خیال کو ترجیح دی جاتی ہے-اب یہ آزاد نظم کہاں رہی، یہی وہ تکنیک ہے جسے ہم نظم کا چولہ بدلنا کہتے ہیں-آزاد نظم کہنے کے لئے کسی ایک بحر کا انتخاب ضروری ہے اور اس میں یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ خیال کو تکمیل تک پہنچانا ہے-اسی لئے تکنیکی اعتبار سے نظم میں کہیں چھوٹا مصرعہ اور کہیں بڑا مصرعہ نظر آتا ہے، اس کے باوجود تسلسل اور توازن برقرار رہتا ہے-

بیسویں صدی کے اوائل میں شعر و ادب میں جو انقلاب برپا ہوا ہے، اس میں نظم کی مروجہ پابندیوں سے گریز کرتے ہوئے مغربی نظم کے تاثر کو فروغ دینا شروع کیا۔ انگریزی نظموں کے ترجموں سے اردو نظم میں ہیئت اور تکنیک کے نئے تجربے ہونے لگے اور یہ تجربے اس بات کا ثبوت ہیں کہ اردو نظم میں ہیئت، تکنیک اور اسلوب میں تغیر اور اس میں وسعت کا پایا جانا ہی روشن امکانات کی واضح دلیل ہے۔ ہیئت اور تکنیک کے نئے تجربوں میں اگر ہم عبدالحلیم شرؔر کا ذکر کئے بغیر آگے بڑھ جائیں تو یہ بات درست نہیں گو کہ شرؔر شاعر کی حیثیت سے ایسا کوئی خاص مقام نہ بنا سکے کیونکہ ان کی تمام تر توجہ ناول نویسی پر رہی۔ پھر بھی اردو نظم میں نظم معریٰ اور آزاد نظم میں جو تجربے ہوئے ہیں، یہ مغربی شاعری کے اثرات ہی کا نتیجہ ہیں۔ ان کے ڈرامے منظوم پیرائے میں ہیں۔ اس تکنیک کی جو مثالیں ملتی ہیں، وہ شعراء کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئیں۔ دراصل شرؔر شیکسپیر سے اس قدر متاثر تھے کہ خود کو ان کے رنگ میں ڈھال لیا کیونکہ شیکسپیر کی شہرت کا راز شعر کی اسی تکنیک میں مضمر تھا، جسے شرؔر نے اپنایا تھا۔ انگریزی ادب میں اس طرز پر کہنے کی ضرورت صرف ڈرامہ میں غیر مقفع اور آزاد نظم کو ایجاد کیا تا کہ خیال کو بہ آسانی نئے تجربے کے ساتھ جس میں ہیئت اور تکنیک کے بدلتے ہوئے زاویے ادا کئے جا سکیں۔ یہی اس کا جواز ہے۔ شرؔر کے بعد اس طرز میں کہنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان میں سرؔور جہاں آبادی، نادؔر کاکوروی، عظمت اللہ خاں، عبدالرحمٰن بجنوری، اخؔتر شیرانی، حفیظ جالندھری اور اقباؔل ان شعراء نے نظموں اور گیتوں میں تکنیک کے تجربے کئے۔ اس کے علاوہ منظوم تراجم اس عمل سے بھی اردو نظم نگاری کا دامن وسیع تر ہو گیا اور اب اس میں ہر قسم کے موضوعات، بہ اعتبار ہیئت، تکنیک، نظم غیر مقفع، آزاد نظم میں تجربے تکنیک کی بازگشت نظر آتی ہے۔ نادؔر کاکوروی کے متعلق ڈاکٹر ابواللیث لکھتے ہیں:

> ''نادر کاکوروی نے بھی اردو میں بعض خوبصورت ترجمے کئے ہیں، ان کو انگریزی شعراء میں بائرن اور ٹامس مور بہت پسند تھے۔ ٹامس مور کی مشہور نظم ''لالہ رخ'' کے انداز پر انہوں نے اردو میں ایک ''مثنوی لالہ رخ'' کے نام سے لکھی۔ ان کی اور نظموں میں انگریزی طرز ادا کی جھلک اور مضامین و خیالات پر انگریزی نظموں کا اثر صاف جھلکتا ہے۔''[۱]

اس حوالہ کی روشنی میں ہمیں اندازہ ہو گیا کہ اس دور کے شعراء کی نظموں میں جو انقلابی تبدیلی آئی وہ ہیئت اور تکنیک کے اعتبار سے کامیاب تجربے رہے۔ اردو نظم پر مغربی نظم کے جو اثرات مرتب ہوئے، انہیں اردو نظم میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اردو میں آزاد نظم کے بارے میں ڈاکٹر حنیف کیفی لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک اردو کی آزاد نظم کا تعلق ہے، تو اس کی بنیاد ہی روایتی عروض پر رکھی گئی ہے۔ مزید برآں فرانسیسی، دریلبر اور انگریزی فری ورس اس کے برعکس اردو آزاد نظم نہ تو وزن و بحر سے یکسر بے نیاز ہوتی ہے اور نہ اس کی تشکیل مختلف اوزان و بحور کے امتزاج سے ہوتی ہے۔ اس طرح اردو کی آزاد نظم ان معنوں اور اس حد تک آزاد نہیں ہے، جن معنوں میں اور جس حد تک اس کے مغربی مآخذ کی آزاد نظم ہے۔''[۲]

شرؔر نے جس چیز کو شدت سے محسوس کیا وہ اردو شاعری میں اوزان اور بحور ہیں۔ ''فلورنڈا'' ان کا مشہور ڈرامہ ہے۔ اس

۱۔ آج کا اردو ادب، ص ۱۲۳

۲۔ اردو میں نظم معریٰ اور آزاد نظم، ص ۱۹۳

ڈرامے سے اور اس کی تکنیک سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شرر نے براہ راست مغربی طرز کو اپناتے ہوئے اور اس کے زیر اثر انہوں نے آزاد نظموں کی داغ بیل ڈالی- اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ مزاجاً اور طبعیتاً مغربی شاعری کو پسند کرتے تھے- اس کی مثالیں ''دلگداز'' کے شماروں میں دیکھی جا سکتی ہیں- یہی وجہ ہے کہ آج اردو نظم نگاری میں تکنیک اور ہیئت کے تجربے ملتے ہیں- وہ تخلیقی عوامل کا حصہ ہیں- یہیں سے علامتیں اپنا سر اٹھاتی ہیں- علامت ہی وہ عمل ہے جس سے استعارے وجود میں آتے ہیں- اس کا تعلق فکر اور وجدانی کیفیات سے ہے- جسے ہم تخیل ادراک اور موضوعات کا نام دے کر جذبے کو مخصوص تجربوں کے ساتھ برتتے ہیں- آزاد نظم نگاری میں تکنیک، استعارہ سازی اور علامت نگاری نے داخلی اور خارجی سطح پر قدیم نقطہ ہائے نگاہ اور روایت کو مسترد کرتے ہوئے عصری تقاضوں کو جدید آہنگ میں رمزیہ اسلوب میں پیش کیا- تکنیک کے اعتبار سے اگر ہم ۱۸۵۷ء کے بعد کا جائزہ لیں تو اس میں سانیٹ، آزاد نظم اور ہائیکو شاعری میں یہ تبدیلی دیکھی جا سکتی ہے-

میراجی کے ہاں ہیئت کے جو مختلف تجربے ملتے ہیں وہ خالصتاً مغربی تقلید کے زیر اثر کہی ہوئی نظمیں ہیں- ان نظموں میں بادلیئر اور ملارمے کی شاعری کے نقوش پائے جاتے ہیں- اس طرح اردو شاعری میں میراجی اور ان کے زیر اثر شعراء نے نئی صنف جسے آزاد نظم کہا جاتا ہے خاصہ اضافہ کیا ہے ؎

حیات گرم رو ساکن ہے، ساکن زندگی ساری
چمکتی ہیں شعاعیں روشنی کی سطحِ مینا پر
شرابِ آتشیں، مینا میں ساکن ہے

میراجی
(مے خانہ)

زندگی محبوب ہے پھر بھی دعائیں موت کی
مانگتا ہے دل مرا دن رات کیوں
قسمتِ غمگیں کے ہونٹوں پر کبھی
آ نہیں سکتی خوشی کی بات کیوں
کیوں نگاہوں میں مری چھائے ہیں آنسو کے نقاب
اس سوالِ مستقل کا کیوں نہیں دیتا جواب

میراجی
(بغاوتِ نفس)

کلیاں چٹکیں غنچے مہکے
رنگ برنگے پنچھی چہکے
اپنی اپنی باتیں کہہ کے
کون بتائے کہاں گئے ہیں

بوڑھا برگد سوچ رہا ہے

میرآجی

(بقاء)

شانوں پہ سفید لٹیں بکھرائے

اک پھٹی پرانی شال بدن سے لپٹائے

سانسوں کی بھاپ سے ٹھٹھری پوریں تاپ تاپ کے

آنکھوں کے حلقے سیکڑے

ملگجے دودھیا دھاگوں سے

روئی کی اجلی رضائی میں

ٹھہر ٹھہر کے ٹکندے ڈالتا جاتا ہے

کبھی کبھی رک کر

اک خواب سا دیکھنے لگتا ہے

ضیآء جالندھری

(سورج)

ایک ہی راہ پر گامزن

لیکن اٹھتا ہوا ہر قدم اجنبی

اک طرف شوخیوں کا ہجوم جواں

بے کراں

اک طرف صرف محتاط سنجیدگی کا سماں

جسم و جاں کا دھواں

سرشآر صدیقی

(خوشۂ گندم)

وقت وہی ہے

سورج کا تالاب وہی ہے

نغمہ زیرِ آب وہی ہے

پیڑ کی خوشبو آئینہ سا

میرآجی کی غیر مطبوعہ نظموں کا انتخاب ''سیپ'' سہ ماہی سے کیا گیا ہے

جس میں میرا بچپن
ایک کھلونا ٹوٹ گیا ہے
مسجد کے مینار وہی ہیں
خنجر آوازوں کے مقتل
اور دل بے آب وہی ہے

احمد ظفر
(خوشبو کا سمّم)

میری وابستگی
ایک چہرے سے تھی، ایک پیکر سے تھی
چند لفظوں سے تھی، چند لمحوں سے تھی
سب بچھڑتے گئے، دور ہوتے گئے
دردرشتوں سے جب ماورا ہو گیا
اس کے چہرے کے سارے حسین زاویے
اجنبی ہو گئے، دھند میں کھو گئے

بلراج کومل
(جدائی کا دوسرا گیت)

بلراج کومل کی نظم میں داخلی اشارے ملتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی کہ جیسے فرانسیسی شاعر کی نظم اردو میں ترجمہ کر لی گئی ہو۔ موضوعات کا ایک ایسا پھیلاؤ ہے جسے شاعری میں مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے مثلاً سردار جعفری کی نظم ''ہمارے نام'' میں جو خارجی پہلو اجاگر ہوئے ہیں۔ معاشرتی اور انقلابی شعور کی بازیابی نظر آتی ہے ؎

ستارے آسماں پر نقرئی حرفوں سے لکھتے ہیں
تمہارا نام، تاریکی کے سینے پر ابھرتا ہے
یہی تارے تھے، جن کو جوڑ کر، مدت ہوئی تم نے
اندھیری رات کے ماتھے پہ میرا نام لکھا تھا
یہ نورانی فرشتے، ناچ اٹھے تھے، مسکرائے تھے
تمہاری ایک انگشت حنائی کے اشارے پر
کبھی بڑھتی ہوئی فوجوں کے اوپر سے گزرتے ہیں
جنازوں میں شہیدان وفا کے ساتھ چلتے ہیں
ٹھہرتے ہیں کبھی کشمیر کے یہ لالہ زاروں میں

کبھی گنگا کی موجوں میں، کبھی جمنا کے دھاروں میں
کبھی تبدیل ہو جاتے ہیں آتش میں شراروں میں

اس تناظر میں جدید شاعری کو سمجھنا سہل ہو جاتا ہے کہ جب بھی کوئی نئی چیز مارکیٹ میں یا پھر ادب میں متعارف ہوتی ہے تو لوگوں کی توجہ اس نئی چیز اور نئے ادب پارے پر مرکوز ہو جاتی ہے- یہی حال ہماری اردو شاعری کا ہے-نظم میں بیک وقت دو رجحان شاعری کو متاثر کر رہے تھے- ایک ''اشتراکی نظریہ'' اور دوسرا فرائیڈ کا ''نظریہ جنسی'' اشتراکی نظریہ کے شعراء نے معاشرتی اور معاشی،، بحران کو اپنی نظموں میں مارکسی نظریہ کے تحت اجاگر کیا ہے جبکہ فرائیڈ کا نظریہ کسی بھی صورت سے کسی بھی ملک میں معاشرتی اقدار سے قابل قبول نہیں کیونکہ ذہنی اور جنسی عیاشی انسان کو ہر لحاظ سے بربادی کی طرف لے جاتی ہے، اسی لئے اس کے نظریئے کو مریضانہ نفسیات کہا گیا ہے، اگر نوجوان نسل فرائیڈ کے نظریات کی شکار رہی تو شاعری کی ہیئت اور تکنیک تو اپنی جگہ، انسان کی اپنی شناخت اور ہیئت بھی پہچانی نہیں جائے گی- امجد اسلام امجد کی نظم ''شاید'' اسی تاثر کی ایک کڑی ہے جو آج اور کل کے تناظر میں دیکھتے ہیں ؀

یہ ''آج'' جو کل میں زندہ تھا
وہ ''کل'' جو آج میں زندہ ہے
وہ کل جو کل کے ساتھ گیا
وہ کل جو ابھی آئندہ ہے
گزر چکے اور آنے والے
جتنے کل ہیں، جتنے کل تھے
ان کا کوئی وجود نہ ہوتا
ہم اور تم بے اسم ہی رہتے
آج اگر موجود نہ ہوتا!
آج ہی واحد لمحہ ہے
عمر رواں کی دہشت میں کھو جانے والی آنکھ ٹھہر

امجد اسلام امجد
(شاید)

ایک اور نظم ملاحظہ کیجئے ؀

اے شمع کوئے جاناں
ہے تیز ہوا، مانا
لو اپنی بچا رکھنا، رستوں پہ نگہ رکھنا
اس بھید بھری چپ میں اک پھول کو کھلنا ہے

اس کو اپنی گلیوں میں، اک شخص سے ملنا ہے

امجد اسلام امجد

(اس بھید بھری چپ میں)

مجید امجد نے اپنی نظم میں دکھ اور ثقافت کو فنی ہیئت میں پیش کیا ہے ؂

آج سحر دم میں نے بھی رک کر وہ جلسہ دیکھا
پکی سڑک کے ساتھ، ذخیرے میں، ٹوٹی سوکھی شاخوں کے
چھدرے چھدرے سائبانوں کے نیچے
اور میری آنکھوں میں پھر گئے دکھ اک ایسے خیال کے، جس کی ثقافت
جانے کب سے اپنا مسکن ڈھونڈ رہی ہے

مجید امجد

(جلسہ)

پھر کئی سال پر
شام چپ چپ کھڑی ہے مری راہ میں
ایک پرچھائیں نے کتنے مانوس انداز میں رنگ بدلا، سنہری ہوئی
چھاؤں آہستہ آہستہ گہری ہوئی
بول اٹھی رات: مہتاب کے سینے کا زخم دیکھا کرو
صبح اترائی: آنکھوں میں سورج کی کرنیں اتارا کرو
درد کی انگلیوں سے حوادث کے اوراق الٹا کرو
پہروں سوچا کرو

حرمت الاکرام

(اک التفات سراپا)

یہ غنیمت ہے کہ وہ خواب ادھورے ہی رہے
وہ جو اک عمر تلک
میری بے خواب نگاہوں کا اڑاتے تھے مذاق
وہ جنہیں سادہ دل سمجھی جنوں کا تریاق
جو کبھی بام پہ چمکے
کبھی در سے جھانکے
کبھی روزن، کبھی چلمن سے نمودار ہوئے

فارغ بخاری

(ادھورے خواب)

اڑتے ورق پر
تاریخوں کی جدول
گویا
بہتی شام کے جبڑے کھولے پیچھے جھانکتی
کف برساتی لہروں کے دامن میں چھپ جانے کی مخلص اور
بے سوچ تمنا کی مظہر ہے

خاطرؔ غزنوی
(دور کا منظر)

شاعر زبان اور بیان سے اور لفظوں سے جو خاکہ تیار کرتا ہے، اس میں کرب اور نشاط آمیز کیفیات کو کس ہنر سے شعر کے قالب میں ڈھالتا ہے، دکھ، غم اور خوشی کو منیرؔ نیازی نے نظم میں اس طرح سمویا ہے ؂

رنگ کی سل کو اٹھا کر
دور تک جانا بہت دشوار ہے
ہر در و دیوار سے مل کر جدا ہوتی ہوا سے
دیر تک نظریں ملانا بھی بہت دشوار ہے
آنکھ کے آنسو کو
ہیرے کی طرح دل میں چھپانا بھی بہت دشوار ہے

منیرؔ نیازی
(بے وفائی)

مرا دل محبت کا بھوکا
بلند، اونچے پیڑوں کے جنگل
میں چلتے ہوئے رہروؤں سے یہ کہتا ہے
مجھ کو اٹھالو۔
مجھے اپنے ساتھ ان المناک رستوں میں لے کر چلو
جن میں ہر آرزو شام کی راگنی بن گئی ہے
جہاں ہر صدا بھیگے سایوں کی خاموش محراب میں چھپ گئی ہے
حسیں رہروو!
میں تمہارے اکیلے گھروں میں

تمہاری حزیں چاہتوں کے غم افروز گیتوں پہ رویا کروں گا

منیؔر نیازی
(نارسائی)

دورجدید کا شاعر جب ماضی کے آئینے میں دیکھتا ہے، تو اسے سب سے پہلے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ کتاب شعر میں ہر موضوع کو برتا گیا ہے لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ کوئی نیا راستہ نکالا جائے۔تخلیق کا دریا سیلاب کا رخ بھی اختیار کر لیتا ہے۔عہد جدید کا شاعر، ماضی کے شاعر سے تراکیب لفظی، تشبیہات واستعارات، صنائع بدائع اور فکری عوامل سے استفادہ کرتا ہے۔فرق یہ ہے کہ جدید شاعری نے اظہار کے نئے سانچے دریافت کئے ہیں۔ان جدید شعراء میں سے ایک شاعر عزیز حامد مدنی ہیں جن کا کہنا یہ ہے کہ:

''میرے نزدیک مختلف اصناف سخن میں کوئی بیر نہیں ہوتا۔میں ساری فکر کو ایک ہی بہاؤ کی صورت میں دیکھتا ہوں۔وہ علامتیں جو جدید شعراء میں آتی ہیں، یونانی بھی ہوسکتی ہیں، ہندی بھی ہوسکتی ہیں۔میں ان کو اس جدید معاشرے کی ترجمانی کے لئے استعمال کرنا بہت ضروری سمجھتا ہوں۔'' [۱]

عزیز حامد مدنی کی نظم ''گوتم کی زمیں'' تہذیبی قدروں کی بازیابی کا سفر ہے ؂

ارض مغرب کی حسیں دوشیزہ
مجھ سے لپٹی ہوئی شرماتی رہی
نیلگوں آنکھوں کے پردوں میں جھلکتا رہا ان سرد ممالک کی فضاؤں کا سرور
جن کے برفیلے کہستانوں کی وسعت میں شب وروز کئی رقص کے گرداب میں سمٹے ہوئے جسم
ڈوبتے ڈوبتے رہ جاتے ہیں
اس کی رخساروں کی دہکی ہوئی آگ
روح زرتشت کی کھائی تھی قسم
چند کانی کے پیالوں کے سبک سایوں میں
ہر تبسم غم دوراں کو تھا، مانند صلیب

عزیؔز حامد مدنی
(گوتم کی زمیں)

کس قدر خوش نصیب ہوتے تھے
اگلے وقتوں کے شاعران کرام
رات دن نغمہ ہائے جنگ ورباب
روز وشب گردش پیالہ وجام

۱۔ چشم نگراں، ص ۲۲

ایک پہلو میں ساقی گلفام

محمد دین تاثیر

(اگلے وقتوں کے شاعران کرام)

نظم میں ہیئت اور تکنیک مغربی اثرات کا نتیجہ ہیں- آزاد نظم اور سانیٹ مغربی شہ پارے ہیں- مغربی استزاجو کہ اب اردو میں رائج ہیں، فیض اور مجاز نے جو نظمیں کہی ہیں براہ راست اس کا اثر اردو شاعری پر پڑا- اس تکنیک کو برتنے کا سب سے پہلے اعزاز دتاتریہ کیفی کو حاصل ہے- سانیٹ کو اختر شیرانی نے اعلیٰ مقام عطا کیا- مغربی اثرات کے تحت جو شاعری وجود میں آئی اس میں موضوع، ہیئت، اسالیب اور تکنیک سے اردو شاعری میں وسعت پیدا ہوئی- مغرب میں جن شعراء نے اس اصول فن پر شاعری کی بنیاد رکھی، ان میں میلارمے اور بادیلیر سرفہرست ہیں-

بیسویں صدی کے وسط میں اردو شاعری میں جو تغیر عمل پذیر ہوا، ان میں راشد، ڈاکٹر تصدق حسین خالد اور میراجی- ان تینوں کی نظمیں جب ارباب ذوق اور اساتذہ فن نے سنیں تو ان کے کانوں کو یہ شاعری عجیب سی لگی- اقبال تک شاعری کا مزاج قدیم روایت پر نظر آتا ہے- البتہ جوش کے بعد شاعری میں ہیئت اور تکنیک کے تجربے ہونے لگے- لیکن ان تجربوں کے ساتھ سیاسی، سماجی اور تہذیبی اقدار کو بھی پیش نظر رکھا- انگلستان اور فرانس کے شعراء سے متاثر ہو کر اردو شعراء نے جدید نظم نگاری کا آغاز کیا، سب سے پہلے آزاد نظم متعارف ہوئی- اس کے مصرعے گھٹتے اور بڑھتے ہیں- ارکان بھی کم اور زیادہ ہوتے ہیں، اس مثال میں اردو شاعری کی مستزاد کو رکھا جا سکتا ہے، جو تکنیک کے لحاظ سے بھی اور ہیئت کے لحاظ سے بھی مغربی طرز لئے ہوئے ہے، جسے ہم اردو شاعری کی ترقی یافتہ شکل کہتے ہیں- اردو شاعری میں علامت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے- اس کی ایک وجہ ہے وہ یہ کہ علامت اپنے اندر شعری کائنات رکھتی ہے- شعری جمال اور حسن کاری ہی نئے تقاضوں کے عصری رجحانات کو واضح کرنے میں معاون ثابت ہوئے ہیں- اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تکنیک کے ذریعہ نئے تجربوں سے جذبات کا اظہار، نازک، نادر اور نایاب علامتیں تکنیک کی کسوٹی پر پرکھ کر اسے اردو نظم کا لباس پہنایا-

آزاد نظم کی تحریک شرر کے ہاتھوں پروان چڑھی- اس لئے آزاد نظم کو جو ترقی ملی، اس سے مغربی افکار و خیالات سے آشنائی ہوئی- ان کی اس مساعی سے اور مغربی اثر جو نمایاں کام سامنے آیا وہ یہ ہے کہ نظم میں وسعت اور ترقی کے روشن امکانات نظر آنے لگے- عالمی ادب کے تناظر میں دیکھا جائے تو مغربی ادب کو اردو میں ترجمہ کرنے کا یہ عمل تیز سے تیز تر ہوا ہے- اقبال نے بھی انگریزی شاعری کی نظموں کے ترجمے کئے ہیں- ''بانگ درا'' میں کئی نظمیں ہمیں ملتی ہیں، جو منظوم ترجمہ ہیں- سرور جہاں آبادی کے ہاں بھی منظوم ترجمے ملتے ہیں- مگر وہ لفظی نہیں اس کے باوجود اصل کا گمان ہوتا ہے- سکسینہ نے منظوم تراجم کی تعداد تقریباً بیس کے قریب بتائی ہے- یہ ترجمے تکنیک کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کی نظم نگاری تسلیم کی جاتی ہے- اس کے علاوہ وہ نظمیں جو طبعزاد ہیں ان میں تاثیر کی نظم ''اگلے وقتوں کے شاعران کرام'' میں پہلے شاعروں کا حال داحوال لکھا ہے کہ کس قدر فارغ البال تھے وہ لوگ جو رات دن بزم طرب کی محفلوں میں اپنا وقت ضائع کرتے تھے- مجموعی تاثر اس نظم کا یہ ہے کہ انسان کو کوئی غم نہ دھڑکا، عیش وطرب کے دن اور ساقی گلفام کے ہمراہ راتیں گزرتی تھیں:

> ''یہی وجہ ہے کہ ان کے اظہار و ابلاغ میں بھی ایک نیا رنگ و آہنگ نظر آتا ہے- ''آتش کدہ'' ان کا پہلا مجموعہ کلام ہے اور اس میں جو نظمیں شامل ہیں، ان میں

مواد اور ہیئت، خیال اور صورت دونوں اعتبار سے بعض ایسی حدیں دکھائی دیتی ہیں جو تاثیر ہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔'' [۱]

عشق و عاشقی جیسے موضوعات سے گریز:

کلاسیکی شاعری میں صرف عشق و عاشقی کے مضامین کی بہتات ہوتی تھی۔ اساتذہ کے ہاں محبوب پرستی کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ لکھنؤ اور دلی کے دبستان شاعری میں اس کی مثالیں واضح نظر آتی ہیں۔ ہجر و وصال، گل و بلبل، معاملہ بندی کے مضامین شاعری کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ حالی، اکبر، اقبال اور عظمت اللہ خان جیسے نابغۂ روزگار ہستیوں نے شاعری کے مزاج کو اور رنگ و آہنگ کو یکسر بدل دیا اور اس میں نئے نئے مضامین نظم میں داخل کیے۔ موضوعاتی نظمیں اس دور کی واضح دلیل ہے، حالی کا کہنا تھا کہ:

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

یہیں سے نظم نے نیا جنم لیا۔ مختلف النوع مضامین کی روح پھونکی گئی۔ ان مضامین کی نوعیت کچھ اس طرح ہے کہ شاعری میں جذبات نگاری کے ساتھ اصلیت اور سادگی کو ملحوظ رکھا گیا۔ شاعری میں اخلاق، واقعہ نگاری اس کے علاوہ منظر نگاری، فطرت نگاری بھی نظم کا خاصہ بن گئی۔

یہی نہیں بلکہ وطن پرستی کا جذبہ بھی نمایاں طور پر ظاہر ہوا۔ سماجی و معاشی، معاشرتی مسائل کو بھی موضوع بحث بنایا گیا۔ جنسی میلان اور نیچرل شاعری کو اس حد تک فروغ ہوا کہ اردو نظم میں وسعت پیدا ہوگئی۔ شعراء نے گل و بلبل کے ترانے چھوڑ کر ان موضوعات کو شاعری میں سمویا جس سے آج کا انسان دو چار ہے۔ ان موضوعات سے اردو نظم کے وقار میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

عشق و عاشقی جیسے موضوعات سے گریز کرتے ہوئے شعراء نے نظموں میں نئے رجحانات اور سیاسی و انقلابی، سماجی و معاشرتی اور دیگر موضوعات پر نئے آہنگ اور نئے طرز پر سوچنا شروع کیا۔ ملی و ثقافتی رجحان کو بھی اس دور میں زیادہ فروغ ہوا۔ چند اشعار، جن میں موجودہ رجحان پائے جاتے ہیں، نمونے کے طور پر دیے جاتے ہیں:

جمع ہیں قومی ترقی کے لئے ارباب قوم — رشک فردوس ان کے قدموں سے یہ شادی خانہ ہے
بسے ہوئے ہیں محبت سے جن کی قوم کے گھر — وطن کا پاس ہے ان کو سہاگ سے بڑھ کر
ہاں گوش حقیقت سے سنیں عاقل و دانہ — تقدیر کی گردش کا یہ پر درد فسانہ
جو صاحب تہذیب ہیں اور صاحب جوہر — ان میں بھی نہیں قوم کے ہمدرد میسر

(چکبست)

تو بڑھ کے بدر ہوگا جس طرح آسماں پر — ڈالے گا اپنی کرنیں اس تیرہ خاک داں پر
نہ گلوں کے اب ہیں وہ قہقہے — نہ وہ بلبلوں کے ہیں چہچہے
یا شفق کا کوئی ٹکرا ہے زمیں پر جلوہ گر — جام زریں میں ہے صہبائے احمر جلوہ گر
وادیٔ پر خار میں ایک مجمر سوزاں ہے تو — دامن کہسار میں ایک شعلۂ عریاں ہے تو
قصہ کہانیاں ہیں باتیں وہ اب کہاں ہیں — اے حسن عشق تیری گھاتیں وہ اب کہاں ہیں

(درگا سہائے سرور جہاں آبادی)

۱- جدید شاعری، ص ۴۰۹

نہ تھی پنہاں نقابوں میں یہاں عارض کی رنگینی — نہ تھے ناز و ادا مخفی یہاں پردہ کی چلمن میں
جہاں کا نقشہ بدلا مصطفیٰ کی ترکتازی نے — عرب کے صدر اول کا جنوں بروئے کار آیا
کاش یورپ جائے کوئی نکتہ ور اور یہ سبق — اٹھ کے دے تہذیب انسانی کے اس استاد کو
کر زندہ عرب کی رسم کہن — پھر ساری یہ دنیا تیری ہے
میرے موتی کوڑیوں کے بھاؤ بک جانے کو ہیں — نفع پہنچانے کو ہے میری گہر ریزی مجھے

(ظفر علی خاں)

دنیا میں بہت دوڑے — راحت کے تمنائی
تسکیں کی مگر صورت — تجھ میں ہی نظر آئی
تو مرکز ثبات ہے دور حیات کا — ہے تجھ سے اہتمام دو روزہ ثبات کا

(تلوک چند محروم)

جھینگر کے سروں سے ملتی ہے — لیمپ کی لو پون سے ہلتی ہے
ہزاروں راگوں کا اک راگ — لاکھ سروں کا ایک راز
روح میں بیٹھے، دل کے ہو پار
برکھا رت کی گھٹا چھائی ہے — بالوں کو کھولے رات آئی ہے

(عظمت اللہ خان)

وہ چاند سورج — نوری غبارے
وہ ندیاں ہیں — امرت کے دھارے
دنیا سے اونچے — پربت ہمارے

اگر دل میں سوچیں، نہ بولیں نہ چالیں
کوئی بات منہ سے نہ چاہے نکالیں
مگر پھر بھی سب کچھ خدا دیکھتا ہے

(حفیظ جالندھری)

اشکباری کی طرف مائل ہوا جاتا ہے دل — درد سا اٹھتا ہے سینے میں بھرا جاتا ہے دل
پھٹی دستار کا ہر تار ہے عنوان مجبوری — برہنہ پاؤں کا ہر نقش ہے نکبت کا افسانہ
لے کے قرآن درد الفت کا — مثل جبریل آ رہی ہے ہوا
یہ وہ انسان ہیں دامان شفقت میں جو پلتے ہیں — جہاں سوتا ہے اور یہ آبیاری کو نکلتے ہیں

(احسان دانش)

ہاں دور گزشتہ کی مہابت کا نشاں ہے — بانی عمارت کا جلال اس سے عیاں ہے
ہے مصیبت مال و دولت میں بڑی — موت کا دھڑکا ہے اس کو ہر گھڑی
قلب انسان ہی پہ کیا ہے مدار — کہ ہر اک دل میں ہے اسی کا شرار

(اسماعیل میرٹھی)

قومی وملی شاعری کا رجحان:

انقلابی اور اخلاقی شاعری سے اتنا ضرور ہوا کہ قوم میں ایک نیا شعور پیدا ہو گیا- کیونکہ قوم اتنی پست اور تنزلی کا شکار ہو چکی تھی- اسلاف کے کارنامے اور گراں قدر خدمات کو فراموش کر چکے تھے- جنگ آزادی کے بعد تو حالت بد سے بدتر ہو گئی تھی- ایسے میں مسلمان اکابرین اور شعراء نے اپنے اپنے طرز پر جو خدمات انجام دیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں- قوم کے مستقبل اور حال پر گہری نظر تھی، یہی وجہ تھی کہ شعراء نے قومی، سیاسی، سماجی، اصلاحی اور نیچرل نظمیں کہہ کر مردہ قوم کو جگایا- اس سے پہلے کی شاعری میں مدحیہ، بیانیہ غنائی شاعری کا رجحان تیز تھا- یہ موضوعات زیادہ تر غزلوں اور قصیدوں میں نظر آتے ہیں کیونکہ اس میں داخلی جذبات کو بڑا دخل تھا- قلبی واردات غزل اور قصیدہ ہی کا حصہ ہیں- بیسویں صدی کے شروع ہی میں شاعری متحرک ہونا شروع ہوئی اور اس میں وقت کے ساتھ قومی وملی تقاضوں کی ضرورت کو محسوس کیا گیا- لیکن جہاں تک وقت کے تقاضوں کا تعلق ہے تو اسے غزل پورا کرنے سے قاصر تھی- اس لئے شعراء نے نظم کا سہارا لیا- ایسے میں آزاد و حالی، اقبال اور ان کے بعد کے شعراء نے گراں بہا اضافہ کیا- خالصتاً یہی دور اردو نظم کا دور کہلاتا ہے-

حالی اور آزاد نے نظموں میں قومی وملی، سماجی تقاضوں کا بھرپور خیال رکھا- قوم کی بیداری میں جہاں جہاں افکار و خیالات کی ضرورت پڑی نظریات پیش کئے مثلاً عملی طور پر ''مدوجزر اسلام''، ''مسدس حالی''، ''برکھارت''، ''بیوہ کی مناجات'' وغیرہ- آزاد کی نظموں میں ''ابر کرم''، ''وداع انصاف''، ''مصور تہذیب'' یہی وہ اصلاحی پہلو تھا جو براہ راست نظموں میں فروغ پایا- ۱۸۵۷ء کے بعد قومی وملی تقاضوں کی عکاسی شاعری میں نظم کی صورت میں ظاہر ہوئی- قومی وملی شاعری میں اقبال نے جو نظمیں کہی ہیں ان میں ''ترانہ ہندی''، ''ہمالہ''، ''تصویر درد''، ''نیا شوالہ'' وغیرہ- اقبال نے اپنی نظموں میں عصری آگاہی کا جو شعور ہمیں دیا، اس سے قومی وملی تقاضوں کی عکاسی ہوتی ہے- ان کے ہاں حقیقت پسندی اور قومی وسماجی احساس کو اولیت دی گئی- انہوں نے بیمار قوم کا علاج ڈھونڈھ نکالا- وہ قوم جو غفلت اور بیزارگی کی زندگی بسر کر رہی تھی- انہیں اپنے پیغام اور قلب کو گرما دینے والی نظموں نے چونکایا- ان کی فکر کا دھارا صرف ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف نہیں بلکہ ملت کے رجحان کے تحت اپنی نظموں کے ذریعہ بیداری کا درس دیتے ہیں جس میں حرکت ہی حرکت نظر آتی ہے- وہ ناامیدی اور مایوسی کے قائل نہیں تھے- اقبال کی شاعری سے قومی وملی شاعری کا جو رجحان تقویت کا باعث بنا، اس میں اقبال کی فکر اور وطن سے بے پناہ محبت کا جذبہ کارفرما ہے- اقبال کے ہاں تضامین اور تراکیب کا ایک باقاعدہ نظام ملتا ہے- سید حامد اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اقبال نے تراکیب اور تضامین سے فکر اور جذبہ کو اظہار کی بیکراں وسعتیں عطا کیں- اس کی بدولت اردو شاعری کا افق اس قدر وسیع ہو گیا کہ اب پیچھے جاتے ہوئے گھٹن کا احساس ہوتا ہے- اس نے اردو شاعری کے مزاج کو خیال آرائیوں اور کج بیانیوں سے بیگانہ کر دیا- اس نے اردو شاعری کو انسانیت کے شانہ بہ شانہ اور قدرت کے روبرو کھڑا کر دیا- اس نے فکر کو جدت اور جذبہ کو سنجیدگی بخشی- شاعری کے اس عظیم سفر میں تراکیب اور تضامین سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں-''[۱]

قومی وملی شاعری میں جو بیداری کا عمل نظر آتا ہے وہ سرسید تحریک اور تہذیب الاخلاق کے مضامین ہیں- اس کے علاوہ

۱- اقبال کا فن، ص ۹۱

انجمن حمایت اسلام، انجمن پنجاب، جمال الدین افغانی کی تحریک ان سب نے قومی وملی جذبے کی بات کی ہے۔لیکن یہ عمل شاعری میں خاصہ تیز نظر آتا ہے۔ حالیؔ کی ''شکوۂ ہند'' قومی وملّی شاعری کی اعلیٰ مثال ہے۔شبلیؔ اور آزاد نے بھی اپنی نظموں میں قومی وملی جذبے کو ابھارا ہے۔برصغیر ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کسی نہ کسی انتشار کا شکار تھی۔اکثر ممالک جنگ کی لپیٹ میں تھے۔ایسے میں شبلیؔ نے ''طفل سیاست'' اور ''یادگار سلف'' اسی قومی جذبے سے سرشار ہوکر لکھیں۔اسماعیل میرٹھی نے بھی قومی وملی نغموں سے تشخص اجاگر کیا ہے مثلاً ''قصیدۂ نوائے زمستاں''، ''قصیدۂ جریدۂ عبرت'' اور ''قلعہ اکبرآباد''۔نظموں سے قومی وملی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ہندوستان میں یکے بعد دیگرے ایسے حالات وواقعات رونما ہوئے جس سے مسلمانوں کی زندگی تیرہ وتار ہوکر رہ گئی مثلاً مسجد شہید گنج مچھلی بازار کانپور کی شہادت۔اکبرالہ آبادی نے بھی اپنی نظموں کے ذریعہ قومی وملی حمیت وغیرت کو للکارا اور قوم کی رہنمائی کی۔اکبرالہ آبادی کی نظم ''افسانۂ مسلم'' اسی جذبے کے تحت لکھی گئی ہے۔

اقبالؔ نے تو قومی وملی شاعری کو آسماں پر پہنچادیا۔ان کی نظم ''صقلیہ'' میں جو قومی وملی جذبات نظر آتے ہیں، اس سے ان کے دل کی کیفیت اور جگر سوزی کا پتہ چلتا ہے۔''حضور رسالت مآبؐ'' میں اقبال نے طرابلس کے شہیدوں کا ذکر کر کے سب کو اشک بار کردیا۔''خضرراہ''، ''طلوع اسلام'' اور ''مذہب'' ان نظموں میں اقبال کا قومی وملی جذبہ دیکھا جاسکتا ہے۔اس وقت کے شعراء میں جو موضوعات گردش کررہے تھے ان میں ترکوں کی شکست کے اسباب، انقلاب روس، ہندوستان میں انگریزوں کا عمل دخل، مسلمانوں کی زبوں حالی، طرابلس کی جنگ بلقان کے ساتھ، جلیانوالہ باغ غرض ہندوستان میں جو افراتفری اور انتشار پھیلا ہوا تھا، اس پر زیادہ تر شعراء نے قومی وملی جذبے کے تحت نظموں میں کثیر گنج ہائے گراں مایہ چھوڑا ہے، جو تاریخ بھی ہے اور عہد کی عکاس بھی۔جوشؔ کی زیادہ تر نظمیں قومی وملی جذبے کے تحت ملتی ہیں۔شعراء کی نظموں سے مسلمانوں میں آزادی کی لہر اور سوتے ہوئے بخت جاگ گئے۔

انگریزوں کے اقتدار سے وطن پرستی کے جذبے کو تقویت ملی۔وطنیت اور ملی تصور نے بھی نئے ذہنوں کو بیدار کیا۔مغربی طرز فکر سے بھی لوگوں نے اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو کو محسوس کیا۔آزادی کے جذبے سے حب الوطنی اور قومی جذبات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔انجمن پنجاب کے مشاعروں میں موضوعاتی نظمیں اور حب الوطنی کے جذبے کو ابھارا گیا۔شعراء نے وطن پرستی کی علامت کو نظموں میں اُجاگر کیا۔حالی اور آزاد کی نظمیں ''حب وطن'' اس مثال میں پیش کی جاسکتی ہیں۔

حالی کے ہاں پہلے انفرادی شعور کارفرما تھا بعد میں انہوں نے اجتماعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے وطن پرستی کا شعور دیا لیکن محمد حسین آزاد نے اپنی ''مثنوی حب وطن'' میں ایک ایسا تصور پیش کیا جسے اتفاق اور اتحاد کا پہلا درس کہا جاسکتا ہے۔

انگریز اور ہندوؤں کی سازشیں مسلمانوں کے خلاف اس قدر تیز ہوتی جارہی تھیں، ان سازشوں کے خلاف مسلمان نبرد آزما ہوئے اور ایک سیاسی لائحہ عمل ترتیب دیا گیا۔بیسویں صدی کا آغاز وطنیت کے جذبے سے ہوا۔مختلف تحریکوں نے آزادی کی جدوجہد اور اس کے حصول میں نمایاں کردار ادا کیا۔اقبال کی نظم ''خضرراہ'' خالصتاً وطنیت، قومی وملی جذبے کے تحت لکھی گئی ہے، اقبال نے ہر اس ابلیسانہ طاقت اور سیاست پر تنقید کی ہے ؎

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبائیں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

ان دو شعروں میں سیاسی اور وطنی محبت اور بصارت کو دیکھا جا سکتا ہے، اقبال اپنی قوم سے کس درجہ پر امید ہیں۔ قوم کا ہر فرد قومی و ملی جذبے سے سرشار ہے، اقبال کا یہ کہنا کتنا درست ہے ؎

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

علامہ اقبال ایک بیدار مغز کی حیثیت سے پہلے ہی مسلمانوں کے ایک علیحدہ ملک کا تصور پیش کر چکے تھے۔ ''بانگ درا'' کی نظم ''پرندے کی فریاد'' اس نظم میں اقبال نے غلامی کا ذکر اپنے قلب کی گہرائیوں سے کیا ہے، یہی وہ نظم ہے جس سے اقبال کا حب الوطنی کا جذبہ ظاہر ہوا۔ اقبال کی شاعری کے اولین دور میں حب الوطنی کا جذبہ زیادہ قوی نظر آتا ہے۔ ۱۹۰۶ء تک کی نظمیں حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر لکھی گئیں۔ ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت''، ''ترانۂ ہندی''، ''نیا شوالہ''، ''تصویر درد'' یہی وہ نظمیں ہیں جو وطن کی محبت میں لکھی گئیں۔ پروفیسر مولانا محمد علم الدین سالک، اقبال اور وطنیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''علامہ مرحوم آزادی کے سچے پرستار تھے۔ اپنے ملک سے محبت رکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے شاعری کے اولین دور میں نہایت پر جوش نظمیں لکھیں، جن کے لفظ لفظ میں حب الوطنی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اس قسم کی نظموں میں ''تصویر درد'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس میں نہ صرف انہوں نے ہندوستان سے اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار کیا ہے بلکہ ان کی کمزوریوں کی نشاندہی بھی کی ہے، جن کی بدولت ہندوستان محکومی کی سختیاں برداشت کر رہا تھا۔'' [۱]

اس روشنی میں مسلمانوں نے اپنے لئے ایک علیحدہ ملک حاصل کرنے میں اپنے قومی تشخص کو اجاگر کیا۔ سرسید کی تحریک کو نقش اول کی حیثیت حاصل ہے لیکن اس کے علاوہ بھی آزادی کی کوششوں میں انجمنیں، ادارے بھی پیش پیش تھے۔ انجمن حمایت اسلام، سندھ مدرستہ العلوم اور دیگر تحریکیں اس بات کی غماز ہیں کہ اب وقت اور حالات کا تقاضا یہی ہے کہ مسلمانوں کا اپنا ایک الگ ملک ہو۔ سرسید تحریک سے جمال الدین افغانی تک کی جو کوششیں ہیں وہ تحریک کی صورت میں ہیں۔ تحریک خلافت اور تحریک ریشمی رومال نے بھی نمایاں کردار ادا کیا۔

شعراء نے حب الوطنی اور قومیت کے جذبے کو پر اثر اور درد انگیز طرز پر ابھارا۔ شاعری میں یہ بازگشت حالی، آزاد، شبلی اور پھر اقبال، چکبست، سرور جہاں آبادی، ظفر علی خاں، اسماعیل میرٹھی، اکبر الہ آبادی، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، احسان دانش، پروفیسر منظور حسین شور، ان تمام شعراء کے ہاں جدو جہد آزادی اور مسلمانوں کی علیحدہ قومیت، آزاد وطن کے تصورات ملتے ہیں۔ ریحان الحسن فاروقی اقبال کے نظریۂ قومیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اقبال نے اسلام دیس کے باسیوں کو جو اصلاً مصطفوی ہیں، اس بت کو خاک میں ملا دینے کا اذن دیا کیونکہ یہ غارت گر کاشانۂ دین نبوی ہے۔ کبھی یہ طعنہ دیا کہ ''امت احمد مرسل کو مقامی کرلو'' اس نے یہ بھی کہا کہ اسلام بذات خود ایک قومیت ہے اور زمانی اور مکانی قیود سے آزاد۔ یہ کالے اور گورے، عربی اور عجمی میں کوئی امتیاز نہیں رکھتی۔ ہر کلمہ گو کی ایک ہی قومیت ہے۔ اقبال اس قومیت کو ملت سے تعبیر کرتا ہے۔

۱۔ اقبال پر ۱۵ مقالات، ص ۷۵

فلسفۂ اجتماع کی روشنی میں وہ زور دیتا ہے کہ ملت کے ربط سے ہی اس کے افراد کا
تشخص ہوتا ہے اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں منکشف کرتا ہے کہ ''ربط وضبط ملت
بیضا ہے مشرق کی نجات'' ہر ریاست کو معاشرے کے نوک پلک سنوارنے کے لئے
ضروری ہے کہ اپنی سیاست کو اسی اخلاقی قدر کے تابع بنایا جائے - ورنہ ''جدا ہو دیں
سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی-''[1]

اقبال کی نظموں میں اسلامی احساسات کے ساتھ قومیت کے واضح نقوش، مسلمانوں سے دردمندی کا اظہار، وطن سے محبت کا اظہار یوں کیا ہے ؂

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے　　　جو پیرہن اس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے

ملت اسلامیہ پر جو نظمیں لکھی گئیں، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد شعراء نے نظم میں اسلامی تہذیب کو اجاگر کیا کیونکہ ہندوستان میں ہندوؤں کا کہنا یہ تھا کہ ہم ایک قوم ہیں جبکہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قوم ہیں- ان کے طور طریق الگ ہیں، ہمارا مذہب اور ان کا مذہب تفاوت لئے ہوئے ہے- اس لئے کسی بھی طرح ہم ایک قوم نہیں ہو سکتے - یہی وجہ تھی کہ ہمیں ایک الگ وطن کی ضرورت تھی، جہاں ہم اسلامی نظام اور اپنی تہذیب کو فروغ دے سکتے - اس جدوجہد میں مسلمانوں نے ہر طرح سے قربانی دی- اس آزادی کے حصول میں جان اور مال دونوں کا نقصان ہوا- لیکن ایک جذبہ تھا کہ آزادی حاصل کر کے رہیں گے اور آخر یہ جدوجہد رنگ لائی - ہندوستان تقسیم ہو کر رہا- ہندوستان میں ہندوؤں نے مسجدوں کے سامنے بینڈ باجے بجانے شروع کر دیئے تھے- گائے کی ذبیح پر پابندی عائد تھی، مسلمان گائے ذبح نہیں کر سکتے تھے یعنی ہر طرح سے مسلمانوں کا دائرہ تنگ کر رکھا تھا- انہی وجوہات کی بناء پر پاکستان کا حصول ناگزیر تھا- ہندوؤں نے جہالت کا جو طوفان اٹھایا ہوا تھا، تاریخ میں یہ واقعات درج ہیں، ان کے لیڈروں کی پالیسیاں اتنی ناقص تھیں کہ یہ لوگ اپنے آپ سے بھی مخلص نہیں تھے- ہندوؤں کے اندر بھی کئی ذاتیں ہیں جو ایک سانحہ سے کم نہیں- کم ذات کے لوگوں کو کمتر سمجھتے تھے- ہندو تقسیم در تقسیم کے جال میں جکڑے ہوئے تھے لیکن اس کے برعکس مسلمانوں کے ساتھ ان کا سلوک ناروا بلکہ ہتک آمیز رویہ جو انسانیت کے منافی تھا، جبکہ مذہب اسلام میں غیر مسلم کے ساتھ بھی رواداری، شرافت، ایثار اور خلوص کے برتاؤ کی تعلیم ملتی ہے- کشت وخون کا یہ بازار ۱۹۴۷ء کے وہ فسادات ہیں جو آزادی سے عبارت ہیں- اردو نظم میں ان واقعات کے ساتھ اسلامی فکر کو بھی فروغ دیا-

غزل اور دیگر اصناف نے یقیناً برصغیر کے کلچر کو اجاگر کیا ہے- برصغیر کے مسلمانوں کی اپنی ایک تہذیب ہے، جس میں مذہب، زبان، تاریخ اور ثقافت - ۱۹۴۷ء سے پہلے کی تاریخ نہایت افسوس اور کرب کے ساتھ لکھی گئی ہے-

مسلمانوں کا زوال اس بات کا آئینہ دار ہے کہ ایک طرف انگریز اور دوسری طرف ہندوؤں کا متعصبانہ طرز جس سے مسلمان افسردہ و بے حال ہوگئے، جہاں زندگی کے دیگر شعبوں میں مسلمانوں کا جانی و مالی نقصان ہوا، وہاں شعر و ادب کی بساط بھی الٹ گئی- غزل میں غالب، مومن، ظفر و ذوق اور پھر داغ جیسے اساتذہ فن غزل کی مشاطگی میں مصروف عمل تھے- حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر غزل پر اعتراضات اٹھائے اور نظم کی طرف متوجہ ہوئے- انجمن پنجاب کے جلسوں میں موضوعاتی نظمیں پڑھی جاتیں- آزاد و حالی نے یہ کام انجام دیا- حالی اور آزاد کی غزل مخالفت سے یہ ہوا کہ شعراء نے نظم گوئی کی طرف پوری توجہ مرکوز کر دی- نظم طباطبائی، اسماعیل میرٹھی نے مغربی نظموں کو اردو میں منظوم تراجم کرنا شروع کئے، غرض عظمت اللہ خاں اور وحید الدین سلیم

۱- جام نو - شمارہ خصوصی، کراچی، ص ۹۵

نے اردو غزل کی حمایت میں اپنی شاعری کو عوام میں متعارف کرایا۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں سیاسی شعلے بھڑک اٹھے۔ اردو ہندی تنازعہ اور اس کے علاوہ برصغیر کے رہنے والے ایک عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ یہ آگ ہندوؤں اور گاندھی کی لگائی ہوئی تھی۔ اردو زبان کی حفاظت کے لئے مولوی عبدالحق سینہ سپر ہوئے اور کئی بار گاندھی سے مڈبھیڑ بھی ہوئی۔ گاندھی ایک عیار آدی تھا۔ اس کے مقابلے میں مولوی عبدالحق جہاندیدہ اور نباض وقت تھے۔ پھر اس سے آگے کے سفر میں شبلی اور اقبال نے قومی و ملی شاعری کو اوج کمال تک پہنچا دیا۔ نظم جدید کا آغاز انہی اشخاص سے ہوا۔ جوش ایک بہادر سپاہی کی طرح مورچے پر ڈٹے رہے۔

انگریزوں کے خلاف اور ہندو تہذیب کے خلاف جوش نے خوب دل کھول کر لکھا۔ نظم گوئی میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ یہ دور اشتراکیت کا دور تھا۔ لینن اور مارکس کے نظریات شاعروں میں منتقل ہو رہے تھے۔ جس میں سردار جعفری، فیض، کیفی اعظمی، مجاز اور جانثار اختر نمائندگی کر رہے تھے، ان میں سب سے توانا آواز علی سردار جعفری کی تھی، جو ترقی پسند تحریک کے سرخیل مانے جاتے ہیں۔

ان اشخاص نے بھوک، افلاس، غربت، ناداری، روٹی، کپڑا کو موضوع بنا کر سماجیات کے مختلف موضوعات پر بے شمار نظمیں لکھیں اور نظم کو ایک نئے آہنگ سے روشناس کرایا۔ حالی و آزاد نے مناظر فطرت پر اور اسلامی پہلوؤں کو پیش نظر رکھا۔ ترقی پسندوں نے معاشرتی و معاشی پہلوؤں پر نظمیں لکھیں۔ ایک طرف یہ حضرات نظموں پر نظمیں لکھ رہے تھے تو دوسری طرف حفیظ جالندھری، احسان دانش اور اختر شیرانی نظم کے مختلف پیرائے میں تجربات کر رہے تھے۔ ان تینوں کے موضوع اپنی اپنی جگہ الگ طرز ادا خاص کا درجہ رکھتے ہیں۔ احسان نے مزدور کی بات کی، تو حفیظ نے شاہنامہ لکھ کر تہذیبی اقدار کو اسلامی نظریہ سے برتا۔ اختر نے رومان کا سہارا لیا اور نظم میں سانیٹ کے تجربے کئے۔

ابھی یہ تجربے چل ہی رہے تھے کہ ڈاکٹر دین محمد تاثیر، ڈاکٹر تصدق حسین خالد، میرا جی، یوسف ظفر، قیوم نظر اور مختار صدیقی نے حلقہ ارباب ذوق تحریک کے تحت آزاد نظم کی داغ بیل ڈالی۔ ان تمام شعراء کے ہاں نظم میں معاشرتی، معاشی، سماجی موضوعات ملتے ہیں۔ برصغیر کی سیاسی صورت حال کے پیش نظر ادب میں جو کروٹیں آئیں شعراء نے اس بدلتی ہوئی حالت کو شدت سے محسوس کیا۔ انسان انسان کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم تھا، کوئی بھی کہیں محفوظ نہیں تھا۔ اس افراتفری کی کیفیت کو شعراء نے نظموں میں اجاگر کیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد کے معاشرے کی تمدنی زندگی پر سب سے زیادہ اثرات ادب پر جو مرتسم ہوئے، ان کی نوعیت اخلاقی و مذہبی ہے۔ اس مضمون میں نعتیہ شاعری کا فروغ ہے۔ آزادی کے بعد پاکستان میں جو رجحانات اور میلانات نظموں میں نظر آتے ہیں، انہیں ارتقائی عمل ہی کہا جا سکتا ہے۔ جدید دور کی فکری اساس اخلاقی اور متصوفانہ طرز پر رکھی گئی۔ خواہ وہ ملی تشخص ہو یا معاشرتی ارتقاء، ثقافتی فروغ اور انسانی قدریں، یہ وہ تمام محسوسات ہیں جو ہمیں نظموں کے علاوہ ناول اور افسانوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ ناولوں میں ''اداس نسلیں''، ''خدا کی بستی''، ''صحرا نورد'' وغیرہ، اسی طرح ڈراموں میں بھی اسی طرح کی بازگشت نظر آتی ہے، پاکستانی ادب میں ڈرامہ کو جو اہمیت حاصل ہے، اسی ڈرامے کے ذریعہ ۱۹۴۷ء کے واقعات و رجحانات کو بہترین طریقہ پر پیش کیا جو کہ فسادات کی صورت میں سامنے آیا۔ آزادی کے حصول میں جن دشواریوں سے مسلمانوں کو گزرنا پڑا، ادیبوں اور شاعروں نے اپنے اپنے طور پر تاریخ قلمبند کر دی۔ تحریک پاکستان اور ۴۷ء کے بعد کے واقعات افسانوں میں اجاگر ہوئے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں میں قرۃ العین حیدر، احمد ندیم قاسمی، قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد، پاکستان بننے کے بعد جن مشکلات سے سابقہ پڑا، کن

کن مرحلوں سے گزرنا پڑا، کیا کیا تکالیف برداشت کرنا پڑیں، اس آزادی کے حصول میں کیسے کیسے بھرے گھر لٹے اور کس قدر بربادی کا سامنا کرنا پڑا، اس پر داستانیں ہی داستانیں رقم ہوتی رہیں۔ آبادی کا منتقل ہونا بھی ایک جانکاہ منظر پیش کرتا ہے۔ ایسے ہی حقائق کو ہمارے شعراء نے اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد سب سے بڑا مسئلہ معاشی تھا۔ روزگار نہ ہونے کے برابر تھے، جو تھے، وہ ہندوؤں کے کارخانے، ملیں تھیں، جنہیں وہ ہندوستان لے گئے۔ اس لئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان معاشی اعتبار سے اس وقت بھی شدید مشکلات میں تھا اور آج بھی ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ناعاقبت اندیشی، غلط پالیسیاں، حکمرانوں کی لوٹ کھسوٹ، سماجی اور سیاسی اعتبار سے پاکستان میں بے شمار مسائل کسی مردِ مومن کی تلاش میں آج بھی ہیں۔

غرض پاکستان اس وقت جس بحران کا شکار ہے، ان میں توانائی، سرمایہ کاری کا نہ ہونا، قرضوں کی ادائیگی، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ، وہ زمین جو سیم اور تھور سے ناکارہ ہو چکی ہے، صنعتی پیداوار میں کمی کا ہونا، تعلیمی معیار کا پست ہونا، پاکستان کے حصول کا مقصد تو یہ تھا کہ آزادی کے بعد مسلمان سکون کا سانس لے سکیں، یہاں انہیں کسی قسم کا خوف نہ ہو، اللہ اور اس کے رسولؐ کی حاکمیت ہو، مسلمان تہذیب، تمدن، ثقافت، اقدار و روایت اور اپنے اکابر و اسلاف کے بتائے ہوئے راستے پر بلا خوف عمل پیرا ہو سکیں اور ملک کو ترقی سے ہمکنار کریں۔ یہ وہ باتیں ہیں جنہیں محسوس کیا گیا۔ سیاسی اعتبار سے بھی اور ادبی حوالہ سے بھی۔ گاہے بہ گاہے ادباء اور شعراء نے، دانشوروں نے اس طرف متعدد بار نشاندہی بھی کی، اسلامی نقطۂ نگاہ سے بھی آگاہ کیا، ناولوں اور افسانوں کے ذریعہ بھی معاشرتی و سماجی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا۔ شاعری میں نظم کو جو عروج حاصل ہوا، موضوعات کی کثرت انہی واقعات سے اخذ ہے، یہ نقوش نظموں میں واضح نظر آتے ہیں۔

غرض ۱۹۴۷ء کے بعد کے معاشرے کی تمدنی زندگی کا عکس ان حوالوں سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ ادب ہی وہ زندہ اور توانا عمل ہے جو جاری رہتا ہے۔ وقت کی نبض پر ادیبوں اور شاعروں کا ہاتھ ہوتا ہے، جسے وہ لحہ لحہ دیکھتے رہتے ہیں، محسوس کرتے ہیں اور پھر انہیں شعری قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ افسانوں میں واقعات کی صورت منظر پیش کر دیتے ہیں، جو تاریخ بن جاتی ہے اب اسے دیدۂ حیرت سے دیکھئے یا پھر دیدۂ عبرت سے۔ اس آئینے میں وہ سب کچھ نظر آئے گا جو کچھ ہم نے پاکستان بننے کے بعد کیا اور وہ بھی جو پاکستان کے حصول میں ہمارے اکابر کا کردار رہا ہے۔ آج کا اردو ادب خاص کر شاعری زندہ ثبوت ہے۔

قیام پاکستان کے بعد اردو نظم نے بھی کروٹیں لیں۔ ہیئت کے تجربے تو قیام پاکستان سے بہت پہلے ہی ہو گئے تھے۔ جدید اردو نظم اپنے شباب پر تھی کہ فسادات نے نئے موضوعات کو جنم دیا۔ ترقی پسندوں نے انقلاب کا نعرہ لگایا۔ ان کے ہاں نظم اور افسانوں میں جذباتی انداز پایا جاتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ادب میں جو رجحانات تیزی سے محسوس کئے گئے اور اس کے نتیجہ میں اسلامی ادب کی طرف ادیبوں نے غور کرنا شروع کیا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ پاکستان کا حصول اور اس کا مقصد صرف اور صرف مذہب تھا، اسی کو بنیاد بنا کر ادیبوں نے ملی جذبہ کو اجاگر کیا۔ اسلامی احیاء پرستی کا یہ رجحان اتنا توانا تھا، اس کی جڑیں مضبوط ہوتی چلی گئیں اور یہ رجحان غالب آیا کہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے۔ اس لئے مذہب اور قومی حوالہ سے افسانے اور نظمیں لکھی جانے لگیں، جو خالصتاً ملی تشخص کو اجاگر کرتی ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے حوالہ سے دو موضوع نہایت اہم ہیں، جنہیں شعراء نے نظموں میں اجاگر کیا۔ ایک تو فسادات اور دوسرے ہجرت۔ فسادات سے ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور دوسرے ہجرت کا کرب۔ دراصل اسلامی ادب ترقی پسند تحریک کا ردِ عمل تھا۔ پاکستان اپنی ترقی کے سفر پر گامزن تھا کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ سے حالات نے نئی کروٹ لی اور فکر کا دھارا بدلا۔ جنگ میں جو جذبہ ابھر کر سامنے آیا، وہ حب الوطنی کا تھا۔ وطن کی محبت میں شعراء نے وہ نظمیں لکھیں جن کو سن کر دل گرما جائیں مثلاً یہ مصرعہ دیکھئے ''اے وطن ہم ہیں تیری شمع کے پروانوں میں''۔

دوسرا شعر بھی دیکھئے ـ

اے مرد مجاہد جاگ ذرا

اب وقت شہادت ہے آیا

یہ وہ کیفیات تھیں جن سے پاکستانی قوم ایک اسلامی جذبہ سے سرشار تھی۔

اس عمل سے مسلمان تشخص اور پاکستان کا وقار ابھر کر سامنے آیا۔ ان نظموں میں جو رموز و علائم برتی گئیں، وہ بھی تشخص کو اجاگر کرنے میں خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ۴۷ء کے بعد نظم میں ایک نیا موڑ آیا۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ آزادی سے پہلے ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق ان دونوں تحریکوں کے موضوعات فسادات، ظلم، درندگی، بھوک، افلاس قرار پائے۔ ان تحریکوں کے ذریعہ شعراء میں انقلابی کیفیت اور ملی رجحانات کو فروغ حاصل ہوا لیکن اس کے ساتھ ساتھ رومان، سیاست اور سماجی محرکات، معاشرتی لحاظ سے مختلف ناانصافیوں پر نظموں میں وہ جذبہ اجاگر ہوا۔ یہ ایک ایسی ضرورت تھی جسے ہم تقاضائے وقت ہی کہہ سکتے ہیں۔ اگر ہم ۴۷ء کے بعد کی نظموں کا مطالعہ کریں تو ہمیں کرب کے ساتھ ایک محرومی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ان نظموں میں ہیئت کے تجربے بھی ہیں، علامت سازی بھی اور مجبور انسان کی داستان بھی۔

جبکہ ترقی پسند شعراء نے نظم آزاد، معریٰ نظم اور پابند نظم میں بہت کچھ مواد فراہم کیا۔ جن میں علی سردار جعفری، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی وغیرہ۔ پاکستان بننے کے بعد جن شعراء نے اس میں اضافہ کیا ان میں انیس ناگی، جیلانی کامران، عباس اطہر، یہ وہ شعراء ہیں جن کا تعلق حلقۂ ارباب ذوق خاص طور پر میراجی اور ن۔م۔ راشد سے زیادہ متاثر ہیں۔ ان کے علاوہ منیر نیازی، افتخار عارف، افتخار جالب، حبیب جالب، عارف عبدالمتین، ساقی فاروقی، ڈاکٹر وزیر آغا، ابن انشاء، سلیم الرحمٰن، آزادی سے پہلے حفیظ جالندھری، حفیظ ہوشیار پوری، فیض، احمد ندیم قاسمی، مجید امجد، قتیل شفائی، مصطفیٰ زیدی، پروفیسر شور، سلیم احمد، عزیز حامد مدنی، شہزاد احمد، آزادی کے بعد پاکستان میں خواتین شاعرات نے بھی ملک کے درپیش مسائل کرب، محرومی، نامسائد حالات، معاشرتی زبوں حالی کو شدت سے محسوس کیا اور نظموں میں تبدل کا سلسلہ جاری ہے۔ اس لحاظ سے خواتین کی کاوشات قابلِ ستائش ہیں۔ ان شاعرات میں فاطمہ حسن، پروین شاکر، زہرہ نگاہ، کشور ناہید، گوہر سلطانہ اعظمی، صفیہ شمیم، فہمیدہ ریاض، شائستہ حبیب، پروین فنا سید، ادا جعفری وغیرہ نے معاشرتی و سماجی پہلوؤں کو اجاگر کیا۔

اردو نظم میں ۴۷ء کے بعد ان شعراء اور شاعرات نے گرانقدر اضافہ کیا۔ ہیئت اور مواد سے نظم کے دامن کو وسیع تر کر دیا۔ خاص طور پر نظم میں علامت اور واقعیت، رموز علائم، اس فکر کے علاوہ ایک اور نئی فکر جسے ہم ٹوٹے ہوئے انسان کی کراہ کہہ سکتے ہیں، مجبور انسان کی داستان کہہ سکتے ہیں، جو غربت اور بھوک سے تنگ آ کر بھی صبر و شکر کا پیکر بنا رہا، صرف اس لئے کہ اسے آزادی درکار تھی اور اس آزادی میں مال و متاع تو لٹا چکے، پر دنیا کے نقشہ پر پاکستان کندہ کرا دیا۔ یہی آزادی مستقبل قریب میں نئی خوشیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے ہمارے ادیب، شعراء، دانشور، ہر مکتبۂ فکر کے لوگ، پاکستان کو بہتر سے بہتر بنانے کی فکر میں ہیں۔ ان سب سے نمایاں کام ادیبوں اور شعراء کا ہے، جنہوں نے ملک و قوم کی تقدیر بدل دی۔ جہاں جوش و اقبال جیسے شاعر ہوں، وہ قوم کبھی نامراد نہیں ہو سکتی۔ ان کی نظموں میں انسان بیداری کا جو پیغام ہمیں ملتا ہے، اس کی زندہ مثالیں ان نظموں میں دی جا سکتی ہیں جو بال جبریل، ضرب کلیم اور بانگ درا اسی طرح جوش کے سترہ مجموعے، جن میں سیف و سبو، رامش و رنگ، حرف و حکایت، الہام و افکار، شعلہ و شبنم اور بھی مجموعے، اس بات کی شہادت دیں گے کہ بعد کے آنے والوں میں ملی تشخص کا جذبہ، حب الوطنی، اس کے برعکس ذہنی ناآسودگی، کرب و غم، محرومی ان تمام موضوعات پر اتنا کچھ لکھ دیا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے، اب جو نظم

ہمارے سامنے ہے، اس میں مغربی پرتو، ہیئت کے تجربے، علامات، ان سب کو مدنظر رکھتے ہوئے عالمی تناظر میں مزید روشن امکانات ہیں۔ اردو نظم کا فروغ قابل فخر ہے۔

قومی و ملی شاعری کا سب سے بڑا محرک ملک کی تقسیم ہے کیونکہ ان واقعات و رجحانات کی روشنی میں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ایک اہمیت حاصل ہے، اور وہ ہے آزادی۔ ہندوستان کی تقسیم۔ اس طرف سے اس طرف اور اس طرف سے اس طرف منتقلی، گو کہ آزادی پر دستخط اور حصول میں کوشش اس بات کا پتہ دیتے ہیں، یہ سب معاملے پر امن طریقہ پر طے پائے مگر انتقال آبادی کی داستان بری خوں ریز، گہہ مقتل کی داستان ہے، جسے پڑھ کر اور سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں پر ہندوؤں اور سکھوں کی بربریت، ظلم، قتل و غارت تاریخ میں رقم ہے۔ ۱۹۴۷ء کے یہ وہ آنسو ہیں جنہیں آج محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس آزادی میں جو کشت و خون بہا ہے، اس کا اندازہ اسی وقت لگایا جا سکتا ہے جب ہم اپنی تاریخ اور شعر و ادب کا مطالعہ کریں۔ ادباء اور شعراء نے اپنی نظموں اور افسانوں کے ذریعے جیتی جاگتی تصویریں اتار کر رکھ دیں کیونکہ ترقی پسند اور حلقۂ ارباب ذوق اپنے اپنے دائرۂ فکر میں نظم کو وسعت دے رہے تھے کہ پاکستان کا وجود عمل میں آگیا، یہ خون آشام ہولی جس سے بہت سے گھروں کے چراغ گل ہو گئے، عورتیں بیوہ ہو گئیں، بچے یتیم ہو گئے، ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم تھا، مسلمان تو پہلے ہی ناگفتہ با زندگی بسر کر رہے تھے، روزگار کے دروازے تو پہلے ہی بند ہوئے تھے، لیکن آزادی کے جذبے نے انہیں ہر قربانی دینے کے قابل رکھا اور آخر کار سرخرو ہوئے۔ اس آزادی کے پیچھے ایک خون کا دریا بہتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس آزادی میں کتنے شہیدوں کا لہو شامل ہے، ان تمام واقعات و رجحانات کی تفصیل نظموں میں جس طریقہ سے عکاسی کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ واقعات اور رجحانات، جس میں وطن پرستی کا تصور نظموں میں دیکھا جا سکتا ہے ؎

مرے جہاں میں سمن زار ڈھونڈنے والے
یہاں بہار نہیں آتشیں بگولے ہیں
دھنک کے رنگ نہیں سرمئی فضاؤں میں
افق سے تا بہ افق پھانسیوں کے جھولے ہیں
پھر ایک منزل خونبار کی طرف ہیں رواں
وہ رہنما جو کئی بار راہ بھولے ہیں

رواں ہے قافلۂ ارتقائے انسانی
نظام آتشیں و آہن کا دل ہلائے ہوئے
بغاوتوں کے دہل بج رہے ہیں چار طرف
نکل رہے ہیں جواں مشعلیں جلائے ہوئے
تمام ارض جہاں کھولتا سمندر ہے
تمام کوہ و بیاباں ہیں تلملائے ہوئے

ساحر لدھیانوی[۱]
(لہو نذر دے رہی ہے حیات)

۱۔ تلخیاں، ص ۱۰۱

میرے محبوب وطن! تیرے مقدر کے خدا
دست اغیار میں قسمت کی عناں چھوڑ گئے
اپنی یک طرفہ سیاست کے تقاضوں کے طفیل
ایک بار اور تجھے نوحہ کناں چھوڑ گئے
پھر وہی گوشۂ زنداں ہے وہی تاریکی
پھر وہی کہنہ سلاسل، وہی خونیں جھنکار
پھر وہی بھوک سے انساں کی ستیزہ کاری
پھر وہی ماؤں کے نوحے، وہی بچوں کی پکار

ساحرلدھیانوی [۱]
(پھر وہی کنج قفس)

۱۹۴۷ء کے بعد کے معاشرے کی تمدنی زندگی کا عکس مندرجہ ذیل نظم میں ملاحظہ کیجئے ـــ

جینے سے دل بیزار ہے
ہر سانس ایک آزار ہے
کتنی حزیں ہے زندگی
اندوہ گیں ہے زندگی
وہ بزم احباب وطن
وہ ہم نوایان سخن
آتے ہیں جس دم یاد اب
کرتے ہیں دل ناشاد اب
گزری ہوئی رنگینیاں
کھوئی ہوئی دلچسپیاں
پہروں رلاتی ہیں مجھے
اکثر ستاتی ہیں مجھے

ساحرلدھیانوی [۲]
(سرزمین یاس)

روایت کی تشکیل نو کو حالی کے آئینے میں دیکھیے ـــ

جہان کہنہ کے مفلوج فلسفہ دانو
نظام نو کے تقاضے سوال کرتے ہیں
یہ شاہراہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا
کہ ان پہ دیس کی جنتا سسک سسک کے مرے
زمیں نے کیا اسی کارن اناج اگلا تھا
کہ نسل آدم وحوا بلک بلک کے مرے
خموشی ہونٹوں سے دم توڑتی نگاہوں سے

۱- تلخیاں، ص ۸۴
۲- تلخیاں، ص ۱۳

بشر بشر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں

ساحر لدھیانوی[1]

(بنگال)

نظموں میں ملی تشخص کی بازیابی کا سفر ملاحظہ کیجئے ؎

دبے گی کب تلک آواز آدم ہم بھی دیکھیں گے
رکیں گے کب تلک جذبات برہم ہم بھی دیکھیں گے
چلو یوں ہی سہی یہ جور پیہم ہم بھی دیکھیں گے
در زنداں سے دیکھیں یا عروج دار سے دیکھیں
تمہیں رسوا سر بازار عالم ہم بھی دیکھیں گے
ذرا دم لو مال شوکت جم ہم بھی دیکھیں گے
بہ زعم قوت فولاد و آہن، دیکھ لو تم بھی
بہ فیض جذبۂ ایمان محکم، ہم بھی دیکھیں گے

ساحر لدھیانوی[2]

(آواز آدم)

جہاد ختم ہوا دورِ آشتی آیا
سنبھل کے بیٹھ گئے محملوں میں دیوانے
ہجوم تشنہ لباں کی نگاہ سے اوجھل
جھلک رہے ہیں شراب ہوس کے پیمانے
یہ جشن، جشن مسرت نہیں، تماشا ہے
نئے لباس میں نکلا ہے رہزنی کا جلوس
ہزار شمع اخوت بجھا کے چمکے ہیں
یہ تیرگی کے ابھارے ہوئے حسیں فانوس
یہ شاخ نور جسے ظلمتوں نے سینچا ہے

ساحر لدھیانوی

(مفاہمت)

اسلامی جوش و خروش ان نظموں کا امتیاز رہا ہے، شبلی نے ان واقعات کو نظم کے پیرائے میں بھی بیان کیا ہے ؎

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے　　دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں، خود مگر　　بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں

۱- تلخیاں، ص ۵۵

۲- تلخیاں، ص ۹۹

آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر نیند آگئی ہے منتظر نفخ سور ہیں
کچھ نوجواں ہیں بے خبر نشۂ شباب ظاہر میں گرچہ صاحب عقل شعور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم آئی یہ صدا ہم کشتگان معرکۂ کان پور ہیں

(سانحہ کانپور)[1]

لاکھ مصیبت اک سلجھاؤ لاکھ بگاڑ اور ایک بناؤ
لاکھ دکھوں کا ایک علاج
اپنے دیس میں اپنا راج
خود ہی بگڑنا خود ہی سنورنا اپنے بل پر آپ ابھرنا
اپنے ہاتھ میں اپنی لاج
اپنے دیس میں اپنا راج
اپنی عدالت اپنی گواہی اپنی حکومت اپنی تباہی
اپنا تخت اور اپنا تاج
اپنے دیس میں اپنا راج

(اپنا راج)

زندگی ہے تو کوئی بات نہیں ہے اے دوست
زندگی ہے تو بدل جائیں گے یہ لیل و نہار
یہ شب و روز، مہ و سال گزر جائیں گے
ہم سے بے مہر زمانے کی نظر کے اطوار
آج بگڑے ہیں تو اک روز سنور جائیں گے

(چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز)[2]

سن لیں یہ جہاں والے اب جیت ہماری ہے، اب جیت ہماری ہے
ہم پرچم آزادی لہراتے ہوئے آئے
طوفان کی لہروں کو شرماتے ہوئے آئے
سنگین چٹانوں سے ٹکراتے ہوئے آئے
وہ دیکھنا دشمن پر پھر خوف سا طاری ہے، اب جیت ہماری ہے
ہر سمت بڑھیں فوجیں ہر سمت قدم اٹھے
وہ بیٹھ گئے دشمن میدان میں ہم اٹھے
وہ ظلم نے دم توڑا وہ جور و ستم اٹھے

۱- حیات شبلی، ص ۲۸۱

۲- انجمن، ص ۲۳۲

اب عدل کا دور آیا، اب عدل کی باری ہے
اب جیت ہماری ہے، اب جیت ہماری ہے

(پرچم آزادی)[۱]

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے آزادی اور اس کے بعد کے مناظر کو نظم میں پیش کیا ہے، ملاحظہ کیجیے ؂

ایک کھوئی ہوئی منزل پہ پہنچنے کے لئے
ہم کئی راہگزاروں سے گزر کر آئے
خارزاروں سے، بیابانوں سے ویرانوں سے
موت کے خوف سے سہمے ہوئے میدانوں سے
کرب و آلام کے طوفانوں سے ٹکراتے ہوئے
زندہ لاشوں کے مزاروں سے گزرر کر آئے

(سراغ منزل)[۲]

اک ابر سیہ تھا گھر کے آیا
سنسان پڑے ہوئے تھے میدان
سونی تھی فضائے دشت و کہسار
خاموش تھے گلشن و چمن زار
افسردہ بہار ہو رہی تھی
آغوش خزاں میں سو رہی تھی
طاری تھی دلوں پہ اک اداسی
چھایا تھا جہان پہ غم کا سایا
خورشید کی تیز روشنی نے
اس ابر سیہ کو چیر ڈالا
ہر سمت چمک اٹھا اجالا

(اک ابر سیہ تھا گھر کے آیا)[۳]

فیض احمد فیض نے ''صبح آزادی'' کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے، اس میں واقعات و رجحانات کے نقوش واضح نظر آتے ہیں ؂

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں

۱- انجمن، ص ۲۲۷
۲- انجمن، ص ۲۲۲
۳- انجمن، ص ۲۲۸

یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
جواں لہو کی پراسرار شاہراؤں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
بہت قریں تھاں حسینان نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنا، دبی دبی تھی تھکن
جگر کی آگ، نظر کی امنگ، دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگار صبا، کدھر کو گئی
ابھی چراغ سر رہ کو کچھ خبر ہی نہیں

(صبح آزادی)[1]

فیض کی یہ نظم دیکھئے، جس میں کرب کے ساتھ زیست اور موت کا رقص بھی ہے اور امید و یاس کے چراغ بھی۔ واقعات و رجحانات کو کس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے، ملاحظہ کیجئے ؎

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے
سولیوں پہ ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی
قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے
کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم
جاں گنوا کر تری دلبری کا بھرم

۱- دست صبا، ص ۲۶

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

(ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے) [1]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور انگریزوں کو اقتدار کی منتقلی، انہی حالات و واقعات کی روشنی میں اقبالؔ نے ایک نظم لکھی جس کا عنوان ''پرندے کی فریاد'' تھا۔ اس نظم میں غلامی کی طرف اشارہ ہے اور حب وطن ہونے کا احساس بھی۔ ملک و ملت کو اس درجہ عزیز رکھتے تھے جیسے کوئی اپنی جاں کی حفاظت کرتا ہے۔ اقبال کی بے شمار نظمیں ایسی ملیں گی جن میں حب الوطنی کے جذبات نمایاں ہیں مثلاً ''ترانۂ ہندی''، ''تصویر درد''، ''نیا شوالہ''، ''وطنیت بحیثیت ایک سیاسی تصور''، ''ہمالہ''۔ ان نظموں کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبالؔ وطن سے کتنی محبت کرتے تھے اور انہیں اپنی قوم کی تنزلی کا کتنا شدید احساس تھا۔ وطن کی محبت میں ایسے پرجوش نغمے جس کی بازگشت دیگر ممالک میں بھی نظر آتی ہے، یہی وہ دل کی آواز تھی جو عالمگیری سطح پر سامنے آئی۔ علامہ اقبال اپنی نظم ''پرندے کی فریاد'' میں اپنے اس جذبات کا اظہار کر رہے ہیں جو اہل وطن کے جذبات تھے۔ اس نظم میں سارا زور آزادی اور غلامی کے فرق کو ظاہر کرتا ہے۔

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ — وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی — اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم — شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا
وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت — آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانہ

آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں

کیا بد نصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں — ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں
آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں — میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں

اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں
آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

(پرندے کی فریاد) [2]

وطن پرستی کے حوالے سے ''ترانۂ ہندی'' میں جو جوش و ولولہ نظر آتا ہے اقبالؔ کی وطن سے دلی محبت کا اظہار ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں — سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستان ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے — اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

۱۔ زنداں نامہ، ص ۱۱۵

۲۔ بانگ درا، ص ۶۳

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری ‏ ‏ ‏ صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا

اقبال! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں

معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا

(ترانۂ ہندی) [1]

اقبالؔ کی یہ نظمیں پہلے دور سے تعلق رکھتی ہیں اور ان نظموں کی خاص وجہ دلی کیفیات کی آئینہ دار ہیں- حب الوطنی کا جذبہ اقبالؔ کے ہاں کبھی ماند نہیں پڑا بلکہ اس جذبے میں تیزی اور عقیدت بڑھتی گئی- اسی وجہ سے ''تصویر درد'' میں وطن سے محبت اور عقیدت منتہائے عروج پر نظر آتی ہے-

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا ‏ ‏ ‏ لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا

جلانا ہے مجھے ہر شمع دل کو سوز پنہاں سے ‏ ‏ ‏ تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا

مگر غنچوں کی صورت ہوں دل درد آشنا پیدا ‏ ‏ ‏ چمن میں مشیت خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو ‏ ‏ ‏ جو مشکل ہے، تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

مجھے اے ہمنشیں! رہنے دے شغل سینہ کاری میں ‏ ‏ ‏ کہ میں داغ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا

دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے

تجھے بھی صورت آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا

(تصویر درد) [2]

''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' نظم میں اقبالؔ نے اپنے دل کی گہرائیوں سے اس جذبہ کا اظہار کیا ہے جو شرط مومن کے ساتھ وابستہ ہے- وطن کی محبت میں سرشار ہو کر پیغام حق لوگوں تک پہنچانا اور اللہ کی برگزیدہ ہستیوں کی تکریم اور ان کا پیغام اس کے علاوہ دیگر مذاہب کا احترام اور ان کے پیشواؤں کی عزت اقبال کے کلام سے نمایاں ہے-

''میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے'' ایک نئے وطن کی طرف اشارہ ہے جس کا خواب علامہ اقبال نے دیکھا تھا، وہ وطن پاکستان ہے- اس مصرعہ کی تکرار ہمیں بتا رہی ہے کہ علامہ کو تلاش ہے، جستجو ہے، اس جیسے جتنے نغمے فضا میں گونج رہے ہیں، ان نظموں میں مستقبل کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے- تقسیم بعد کا مسئلہ ہے- اقبال مسلمان پہلے ہیں، اس لئے انہوں نے اپنی فکر کی بنیاد کسی ایک خطے سے منسلک کر کے خود کو محدود نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ ''سارا جہاں ہمارا'' کیا لطیف اشارہ ہے کہ جب جہاں کا خالق رب العالمین ہے تو ہم اس کی مخلوق ہیں- وہ خالق کائنات ہے تو ہم کائنات کا ایک حصہ ہیں- اس جہاں کو اپنا کہنے کا یہ ڈھنگ اچھوتا بھی ہے اور نرالا بھی- جس میں پیار بھی جھلکتا ہے اور عقیدت بھی- اقبالؔ کے اس جذبے کو دو آتشہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا، ان کے دل میں مذہب کا عشق بھی ہے اور وطن کی محبت بھی-

چشتیؒ نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا ‏ ‏ ‏ نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا

تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا ‏ ‏ ‏ جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

۱- بانگ درا، ص۸۲

۲- بانگ درا، ص۶۷

بندے کلیم جس کے، پربت جہاں کے سینا　　نوح نبی کا آ کر ٹھہرا جہاں سفینہ
رفعت ہے جس زمیں کی بام فلک کا زینہ　　جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

(ہندوستانی بچوں کا قومی گیت) [۱]

علامہ اقبال نے ''نیا شوالہ'' عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس میں خالصتاً برہمن کی طرف اشارہ بھی ہے اور طنز بھی- برہمن کو مخاطب کر کے یہ بار آور کرایا ہے کہ تو صرف پتھر کی بنائی ہوئی مورتیوں کو خدا سمجھتا ہے، یہ محض تیرا خیال ہے- اقبال کہتے ہیں اب ہمارا عقیدہ بھی دیکھ ہر چیز میں وہی وہ ہے، اس نظم میں وحدت الوجود کا نظریہ بھی ہے اور وطن سے محبت کا اظہار بھی- اس لئے اقبال کی یہ نظم ایک موثر نظم ہے، اس میں نظریہ ہے، پیغام ہے، جذبات کی عکاسی، وطن پسندی، سبھی کچھ اس نظم میں موجود ہے —

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے　　تیرے صنم کدوں کے بت ہوگئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا　　جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا　　واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتیوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

(نیا شوالہ)

علامہ اقبال کی شاعری میں فن آرٹ بن کر سامنے آتا ہے- معاصرین میں ان کی شاعری کا آہنگ جدید رنگ لئے ہوئے ہے- اس کی خاص وجہ ہے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کا زمانہ علامہ نے یورپ میں بغرض تعلیم گزارا- وہاں مشاہدات، تجربات اور جدید علوم کی روشنی میں مغربی علوم سے استفادہ کیا- اس سے شاعری کا مزاج رنگ و آہنگ تبدیل ہو چکا تھا اور جدیدیت کلام میں ظاہر ہونے لگی تھی- وہ پودا جسے حالی، شبلی اور اکبر نے لگایا تھا- اقبال نے فکر نو سے شاعری میں جدید رنگ میں نظمیں لکھ کر اس کو تناور درخت بنا دیا- آنے والی نسلیں اس درخت سے فیضیاب ہو رہی ہیں-

قومی و ملی شاعری کے رجحان کے تحت جن شعراء نے نظمیں لکھی ہیں، ان کی تعداد خاصی طویل ہے- یہاں اختصار کے پیش نظر دو دو شعر پر اکتفا کیا جاتا ہے تاکہ نظموں میں قومی و ملی رجحان کو دیکھا جا سکے- ان نظموں میں اقبال کے اثرات کو دیکھا جا سکتا ہے —

قسم ان من چلوں کی، موت کو جو زیر کرتے ہیں
منوں مٹی کے نیچے دفن ہو کر بھی ابھرتے ہیں
قسم اس عزم کی جو سینۂ ہمت ابھارے گا
کہ اے میرے وطن، جیسے ہی تو مجھ کو پکارے گا

جوش

دیکھنا، اہل وطن، ساعت جہد آ پہنچی
اب کوئی نقش بدیوار نہ ہونے پائے
دشت میں خون حسین ابن علی بہہ جائے

۱- بانگ درا، ص ۸۷

بیعت حاکم کفار نہ ہونے پائے

مصطفیٰ زیدی

بنائے وحدت ملت یہی آئین برحق ہے
کہ ملت کے تحفظ پر قیام دین برحق ہے
جو ملت کے مقابل تیغ خنجر لے کے آجائے
تحفظ کے لئے جز قتل اس دم کیا کیا جائے

ابوالاثر حفیظ جالندھری

نکہت و رنگ و آہنگ کی انجمن
اے وطن، اے وطن، اے وطن، اے وطن
سر بہ سر جلوہ گاہ بہاراں ہے تو ذرہ ذرہ ترا جنت آرزو
نازش گلستاں تیرے دشت و دمن
اے وطن، اے وطن، اے وطن، اے وطن

جون ایلیا

ساتھیو! مجاہدو! جاگ اٹھا ہے سارا وطن
آج مظلوم، ظالم سے ٹکرائیں گے
آج طاقت زمانے سے منوائیں گے
سامراجی خداؤں پہ چھا جائیں گے
ساتھ ہیں مرد و زن سر پہ باندھے کفن

حمایت علی شاعر

چرخ ایثار کے تابندہ ستارے ہو تم
وطن پاک کی عظمت کے سہارے ہو تم
مجھے خود اپنے ہی نغموں سے بھی پیارے ہو تم
بزم میں پھولوں کی مہکار ہو شبنم کا جمال
امن کے دور میں ہو مہر و محبت کی مثال

احمد ندیم قاسمی

مرے شہید! ترے خون کے چراغوں سے
ترے وطن کے اندھیروں نے روشنی پائی
نشان راہ عمل ہیں ترے نقوش قدم
کہ تیری موت سے ایمان نے زندگی پائی

ادا جعفری

قوم کو زندگی دینے والو سلام اے شہیدو سلام اے شہیدو سلام
تم سے روشن فضاؤں میں شمع یقیں
تم سے تابندہ ہے حوصلوں کی جبیں

صہبا اختر

یہ ارض وطن، مہر بداماں و جہاں تاب
یہ شاعر مشرق کے تخیل کا حسین خواب
یہ قائداعظم کا اجالا ہوا مہتاب
یہ صبح درخشاں کا وطن میرا وطن ہے

یوسف ظفر

اے میرے وطن تیری فضا کتنی بھلی ہے
جنت سے بھی پیاری تری ایک ایک گلی ہے

قتیل شفائی

اے وطن اے جان من تیرے جیالوں کے نثار
حق کی خاطر اہرمن سے لڑنے والوں کے نثار

امید فاضلی

اے میرے پیارے وطن کی سرزمیں
اے وطن کی سرزمیں
زعم باطن کو مٹانا ہے ابھی
ظلم کی بنیاد ڈھانا ہے ابھی

صہبا لکھنوی

جاں سے پیاری ہے ہم کو تیری آبرو
تیری رگ رگ میں بھر دیں گے اپنا لہو
اور مہکائیں گے یہ گلاب و سمن
اے زمین وطن اے زمین وطن

حزیں لدھیانوی

اے ارض وطن اے پاک وطن ہم تجھ سے وعدہ کرتے ہیں
ہم تیری راہ میں اپنے لہو کی مشعل روشن کر دیں گے

اطہر نفیس

برق تاباں مانگتی ہو جن کے تنکوں سے پناہ
وہ چمن پیدا کریں وہ آشیاں پیدا کریں

اپنے ہر نقش قدم پر ثبت کر دیں انقلاب
دھوپ سے سایہ زمیں سے آسماں پیدا کریں

منظور حسین شور

قوم میں ایمانی جذبے کو ابھارنے میں ہمارے شعراء نے جو کارنامے سرانجام دیئے، ان کی نظمیں اس بات کی آئینہ دار ہیں کہ قوم پوری طرح بیدار ہو چکی ہے اور اپنے وطن کی محبت میں سرشار ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں تین شاعر ہمیں ایسے ملے ہیں کہ انہوں نے ڈوبی ہوئی کشتی کو ابھارا ہے۔ سب سے پہلے حالی ان کے بعد اقبال اور پھر جوش۔ ان کی قومی وطنی شاعری آج بھی دلوں کو گرما رہی ہے۔ ان کے جلائے ہوئے چراغ آج بھی روشن ہیں اور قیامت تک روشن رہیں گے اور قوم اس روشنی سے استفادہ کرتی رہے گی۔

نیچرل شعری:

فطرت نگاری اور منظر نگاری پر قدرت رکھنا بھی ایک ہنر ہے۔ یہ بات کم ہی شعراء کو نصیب ہوتی ہے۔ نیچرل شاعری میں فطری عمل کی کارفرمائی کا زیادہ دخل ہوتا ہے۔ آزاد، حالی، اسماعیل میرٹھی، عظمت اللہ خان اور چکبست نے نیچرل شاعری کو منتہائے کمال پر پہنچا دیا۔ چکبست کی مشہور نظم جسے نیچرل نظم کہا جاتا ہے، ''گائے'' ہے۔ اسماعیل میرٹھی کی نظم ''آزادی'' نیچرل نظم کہلاتی ہے۔ وحید الدین سلیم کے ہاں بھی نیچرل نظم اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں فکر و نظر کی گہرائی کے ساتھ جذبات و خیالات کو نظم میں اس طرح سمو دیتے ہیں اور حقیقت سے اتنے قریب ہو جاتے ہیں پھر نظم نیچرل نظم بن جاتی ہے۔ سرور جہاں آبادی، حفیظ جالندھری، ظفر علی خان، احسان دانش کے ہاں بھی اس کی اچھی مثالیں ہیں۔ سرور جہاں آبادی کی نیچرل نظموں میں ''بیر بہوٹی'' اور ''کوئل'' کو ایک حیثیت اور مقام حاصل ہے۔ نیچرل نظمیں کہنا بھی ایک خاص ملکہ ہے جسے ودیعت ہو جائے۔ یہاں ہر شاعر کی نظمیں دینا تو محال ہے، یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ ان کی شاعری میں مبالغہ کی آمیزش قطعی نہیں۔ بلکہ تعلی سے بھی گریز کیا گیا ہے۔ سادگی اور سلاست کے پیرائے میں ان موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ جو فطرت کی عکاس ہوں اور براہ راست انسان کا تعلق ہو مثلاً ''برکھا رت''، ''صبح امید''، ''گائے''، ''جگنو''، ''ہرن کا بچہ''، ''پہاڑ اور گلہری'' ایسی بہت سی نظمیں ہیں جن سے نیچرل شاعری کا اظہار ہوتا ہے۔ ان موضوعات پر نظمیں پڑھنے سے نیچرل شاعری واضح ہو جاتی ہے اور نئے نئے موضوعات سامنے آتے ہیں۔ ویسے بھی کائنات وسیع و عریض ہے بلکہ مظہر العجائب ہے۔ جس کو جو نظر آیا، نظم کے پیرائے میں قلمبند کر دیا۔

نیچرل شاعری سے مراد فطرت نگاری ہے۔ قدرت نے بے شمار چیزیں تخلیق کی ہیں مثلاً سمندر، پہاڑ، دریا، جنگلات، چرند، پرند، برسات، گل و لالہ، خزاں، بہار، موسموں کا تغیر، چاند اور چاندنی، صبح کا منظر، شام کی کیفیت، آفتاب و ماہتاب کا طلوع ہونا اور غروب ہونا، دیہات کی شام، گرمی کی دوپہر وغیرہ مظہر قدرت کائنات میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان کی تصویر کشی کرنا ایک اچھے اور عظیم شاعر کا کام ہے۔ میر انیس نے اپنے مرثیوں میں نیچرل شاعری کو ملحوظ رکھا ہے۔ اسی طرح قصائد میں بھی فطرت نگاری کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اگر ہم بالاستیعاب مثنویوں کا مطالعہ کریں تو یہاں بھی نیچرل شاعری کے بغیر قدم آگے نہیں بڑھتا۔ میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' اس کی واضح مثال ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی نظموں میں فطرت نگاری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ نیچرل شاعری کی صحیح معنی میں داغ بیل ۱۸۵۷ء کے بعد ہی سے پڑی، وہ اس لئے کہ جدید شاعری میں ان موضوعات کو اولیت دی گئی۔

آزادؔ اور حالیؔ نے اس کی ابتداء کی۔ نیچرل شاعری میں ان کے ہاں جو موضوعات ہمیں ملتے ہیں ان نظموں سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے شاعری میں موضوعات سے جو تبدیلی پیدا کی ہے، اسے ہم مغربی اثرات کہہ سکتے ہیں۔ کولرجؔ، بائرنؔ، کیٹس، ورڈز ورتھ اور شیلےؔ نے فطرت نگاری پر عمدہ شاعری کی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی بھی اس بات کی غماض ہے کہ شعراء نے خارجی شاعری پر توجہ دی۔ حالیؔ اور آزادؔ کے بعد اسماعیلؔ میرٹھی نے نیچرل شاعری میں بے پناہ اضافہ کیا۔ اس روایت کو آگے بڑھانے میں چکبست، شوقؔ قدوائی، سرورؔ جہاں آبادی نے بھی نیچرل شاعری میں گرانقدر اضافہ کیا۔ اقبالؔ نے نیچرل شاعری میں جو اضافہ کیا ان میں ''ہمالہ''، ''پیامِ صبح''، ''بچہ اور شاعر''، ''انسان اور بزمِ قدرت''، ''ماہِ نو'' وغیرہ ان نظموں کے مطالعہ سے جو تصویریں ابھر کر سامنے آئی ہیں۔ اس میں قدرت کی صناعی اور حسنِ فطرت آشکار ہے۔ یہاں یہ کہنا درست ہوگا کہ اقبالؔ کی نظموں میں الفاظ کی بندش، اسلوب اور ہیئت کے نئے تجربوں کے ساتھ محاکاتی انداز، تخیل اور ادراک آمیزش سے نظم میں جو تنوع پایا جاتا ہے، اسے ہم اقبالؔ کی دیگر علوم سے واقفیت اور باخبری ہی کہہ سکتے ہیں۔ یہی وہ نیچرل شاعری ہے جس سے اردو نظم موضوعات کے اعتبار سے مالا مال ہے۔

حفیظؔ جالندھری کی نظمیں نیچرل شاعری پر ہیں۔ ان کی اپنی ایک شان ہے۔ ان کے مجموعہ ہائے کلام، ''نغمۂ زار''، ''سوز و ساز''، ''تلخابۂ شیریں'' میں ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ جوشؔ کے مجموعے ''سموم و صبا''، ''حرف و حکایت''، ''شعلہ و شبنم''، ''رامش رنگ'' ان میں نیچرل شاعری کے اعلیٰ نمونے اور فطرت نگاری کے خد و خال بے شمار نظموں میں ملتے ہیں۔ اسی طرح ظفرؔ علی خان کے مجموعوں میں ''نگارستان''، ''چمنستان'' میں بہت سی نظمیں ہیں جو نیچرل شاعری کا امتیاز ہیں۔

یہی وہ شعراء ہیں جنہوں نے فریضہ سمجھ کر نیچرل شاعری کے اسلوب کو آگے بڑھایا۔ چند نظمیں نیچرل رجحان کے تحت جو مظاہرِ فطرت اور مناظرِ فطرت کی عکاس ہیں، ملاحظہ کیجئے ؎

پر کھول کے تتلیوں کا پرواز　　پر جوڑ کے بیٹھنے کا انداز
وہ نقش و نگار اور بوٹے　　پر ان کے چھوؤ تو رنگ چھوٹے

شوقؔ قدوائی، (تتلیاں)

چڑیوں کا ادھر ادھر سے آنا　　چھوٹے چھوٹے پھلوں کو کھانا
ہر شکل کے ساتھ جلوہ گر حسن　　جو کچھ ہے وہ قصہ مختصر حسن

شوقؔ قدوائی، (چڑیاں)

کیا مور ہے بنایا پروردگار تو نے　　بخشے ہیں اس کو کیا کیا نقش و نگار تو نے
دل شاد ہو کے بولی تب اپنی بولتا ہے　　پر ناچنے کی خاطر اس وقت کھولتا ہے

تلوک چند محروم، (مور)

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں　　یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

اقبالؔ، (جگنو)

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں، وہ سب کا چہچہانا

اقبالؔ، (پرندے کی فریاد)

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
تجھے ہو شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے
کہا یہ سن کے گلہری نے منہ سنبھال ذرا
یہ کچی باتیں ہیں دل سے انہیں نکال ذرا

اقبالؔ، (ایک پہاڑ اور گلہری)

کیوں نہ درختوں پہ ہو وہ سر بلند اس کا ہے پھل شاہ و گدا کو پسند

اسماعیل میرٹھی، (آم)

وہ ملتے ہیں زرد آدم جو سامنے لٹکتے ہیں پکھراج کے قمقمے

نظیرؔ اکبرآبادی، (آموں کی بہار)

طاہر خوش خبر ہے نام مرا الفت حسن ہے پیام مرا
مری بستی ہے پھول کی خوشبو غنچہ و گل کی دید کام مرا

غلام بھیک نیرنگؔ، (بھونرا)

ڈھونڈتی پھرتی ہے کیا کوئی سہانہ آبشار یا کہ سرگرم تلاش دامن دریا ہے تو
کیا کسی بحر تموج خیز کی ہے جستجو یوں سکوت شام میں کیوں آسماں ہما ہے تو

سرور جہاں آبادی، (مرغابی)

شام ہے اور اندھیرے کا وقت ہے پرندوں کے بسیرے کا وقت
اب ہے پانی کی نہ دانے کی تلاش جس کو ہے اپنے ٹھکانے کی تلاش

حالی، (مرغی اور اس کے بچے)

''اس کے بے شمار عجائبات ہمیشہ آنکھوں کے سامنے موجود رہے لیکن ہمارے شاعروں نے کہیں اب جا کر نقاشی شروع کی ہے اور ابھی وہ زمانہ دور ہے جبکہ نیچر کی تصاویر منہ سے بولنے لگیں۔''[۱]

نیچرل شاعری دراصل مغرب کا وہ تحفہ ہے جسے برصغیر کے شعراء نے بہ حسن خوبی قبول کیا۔ ایسی شاعری جس میں فطرت کی عکاسی کی گئی ہو، نیچرل کہلائے گی۔ یعنی فطرت کے وہ گلہائے رنگ جو کائنات میں پھیلے اور بکھرے ہوئے ہیں، جنہیں آنکھیں دیکھتی بھی ہیں اور اس کے بارے میں مغربی شعراء نے نیچرل شاعری کا نام دیا ہے۔ ہمارے شعراء میں دو نام ایسے ملتے ہیں جنھوں نے اپنی نظموں میں نیچر پرستی کا التزام رکھا ہے۔ ایک تو نظیرؔ اکبرآبادی اور دوسرے میر حسنؔ ''کلیات نظیر'' میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں مثلاً ''آموں کی بہار''، ''پرندوں کی عبادت''، ''کبوتر بازی''، ''ہندوستان کے پرند''، ''گلہری کا بچہ''، ''ریچھ کا تماشا''، ''شیرنی اور اس کے بچے''، ''کورابرتن''، ان سب نظموں میں ہندوستان کے وہ مناظر پیش کیے جو نیچر پرستی کے علاوہ فضا اور ماحول کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ حالی کی نظم ''برکھارت'' اور محمد حسین آزاد کی نظم ''ابر کرم'' نیچرل شاعری کی بہترین مثالیں ہیں۔ میر حسنؔ کی مثنوی ''سحر البیان'' جس میں مناظر کو فطرت سے قریب کر کے پیش کیے ہیں۔ اس مثنوی کا ہر منظر، دلفریب، دلربا اور جاذب نظر ہے،

۱۔ مناظر قدرت، ص ۵

یعنی یہ ایک ایسی نظم ہے جس میں نیچرل کے تمام سربستہ راز ہیں جنہیں میر حسن نے نہایت خوبصورتی سے ہر منظر کی دلکش تصویر کھینچی ہے۔ میر حسن کی مثنوی کو نیچرل شاعری کا بہترین نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ حالی نیچرل شاعری کے بارے میں کہتے ہیں:

''نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً و معناً دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت یا عادت کے موافق ہو۔''[۱]

سادگی و اثر آفرینی:

اگر ہم شاعری کے اس بدلے ہوئے رجحان کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ شعراء نے مبالغہ سے گریز کیا ہے اور سادگی کو اپنایا ہے۔ دراصل شاعری میں اصلیت کو محور و مرکز بنانے میں تمام تر کوشش کی گئی ہے۔ اس کی مثال منظومات حالی کا مطالعہ ہے یا پھر اسماعیل میرٹھی کا منظوم کلام۔ اس میں ایسے عنوان ملیں گے جس سے شاعری میں سادگی اور اثر آفرینی کے ارتقاء کا پتا چلتا ہے مثلاً ''کچھوا اور خرگوش''، ''اونٹ اور شیر''، ''عجیب چڑیا''، ''صبح کی آمد''، ''چاندنی کی بہار''، ''شام کا جھٹپٹا''، ''فضائے برشگال''، ''بادل کا پھٹنا''، ''جمنا جی، گنگا جی'' وغیرہ نظموں میں سادگی و اثر آفرینی کو اہمیت اور فوقیت دی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والے شوق و ذوق سے ان نظموں سے محظوظ ہوتے ہیں اور انہیں یاد رکھتے ہیں۔ جوش کی سادگی و اثر آفرینی پر ڈاکٹر ساجد امجد لکھتے ہیں:

''جوش کا کائناتی تناظر اقبال کے مقابلے میں کمزور ہے لیکن ان کے یہاں منظر نگاری کے بہت سے نمونے ملتے ہیں۔ فطرت کو وہ معلم کا درجہ دیتے ہیں۔ ان کی تصویریں ذاتی مشاہدے سے قریب ہیں۔ تخیل کی بجائے محاکات سے کام لیتے ہیں۔ موسیقیت اس کی روح ہے۔ ان کی قادر الکلامی، دروبست الفاظ اور ذخیرۂ الفاظ نے ان مناظر میں ایسی سرشاری اور بدمستی پیدا کر دی ہے جو جدید شاعری کی منظر نگاری میں ہمیشہ وقعت سے دیکھی جائے گی۔''[۲]

سرسید احمد خاں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے شاعری میں پرانے نقطۂ نظر کو رد کرتے ہوئے اس میں اصلاح کے پہلو تلاش کئے ہیں۔ ادب کوئی علیحدہ چیز نہیں بلکہ اس کا تعلق زندگی سے ہے۔ ان کے نزدیک تخلیقی ادب وہ ہے جس میں ابہام نہ ہو، سادگی اور اثر آفرینی کے ساتھ بات کہی گئی ہو۔ ان کا کہنا تھا کہ ''جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل ہی میں بیٹھے۔''

سرسید کی فکر کا محور شاعری پر بھی مرکوز ہوا۔ وہ انفرادی نقطۂ نظر کے خلاف تھے۔ وہ اس شاعری کے قائل تھے جس میں اجتماعیت کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اگر ہم پرانی شاعری، جو سینکڑوں دیوانوں پر مشتمل ہے، کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس شاعری میں سادگی، فطری اور اثر آفرینی والی باتیں قطعی طور پر نہیں ملیں گی۔ اسی وجہ سے انہوں نے تہذیب الاخلاق کے ذریعہ اپنے نظریہ کی ترسیل کی اور یہ واضح کیا کہ نیچر قدرت کا وہ اظہار ہے جسے مشاہدے کی عینک سے دیکھا جاتا ہے۔ سرسید کی مساعی سے اردو شاعری میں جو انقلاب رونما ہوا، اس کی پہلی مثال حالی کا ''مقدمۂ شعر و شاعری'' ہے، جس میں شعر کی ماہیت، شعر کے اجزائے

۱۔ مقدمۂ شعر و شاعری، ص ۱۲۱

۲۔ اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، ص ۲۷۷

ترکیبی، نیچر پرستی اور سادگی پر مفصل بحث کی گئی ہے۔شاعری میں ''مسدس حالی'' سادگی واثر آفرینی کی وہ پہلی مثال ہے جو سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے:

''جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی بدولت ذرہ سے آفتاب بن گئیں، ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے۔ سرسید ہی کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی، ہر قسم کے مضامین اس زور اور اثر، وسعت و جامعیت، سادگی اور صفائی سے ادا کر سکتی ہے۔'' [۱]

انجمن پنجاب کے مشاعروں میں موضوعاتی نظمیں اس بات کا اعادہ ہیں جسے سرسید نے اپنی کوششوں سے قدیم ادب اور شعروشاعری سے گریز ہی نہیں کیا بلکہ ایک نئی راہ نکالی اور اپنے رفقائے کار کو اس بات پر آمادہ کیا کہ شعروادب میں انفرادیت نہیں بلکہ اجتماعیت اور افادیت ہونی چاہئے۔ دیگر علوم میں بھی سرسید کی اصلاحیں معاون ثابت ہوئیں۔ سرسید کے زیراثر حالی اور شبلی سادہ واثر آفرینی کو پیش نظر رکھتے، ایسی شاعری تخلیق کی جو پراثر بھی ہے اور قابل تقلید بھی، اقبال نے براہ راست حالی اور شبلی سے اثرات قبول کئے۔ اقبال کی اردو شاعری سادگی واثر آفرینی سے لبریز نظر آتی ہے۔

۱۔ نگار۔سرسید نمبر، ص ۴۷

باب سوم

ترقی پسند تحریک

ترقی پسند تحریک سے پہلے اردو شاعری پر رومانوی طرز فکر اور متصوفانہ رنگ غالب رہا- اردو شاعری کے ابتدائی نقوش میں موضوعات کے اعتبار سے سب سے زیادہ عاشقانہ اور متصوفانہ رنگ کو فروغ ہوا- اس کے علاوہ شہر آشوب لکھے گئے- مختلف تحریکوں کے ذریعے اردو شعروادب کو جو مقام حاصل ہوا، ان میں علی گڑھ نے سب سے زیادہ فعال کردار ادا کیا- اردو شعروادب پر علی گڑھ تحریک کے جو احسانات ہیں انہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا- دیگر تحریکوں مثلاً رومانی تحریک، انجمن پنجاب تحریک، ان تحریکوں سے بھی اردو شعروادب میں گراں بہا اضافہ ہوا ہے- ترقی پسند تحریک سے وابستہ لوگوں نے سماجی اور معاشرتی تنزلی کو محسوس کرتے ہوئے ادب میں تبدیلی کا اعلان کیا- ان حضرات کا کہنا یہ تھا کہ ہم تقلید اور روایت کی بیساکھیوں کے سہارے کب تک چلیں گے- انور سدید کے کہنے کے مطابق:

> ''یہ زمانہ سماجی اور سیاسی تحریکوں کے لئے اس لئے بھی سازگار تھا کہ عوام اب اپنی جانب دیکھنے پر مائل ہو چکے تھے اور غلامی کا جواء اتارنے پر آمادہ تھے- روس کے انقلاب عظیم نے دنیا بھر کے نچلے طبقے کی آنکھیں کھول دی تھیں اور سماجی انصاف اور مساوات ممکن العمل نظر آنے لگے تھے-''[۱]

برصغیر میں مسلمانوں کا تسلط، شعروادب پر مغربی اثرات اور انقلاب روس کی وجہ سے اشتراکیت کے نظریے کو فروغ ہوا- ترقی پسند تحریک کا اصل محرک انقلاب روس ہی ہے- مارکس اور لینن کے نظریات شعروادب میں آنا شروع ہو گئے تھے- رومانیت سے شعروادب کو جو نقصان پہنچ رہا تھا- ترقی پسندوں نے اس پر بھی خصوصی توجہ کی- ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ترقی پسند شاعروں کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''ترقی پسند شاعروں نے قدیم معاشرتی اقدار کے علاوہ مذہب و اخلاق اور روحانیت و وجدان کو بھی خاص طور سے ہدف ملامت بنایا- حالانکہ یہ امر اشتمالی حقیقت نگاری سے بھی بعید تھا- اشتمالیت کے علم برداروں اینگلز اور لینن نے بھی اس انتہا پسندی اور بے اعتدالی کی تنقیص کی ہے- ترقی پسند تحریک کے بیشتر شعراء اس ذہنی انتشار کا شکار ہوئے- رومان کی فضا سے ایک حقیقت و انقلاب کی شاہراہ پر آ جانے سے ان کے افکار و اشعار میں جوش و خروش کا ایک سطحی سا ابال آیا-''[۲]

۱- اردو ادب کی تحریکیں، ص ۴۸۲

۲- اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر، ص ۴۷۶

دراصل ترقی پسند تحریک کا اصل مقصد سامراجی نظام سے نجات حاصل کرنا تھا-۱۹۳۵ء میں ترقی پسند تحریک اور اس کے زیر اثر ترقی پسند ادب کا باقاعدہ آغاز ہوا-اس سلسلہ میں بین الاقوامی کانفرنس، جو کہ پیرس میں منعقد ہوئی، اس کانفرنس میں دنیا کے ہر خطہ سے ادیب اور شاعر جمع ہوئے، لیکن کانفرنس میں ہندوستانی ادیب شریک نہ ہو سکے-البتہ سجاد ظہیر اور ملک راج آنند لندن ہی میں مقیم تھے-دونوں نے کانفرنس میں شرکت کی-شرکت کے بعد لندن میں مقیم ہندوستانی طلباء کو ایک جگہ جمع کر کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کیا-لندن کا ایک ریستوران جس کا نام ''نانکنگ'' تھا، اس میں بیٹھ کر تحریک کا اعلان نامہ تیار کیا گیا-بعد میں بڑے بڑے ادیبوں سے دستخط کرائے گئے-

ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کا آغاز اپریل ۱۹۳۶ء لکھنؤ میں منشی پریم چند کی صدارت سے ہوا-علی سردار جعفری، ترقی پسند تحریک اور اس کے مقاصد کی بابت رقم طراز ہیں:

> ''ہماری انجمن کا مقصد ادب اور آرٹ کو ان رجعت پرست طبقوں کے چنگل سے نجات دلانا ہے، جو اپنے ساتھ ادب اور فن کو بھی انحطاط کے گڑھوں میں دھکیل دینا چاہتے ہیں-ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں اور اسے زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا موثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں-ہمارے اعلان نامے نے فراریت، ہیئت پرستی، کھوکھلی روحانیت، ماضی پرستی، فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسانی استحصال کی مخالفت کی اور سائنسی عقل پسندی اور تنقیدی حقیقت نگاری کا مطالبہ کیا-تغیر اور ترقی کی راہ دکھائی، اس طرح ادب پر اور ذمہ داریاں عائد کیں-ایک تو غیر عقلی، غیر مفید انحطاط پذیر سماجی نظریات اور اداروں کی تنقید کرنا اور دوسرے نئی فکر، نئے جذبے اور نئے سماج کی تعمیر کرنا، جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہترین زندگی کی راہ دکھائے-'' [۱]

ترقی پسند تحریک کا آغاز اور اس کا فروغ جس انداز سے ظاہر ہوا، اس سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ تحریک نے کامیابی کے زینے بڑی تیزی سے طے کئے-اس کی ترقی میں ہمارے شعراء و ادبا کی گرانقدر خدمات ہی اس بات کی ضامن ہیں کہ اردو کے نامور ادیب و شاعر اس میں شامل ہوئے-ان میں منشی پریم چند، ڈاکٹر عبدالحق، حسرت موہانی، مجنوں گورکھپوری، نیاز فتح پوری، فراق گورکھپوری، علی عباس حسینی، احتشام حسین، فیض احمد فیض، ضیاء جالندھری، رضا ہمدانی، پروفیسر شور علیگ، فارغ بخاری، کیفی اعظمی، اختر الایمان، علی سردار جعفری، جاں نثار اختر، مجاز لکھنوی، جوش ملیح آبادی ان کے علاوہ دیگر شعراء نے ترقی پسند تحریک کی آبیاری ہی نہیں کی بلکہ اپنے خون جگر سے ادبی تخلیقات میں بے پناہ اضافہ بھی کیا ہے-ترقی پسند تحریک کے بارے میں محمود الرحمٰن لکھتے ہیں:

> ''اس تحریک کے زیر اثر آزادی کے نغمے گانے والے شعراء محض روایتی انداز کے پیرو نہیں-ان کا مسلک حیات، ان کا نقطۂ نظر، ان کا دائرۂ عمل، سب کا مرکز ایک تھا یعنی فرنگی استبداد کا خاتمہ! گویا سیاست ہی ان کی شاعری کا محور تھا اور وہ اس سے انقلاب کی رفتار کو تیز تر کر دینا چاہتے تھے-جنگ آزادی کی شاعری میں ان ترقی پسند شاعروں کو جن اسباب و عوامل کی بناء پر قدر و منزلت حاصل ہوئی ہے، اس کا اندازہ سید

۱- ترقی پسند ادب، ص۱۹۴

احتشام حسین کی درج ذیل تحریر سے بخوبی ہو جاتا ہے:

''سب کے سب انقلاب کی رفتار سے واقف ہیں- انہیں تاریخی طور پر سماج کے تضاد اور ہیجان کا حال معلوم ہے- انہوں نے دنیا میں انقلابات کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے- انہیں زندگی کے وہ موڑ معلوم ہیں جہاں انسانیت کروٹ بدلتی ہے- ان کی تیز نگاہیں ملکوں ملکوں میں آزادی کی جدوجہد، لڑنے اور فتح پانے کے اصولوں کو دیکھ رہی ہیں- ان میں سے کئی تو خود ہندوستان کی جنگ آزادی کے سپاہی ہیں-'' [1]

ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے آغاز کا ایک سبب یہاں کے سماجی حالات بھی تھے- ہندوستان میں قابض برطانوی، جس نے بین الاقوامی سطح پر دنیا کے بیشتر غریب عوام کو اپنے ظلم و جبر کا نشانہ بنایا ہوا تھا مثلاً اٹلی میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا- اسپین کو بمباری سے تباہ کیا جارہا تھا- ایشیاء میں کوئی ملک آسودہ حال نہیں تھا- ان تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھی گئی- انقلاب روس سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مزدوروں نے جاگیرداروں اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف آواز بلند کی- یہ ایک ایسی بغاوت تھی جس سے دوسرے طبقوں میں بھی حریت کا جذبہ بیدار ہوا- ۱۸۴۰ء میں کسانوں کی بغاوت بھی سامنے آئی- کسانوں نے اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا شروع کیں- یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ ان بغاوتوں میں شدت اس انتہاء کو پہنچی کہ دوسری انقلابی تحریکیں بھی زور پکڑنے لگیں- ان تحریکوں کا حال اس وقت کے ادیبوں نے اپنے ناولوں میں خاص طور پر موضوع بنایا ہے- ان ناول نگاروں میں طالسطائی اور ترگنیف زیادہ اہمیت کے حامل ہیں- ان دونوں نے اپنی تصانیف میں مزدوروں اور کسانوں کی زبوں حالی اور معاشرتی انحطاط کو خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے-

زارشاہی کے خلاف جو بغاوت ہوئی اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو طاقت کا سرچشمہ اور مختار کل سمجھتے تھے- ۱۸۲۵ء میں فوجی افسروں اور مغربی خیالات کے رؤسا نے زار کے خلاف بھرپور بغاوت کی، اس بغاوت کے باوجود زارشاہی نکولس اول کے عہد میں پھر سے ان کی جڑیں مضبوط نظر آنے لگیں- ان کی خودسری اور جابرانہ انداز سر چڑھ کر بول رہا تھا- اس عہد کی تاریخ کو اس وقت کے ادیبوں نے ادبی حیثیت سے ہمیشہ کے لئے ان واقعات کو شعر و ادب میں زندہ کر دیا- روس کے تین مشہور مصنف ان کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کے ناولوں میں ہر وہ استبداد نظر آئے گا جو اس عہد میں روا رکھا گیا مثلاً ظلم و زیادتی، سامراجی اذیتیں اور معاشی بحران ان کیفیات سے مزدوروں اور کسانوں کا دم گھٹنے لگا تھا- روس میں چند تحریکیں تو ایسی تھیں جو خفیہ طور پر اپنی جنگ لڑ رہی تھیں- وہ انقلاب روس کی صورت میں سامنے آیا-

طالسطائی، چیخوف اور گورکی ان کے ناولوں میں عہد کی پوری عکاسی نظر آتی ہے- سیاسی انقلاب سے اقتصادی و سماجی حالات پر جو اثرات مرتب ہوئے اس سے مزدوروں میں بغاوت کی دبی چنگاری بھڑک اٹھی- اس لئے یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ترقی پسند مصنفین نے دنیا کے بدلتے ہوئے حالات اور تباہ کاریوں کو اپنا موضوع سخن بنایا اور رومانیت کے چنگل سے آزاد ہونے کا اعلان کیا- انقلاب اور اشتراکیت کے حامی نظریہ کے تحت جاگیرداروں اور ان کے بنائے ہوئے نظام کے خلاف بغاوت لازمی امر کی حیثیت رکھتی ہے- سیاسی، سماجی اور معاشی نظام میں ابتری فاشیت کے ذریعہ عمل میں آئی- مزدوروں کی منظم قوت فاشیت کے خلاف صف بستہ ہوگئی اور سراپا احتجاج بن کر ابھرے- محمود الرحمٰن اس احتجاج کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ادب زندگی کا ترجمان ہے، حیات کی بدلتی ہوئی قدروں کا امین ہے اور ماحول و

۱- جنگ آزادی کے اردو شعراء، ص ۳۴۱

معاشرے کی آواز ہے۔ چنانچہ مغربی دنیا کے ادیبوں اور شاعروں نے امن وآشتی، حق و انصاف اور مساوات وانسان دوستی کی روشنی پھیلا کر فاشیت کے بڑھتے ہوئے اندھیرے کا سینہ چاک کردینے کا منصوبہ بنایا۔ یہی وہ رجحان ونظریہ تھا جس نے دنیا بھر کے قلم کاروں کو ہم آہنگ کردیا اور انہوں نے ۱۹۳۵ء میں ترقی پسند تحریک شروع کی۔ ان کا مقصد ہر طرح کے استحصالی نظام سے انسانیت کو آزاد کرانا تھا۔'' [۱]

ترقی پسند تحریک سے یہ فائدہ ہوا کہ اس میں موضوعات کی کثرت اور نئے ذہنوں میں ایک انقلابی رجحان کروٹ لینے لگا۔ غزل کی جگہ نظم کو اہمیت دی جانے لگی۔ کسان، مزدور، محنت کش اور وہ طبقہ جو خستہ حالی اور کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہا تھا، جن کا نہ کوئی پرسان حال اور نہ کوئی مسیحائی کرنے والا تھا، ایسے میں شعراء نے ایسی پرسوز نظمیں لکھ کر ان کی واضح تصویر کشی اور ترجمانی کی اور ساتھ ہی وہ جذبہ بیدار کیا جو آزادی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن ترقی پسند تحریک کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ترقی پسند تحریک نے پہلی بار صاف لفظوں میں ادب کو آسمانی صحیفہ قرار دینے کی بجائے اسے سماجی مسائل کے ادراک اور ان کے حل کرنے کا ذریعہ بتایا۔ اس کھلم کھلا اعلان نے رومان نگاری کی تاثراتی خیال آرائیوں سے نقاب اٹھا دیا۔ ہیئت اور آسائش کی بجائے توجہ خیال اور مضمون کی طرف مبذول ہوئی اور ادب کو سماجی بہتری کا ذریعہ سمجھا جانے لگا۔'' [۲]

مارکس نے اپنے نظریئے میں، جو کہ اس کا فلسفہ بھی تھا کہ ''انسان اور مادی دنیا لازم وملزوم ہیں، انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا'' کیونکہ انسان کا تعلق معاشرتی اور اقتصادی حوالے سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔ زبوں حالی جب انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو انقلاب ناگزیر ہو جاتا ہے۔ وہ انقلاب جو تحریک کے زور پر آتا ہے، اس کے اثرات شعروادب پر بھی پڑتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے موضوعات کی اساس بھوک، افلاس، روٹی، کپڑا اس کے علاوہ فطرت نگاری اور حقیقت نگاری کے سہارے تخیل کی پرواز کو بلند رکھنا۔ ان عوامل سے ترقی پسند شاعری میں بغاوت کا رجحان اور اظہار میں تیزی پائی جاتی ہے۔ ان نظموں میں انقلاب اور بغاوت، سامراج اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف باغی نظمیں لکھی گئیں۔ ترقی پسندوں میں یہ علامت ابھر کر سامنے آئی جو نظموں میں نمایاں ہے۔ جوش وولولہ اور اشتراکیت کا پرچار، یہ وہ شناخت ہے جو صرف ترقی پسندوں سے مخصوص ہے۔ ڈاکٹر انور سدید مارکسی تحریک کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مارکسی تحریک نے ادب کو فکری زاویے سے ہی متاثر نہیں کیا بلکہ ادیب کو عوام کی زبان میں ادب تخلیق کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ اس تحریک نے ادب کو بلاواسطہ انسان کے ساتھ متعلق کیا اور ادیب کی غیر جانبداری کو یکسر ختم کردیا چنانچہ اس تحریک کا موقف یہ ہے کہ جب سماج کی بنیاد طبقاتی تقسیم پر مبنی ہے تو ادب غیر طبقاتی کس طرح ہوسکتا ہے۔'' [۳]

۱۔ جنگ آزادی کے اردو شعراء، ص ۳۳۹

۲۔ ادبی تنقید، ص ۹۵

۳۔ اردو ادب کی تحریکیں، ص ۱۴۱

ترقی پسندوں نے کارل مارکس کے نظریات کو اپناتے ہوئے ادب کو سماجی فریضہ قرار دیا۔ ہندوستان میں سیاسی غلامی اور انگریزوں کے بے جا تسلط نے معاشرتی نظام کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ فاشزم کا بخار یورپ ہی میں نہیں ہندوستان میں بھی محسوس کیا گیا۔ سماجی زندگی کے مطالعے کے بغیر ادبی رجحانات تکمیل پذیر نہیں ہو سکتے۔ ڈاکٹر محمد حسن ترقی پسند نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ محض جذبے کے سہارے شاعری بہت دور نہیں جا سکتی۔ اس کے طلسم ہوش ربا اور اس کے رنگ محل دل آویز ہوں گے لیکن فکر کی ٹھوس سچائی کے بغیر اسے بالیدگی اور ابدیت سے آشنا نہیں کیا جا سکتا۔ ترقی پسند تحریک نے جذبے کی حکمرانی ختم کی اور فکر کے سر پر تاج رکھا، یہی اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔'' [۱]

اسلامی تعلیم اور مارکسی نظریہ دونوں کا ماخذ ایک ہی ہے۔ سرمایہ و محنت کو قرآن نے واضح طور پر بیان کیا ہے۔ اقبال نے سرمایہ داروں پر تنقید کرتے ہوئے مارکسی نظریے کو بھی پیش نظر رکھا۔ سرمایہ داروں نے مختلف حربے اور نت نئی چالوں سے مزدوروں اور مظلوم انسانوں کو مغلوب رکھنے کی کوششیں کیں جو ظلم و استبداد کے نام سے تاریخ میں رقم ہیں، اقبال کا یہ شعر اس بات کی عکاسی کرتا ہے ؎

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

عزیز احمد نے ''طلوعِ اسلام'' کے بارے میں لکھا ہے:

''طلوعِ اسلام'' دراصل اشتراکی اسلام کا طلوع ہے۔ اس کی قدریں حرکت انسانیت اور معاشی انصاف ہیں اور ان کے پس منظر میں وجدانی ''یقین'' کی تلقین کی گئی ہے۔ یہ ذوق یقین عشق ہے اور عقل کی اعلیٰ ترین نوع ہے۔ یہ یقین افیونی نہیں بلکہ عملی ہے اور آزادی کی تحریک اس کا منطقی نتیجہ ہے کیونکہ اس یقین کی بنیاد زر و فقر اور صداقت پر ہے۔'' [۲]

ترقی پسند دراصل اسے مارکس، ڈارون اور فرائیڈ کے نظریات سے حل کرنا چاہتے تھے۔ روس میں متعدد بار جو انقلاب آئے، اس کی خاص وجہ مارکس کے نظریے کو وسعت دینا تھا۔ مارکس کے نظریے کو آگے بڑھانے میں لینن کا بڑا ہاتھ ہے، لینن ہی کی خدمات سے نظریات کو اشتراکیت کا نام دیا گیا۔ ان نظریات کو ترقی پسند ادب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ترقی پسند تحریک ڈارون کے نظریہ سے بھی اس قدر متاثر ہوئی کہ ارتقائی عمل ڈارون کے نظریہ ''ارتقاء'' کو اہمیت دی گئی۔ صرف اس لئے کہ اس نے انسانی قدروں کا مطالعہ کر کے اسے اس کا مقام دلوانے کی کوشش کی۔ ڈارون کا یہ کمال کیا کم ہے کہ اس نے انسانی خدمت کو اپنی زندگی کا مشن قرار دیا۔ مائیکل ہارٹ ڈارون کے نظریات کے بارے میں لکھتا ہے:

''انسانی فکر پر ڈارون کے اثرات بہت گہرے ہیں، خالصتاً سائنسی نقطۂ نگاہ

۱۔ ادبی تنقید، ص ۹۸

۲۔ اقبال نئی تشکیل، ص ۱۳۹

سے اس نے حیاتیات کے علم میں انقلاب برپا کر دیا۔ فطری انتخاب ایک عالمگیر اصول ہے۔ اس اصول کو دیگر میدانوں میں بھی منطبق کرنے کی سعی کی گئی۔ جیسے علم آثار قدیمہ، عمرانیات، سیاسیات اور معاشیات، تاہم اس کے سائنسی اور عمرانی مفہوم سے کہیں زیادہ اہم بات وہ اثرات ہیں جو ڈارون کے نظریات نے مذہبی فکر پر ثبت کیے۔'' [1]

ترقی پسندوں میں جو جذبہ وجۂ محرک بنا وہ صرف انسانیت کا ارتقاء ہے۔ انقلابات اور تغیر کے اس عمل میں فطری نظام کو اہمیت دی گئی کیونکہ دنیا معاشی استحصال اور استعماریت اور جنگ عظیم سے دوچار تھی۔ قوم کو صحیح معنی میں رہبری درکار تھی۔ ترقی پسندوں نے مردہ دلوں میں پھر سے زندگی کی روح پھونکی اور زندہ قوموں کی طرح زندہ رہنے کا درس دیا۔

ترقی پسند تحریک میں جو خارجی زندگی کا عمل ہمیں نظر آتا ہے وہ فرائیڈ کے نظریات کا ہی شاخسانہ ہے۔ ترقی پسند نظریے کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی اساس ادب اور سماج کا وہ لامتناہی سلسلہ ایک ایسا مضبوط بندھن ہے جو شاعری میں خاصا ابھر کر سامنے آیا ہے۔ فرائیڈ کے نظریات میں سے بنیادی نظریہ تحلیل نفسی ہے، جس کا محرک جنسی قوت ہے۔ اسی سے اس نے رازِ حیات کو جاننے کی کوشش کی ہے۔ جس طرح مغرب میں رومانی تحریکوں نے بشری پامالیوں کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے، فرائیڈ نے ایسی ہی بے راہ روی اور پست اخلاقیات کو نفرت سے دیکھا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان کی خواہشات اپنی جگہ مسلّم ہیں لیکن اس عمل کو وہ قاعدے کے تحت حل کرنا چاہتا ہے، جس میں معاشرتی اقدار کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ فرائیڈ ادب میں منفی رجحانات کا قائل نہیں اور نہ ہی وہ تفریق پسند ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں فرائیڈ کے نظریات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''برگسوں کے وجدانی فلسفے کے علاوہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے شروع میں فرائیڈ کے تحلیل نفسی کی نئی نفسیات نے بھی فرانس میں ادب اور فن کو متاثر کیا۔ فرائیڈ نے ہسٹریا کے اسباب کی تحقیق کے دوران میں محسوس کیا کہ شعور کی سرحدیں ایک اور دنیا سے جا کر مل جاتی ہیں، جو اس سے زیادہ وسیع ہے۔ اسے فرائیڈ نے لاشعور یا تحت الشعور کہا ہے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ انسانی ذہن ناخوشگوار تجربہ کو بھولنے کے لئے انہیں لاشعور یا تحت الشعور میں دھکیل دیتا ہے۔ وہاں یہ یادیں مدتوں چھپی پڑی رہتی ہیں، پھر وہ غیر دانستہ طور پر ذہنی الجھنوں کا موجب بنتی اور انسانی عمل کو متاثر کرتی ہیں۔ فرائیڈ کا خیال تھا کہ انسان کی اکثر الجھنوں کی وجہ یہ ہے کہ اس کی جنسی جبلت ناآسودہ رہتی ہے۔ تہذیب و تمدن جنسی تقاضوں کی تکمیل کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ فرائیڈ کے ان خیالات کا فرانس کے بیسویں صدی کے شاعروں ادیبوں پر گہرا اثر نظر آتا ہے۔'' [2]

ترقی پسندوں کے ہاں جو چیز شدت سے دیکھنے میں آئی وہ ہیجانی کیفیت ہے۔ شاعری میں مارکس، ڈارون اور فرائیڈ کے نظریات کو داخل کیا، کچھ ایسے نکات جو ترقی پسندوں نے مغربی ممالک کے مفکرین کے نظریات سے اخذ کیے اور خاص طور پر انقلاب

۱۔ سو عظیم آدمی، ص ۹۷

۲۔ فرانسیسی ادب، ص ۴۶۳

روس کے ان عوامل سے بلکہ ان تحریکوں سے جیسے بورژوا تحریک، زار شاہی تحریک، بالشویک تحریک، اشتراکیت یہ وہ تحریکیں تھیں جن سے براہ راست ترقی پسندوں نے اپنے مذاق کے مطابق پایا- ترقی پسند تحریک پر زیادہ رجحان خالصتاً اشتراکیت ہی سے ماخوذ ہیں- اس کی ایک مثال افسانوں کی کتاب ''انگارے'' ہے جس کو آدمی پڑھ لے تو باغی ہو جاتا ہے- بغاوت پر اکسانے والی یہ پہلی کتاب ہے یا یوں کہئے کہ ترقی پسند ادب کی ابتداء انگارے سے ہوئی- آزادی کے بعد ترقی پسندوں نے جس بات کو شدت سے محسوس کیا اس میں بھوک، افلاس، محرومی اور غلامی، یہ وہ گراں بار طوق تھے جسے اتار پھینکنے کی جدوجہد شامل منشور تھی- اگر ہم اقبالؔ اور جوشؔ کی شاعری پہ نظر غائر دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اقبالؔ نے انسان اور تہذیبی اقدار پر اپنی شاعری کا قصر تعمیر کیا جسے ہم تعمیری ادب کہتے ہیں- یہی وہ تعمیری ادب ہے جو ترقی پسندی کے مفہوم کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے-

ترقی پسند تحریک کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی شاعری نظریاتی تھی- شعراء زیادہ تر انقلاب اور جدیدیت کے قائل تھے- ان میں بہت سے شعراء تو اتنے ممتاز ہوئے کہ ترقی پسندی ان کی شناخت بن گئی- اردو نظم میں ترقی پسند نظریات کے نقوش گہرے نظر آتے ہیں- حالیؔ اور آزادؔ نے نظم کو جہاں چھوڑا تھا وہاں سے اقبالؔ نے اسے ترقی دے کر منتہائے کمال پر پہنچا دیا لیکن ترقی پسندوں نے نئے موضوعات شامل کئے اور اسے اوج ثریا سے بھی آگے لے گئے- سردار جعفری اقبال کی ترقی پسندی کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''برطانوی سامراج اور انگریزی سرمایہ داری کا بھیانک پن سرسید اور حالی کی نگاہوں سے اوجھل رہا لیکن اقبال کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکا اور انہوں نے اس پر بھرپور حملہ کیا- سامراج کے دشمن، سرمایہ داری نقاد کی حیثیت سے اقبال کی شاعری کا درجہ بہت بلند ہے- یہ حقیقت کسی حالت میں بھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ ۱۹۰۷ء ہی میں اقبال نے اس نظام کی آنے والی موت کا اعلان کر دیا تھا-'' [۱]

ترقی پسندی تحریک کے موضوعات:

انقلاب روس سے دنیا بھر کے انسان بیدار ہو چکے تھے- اس انقلاب کا اثر ہندوستان پر بھی پڑا- پے در پے انقلاب نے انسان کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا- عوام میں تحریکی جذبہ پیدا ہوا کیونکہ پلک جھپکتے سیاست کی بساط الٹ جاتی تھی- مزدور، کسان اور ایک عام انسان مسلسل انقلاب کی زد میں آ کر اپنا سب کچھ ہار چکے تھے- دوسری عالمی جنگ کے بعد بیشتر ممالک نے فکر کے نئے زاویے وضع کیے- ہندوستان میں بھی سیاست کے بازار میں گرمی آئی- ۱۹۳۷ء کا الیکشن اس بات کا آئینہ دار ہے- کانگریس نے جب اپنی وزارتیں تشکیل دیں- سامراجیوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا- دوسری طرف روس کے ادیبوں نے اپنی تحریروں سے ادب کو نئے اثرات سے مزین ہی نہیں بلکہ ایک حیات نو بخشی- ان میں ٹالسٹائی، میکوؤسکی، گورکی اور چیخوف روس کے انقلاب سے پہلے بھی اپنے خیالات و نظریات سے عوام کو بیدار اور خبردار کر رہے تھے-

انگریزی ادب میں چاسر کو اہم مقام حاصل ہے- اس نے بھی انسانی اقدار سے بحث کی ہے- انسانیت عظمیٰ کے وقار کا خاص خیال رکھا ہے جبکہ شیلے، شیکسپیر اور ورڈسورتھ کے ہاں بھی ایسے نظریات ملتے ہیں- ان سب نے سماجی اور معاشرتی لحاظ سے بھی

۱- ترقی پسند ادب، ص ۱۲۰

اور معاشی اعتبار سے بھی انسانیت اور انسان کو فوقیت دی ہے- ان واقعات کی روشنی میں ہندوستان میں بھی ترقی کرنے کا جذبہ ملتا ہے، اس کی واضح مثال منشی پریم چند کے ناول اور افسانے ہیں- اس کے علاوہ ٹیگور اور قاضی نذرالاسلام نے بھی مظلوم اور فاقہ زدوں کو پیش نظر رکھا اور اپنی شاعری میں بھوک، افلاس اور مفلوک الحالی جیسے مسائل کو شعر وادب کا موضوع بنایا-

جنگ عظیم کی تباہ کاریوں سے جو معاشی بحران پیدا ہوا، لوگ در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور تھے- ترقی پسندوں نے ان واقعات و حالات کو موضوعات کا رنگ دے کر ایسی نظمیں لکھیں، جن میں بھوک، افلاس، بلکتے ہوئے بچے، سسکتی ہوئی آہیں اور طبقات کی ناہمواری نظر آتی ہیں- ان ادیبوں میں نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، منشی پریم چند، مخدوم محی الدین، جوش ملیح آبادی، علی سردار جعفری، فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ نے بھی معاشی مسائل سے پیدا ہونے والے معاملات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا- اقبال نے بھی اپنی شاعری میں ان موضوعات سے بحث کی ہے- اقبال کا یہ شعر دیکھئے ؎

اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامان وجود
مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہان پیر دیکھ

اقبال نے اپنی نظم ''خضر راہ'' میں وہ تمام سوالات خضر کے سامنے رکھے، ان میں سیاسی سوالات، زندگی سے متعلق اور سرمایہ و محنت، مزدور کی مفلوک الحالی اور دکھی انسانوں کی بات کرتے ہوئے بین الاقوامی سطح پر حالات و واقعات کی منظر کشی نظم کا حصہ ہیں- زندگی کے متعلق اقبال لکھتے ہیں ؎

آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

اب سلطنت کے متعلق یہ دو شعر دیکھئے ؎

مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے، اثر خواب آوری
گرمی گفتار اعضائے مجالس، الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری

اقبال کا اشتراکیت کا نظریہ ملاحظہ کیجئے ؎

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیام کائنات
دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اقبال نے اپنی شاعری میں بامقصد اور عالمگیر انسان کے لئے پیغام اور معاشرتی وسماجی اعتبار سے مردہ دلوں اور سوئے

ہوئے لوگوں کو بیدار کیا اور ایک ایسا حوصلہ دیا کہ جس سے کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے خودی کا عرفان، جدوجہد اور اخلاقیات پر زور دیا۔ اقبال کی شاعری سے سویا ہوا انسان وہ خواہ کسی بھی خطے سے ہو، بیدار تو ہوا۔ ڈاکٹر عبدالمغنی اقبال کے نظریہ اشتراکیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اقبال شاید دنیا کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے روس اور چین سے باہر اشتراکیت کے ابھار کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سرمایہ ومحنت یا سرمایہ دار ومزدور کے معاشی معاشرتی اور سیاسی مسئلے کی بین الاقوامی اہمیت کو حسین ومتین شاعری کا موضوع بنایا اور اس کے مضمرات واثرات کی طرف لطیف اشارے کئے، اس سلسلے میں یہ بات بھی کم اہم نہیں کہ اشتراکی نہ ہونے اور نہایت دین پسند ہونے کے باوجود اقبال نے سرمایہ ومحنت کی کشمکش میں محنت کے موقف کی پرزور تائید کی اور سرمایہ کے خلاف اس کی بغاوت کا ولولہ انگیز شاعرانہ خیر مقدم کیا۔'' [۱]

اقبال کے ہاں انسانی ہمدردی کا جذبہ آفاقی سطح پر ملتا ہے۔ ان کا دل ہر ایک مظلوم کے لئے دکھتا ہے۔ وہ ایک ایسے انصاف کے خواہاں تھے جس سے غریب اور مزدور طبقہ آسودہ حال زندگی بسر کر سکے۔ اس دور کی نظموں میں جور جحانات، موضوعات کی کثرت اور آفاقی پھیلاؤ نظر آتا ہے۔ اس نئے رجحان میں اقبال کی فکر اور فن نے اردو شاعری کو سہارا ہی نہیں دیا استحکام بھی بخشا ہے۔ یوسف حسین خان، اقبال کے فن اور فکر پر رقم طراز ہیں:

''اقبال نے اپنی شاعری میں جلال و جمال کی آمیزش، اجتماعی معنویت پیدا کرنے کے لئے بھی کی ہے۔ خودی کے استحکام کے ساتھ اس نے جدید علوم (سائنس) کے حصول پر بہت زور دیا تاکہ اہل مشرق میں تسخیر فطرت کی صلاحیت پیدا ہو۔ وہ سکونی دروں بینی کے بجائے متحرک بروں بینی کا احساس پیدا کرنا چاہتا تھا تاکہ انفس و آفاق دونوں کی بصیرت حاصل ہو۔ انفس کی حد تک خود شناسی کا احساس اور آفاق کی حد تک سائنس کی تعلیم کو جماعت کے امراض کا علاج تجویز کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ موضوع دھیمے اور نرم لہجے میں نہیں بیان کیا جاسکتا۔'' [۲]

ڈاکٹر عبادت بریلوی نظریہ اشتراکیت اور اقبال کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اقبال کے خیال میں اشتراکیت ایک ایسا نظام ضرور ہے جو رنگ وخوں اور نسل وقوم کے سطحی امتیازات کو مٹانا چاہتا ہے، جس کے نزدیک طبقاتی تفریق کو مٹا کر ایک ایسے نظام کی تشکیل لازمی اور ضروری ہے، جس میں نفرت نہ ہو، بغض وعناد نہ ہو، ہوس ملک گیری نہ ہو، غربت وامارت کا فرق نہ ہو اور دولت کی تقسیم غیر مساوی نہ ہو۔ اقبال اشتراکی نظام کے ان پہلوؤں کی اہمیت کے تو قائل ہیں لیکن اس نظام نے روحانیت سے جو چشم پوشی کی ہے، اس کے وہ دشمن ہیں۔'' [۳]

۱۔ اقبال کا نظام فن، ص ۲۴۷

۲۔ اقبال کا فن، ص ۱۳۱

۳۔ اقبال احوال وافکار، ص ۶۵

اقبال ایسی جمہوریت کا قائل نہیں جہاں سرمایہ داروں کو تحفظ اور تقویت دی جا رہی ہو- اقبال نے اپنے پیغام میں بورژوا جمہوریت کو ناپسند کرتے ہوئے حقارت کی نظر سے دیکھا ہے کیونکہ آج کا غریب جسے نہ پیٹ بھر روٹی نصیب ہے اور نہ ہی رہنے کو مکان، کسان اور مزدوروں کی حالت کو دیکھتے ہوئے اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ انہیں بیدار کیا اور وہ جرأت عطا کی کہ مزدور سرمایہ دار سے صف آراء ہو گئے ؎

محنت و سرمایہ دنیا میں صف آراء ہو گئے
دیکھئے ہوتا ہے کس کس کی تمناؤں کا خون

اقبال نے سوشلسٹ خیالات کا اظہار اپنی شاعری کے ذریعے کیا- اس کی ایک خاص وجہ تو یہ ہے کہ ہندوستان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، ایسے میں اقبال کی آواز مسیحا کی آواز بن کر ابھری، اقبال کہتے ہیں ؎

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

یہ ہے وہ نظریہ جسے خالصتاً اشتراکیت کہتے ہیں- اسی شعر میں غریب کی حمایت کا اعلان بھی ہے اور یہیں سے ترقی پسندوں نے اپنی شاعری میں اور نثری ادب میں خاص طور پر بھوک، افلاس، مفلوک الحالی اور غریبوں کی داستان کو موضوع سخن بنایا تاکہ مزدوروں میں جذبۂ حریت پیدا ہو، اقبال نے ترقی پسند تحریک کو کثیر جہتیں عطا کیں-

کلاسیکی ادب سے انحراف:

اردو شعراء کے تذکروں کی روشنی میں کلاسیکی ادب کا جو معیار قائم ہوا، وہ فارسی ادب سے متخرج ہے کیونکہ شعری اسالیب، اصناف، موضوعات اور اوزان و بحوران کے مآخذ فارسی ادب سے ہے، اس کے علاوہ صنائع بدائع کی وہ خوبیاں اور خصوصیات جو شعر کی جان ہوا کرتی ہیں- اگر ہم فارسی کے محاورات پر نظر ڈالیں تو بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اردو شعر و ادب میں یہ محاورات بھی فارسی کے زیر اثر ہیں- ولی دکنی کی شاعری سے داغ دہلوی تک کا اجمالاً جائزہ لیں تو بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارا کلاسیکی ادب فارسی کا احسان مند ہے- کیونکہ تشبیہات و استعارات، تلمیحات اور صنائع شعری میں جو اضافہ ہوا ہے، اس سے اردو کے کلاسیکی ادب میں بے پناہ وسعت ہوئی ہے کیونکہ ابتداء میں قصہ، کہانی، پھر داستانوی ادب، ان تمام کو منظوم پیرائے میں ادا کرنا اور ان اصولوں کو پیش نظر رکھنا جو شاعری کے لئے ضروری سمجھا گیا ہے اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایرانی تہذیب کے اثرات ہماری اردو شعری میں دیکھے جا سکتے ہیں- شاعری میں فن بلاغت اور علم بیان ہی سے کلاسیکی ادب میں اضافہ ہوا- اس سے یہ ہوا کہ موضوعات محدود ہوتے چلے گئے اور شاعری مخصوص پیرائے میں کی جانے لگی- فطری اور تہذیبی فکر کا کہیں ذکر نہیں ملتا البتہ نظیر اکبرآبادی سے شاعری میں تبدیلی آئی- ان کی شاعری میں وہ تمام موضوعات داخل شعر کیے گئے کہ جن کا داخلہ اس سے قبل ممنوع تھا- یہ وہ نیا رجحان تھا جسے اس دور کے شعراء نے قبول کرنے میں تامل برتا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ نظیر نے اپنی شاعری اور خاص کر نظموں سے مختلف موضوعات اور کثرت الفاظ سے شاعری میں خاصی وسعت پیدا کر دی-

شمالی ہند میں شاعری کے آغاز میں ہی فارسی تراکیب کا استعمال بکثرت نظر آتا ہے- ان میں ذوق و سودا کی قصیدہ گوئی، ان کی شاعری میں خارجیت کے تمام پہلوؤں کو سمیٹا گیا ہے- اب اگر لکھنؤ دبستان یا پھر دہلی کا دبستان شاعری یا کوئی اور دبستان، ان

سب میں مشترکہ بات یہی نظر آتی ہے، وہ یہ کہ محبوب کا سراپا، گل وبلبل، عشق و عاشقی جیسے مضامین ہی میں شعراء طبع آزمائی کر رہے تھے۔ غالبؔ و مومنؔ نے کلاسیکی ادب میں جو گراں قدر اضافہ کیا ہے، ان کے دیوان اس بات کے شاہد ہیں۔ تاہم حالیؔ اور آزادؔ نے انجمن پنجاب کے ذریعے شاعری میں جدید رجحان کے تحت موضوعاتی نظموں سے نئی فکر کا آغاز کیا۔ قدیم روایت سے بغاوت کرتے ہوئے شاعروں میں نیچرل شاعری کو فروغ دیا۔ ادب کی کلاسیکی روایات سے انحراف کی یہ پہلی مثال تھی، جو انجمن پنجاب کے ذریعے ظہور میں آئی۔ حالیؔ نے غزل کو بے وقت کی راگنی کہہ کر شعراء کو یہ باور کرایا کہ وقت اور حالات کے تحت اور قوم کی تنزلی کو پیش نظر رکھ کر ایسی شاعری کی جائے جس سے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کیا جا سکے۔ اس لئے اب کلاسیکی ادب کی ضرورت نہیں۔ فطری اور وطنی شاعری کی ضرورت ہے۔ حالی کے بعد اردو شاعری کی کلاسیکی روایات پر سب سے کاری ضرب اقبالؔ نے لگائی اور ایسی نظمیں لکھیں جن میں ان کے معاصرین اور بعد کے شعراء میں ان کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ اقبال کے معاصرین اور بعد کے شعراء نے بھی اقبال کے نظریات وخیالات سے استفادہ کرتے ہوئے اور کلاسیکی ادب سے گریز کرتے ہوئے اقبال کے اثرات قبول کئے۔ اس طرح کلاسیکی ادب بے جان اور پھیکا پڑتا چلا گیا۔ اس طرح اقبال کی شاعری پورے برصغیر میں سنائی دینے لگی۔

اگر ہم کلاسیکی شاعری کا بہ نظر غائر مطالعہ کریں تو میری تقی میرؔ سے لے کر داغؔ دہلوی تک کی شاعری کو کلاسیکی شاعری کہا جائے گا۔ اردو میں جتنی بھی اصناف سخن رائج ہیں مثلاً قصیدہ، ہجو، مستزاد، ترکیب بند، ترجیع بند، مرثیہ، غزل، مثنوی، رباعی، مثلث، مخمس، مسدس وغیرہ ان میں اردو شاعری کا دامن موضوعات اور تراکیب لفظی کے لحاظ سے خاصا پہلے سے وسیع ہے۔ اس کے باوجود غالبؔ نے موضوعات کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے بیان کی تشنگی کا اظہار کیا تھا۔ حالیؔ اور آزادؔ نے نیچرل نظم کا آغاز کیا۔ عظمت اللہ نے نئی شاعری پر ایک مضمون بھی لکھا اور اس میں مشورہ بھی دیا کہ اردو عروض کی اساس ہندی پنگل پر رکھی جائے کیونکہ غزل کو بے وقت کی راگنی کہا جا رہا تھا۔ اگر ہم حالیؔ کے مقدمے کا بالاستیعاب مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے دیگر اصناف سخن پر کڑی تنقید کی۔ حالیؔ کی کوشش تھی کہ نئے مضامین اور نئے موضوعات شاعری میں داخل ہوں۔ اس طرح مولانا اسماعیلؔ میرٹھی، حسرتؔ، چکبستؔ، اقبالؔ، جوشؔ، احسانؔ دانش اور حفیظؔ جالندھری نے مل کر شاعری کی زمین میں نئے بیج ڈالے۔ جسے جدیدیت کہتے ہیں۔ اس جدیدیت میں اردو نظم کا پیرایہ اختیار کیا گیا۔ نظم کے اظہار میں اقبالؔ اور چکبستؔ نے بے پناہ موضوعات دیئے۔ اقبال کی وسعت فکر کے متعلق ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''احساس جمال اور احساس فطرت کے علاوہ اقبال کی نظر عمیق نے بھی ان کے فلسفے اور شاعری پر بڑے واضح اثرات مرتسم کئے ہیں۔ دیکھا جائے تو ان کی یہ نظر عمیق ان خاموش و پرسکون لمحات کی پیداوار دکھائی دے گی۔ جو فطرت کی نرم و گداز آغوش میں پہنچنے پر انہیں حاصل ہوئے اور جن کے سحر میں اسیر ہو کر انہوں نے نہ صرف زندگی کو ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھا بلکہ ایسی گہری نظروں سے دیکھا کہ ان کے لئے کائنات، زندگی اور معاشرے کے بہت سے پہلو دائرۂ نور میں آ گئے۔''[۱]

جدید شاعری اور اقبال کی ہمہ گیر فکر نے شعراء کو کلاسیکی ادب سے انحراف کرنے پر مجبور کر دیا۔ کلاسیکی ادب سے انحراف کرتے ہوئے ترقی پسندوں نے شاعری کے مزاج کو بدلا۔ سیاسی وسماجی پس منظر اور پیش منظر کو سامنے رکھتے ہوئے ان موضوعات کی طرف توجہ دی جو کہ وقت کی ضرورت تھی اس لئے شعراء نے ترقی پسند رجحانات کے تحت یہ محسوس کیا کہ نظام کی تبدیلی سے مسئلہ حل

۱۔ نظم جدید کی کروٹیں، ص ۵۲

نہیں ہوگا بلکہ ایک شدید انقلاب کی ضرورت ہے تا کہ کچلے ہوئے انسان کو عزت اور وقار دلایا جا سکے۔ اس کے علاوہ معاشرے میں بھوک پل رہی تھی۔ اس کا تدارک بھی شعر وادب کے ذریعہ ان مجبور انسانوں کی ترجمانی کی ہے جو مفلوک الحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اس بارے میں لکھتے ہیں:

''بایں ہمہ اردو شعر وادب کی یہ نئی تحریک بڑی ہمہ گیر اور دوررس نتائج کی حامل تھی۔ یہ ہیجان واضطراب، جو بہت حد تک اپنے ماحول کی سیاسی ومعاشی بے اطمینانی کی پیداوار تھا، زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوا۔ نئے فنکاروں میں بعض ایسے باشعور لوگ بھی تھے، جو تاریخ انسانی کی اقتصادی، طبقاتی، جدلیاتی، نفسیاتی، اخلاقی وروحانی باریکیوں کا علم بھی رکھتے تھے اور اپنے تہذیبی ورثے سے بھی بیگانہ نہیں تھے۔''[۱]

ترقی پسندوں نے ان موضوعات کو فروغ دے کر جدید نظم میں جو اضافے کئے ہیں اس میں ادب اور زندگی کو ہی موضوع سخن بنایا گیا تا کہ انسان اور اس کے مسائل زیر بحث آ سکیں۔ یہی وہ نظریہ تھا جو کلاسیکی شاعری کے انحراف کا سبب بنا۔ مجنوں گورکھپوری موضوعات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انسان کی سب سے بڑی ضرورت روٹی ہے اور انسانی تمدن اور اس کے تمام شعبوں کا پہلا بنیادی پتھر اقتصادیات ہے، اگرچہ آگے چل کر اس عمارت میں یہی سب کچھ نہیں رہ جاتا لیکن ابھی آگے چلنے کا کیا ذکر ہے؟ ابھی تو بنی نوع انسان کی یہی سب سے بڑی ضرورت پوری نہیں ہوئی ہے اور زندگی کی عمارت کے پہلے پتھر ہی نے مضبوط زمین نہیں پکڑی ہے۔ ہماری پہلی ضرورت یہ ہے کہ دنیا کی کثیر سے کثیر انسانی آبادی کو پیٹ بھر کر کھانا ملے، کوئی ننگا نہ رہے۔ کوئی ان پڑھ نہ رہے اور تہذیب کے یکساں مواقع ملیں۔''[۲]

انقلابی وسیاسی رجحانات:

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی سے ہندوستان کے مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی خاص طور پر مسلمان ہی انگریزوں کا نشانہ بنے۔ ہندوؤں کی خوشامد اور چاپلوسی سے یہ ہوا کہ انگریزوں کی تمام مراعات اور نوازشیں ان کے لئے مخصوص ہو گئیں۔ مسلمانوں نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا اور متحد ہو کر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ یہی وہ سیاسی جدوجہد تھی جس سے ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ اس عمل سے مسلمانوں کا ایک تشخص اجاگر ہوا۔ دریں اثناء ہندوستان میں چند اہم واقعات ایسے رونما ہوئے مثلاً کانپور میں مسجد کا انہدام کا واقعہ، اس میں سینکڑوں مسلمان شہید ہو گئے۔ اسی طرح طرابلس پر اٹلی نے حملہ کیا اور جنگ بلقان کے نام سے جو واقعہ پیش آیا۔ مولانا محمد علی جوہر نے تحریک خلافت کا آغاز کیا۔ اس تحریک میں مذہبی اور انقلابی رجحان تیز تر تھا۔ محمد علی جوہر اور دوسرے لیڈر گرفتار کر لئے گئے۔ مصطفیٰ کمال نے تحریک خلافت کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا، جس سے مسلمانوں کو

۱۔ اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر، ص ۴۷۶

۲۔ نکات مجنوں، ص ۱۹۷

ذہنی وقلبی طور پر دھچکا لگا اور وہ ایک بار پھر مایوسی کے گڑھے میں جا گرے۔ رفیع الدین ہاشمی سیاسی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا تو سکھا دیا مگر ان میں حریت فکر اور انقلابی اسپرٹ پیدا کرنے سے قاصر رہی۔ ہندو مسلمانوں کو ایسی بے جان حالت میں بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ آریہ سماج جیسی تحریکیں اس حد تک چلائی گئیں کہ ہندوستان میں رہنے کا حق صرف ہندوؤں کو ہے۔ آریہ سماجیوں نے ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف اس حد تک نفرت وتعصب پیدا کر دیا کہ وہ مسلم تمدن کے نقوش محو کر دینے کے درپے ہو گئے۔ ۱۹۰۶ء میں انتہا پسند ہندوؤں نے فرقہ پرست جماعت ''ہندو مہا سبھا'' قائم کی۔ غرض مسلمان ایک طرف ہندوؤں کے تعصب اور نفرت کا شکار تھے، دوسری طرف انگریز بھی انہیں کوئی حیثیت نہیں دیتے تھے۔''[۱]

مسلمانوں کی سیاسی وسماجی اور تعلیمی میدان میں جو پیش رفت نظر آتی ہے، اسے ہم سر سید احمد خاں کی محنت کا ثمر کہہ سکتے ہیں۔ علی گڑھ تحریک کی خدمات اور کارنامے اس بات کے شاہد ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے اندر ایک نئی زندگی کا سراغ ڈھونڈ نکالا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اس تحریک کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بہرحال ان تحریکات اور افکار نے ایک ذہنی اور بعد ازاں ایک سیاسی بیداری پیدا کی اور آہستہ آہستہ ایسے ادارے اور جماعتیں پیدا ہو گئیں جن کا نصب العین سیاسی جدوجہد تھا۔ ۱۸۵۷ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی جس نے آگے چل کر آزادی کی تحریک میں ایک اہم کردار ادا کیا اور آج تک ایک فعال سیاسی جماعت کی حیثیت سے بھارت میں باقی ہے۔''[۲]

علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء، الہ آباد میں جو خطبہ دیا اس میں واضح طور پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ مسلمان اور ہندو الگ الگ قوم ہیں، ان کی تہذیب، مذہب، کلچر، ثقافت جداگانہ ہیں اس لئے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ ملک ناگزیر ہے۔ ہندو شر انگیزی پھیلانے میں پیش پیش تھے۔ مسلمان ان کے عزائم اور حرکات کو دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار بیسویں صدی میں ملکی سیاست کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بیسویں صدی کے ساتھ ہی ملکی سیاست پیچیدہ تر ہونے لگی تھی۔ بنگال کی تقسیم اور پھر اس کی منسوخی، ہوم رول تحریک اور پھر عدم تعاون اور خلافت تحریک تک سیاست ہند میں ایسے ایسے مدوجزر آئے جو برعظیم کے مستقبل پر اثر انداز ہونے والے تھے لیکن یہ دور بڑا ہنگامی اور جذباتی تھا خصوصاً تقسیم بنگال کی تنسیخ کے بعد مسلمانوں میں ایک جذباتی ہیجان پیدا ہو چکا تھا، جسے بلاد اسلامیہ کے حادثات نے سہ آتشہ کر دیا تھا۔''[۳]

۱۔ اقبال کی طویل نظمیں، ص ۲۱

۲۔ آج کا اردو ادب، ص ۳۳

۳۔ اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر، ص ۴۱۵

شبلی اور سرسید ملکی سیاست کے علاوہ وہ بھی قوم کی اصلاح کی طرف توجہ دے رہے تھے- ان کی فکر کا دائرہ تاریخی، سماجی، مذہبی نقطۂ نگاہ لئے ہوئے تھا- یہ رجحان شبلی کی نظموں میں دیکھا جاسکتا ہے- ان کی مشہور نظم ''شہرآشوب اسلام'' اس بات کا ثبوت ہے- بیسویں صدی کے آغاز ہی میں سیاست نے ایک اور کروٹ لی-۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان سے ترکوں پہ جو قیامت ٹوٹی، طرابلس اور بلقان کی جنگوں کا حال علامہ شبلی نعمانی نے اپنی نظموں میں کیا ہے ؂

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک

جنگ بلقان کے بعد ۱۹۱۲ء میں کانپور کے محلہ مچھلی بازار میں مسجد کا وضوخانہ منہدم کر دیا گیا- اس واقعہ سے مسلمانوں کا سویا ہوا انسان جاگ اٹھا- ایک جلسہ کا انعقاد کیا گیا- اس جلسہ میں مسلمانوں کی ایمانی قوت دیکھنے کے قابل تھی- گری ہوئی دیوار کو پھر سے اٹھایا گیا لیکن شرپسندوں نے ان مسلمانوں پر، جن میں بچے بھی تھے، گولیاں برسائیں، اس میں کئی بچے بھی شہید ہوئے- شبلی نے اس واقعہ پر بھی نظم لکھی ؂

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں

اگر ہم پہلی جنگ عظیم سے دوسری جنگ عظیم تک کا جائزہ لیں تو اس میں سیاسی اضطراب، اقتصادی بحران، اخلاقی انحطاط، مزدوروں کی خستہ حالی، غربت اور افلاس کے مارے ہوئے انسان نظر آئیں گے-

علامہ شبلی نعمانی نے مسلم لیگ پر بھی کافی نظمیں لکھیں- شبلی کے یہ شعر دیکھئے ؂

لیگ کی عظمت و جبروت سے انکار نہیں ملک میں غلغلہ ہے شور ہے، کہرام بھی ہے
کوئی ہے جو نہیں اس حلقۂ قومی کا اسیر اس میں زہاد بھی ہیں، رند مے آشام بھی ہے

علامہ شبلی نعمانی سیاسی وجوہات کی بناء پر مسلم لیگ کے زاویۂ نظر سے اختلاف بھی رکھتے تھے، انہوں نے کانگریس کی کھل کر حمایت کی-

علامہ شبلی نعمانی کی سیاسی شاعری میں دیگر شعراء نے بھی ساتھ دیا- ان میں چکبستؔ، اقبالؔ، اکبرؔ، ظفر علی خاں، حسرت موہانی- ان شعراء نے وقت اور حالات کے تحت مسلمانوں کی بیداری کے لئے ایسے نظمیں لکھیں جو خالصتاً سیاسی رجحان کی حامل ہیں- سیاسی و معاشرتی پس منظر کی روشنی میں شعراء نے جو نظمیں کہی ہیں، ان سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہر صدی کی اپنی ایک داستان ہے لیکن بیسویں صدی کے آغاز ہی سے اردو نظم میں خاصا اضافہ ہوا- اس کی ایک خاص وجہ تو یہ ہے اقبالؔ اور ان کے معاصرین نے جس تیزی سے نظم کے میدان میں وسعت عطا کی، ان میں اقبال اور ظفر علی خاں قابل ذکر ہیں- جنھوں نے سیاسی جدوجہد کے حوالہ سے متعدد نظمیں لکھیں-

ان شعراء کے بعد ترقی پسند تحریک سامنے آئی- ان کے ہاں انقلاب اور اشتراکیت کا رجحان غالب رہا- ترقی پسند تحریک

کے بارے میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> ''ترقی پسند شاعری کے اس مختصر سے جائزے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شاعری کے قدیم اور رسمی اسلوب، موضوعات اور تکنیک کے خلاف بغاوت کی یہ تحریک اپنے مقاصد کے اعتبار سے ترقی پسند ضرور تھی اور اس نے بلاشبہ تجربے کے لئے نئی راہیں دکھائیں لیکن ایک مخصوص سیاسی نظریہ کی تبلیغ و اشاعت میں شدت افادیت پر فن کی نزاکت کو قربان کر دینے کا جذبہ سستی قسم کی جذباتیت اور نعرہ بازی سہل پسندی اور غور و فکر کی کمی نے اس تحریک کو اردو میں ایک شعری روایت کی عظمت سے محروم کر دیا۔'' [۱]

یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ ترقی پسندوں نے اپنی نظموں میں سیاسی و انقلابی رجحان کو اجاگر کیا۔ ترقی پسند نظریہ کے تحت شاعری کر رہے تھے جبکہ اقبال ترقی پسندوں سے پہلے ترقی پسندی کا اظہار کر چکے تھے۔ اقبال مغرب کی سیاست، سامراجی نظام اور ان کی حکمت عملی کے مخالفت ہی نہیں کرتے تھے، حد درجہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مغرب کی سیاسی حکمت پر عزیز احمد لکھتے ہیں:

> ''سیاسی حکمت دو طرح کی ہو سکتی ہے ''پس چہ باید کرد'' میں اقبال نے مغرب کی سرمایہ دار اور سامراجی حکمت عملی کو حکمت فرعونی قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی اشتراکیت کی حکمت عملی حکمت حکیمی ہے۔ یہ وحی برحق میں جدید اشتراکی قدروں کی تلاش اور ان کے اساس پر اسلامی اشتراکی جمہوریت کی انقلاب انگیز تخلیق ہے۔ نبوت جب فرمان حق باری کرتی ہے تو اس کے ساتھ ہی وہ ملوک و سلاطین سے بغاوت سکھاتی ہے۔ یہ حکمت حکیمی عقل سے بالاتر ہے۔ اس کے ضمیر سے نئی امتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان امتوں کی سرداری ایسے درویش کرتے ہیں جو تاج و سپاہ و خراج سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ حکمت حکیمی کا درس انقلابی ہوتا ہے۔'' [۲]

ترقی پسندوں نے اقبال سے اسلامی اشتراکیت کے اصول اخذ کئے۔ روس میں انقلاب آ چکا تھا اور مزدوروں نے اقتدار سنبھال لیا تھا۔ ہندوستان میں آزادی کی جنگ لڑی جا رہی تھی۔ سیاسی اعتبار سے معاشرتی و سماجی اقدار میں جو بے چینی پائی جاتی تھی اس میں مذہب اور اخلاق بھی زد میں آیا۔ نوجوانوں میں خودسری پیدا ہوئی۔ قومی اور آفاقی مسائل کے پیش نظر شعراء نے نظموں میں ان کیفیات کی ترجمانی کر کے انقلابی اور سیاسی رجحان کو اجاگر کیا۔

اسرار الحق مجازؔ ۱۹۱۱-۱۹۵۵ء:

مجازؔ کی شاعری حسن و عشق سے شروع ہو کر انقلاب آفریں نظموں پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ جہاں ان کی غنائی شاعری نے متاثر کیا وہاں انقلابی شاعری نے عہد جدید کو اپنی آغوش میں لے کر سماج اور فرسودہ قوانین کو نشانہ بنایا۔ شراب و شباب مجازؔ کا وہ اولین

۱۔ آج کا اردو ادب، ص ۱۷۲

۲۔ اقبال نئی تشکیل، ص ۴۰۶

دور تھا جس میں انہوں نے ایسی نظمیں لکھیں جن میں ''شکوۂ مختصر''، ''طفلی کے خواب'' اور ''آج بھی'' ان نظموں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مجازؔ عاشق انقلابی تھے کیونکہ ان نظموں سے حریت کا جذبہ اجاگر ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر مجازؔ نے جس انقلاب کی بات کی ہے وہ ترقی پسند نقطہ ہائے نگاہ سے اس لئے قریب ہے کہ یہ از خود انسان سے محبت کرتا ہے، ان انسانوں سے جو مظلوم ہیں، فاقہ زدہ ہیں، بھوک سے تڑپتے ہوئے سینکڑوں انسان، جنہیں نہ رہنے کو مکان اور نہ کھانے کو روٹی۔ ان موضوعات کو انقلابی رنگ دے کر نظم ''آوارہ'' لکھی۔ مجاز کی زندگی کا طرز بھی عجیب ہے۔ ایک ہاتھ میں جام تو دوسرے ہاتھ میں تلوار، تلوار علامت ہے انقلاب کی۔ ''کج کلہی''، ''جنونِ سفر''، ''آزادروی''، ''سرفرازی'' ان نظموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجاز کا دل انسان کے لئے دھڑکتا ہے اور تڑپتا ہے۔ زخم خوردہ انسانیت کے لئے مرہم تلاش کرتا ہے۔ ایک طرف وہ عشقیہ شاعری کا امام ہے تو دوسری طرف مجاہدوں کا سپہ سالار۔ یہی جذبات ان کے مجموعہ کلام ''مجاز ایک آہنگ'' میں نظر آتا ہے۔ فیض احمد فیضؔ نے مجاز کی شاعری پر ''مطربِ انقلاب'' کے نام سے ایک مضمون لکھا، اس کا اقتباس پیش خدمت ہے:

> ''یہی وجہ ہے مجاز کے شعر میں تھکن نہیں مستی ہے۔ اداسی نہیں سرخوشی ہے۔ مجاز کی انقلابیت عام انقلابی شاعروں سے مختلف ہے۔ عام انقلابی شاعر انقلاب کے متعلق گرجتے ہیں، للکارتے ہیں، سینہ کوٹتے ہیں، انقلاب کے متعلق گا نہیں سکتے۔ ان کے ذہن میں آمد انقلاب کا تصور طوفان برق ورعد سے مرکب ہے۔'' [1]

مجازؔ کو دراصل انقلابی مجاز بنانے میں علی گڑھ کا قیام اور ترقی پسند شعراء کا ہاتھ ہے۔ قدآور شخصیات کی صحبت نے مجازؔ کو ایک نئے آہنگ سے روشناس کرایا۔ محمود الرحمٰن مجازؔ کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''یہ نا قابل انکار حقیقت ہے کہ ۱۹۳۰ء کے بعد کی سیاسی تگ ودو نے مجاز کو خاص طور سے متاثر کیا تھا۔ شہر نگاراں کا شاعر ہونے کے باوجود حصول آزادی کے لئے ان کے دل میں تڑپ تھی۔ برطانیہ کے قائم کردہ سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کرنے اور غلامی کی زنجیریں توڑنے کا بے پناہ جذبہ ان کے سینے میں موجزن تھا۔ وہ وقت کی آواز سن رہے تھے اور ''سرشار نگاہ نرگس'' ہونے کے باوجود لپکتے ہوئے شعلے اور چلتی ہوئی تلوار بن کر میدان کارزار میں کود گئے تھے۔'' [2]

سرمایہ داری کے خلاف مجازؔ کی نظم ''انقلاب'' پر اقبال کی نظم اور فکر کے اثرات ''فقر وملوکیت'' میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اقبال کے دو شعر ملاحظہ کیجئے ؎

فقر جنگاہ میں بے ساز و براق آتا ہے　　ضرب کاری ہے، اگر سینے میں ہے قلب سلیم
تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون و کلیم　　اب ترا دور بھی آنے کو ہے اے فقر غیور
(فقر وملوکیت)

اقبال کا یہ شعر دیکھئے ؎

آشنا اپنی حقیقت سے ہوا ہے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

۱۔ آہنگ، ص ۷

۲۔ جنگ آزادی کے اردو شعراء، ص ۳۴۲

مجاز کی نظم ملاحظہ کیجئے ؎

بھوک کے مارے انساں کی فریادوں کے ساتھ
فاقہ مستوں کے جلو میں خانہ بربادوں کے ساتھ
ختم ہو جائے گا یہ سرمایہ داری کا نظام
رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوش انتقام
خون کی بو لے کے جنگل سے ہوائیں آئیں گی
خون ہی خون ہوگا، نگاہیں جس طرف بھی جائیں گی
اور اس رنگ شفق میں باہزاراں آب و تاب
جگمگائے گا وطن کی حرّیت کا آفتاب

(انقلاب)[1]

مجاز نے نظم ''انقلاب'' میں ظلم و جبر کے واقعات کو بھی نظم کیا ہے اور ایک ایسی تبدیلی اور انقلاب کی طرف اشارہ کیا ہے جہاں روشن مستقبل کا سورج طلوع ہوگا- مجاز کی نظموں میں اقبال کے تیور، تنوع اور تراکیب ملتی ہیں- اصناف ہیئت کے اعتبار سے بھی انہوں نے اقبال کی تقلید کی ہے مثلاً ''آوارہ'' نظم جو کہ مثلث میں ہے- اسی طرح اقبال کی نظم ''علم و عشق'' جو کہ ''ضرب کلیم'' میں ہے، اسی ہیئت میں ہے، ترقی پسندوں نے اقبال کی علمی و فکری جہتوں کو سراہتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ نظریات میں جو ہمہ گیری پائی جاتی ہے وہ کسی اور شاعر میں نظر نہیں آتی- مجاز نے بعینہ اقبال کی طرح اپنے گرد و پیش کے حالات اور ملکی سیاست، سفاکانہ طرز عمل سے نفرت اور بغاوت کا اظہار کرتے ہوئے اپنی نظموں میں ترقی پسند خیالات کو فروغ دیا- سیاسی و انقلابی نظموں میں ''جنون سفر''، ''آزادی''، ''خانہ بدوش''، ''خواب سحر''، ''اندھیری رات کا مسافر''، ''میرا چمن'' ان کے علاوہ اور بھی نظمیں ہیں- مجاز کی نظم ''آوارہ'' میں جبر و استبداد، سامراجیت نظام کے خلاف بغاوت، خودداری اور غیور ہونے کی تمام علامات اس نظم میں موجود ہیں- محمد حسن عسکری نے اس نظم کو ''میری بہترین نظمیں'' میں انتخاب کیا ہے- اس نظم کے چند بند ملاحظہ کرنے سے پہلے اقبال کی نظم کا رنگ و آہنگ دیکھئے، اس نظم میں اقبال کے خیالات کی ترسیل ہوتی ہے- ''شبنم اور ستارے'' اقبال کی یہ نظم ''بانگ درا'' میں ہے ؎

اک رات یہ کہنے لگے شبنم سے ستارے
ہر صبح نئے تجھ کو میسر ہیں نظارے
کیا جانیے، تو کتنے جہاں دیکھ چکی ہے
جو بن کے مٹے، ان کے نشاں دیکھ چکی ہے

(شبنم اور ستارے)

مجاز کی نظم ''آوارہ'' ملاحظہ کیجئے ؎

یہ روپہلی چھاؤں، یہ آکاش پہ تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور، جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے، کون سمجھے جی کا حال
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں
دل میں ایک شعلہ بھڑک اٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اٹھا ہے آخر کیا کروں

۱- آہنگ، ص ۵۸

زخم سینے کا مہک اٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

(آوارہ) [1]

مجاز کا جمالیاتی تصور اور انقلابی نظام دونوں آپس میں مدغم نہیں ہوئے ہیں بلکہ دونوں کی راہیں جدا جدا ہیں۔ جمالیاتی شاعروں میں وہ جوش، جاں نثار اختر اور اختر شیرانی سے متاثر ہیں تو دوسری طرف انقلابی شاعری میں انہوں نے اپنے پیش نظر اقبال کو رکھا ہے جبکہ بیسویں صدی میں اقبال ہی وہ شاعر ہیں جن کی ہمہ جہت فکر نے تمام شعراء کو متاثر و متوجہ کیا۔ مجاز کے تین مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان میں ''آہنگ''، ''شب تاب'' اور ''سازنو'' اس کے علاوہ افکار کے مدیر صہبا لکھنوی نے ''مجاز ایک آہنگ'' کے نام سے مجاز پر نہایت وقیع کتاب مرتب کی ہے۔ مجاز کی نظم بعنوان ''آج بھی'' میں اقبال کی نظم ''عشرت امروز'' کے نکات و اثرات پائے جاتے ہیں ؎

نہ مجھ سے کہہ کہ اجل ہے پیام عیش و سرور
نہ کھینچ نقشہ کیفیت شراب طہور
فراق حور میں ہو غم سے ہمکنار نہ تو
پری کو شیشۂ الفاظ میں اتار نہ تو

(عشرت امروز) بانگ درا

مجاز کی نظم ملاحظہ کیجیے ؎

آج بھی خار زار غم خلد بریں میرے لئے
آج بھی رہ گزار عشق میرے لئے ہے کہکشاں
آج بھی ہے رچی ہوئی، آج بھی ہے بسی ہوئی
میرے نفس میں خلد کی نزہت و نکہت جواں
آج بھی ہے زباں مری خنجر بے نیام شوق
بحث طلب ہے آج بھی جرأت شوخی بیاں

مجاز نے اپنی نظم میں اقبال کے نظام فن کو ملحوظ رکھا ہے اور یوں بھی یہ نظم رنگ و آہنگ اور اسلوب کے لحاظ سے اقبال کے آہنگ سے مناسبت رکھتی ہے۔ ترقی پسند نظریات میں بھی مجاز نے اقبال سے کسب فیض کیا ہے۔ مجاز کی عشقیہ شاعری پر اقبال کی عشقیہ شاعری کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اقبال کی عشقیہ شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

''اقبال کی عشقیہ شاعری اس سے پہلے کی اردو شاعری سے کس درجہ مختلف ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق محض اضطراری کیفیت، ہیجان، دشمن عقل، خود رفتگی، فنا آمادگی یا محدود کو لامحدود میں گم کر دینے کا نام نہیں ہے بلکہ اقبال کے ہاں عشق نام ہے ایک عالمگیر قوت حیات کا، عمل سے سرشاری کا، مقصد کے حصول کے لئے بے پناہ لگن کا عزم و آرزو سے آراستہ جہد مسلسل کا چنانچہ اپنے پیش رو شعراء اور منکرین میں سے،

۱۔ آہنگ، ص ۹۱

جن جن کے یہاں عشق کے یہ تصورات منتشر صورت میں اسے ملتے ہیں، وہ ان سب
سے استفادہ کرتا ہے- اقبال کے منظم فلسفۂ عشق کے اولین نقوش رومیؔ کی شاعری میں
ملتے ہیں-'' ؎۱

مجازؔ کی شاعری میں عشقیہ مضامین جس میں نالۂ غم کے ساتھ کیف و مستی کا رنگ بھی پایا جاتا ہے، ان کے موضوعات میں عورت کو اہمیت دی گئی ہے- اسی وجہ سے ان کی عشقیہ شاعری میں جذبۂ عشق ابھر کر سامنے آیا ہے- مجازؔ کا شعر ملاحظہ کیجئے ؎

عشق ہی عشق ہے دنیا میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں

اقبال کہتے ہیں ؎

اے دردِ عشق! ہے گہر آب دار تو
نا محرموں میں دیکھ نہ ہو آشکار تو

مجازؔ اور اقبال کے ہاں جو درد مشترک ہمیں ملتا ہے، اس جلال و جمال کی روشنی میں وہ تمام جلوہ سامانیاں نظر آتی ہیں، جو عشقیہ شاعری کے لئے لازم آتی ہیں- نظم ''رات اور ریل'' پر اقبال کی نظم ''ہمالہ'' کی بازگشت سنائی دیتی ہے-

ساحرؔ لدھیانوی......۱۹۲۲ء-۱۹۸۱ء:

ساحرؔ کا سحر غزل اور نظم میں سر چڑھ کر بولا- اس کی وجہ ہے انہوں نے شاعری میں بے پناہ تجربے کئے ہیں اور یہ تجربے انقلابی تجربوں سے زیادہ موثر ثابت ہوئے- ان کا سیاست میں آنا ہی اس بات کی علامت ہے کہ انہیں ایک انقلاب کا لانا مقصود تھا- ان کی نظموں میں سماجی اور معاشرتی زبوں حالی کی زندہ تصویریں نظر آتی ہیں- ساحرؔ نے فلمی دنیا میں رہتے ہوئے اپنے مقصد کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا- انہوں نے فلم کے ذریعہ بھی اپنے مشن کو جاری رکھا-

ترقی پسند تحریک سے ان کے خیالات کو اور بھی تقویت ملی اور ایسی نظمیں کہیں جو سرمایہ داری کے خلاف تھیں- ان کی نظموں کا ہر مصرعہ ایسا پر اثر ہوتا ہے جیسے ہر مصرعہ پر جادو کا منتر پڑھا گیا ہو- یہ حقیقت ہے کہ ساحرؔ کے کلام میں تاثیر اور جاذبیت بدرجہ اتم موجود ہے- ان کی کسی بھی نظم کو دیکھ لیجئے، لطیف اشارے، تراکیب، حالات و واقعات کی روشنی میں پس منظر سے آگاہی کا ادراک بھی سہل ہو جاتا ہے مثلاً ان کی یہ نظمیں جن میں تاثر ہی تاثر ہے ''تاج محل''، ''خوبصورت موڑ''، ''کبھی کبھی''، ''ردِ عمل'' ان کے مجموعہ ہائے کلام ''تلخیاں''، ''پرچھائیاں''، ''آ ؤ کچھ خواب بُنیں'' میں ایسی متعدد نظمیں ملیں گی جن میں انقلاب، سماجیات اور رومان پر پر کیف اور سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی دلی کیفیات کا اظہار ملے گا- ساحرؔ کے وہ نغمے جو انقلابی ذہن کی عکاسی کرتے ہیں- ساحرؔ کی ایک مشہور نظم ''ثنا خوان تقدیس مشرق کہاں ہیں'' اس نظم کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر عوام سے کتنا قریب ہے- ساحرؔ نے اپنے گیتوں کے ذریعہ بھی ترقی پسند نظریات کی ترسیل کی ہے جس میں بھوک، افلاس اور سرمایہ داری کے خلاف موضوعات کو جدید رنگ سے نظم میں پیش کیا ہے-

ساحرؔ اپنی نظم ''گاتا جائے بنجارہ'' میں ترقی پسند رجحان کو پیش کرتے ہوئے اقبال کے افکار و خیالات سے بھی استفادہ

۱- نگار- پاکستان، ص ۳۱

کرتے ہیں- اقبال کی نظم ''لادین سیاست'' میں سے دو شعر دیکھئے ؂

جو بات حق ہو، وہ مجھ سے چھپی نہیں رہتی
خدا نے مجھ کو دیا ہے دل خبیر و بصیر
مری نگاہ میں ہے یہ سیاست لادیں
کنیز اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر

(لادین سیاست) ضرب کلیم

ساحر کی نظم ملاحظہ کیجئے ؂

یہ محلوں یہ تختوں یہ تاجوں کی دنیا
یہ انساں کے دشمن سماجوں کی دنیا
یہ دولت کے بھوکے رواجوں کی دنیا
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے

(گاتا جائے بنجارہ)[1]

اقبال نے سیاست لادیں کہہ کر ساحر کی مشکل آسان کر دی اور انہیں یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ عوامی مسائل اور مصائب کا ذکر ان کی شاعری میں اولین ترجیح ہے- ساحر نے قومی انحطاط اور معاشرتی زبوں حالی کی جو تصویریں اتاری ہیں، اس میں سوز و گداز کے ساتھ مخصوص علامتیں ملتی ہیں جس سے ترقی پسند ہونے کا اظہار ہوتا ہے- ساحر کی ایک نظم ''میں'' ہے، اس میں اقبال کی نظم ''سرگزشت آدم'' کے اثرات ملاحظہ ہوں ؂

سنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے
بھلایا قصۂ پیمان اولیں میں نے
لگی نہ میری طبعیت ریاض جنت میں
پیا شعور کا جب جام آتشیں میں نے

(سرگزشت آدم) بانگ درا

ساحر کی نظم کے دو شعر ملاحظہ کیجئے ؂

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں
آئینہ حوادث ہستی میں میرے شعر جو دیکھتا رہا ہوں وہ کہتا رہا ہوں میں

(میں)[2]

ساحر کے کرب کو نظموں میں محسوس کیا جا سکتا ہے- ان کی شاعری ایک دکھے دل کی وہ صدا ہے جو آج بھی ہمارے درمیان گونج رہی ہے- ساحر کی نظم ''پھر وہی کنج قفس'' میں اقبال کا وہ انداز اور تیور ملاحظہ کیجئے، جو انہوں نے ''شکوہ'' اور ''جواب

۱- گاتا جائے بنجارہ، ص۲۱۱

۲- تلخیاں، ص۴۳

شکوہ'' میں اختیار کیا ہے۔ ساحر کی نظم ملاحظہ کیجئے۔

پھر وہی گوشۂ زنداں ہے وہی تاریکی
پھر وہی کہنہ سلاسل وہی خونیں جھنکار
پھر وہی بھوک سے انساں کی ستیزہ کاری
پھر وہی ماؤں کے نوحے، وہی بچوں کی پکار
بھوک اور قحط کے طوفان بڑھے آتے ہیں
بول! اے عصمت و عفت کے جنازوں کی قطار
روک! ان لوٹتے قدموں کو، انہیں پوچھ ذرا
پوچھ، اے بھوک سے دم توڑتے ڈھانچوں کی قطار
زندگی جبر کے سانچوں میں ڈھلے گی کب تک
ان فضاؤں میں موت پلے گی کب تک

(پھر وہی کنج قفس) [۱]

نظم میں بھوک اور افلاس کو اجاگر کیا ہے۔ معاشرتی کرب اور اخلاقی انحطاط کو جس انداز سے پیش کیا ہے۔ اقبال نے مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ بڑے خوبصورت پیرائے میں کھینچا ہے۔ اقبال کا علامتی نظام نہایت دلکش ہے۔ اس میں انہوں نے ہر زاویے سے خواہ وہ فلسفیانہ انداز ہو، فکری اجتہاد ہو، اصول ونظریات کی بحث ہو یا تشبیہات و استعارات کی دنیا ہو، انہیں بصری علامتوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ناز صدیقی، ساحر کی نظریاتی شاعری کے متعلق لکھتی ہیں:

''محنت کش طبقے سے ساحر کی ہمدردی محض نظریاتی یا جذباتی سطح پر نہیں رہی۔ انہوں نے خود بھی شدید معاشی سختیاں جھیلیں، بے گھری اور فاقہ کشی کی صعوبتیں اٹھائیں۔ پھر سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جذبات کا اظہار شاعری ہی میں نہیں کیا بلکہ سیاسی جدوجہد میں عملی حصہ بھی لیا۔ ساحر کو انسان اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے بے حد پیار ہے۔ ان کی ہمدردیاں شروع ہی سے سماج کے کچلے ہوئے طبقات اور مظلوم انسانوں کے ساتھ وابستہ رہیں۔'' [۲]

اقبال اپنے خیالات اور افکار اس قدر وسیع پیمانے پر نہ پھیلاتے تو آج ان شعراء میں یہ بات نہ پیدا ہوتی۔ یہی اقبال کی فکر کی وہ آفاقیت ہے کہ شعراء اقبال کی شاعری کی طرف متوجہ ہوئے اور کسب فیض کے ساتھ اس بات کا اعتراف بھی کیا کہ اقبال ایک عظیم شاعر ہے۔

فیض احمد فیض......۱۹۸۴ء-۱۹۱۱ء:

فیض رومان اور انقلاب کے شاعر ہیں۔ کلام میں تازگی، فنی صلاحیت، تخلیقی قوت اور شیرینی لطافت اور علائم درموز سے

۱- تلخیاں، ص۱۸۰

۲- ساحر شخص اور شاعر، ص۳۶

آشنائی کا جواظہار ملتا ہے، یوں توغم دوراں اورغم جاناں کے امتزاج سے نئے آہنگ کی بنیاد رکھی۔جیل کی صعوبتوں اوراشتراکیت کے نظریے سے مظلوموں کی آہ و بکا، مجبور ومحروم انسانوں کی حالت زار، مزدور اور سرمایہ دار جیسے موضوعات پر نظمیں لکھیں۔فیض دراصل مزدوروں کے حامی رہے۔انسانی ہمدردی، معاشی اور معاشرتی قدروں کا ذکر نظموں میں جگہ جگہ ملتا ہے۔وطن کی محبت میں بھی سرشاری کا جذبہ ملتا ہے۔فیض کے کلام میں زیادہ تر اقبال کی فکری جہتیں بھی نظر آتی ہیں مثلاً قدیم الفاظ کو نئے علائم دے کر لفظوں کے نئے معنی نکالے ہیں۔میجر محمد اسحاق نے ''زنداں نامہ'' میں فیض کی نظموں کے متعلق لکھا ہے:

''فیض کی جیل کی نظموں میں وطن کی محبت کے چشمے ہر طرف پھوٹ رہے ہیں۔
وہ جابجا اپنے دیس اور اس کے باسیوں کی خستہ حالی، قوم کی عزت و ناموس کی ارزانی،
لوگوں کی ناداری، جہالت، بھوک اور غم کو دیکھ کر بے طرح تڑپ رہے ہیں۔'' [۱]

اقبال کی نظم ''تصویر درد'' میں وطنیت کا جذبہ جس شدت احساس کے ساتھ ملتا ہے اس کا اظہار انہوں نے، اشعار میں بندش تراکیب، وسعت معانی، تشبیہات واستعارات، زبان وبیان کی خوبی سے نظم کو آرٹ کا بہترین نمونہ بنادیا۔اقبال کی نظم طویل نظموں میں شمار ہوتی ہے۔دوشعر ملاحظہ ہوں، یہ نظم ترکیب بند میں ہے ؎

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری ۔۔۔ خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری
یہ دیرانہ قفس بھی، آشیانہ بھی، چمن بھی ہے ۔۔۔ بیابان محبت دشت غربت بھی، وطن بھی ہے

(تصویر درد) بانگ درا

اقبال کی ایک اور نظم ''آزادی'' یہ بھی وطن کی محبت میں لکھی گئی، اس نظم کے تیور ملاحظہ کیجیے ؎

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے ۔۔۔ حریت افکار کی نعمت ہے خداداد
ہے مملکت ہند میں اک طرفہ تماشا ۔۔۔ اسلام ہے محبوس مسلمان ہے آزاد

(آزادی) ضرب کلیم

فیض نے اقبال سے جو کسب فیض کیا ہے نظم ''ترانہ'' میں جو خیالات اور افکار نظر آتے ہیں، وہ اقبال کے اثرات کا نتیجہ ہیں گو کہ بحر مختلف ہے، لیکن خیالات وافکار ایک جیسے ہیں ؎

دربار وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے، کچھ اپنی جزا لے جائیں گے
اے خاک نشینوں اٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے
کٹتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں، سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے
اے ظلم کے ماتو لب کھولو، چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو ان سے اٹھے گا، کچھ دور تو نالے جائیں گے

۱۔ زنداں نامہ، ص ۵۳

اس نظم میں فیض نے اپنی قوم کو بیداری کا درس دیا ہے- جذبۂ حریت کو جھنجھوڑا ہے-تخت گرانا اور تاج کا اچھالنا مغربیت کے سینے میں کیلیں جڑنے کے مترادف ہے- دریا جھوم کے اٹھے ہیں،قوم کو سیلاب سے تشبیہہ دے کر طوفان کا تصور پیش کیا ہے، جو کسی صورت رکنے والا نہیں-فیض کہتے ہیں کہ ظلم کی معیاد اب ختم ہوگئی، اب ہر حال میں ایک حشر اٹھے گا، مایوسی اور نا امیدی چھوڑ دو، کمر بستہ ہو کر دشمن کے مقابلے میں کھڑے ہو جاؤ- اقبال نے اپنی نظموں میں انداز ملوکانہ اور ملوکیت کی متعدد جگہ مذمت کی ہے-

اقبال کی نظم ''حیات ابدی'' صرف دو شعر پر ہے- ان اشعار میں حیات کا فلسفہ بیان کیا ہے ؎

زندگانی ہے صرف، قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

(حیات ابدی) ضرب کلیم

فیض کی نظم پر اقبال کے اثرات صوت و آہنگ کے لحاظ سے ملاحظہ کیجیے ؎

جو پھول سارے گلستاں میں سب سے اچھا ہو
فروغ نور ہو جس سے فضائے رنگیں میں
خزاں کے جور و ستم کو نہ جس نے دیکھا ہو
بہار نے جسے خون جگر سے پالا ہو
وہ ایک پھول سماتا ہے چشم گلچیں میں
ہزار پھولوں سے آباد باغ ہستی ہے
اجل کی آنکھ فقط ایک کو ترستی ہے

(حسن اور موت) [۱]

فیض نے جو ایمائی تشبیہات سے کام لیا ہے، اس میں انتہائے خیال ہی کا کمال ہے- خیال کی وسعت ہی سے فضائے شعری کے نکھارنے میں جو علامتیں سامنے آتی ہیں اس عمل سے شاعر کا رنگ نکھرتا ہے اور وہ رنگ شاعری اس کی شناخت بن جاتا ہے-فیض کے ہاں اپنا ایک فکری نظام ہے- اس میں سماجی اور معاشرتی اقدار کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے-فیض کی تراکیب لفظی ملاحظہ کیجیے ،خزاں کے جور و ستم، چشم گلچیں ، اجل کی آنکھ، یہ وہ تراکیب ہیں جو اقبال کی شاعری میں فکری میلانات کے ساتھ نظر آئیں گی- اس کے علاوہ فیض کی اور بھی نظمیں ہیں جو قومی ، وطنی اور ترقی پسند رجحان پر ہیں مثلاً ''یہ فصل امیدوں کی ہمدم''، ''درد آئے گا دبے پاؤں''، ''دریچہ-'' فیض کی نظم ''دریچہ'' نمائندہ نظم کی حیثیت رکھتی ہے- اس نظم میں ترقی پسند رجحان کو دیکھا جاسکتا ہے- اقبال کی نظم ''فلسفۂ غم'' کے نقوش ''دریچہ'' میں دیکھے جاسکتے ہیں ؎

آرزو کے خون سے رنگیں ہے دل کی داستاں　　نغمۂ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں
دیدۂ بینا میں داغ غم چراغ سینہ ہے　　روح کو سامان زینت آہ کا آئینہ ہے

(فلسفۂ غم) بانگ درا

۱- نقش فریادی، ص ۴۵

دراصل اقبال کی نظم ڈرامائی عمل پر ہے- اس میں محاکاتی انداز پایا جاتا ہے- اسے خودکلامی کی روشنی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے- اقبال کے ہاں یہی وہ شعری وقار ہے جو الفاظ و معنی سے تعبیر ہے- اقبال کی فکری پہنائی کو ناپا نہیں جاسکتا ہے- فیض کی نظم ''دریچہ'' ملاحظہ کیجئے -

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لئے
ہر ایک وصل خداوند کی امنگ لئے
کسی پہ کرتے ہیں ابر بہار کو قرباں
کسی پہ قتل مہ تابناک کرتے ہیں
کسی پہ ہوتی ہے سرمست شاخسار دو نیم
کسی پہ باد صبا کو ہلاک کرتے ہیں
ہر آئے دن یہ خداوندگان مہر و جمال
لہو میں غرق مرے غمکدے میں آتے ہیں
اور آئے دن مری نظروں کے سامنے ان کے
شہید جسم سلامت اٹھائے جاتے ہیں

(دریچہ) [1]

فیض کی تراکیب لفظی دیکھئے، وصل خداوند کی امنگ، قتل مہ تابناک، سرمست شاخسار، شہید جسم سلامت، یہ وہ تراکیب ہیں جو اقبال کے صوتی آہنگ کا ثمر ہے- فیض کی نظموں میں شعلہ گری بھی ہے اور شعلہ زنی بھی- اس میں اخلاقی تلازمے بھی ہیں اور جہل و تعصب کا اظہار بھی- ماحول کی عکاسی بھی ہے اور ظلم و جبر کی داستاں بھی- مظلوم و محکوم کی حکایت خونچکاں کو محسوس کرتے ہوئے فیض نے انسانیت کی کتاب کو اپنے خون جگر سے لکھا ہے- اس لئے ان کے شعروں میں تاثیر ہے- یہی وہ اقبال کے اثرات ہیں جو فیض کی نظموں میں جا بجا ملتے ہیں-

مخدوم محی الدین......۱۹۰۸ء-۱۹۶۹ء:

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ مادہ کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مارکس نے ایک ایسا نظریہ پیش کر کے انسانیت پر احسان کیا ہے اور یہ احسان جاگیردارانہ نظام کے خلاف، سرمایہ داروں کے خلاف ایک منظم اور ٹھوس نظریہ کا اجراء تھا- مقلدین مارکس جب اس نظریہ سے متاثر ہوئے تو وہ ترقی پسند تحریک کی صورت میں نمودار ہوئے- ان میں مخدوم محی الدین بھی ایک اہم رکن کی حیثیت سے نمایاں نظر آتے ہیں-

مخدوم نے مادہ ہی سے کسب فیض کیا اور یہ رجحان ان کی نظموں میں نظر آتا ہے- سماجی اور سیاسی کمزوریوں کو انہوں نے شدت سے محسوس کیا اور انہیں اپنی نظموں میں موضوع بنایا- ان نظموں میں جہاں اشتراکی نظریہ کارفرما ہے، وہاں جمالیات پر بھی

۱- زنداں نامہ، ص ۱۲۴

ایسی نظمیں لکھی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مخدومؔ اپنے عہد کا ترجمان بھی ہے اور روایت سے منحرف بھی نہیں- شاعری میں اقبال سے بہت زیادہ متاثر ہیں- ''اسٹالن کی آواز'' اور ''چارہ گر'' جیسی نظمیں لکھ کر مخدوم کے اندر کے انسان کا ادراک با آسانی کیا جاسکتا ہے- مخدوم انقلاب اور جنگ کی بات بھی کرتا ہے اور بہتا ہوا خون بھی نہیں دیکھ سکتا- وہ ایسے انقلاب کا خواہاں ہے جس میں انسانیت کو ایک اعلیٰ مقام مل جائے کیونکہ وہ مجبور اور مظلوم انسانوں سے محبت کا داعی ہے- اس لئے کہ شہید کے خون سے مستقبل میں تعمیر کا خواب اس کا فطری عمل ہے- انقلابی نظموں کے ساتھ اگر ہم ان نظموں کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے جس میں موسیقیت غنائی لہجہ، بے پناہ مٹھاس، ان کیفیات سے وہ روحانی تسکین کا کام بھی لیتے ہیں- مخدومؔ کی شاعری کا بہاؤ ایک سمت پر نہیں بہتا بلکہ مختلف پیرائے ہیں اس کا اظہار بدلتا رہتا ہے- مخدوم کی شاعری پر ڈاکٹر محمود الرحمٰن لکھتے ہیں:

> ''مخدوم کی شاعری میں جو للکار ہے، جو گھن گرج ہے، جو غیر مروجہ ہے، ان سب عناصر نے اسے بڑی تاب و توانائی عطا کی ہے- یہی تاب و توانائی ظلم و جور کے اندھیروں میں مجاہدین کا حوصلہ بڑھاتی رہی ہے اور دشمنوں سے معرکہ آراء ہونے اور آزادی کی خونیں جنگ لڑنے کے لئے حرارت بخشتی رہی ہے-'' [۱]

مخدوم کی نظم ''جہانِ نو'' میں دکھی انسانیت سے ہمدردی کا وہ جذبہ ملتا ہے جسے اقبال نے اپنی نظم ''تہذیب حاضر'' میں مسلمانوں اور خاص کر نوجوانوں کے حوصلے اور مزاج پر بات کی ہے- اقبال کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیب حاضر میں — بھڑک اٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تن خاکی
کیا ذرے کو جگنو دے کے تاب مستعار اس نے — کوئی دیکھے تو شوخی آفتاب جلوہ فرمائی

(تہذیب حاضر) بانگ درا

مخدومؔ کی نظم ''جہانِ نو'' کے دو بند دیکھئے ؎

نغمے شرر فشاں ہوں اٹھا آتشیں رباب
مضراب بے خودی سے بجا ساز انقلاب
معمار عہد نو ہو ترا دست پُر شباب
باطل کی گردنوں پہ چمک ذوالفقار بن

ایسا جہان جس کا اچھوتا نظام ہو
ایسا جہان جس کا اخوت پیام ہو
ایسا جہان جس کی نئی صبح و شام ہو
ایسے جہان نو کا تو پروردگار بن

(جہانِ نو) [۲]

مخدومؔ کی تراکیب لفظی جو اقبال سے مشابہت رکھتی ہیں- ''آتشیں رباب''، ''مضراب بے خودی''، ''معمار عہد نو''، ''دست پر شباب''، اقبال نے تہذیب حاضر میں اپنی کیفیات کو اجاگر کیا ہے- مخدومؔ انقلاب اور انسانی ہمدردی کے حوالے سے اپنی

۱- جنگ آزادی کے اردو شعراء، ص ۳۵۱

۲- مخدوم اور کلام مخدوم، ص ۸۶

نظموں میں جارحانہ طرز اختیار کرتے ہیں-مخدوم کی نظم ''مشرق''میں اقبال کی نظم ''غلاموں کے لئے'' فکری اثرات نمایاں ہیں ؎

حکمت مشرق و مغرب نے سکھایا ہے مجھے ایک نکتہ کہ غلاموں کے لئے ہے اکسیر
دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں ہوگیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

(غلاموں کے لئے) ضرب کلیم

مخدوم کے ہاں ترقی پسند رجحان اور اقبال کی فکر کے اثرات نظموں میں دیکھے جاسکتے ہیں-نظم ''مشرق ملاحظہ ہو ؎

جہل، فاقہ، بھیک، بیماری، نجاست کا مکان
زندگانی، تازگی، عقل و فراست کا سان
وہم زائیدہ خداؤں کا روایت کا غلام
پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا جذام
اک مسلسل رات جس کی صبح ہوتی ہی نہیں
خواب اصحاب کہف کو پالنے والی زمیں

(مشرق) [۱]

نظم میں قرآنی تلمیحات مثلاً ''اصحاب کہف'' جسے اقبال نے اپنے شعروں میں بھی استعمال کیا ہے-ایسے دور کا نقشہ کھینچا ہے جس میں انسانیت سوز مظالم ڈھائے جارہے ہوں-بھوک اور افلاس گھر گھر کی علامت بن چکا ہو-انسانوں کا قتل، ظلم و بربریت کی طرف اقبال نے بھی اپنی نظموں میں ان کیفیات کا نقشہ کھینچا ہے-

مخدوم کی نظم ''نذر آزادی زندان وطن کیوں نہ ہوا'' میں اقبال کی نظم ''پرندے کی فریاد'' کے واضح نقوش نظر آتے ہیں-اقبال آزادی وطن کو پرندے کی زبان میں ادا کررہے ہیں ؎

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ وہ باغ کی بہاریں، وہ سب کا چہچہانہ
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا
آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش مرے بس میں

(پرندے کی فریاد) بانگ درا

فکری اعتبار سے اقبال کے نظریات مخدوم کی نظم میں ملاحظہ ہوں ؎

قید ہے قید کی معیاد نہیں
جور ہے جور کی فریاد نہیں، داد نہیں
رات ہے رات کی خاموشی ہے، تنہائی ہے
دور محبس کی فصیلوں سے بہت دور کہیں
سینۂ شہر کی گہرائی سے گھنٹوں کی صدا آئی ہے

۱- مخدوم اور کلام مخدوم، ص ۱۷

چونک جاتا ہے دماغ
ان کی آنکھوں میں غمِ دوش اور اندیشۂ فردا کا خیال

(نذرِ آزادی زندانِ وطن کیوں نہ ہوا) [۱]

مخدومؔ کی نظم میں اقبال کی ایمائی کیفیت اور لفظی تراکیب بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں مثلاً آنکھوں میں غمِ دوش اور اندیشۂ فردا جیسی تراکیب اقبال ہی نے متعارف کرائی ہیں۔ مخدومؔ کے بحور اور صوتی آہنگ میں جو فنکارانہ شعور ملتا ہے، اسی طرح اقبال کے ہاں بڑا جاندار اور تنوع کے ساتھ یہ رجحان پایا جاتا ہے۔ پروفیسر محمد اسلم ضیاء اقبال کی بحور کے فن پر رقمطراز ہیں:

''بحور کے فن کارانہ استعمال کا انہیں گہرا شعور تھا۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ان کے آہنگ کی تخلیق کی۔ ان کے جذبات واحساسات کو سبک، رواں بنادیا ان کے افکار رقص کرنے لگتے ہیں اور پڑھنے والے کا دل بھی رقص کرنے لگتا ہے۔ ان کی بحریں ان کے موڈ کی عکاسی کرتی ہیں۔ جہاں جذبات کی شدت ہو، سرخوشی کی کیفیت ہو، انہوں نے رواں دواں اور شگفتہ بحر سے کام لیا ہے۔'' [۲]

مخدومؔ کی بحروں کی بھی یہی کیفیت ہے جو اقبال کے ہاں صوتی آہنگ کا خاصہ ہے۔ شعر ملاحظہ ہو ؎

توڑ ڈالوں گا میں زنجیرِ اسیرانِ قفس
دہر کو پنجۂ عسرت سے چھڑانے دے مجھے

مخدوم

ان کا مجموعۂ کلام ''سرخ سویرا'' میں جو بحریں ہمیں ملتی ہیں، ان میں زیادہ تر انقلابی رجحان بڑی تقویت لئے ہوئے ہے۔ محمود الرحمٰن لکھتے ہیں:

''مخدوم خونی انقلاب بپا کرنے کے ساتھ ساتھ میدانِ کارزار میں رجز بھی پڑھتے جاتے ہیں، جس میں حصولِ آزادی کا جوش وخروش ہے، محکومی ومجبوری کے خلاف نفرت کا اظہار ہے اور آگے بڑھ کر دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کا جذبہ ہے۔'' [۳]

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مخدوم کے کلام پر اقبال کے اثرات کے جو نمایاں پہلو ہیں، وہ انقلابی اور بحور کا فنی التزام ہے۔ جس سے ان کی شاعرانہ حیثیت کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ ان کی نظموں میں مجاز اور حقیقت کا جو امتزاج نظر آتا ہے، وہ ان کے جدید علوم اور فن کی ریاضت کا آئینہ دار ہے۔ مخدوم کی نظموں میں فکر اور ارادے کی پختگی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ فیض ہے جو انہیں اقبال جیسے شاعر سے حاصل ہوا ہے۔

۱۔ گل تر، ص ۹

۲۔ افکار۔ نذر اقبال، ص ۱۲۱

۳۔ جنگ آزادی کے اردو شعراء، ص ۳۵۰

جوشؔ ملیح آبادی......۱۹۸۲ء-۱۸۹۸ء:

جوشؔ بحیثیت شاعر فطرت، شاعر شباب اور شاعر انقلاب کے نمایاں مقام حاصل کر چکے ہیں- ان کی نظمیں مغربیت، ظلم وجبر اور سامراجی نظام کے خلاف بھڑکتی ہوئی آگ کے مانند ہیں مثلاً ''بغاوت''، ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب''، ''شکست زنداں کا خواب''، ''باغی''- یہ وہ نظمیں ہیں جن سے ہندوستانیوں کو بیدار کرنے اور آزادی کا جذبہ دلوں میں ابھارنے میں خاصی معاون ثابت ہوئیں- ہندوستان میں آزادی ہند کی تحریک اس وجہ سے تقویت کا باعث بنی کہ اس میں علامہ اقبال جیسی شخصیت، جو اپنے شعروں سے لہو گرماتے رہے ع

جو روح کو تڑپا دے جو قلب کو گرما دے

اقبال کی یہ دعا بارگاہ رب العزت میں مقبول ہوئی- انہوں نے خودآگہی کا ایسا درس دیا کہ پوری قوم اقبال کے افکار سے متاثر ہونے لگی- اشعار میں اپنے دل کے درد کو شامل کر کے شعراء کو اپنی طرف متوجہ کیا- اس طرح جوش کی شاعری میں اقبال کی بازگشت سنائی دیتی ہے- جوش نے اپنے اشعار سے بارود کا کام لیا اور انگریزوں کے کلیجے خاکستر کر دیے- ایسی شعلہ بار نظمیں لکھیں جو ہر لحاظ سے بلند پایہ ہیں- جوش کا ذہن انقلابی اور دل رومان سے لبریز تھا- جوش نے خود اس بات کا اظہار اپنے شعروں میں کیا ہے ؎

میری نظمیں، آتش سوزاں کا ہے جن پر گماں
سُننے والے! یہ تو ہیں سیلی ہوئی چنگاریاں
سننے والے جل اٹھیں، شور فغاں اٹھنے لگے
پڑھنے والے کی رگ و پے سے دھواں اٹھنے لگے

(شعر کی آگ)

''جوش کا آہنگ شاعری'' کے عنوان سے پروفیسر حنیف فوق نے پرمغز مقالہ لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''درد زندگی کے درماں کے لئے جوشؔ نے فطرت کے خزانوں کی دریافت کی ہے- جوش کے ابتدائی فطرت نگاری کے خاکوں مثلاً ''مناظر سحر'' میں میر انیس کے مرثیوں کا چہرہ جھلک دکھاتا ہے- لیکن جلد ہی فطرت کو صاحب کتاب مان کر وہ اس صحیفہ زریں کے اسرار کو اپنے طور پر حل کرنے لگے ہیں- ان کا ذہن فطرت کی تعبیر کے لئے نت نئے تخیلاتی پیکر تراشتا اور نئے نئے استعاروں کا سہارا لیتا ہے-''[1]

جوش نے ''کارل مارکس'' کے عنوان سے نظم لکھی ہے جبکہ اقبال نے ''کارل مارکس کی آواز'' کے عنوان سے نظم لکھی ہے- ''ضرب کلیم'' کی نظمیں زیادہ تر مختصر ہیں- یہ نظم صرف تین شعر پر ہے ؎

یہ علم و حکمت کی مہرہ بازی، یہ بحث و تکرار کی نمائش
نہیں ہے دنیا کو اب گوارا پرانے افکار کی نمائش

(کارل مارکس کی آواز) ضرب کلیم

۱- افکار- جوش نمبر، ص ۵۵۸

جوش کی نظم کارل مارکس ملاحظہ کیجئے ؎

السلام اے مارکس، اے دانائے راز اے مریض انسانیت کے چارہ ساز
نخل خوشحالی کی بیخ و بن ہے تو عقدہ ہائے زیست کا ناخن ہے تو
تجھ سے قائم دہر میں محنت کا حق تجھ سے امرت گرم ہاتھوں کا عرق
اے پیام آب بہر تشنگاں اے نوید ناں برائے خستگاں
اے رفیق خستگان بے نوا ناخدائے بندگان بے خدا

(کارل مارکس) [۱]

جوش کے ہاں صنائع و بدائع ،لفظی پیکر تراشنا، تراکیب کا بہترین استعمال ملتا ہے مثلاً ''نخل خوشحالی''، ''مریض انسانیت''، ''امرت گرم''، آب بہر تشنگاں''، ''خستگان بے نوا'' اور ''بندگان بے خدا'' یہ ایسی تراکیب لفظی ہیں جو اقبال سے پہلے کی شاعری میں کہیں نہیں ہے- اقبال نے صنعت گری کا پورا انتظام رکھا ہے-صنعت مراعات النظیر ،صنعت ترصیع ،صنعت تلمیح ،صنعت طباق ایجابی وغیرہ- اسی طرح جوش نے اقبال کی فکر سے متاثر ہوکر اپنے شعری آہنگ کو نکھارنے کی کوشش کی ہے-

فطرت نگاری میں جوش کو کمال حاصل ہے-لیکن اقبال کی فطرت جوش سے آگے ہے مثلاً ''ماہ نو''، ''موج دریا''، ''چاند''، ''جگنو''، ''ابر''، ''کنارِ راوی''، ''ایک شام''، ''صبح کا ستارا''، ''نمود صبح''، ''بزم انجم''، اس کے علاوہ ''گورستان شاہی'' کی تمہید فطرت پر ہے- انسان اور بزم قدرت میں بھی فطری حسن اور مظاہر قدرت کے نظارے ملتے ہیں- اقبال کی نظم ''ایک شام'' میں سے چند شعر ملاحظہ کیجئے ؎

خاموش ہے چاندنی قمر کی شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت خاموش ہوگئی ہے آغوش میں شب کے سو گئی ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے یہ قافلہ بے درا رواں ہے

(ایک شام) بانگ درا

جوش کی نظم ''روح شام'' ملاحظہ کیجئے ؎

مغرب کی وادیوں میں خورشید اتر رہا ہے تصویر بے خودی کا ہر نقش ابھر رہا ہے
پامال و خشک پتے بکھرے ہوئے پڑے ہیں سرسوں کے کھیت سارے پھولے ہوئے کھڑے ہیں
چرواہے چھٹپٹے کی تانیں سنا رہے ہیں چوپائے سر جھکائے میداں سے جا رہے ہیں
اک سمت چھوٹی چھوٹی رنگیں پہاڑیاں ہیں اک سمت گل بداماں ڈھاکے کی جھاڑیاں ہیں
اے جوش ادب سے جھک جا تو جانتا نہیں ہے دربار میں ہے کس کے؟ پہچانتا نہیں ہے

اس بھیس میں جو مست و بے خود بنا رہی ہے
یہ روح شام تجھ کو جلوے دکھا رہی ہے

روح شام

۱- عرش وفرش، ص ۲۰۹

مناظر فطرت کی جاذب نظر تصویریں جوشؔ کی اکثر نظموں میں نظر آتی ہیں مثلاً ''جنگل کی شہزادی''، ''آواز کی سیڑھیاں''، ''فاختہ کی آواز''، ''گرمی اور دیہاتی بازار''، ''بدلی کا چاند''نظموں میں زیادہ تر جوشؔ نے اقبال کے اسلوب سے استفادہ کیا ہے اور تشبیہات واستعارات سے بھی کما حقہ فیض اٹھایا ہے۔ جوش کی نظموں میں اقبال کی فکر کے نقوش واضح نظر آتے ہیں۔ جوشؔ کی نظم ''بغاوت'' پر اقبالؔ کی نظم کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں، دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز وساز
لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیلؑ
خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک مجاز

(دنیائے اسلام) بانگ درا

اقبال کی نظم میں اچھوتی تراکیب، محاکات وتلمیحات، فکر ومعنی کی گہرائی، اسلوب کی دلآویزی اور طرز ادا کی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ جوشؔ کی نظم ''بغاوت'' ملاحظہ کیجیے ؎

میری آوازوں سے کانپ اٹھتا ہے روحوں کا سکوں
جذبۂ غیرت کی آنکھوں میں اتر آتا ہے خوں
شور اٹھتا ہے محض اک وہم ہے دارو رسن
یا تو اب ہم تاج پہنیں گے یا خونیں کفن
طبل کی دوں دوں سے جل اٹھتے ہیں آنکھوں میں چراغ
جھنجھناتے ہیں جلال سنسناتے ہیں دماغ
رعب سلطانی سے یہ چہرہ اتر سکتا نہیں
جو خدائی سے لڑے، شاہی سے ڈر سکتا نہیں

(بغاوت) [1]

جوشؔ کی نظم میں تلخ نوائی بھی ہے اور جرأت بھی، کیونکہ وہ غلامی سے نجات کے خواہاں ہیں۔ پستی سے بلندی کی طرف لانے کے لئے وہ انسان کو بیدار کرنے کی سعی میں مصروف ہیں۔ جوش ایک بیباک اور نڈر شخصیت کا نام ہے۔ یہی بیباکی ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔ جوش نے اپنی نظم ''نظام نو'' میں اپنے عہد کے انسانوں کی جو تصویر کھینچی ہے، اس میں وہ اپنے پیغام کے ذریعے حوصلہ اور ایک ایسا جذبہ عطا کرتے ہیں۔ جوش تاریکی کے سینے سے اجالا نکالنے کے آرزومند ہیں۔ ''نظام نو'' کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

کھیل، ہاں اے نوع انساں ان سیہ راتوں سے کھیل
آج اگر تو ظلمتوں میں پابجولاں ہے تو کیا
مسکرانے کے لئے بے چین ہے صبح وطن
اور چندے ظلمت شام غریباں ہے تو کیا
اب کھلا ہی چاہتا ہے پرچم باد مراد
آج ہستی کا سفینہ وقف طوفاں ہے تو کیا
اٹھنے والی ہے نگار صبح داماں کی نقاب
آخر شب زحمت درد فراواں ہے تو کیا

(نظام نو) [2]

جوشؔ نے اپنے مزاج اور وقت کو سامنے رکھتے ہوئے انگریزوں سے کھلی بغاوت کی اور ایسی نظمیں لکھیں جو حریت پسندی کی اعلیٰ مثال ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کے حصول کے لئے خود بھی کمربستہ ہوگئے۔

۱۔ شعلہ وشبنم، ص ۳۰

۲۔ سیف وسبو، ص ۳۹

جوش کی مجموعی نظمیں اور فکر ونشاط کی نظموں میں شاعر اور اس کی خصوصیات پر جو کچھ مواد ہمیں ملتا ہے، ان میں ''عالم اور شاعر''، ''دنیا اور شاعر''، ''شاعر اور لیڈر''، ''شاعر کا دل'' وغیرہ اس طرح جوش نے ایک شاعر کو پیش کر کے خود اپنے اوصاف ظاہر کئے ہیں- وہ اس لئے کہ جوش شاعر انقلاب، شاعر شباب، شاعر خمریات اور شاعر فطرت کی حیثیت سے مشخص ہو چکے تھے- شعلہ وشبنم میں مناظر فطرت پر کئی نظمیں ملتی ہیں، جن سے تشبیہات اور استعارات کا مربوط نظام ملتا ہے- یہی اقبال کے اثرات کا اشاریہ ہیں- جوش کی یہ مثلث دیکھئے-

یہ شفق ہے یا فراز چرخ پر عکس چمن
یا تصور میں کسی گل پیرہن کا بانکپن
یا غریب خستہ جاں کے قلب میں یاد وطن

اس نظم میں تشبیہات کا جو نظام ہے وہ اقبال کی تشبیہات سے مماثل ہیں- ڈاکٹر محمد عزیز جوش کی نظموں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بہت سی نظمیں خالص فطرت پرستی کے جذبے کی رہین منت ہیں- ان میں جوش نے فطرت کے مختلف مناظر کی ایسی دلکش تصویریں کھینچی ہیں اور حسین نادر تشبیہات سے محاکات کا ایسا کمال دکھایا ہے کہ اردو تو کیا دوسری زبانوں میں بھی اس کی مثالیں مشکل سے مل سکیں گی- جوش کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے- تشبیہوں اور استعاروں کی دل آویزی میں انیس کے علاوہ اردو کا کوئی شاعر ان کا حریف نہیں-''[1]

جوش کی نظمیں جو فطرت پر ہیں ان میں ''مناظر سحر''، ''تماشائے قدرت''، ''برق عرفاں'' اور ''برسات کی شفق'' پر اقبال کی فکر کے اثرات واضح نظر آتے ہیں-

علی سردار جعفری......۱۹۱۲ء-۲۰۰۲ء:

ترقی پسند تحریک کی سب سے اہم اور توانا آواز علی سردار جعفری کی ہے- ان کے معاصرین کو ان پر فخر ہے- ان کی فکر انقلابی، ان کا جذبہ انقلابی، ان کا سونا انقلابی اور ان کا جاگنا انقلابی یعنی ان کا دوسرا نام انقلاب ہے- یہ ہر چیز میں انقلاب کے پہلو تلاش کرتے ہیں- ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں تھے- سامراجیوں کے خلاف بھرپور بغاوت ان کے ہر شعر اور نثر کی ہر سطح سے ظاہر ہے- سردار جعفری انسان کو مجبور محض نہیں سمجھتے اور نہ وہ انسان کی شکست کے قائل ہیں بلکہ ان کے ہاں طبقات کو شکست ہو سکتی ہے، انسان کو نہیں- کیونکہ وہ مزدور کی محنت پر فخر کرتے ہیں- ایسے ہی معمار جو وطن کی اور شعر وادب کی آبیاری کرتے ہیں- ان کے انسان کی قدر ومنزلت اسی بات میں ہے کہ انسان عظیم بھی ہے اور حسین بھی- اپنی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' کے پیش لفظ میں علی سردار لکھتے ہیں:

''دنیا کی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جس میں انسانوں کو شکست ہوئی ہو-

---

۱- ساقی- جوش نمبر، ص۱۳۱

> افراد اور طبقات کو شکست ہوتی رہی ہے اور ہوگی لیکن ''انسان'' نا قابل شکست ہے کیونکہ اس کی محنت، عمل اور جد و جہد اس کے اپنے شعور ہی کی نہیں بلکہ بڑی حد تک اس کے ماحول کی بھی خالق ہے اس لئے وہ ہمیشہ فتح مند اور کامران رہے گا۔ میں اس کو ادب اور فن کا ابدی موضوع سمجھتا ہوں۔ سب سے زیادہ شاندار، سب سے زیادہ عظیم المرتبت، سب سے زیادہ حسین انسان ہے۔''[۱]

انسان کی اس محنت میں سرشار ہو کر جعفری نے ایک اور نظم لکھی جس کا عنوان ''جمہور کا اعلان نامہ'' ہے۔ اس نظم میں انسانیت سے محبت، ان کے غموں کا مداوا اور بہتر مستقبل کی نوید ملتی ہے۔

سردار جعفری کی مثنوی جو کہ سیاست کے موضوع پر ہے، اقبال کے ''ساقی نامہ'' کو بنیاد بنا کر اس کی اساس رکھی۔ جعفری نے خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ اس صنف میں روشن امکانات ہیں۔ اسلوب احمد انصاری، اقبال کے ''ساقی نامے'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''رزمیہ کی طرح ''ساقی نامہ'' بھی ایک نوع کی التجا سے شروع ہوتا ہے۔ یہاں یہ التجا نہ خدا سے ہوتی ہے اور نہ دیوی دیوتاؤں سے، بلکہ ایک ایسی ذات یا فرضی کردار سے جس سے جود و سخا اور بخشش مختص ہے اور اس کا حصول معاون ہوتا ہے۔ خود اپنی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے اور اپنے گرد و پیش کی دنیا کو بدلنے میں ساقی نامے کا آغاز عام طور پر بہار کی آمد آمد کے ذکر سے ہوتا ہے۔ اقبال کی نظم بھی اسی طرح شروع ہوتی ہے۔''[۲]

اقبال کے ساقی نامے کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہوا خیمہ زن کاروان بہار
ارم بن گیا دامن کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن
شہید ازل لالہ خونیں کفن
(ساقی نامہ) بال جبریل

اب جعفری کا ساقی نامہ ملاحظہ کیجئے، اس کا موضوع سیاست ہے ؎

اٹھا خاک جادہ سے طوفان نور
بغاوت نے پھونکا قیامت کا صور
ہماری ہی قوت سے چلتے ہیں مل
دھڑکتے ہیں ہم سے مشینوں کے دل
دل ایشیاء میں ہے جو اضطراب
ہماری ہی ہے روح کا پیچ و تاب
یہ دولت ہے میراث انسان کی
زمیں پر حکومت ہے دہقان کی
ملوں پر ہے مزدور کا اختیار
وطن پر ہے جمہور کا اختیار
یہ افلاس کی رات ڈھل جائے گی
کسانوں کی دنیا بدل جائے گی
(جمہور کا اعلان نامہ)

۱۔ نئی دنیا کو سلام اور جمہور، ص ۱۱

۲۔ اقبال کی تیرہ نظمیں، ص ۱۶۵

جعفری کی مثنوی خاصی طویل ہے- اشتراکیت کے نظریہ کا پرچار کے ساتھ انقلاب کی بات کی ہے- گو کہ اقبال نے بھی اشتراکیت پر نظمیں کہی ہیں- ان میں ''کارل مارکس کی آواز''، ''انقلاب''، ''نفسیات غلامی''، ''بلشوک روس''، جمہوریت وغیرہ- جعفری کی مثنوی میں تیزی، تندی اور جارحانہ انداز پایا جاتا ہے جبکہ اقبال کے ہاں شیرینی، حلاوت اور پیار کا جذبہ ملتا ہے-

بھوک، افلاس، مزدور، سرمایہ دارانہ نظام جیسے موضوعات پر نظمیں لکھ کر ترقی پسندوں نے جو اضافہ کیا ہے- انسان کو دردناک اور کربناک اذیتوں سے نجات دلوانے میں انتھک کوششیں کی ہیں-

جعفری کی نظم ''بھوکی ماں بھوکا بچہ'' پر اقبال کی نظم کے اثرات دیکھئے ''طفل شیرخوار'' ـــ

میں نے چاقو تجھ سے چھینا ہے تو چلاتا ہے تو   مہرباں ہوں میں، مجھے نامہرباں سمجھا ہے تو
پھر پڑا روئے گا اے نوارد اقلیم غم   چبھ نہ جائے دیکھنا! باریک ہے نوک قلم
آہ کیوں دکھ دینے والی شئے سے تجھ کو پیار ہے
کھیل اس کاغذ کے ٹکڑے سے یہ بے آزار ہے

(طفل شیرخوار) بانگ درا

جعفری کی نظم ملاحظہ کیجئے ـــ

میرے ننھے، مرے معصوم، مرے نورِ نظر
آ کہ ماں اپنے کلیجے سے لگا لے تجھ کو
اپنی آغوش محبت میں سلا لے تجھ کو
سنتی ہوں کھیتوں میں اب اناج نہیں اگ سکتا
کانگریس راج میں سونا پھلا کرتا ہے
گائے کے تھن سے نکلتی ہے چمکتی چاندی
اور تجوری کی درازوں میں سمٹ جاتی ہے
سو بھی جا میری محبت کی کلی
میری جوانی کے گلاب
میرے افلاس کے ہیرے سو جا

(بھوکی ماں بھوکا بچہ) [1]

سردار جعفری نے یہ نظم سامراجیت کے خلاف لکھی ہے- جعفری کی دیگر نظموں پر بھی اقبال کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں مثلاً ''ملاحوں کی بغاوت''، ''انقلاب روس''، ''جشن بغاوت''، ''تلنگانہ''، ''سامراجی لڑائی'' وغیرہ پر اقبال کی نظموں میں فقر و ملوکیت، مغربی تہذیب، یورپ اور یہود، لادین سیاست، مشرق و مغرب جیسی نظموں سے جعفری نے کسب فیض کیا ہے- جعفری کی نظموں کا رنگ و آہنگ قریب قریب اقبال کے آہنگ سے ملتا ہے- جو اسلوب انہوں نے اپنایا ہے وہی اسلوب اقبال کا بھی ہے- بس ذرا فکر کے زاویے مختلف ہیں- جعفری صرف ترقی پسند کے نمائندہ شاعر ہیں اور اقبال کی ہمہ جہتی اور ہمہ گیری کا اعتراف پوری دنیا نے کیا- جعفری کو اقبال کی تقلید میں خاصی کامیابی ہوئی ہے- ان کی بیشتر نظموں میں اقبال کے اثرات جھلکتے نظر آتے ہیں-

---

۱- پتھر کی دیوار، ص ۹۹

سردار جعفری کی نظم ''پتھر کی دیوار'' ایک ایسی نظم ہے جس میں مفلسی کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا جبکہ اقبال جعفری سے پہلے کہہ گئے ہیں ؎

دہقاں ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے
جاں بھی گرد غیر، بدن بھی گرد غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے

گو کہ اس دور کے مزدور کی حالت ناگفتہ بہ ہے، پھر بھی ایک امید تو ہے، مزدور ابھی مایوس نہیں ہے۔جعفری کی نظم میں اقبال کی فکر دیکھیے ؎

بھوک کا بھیانک روپ
چکیوں کے بھدے راگ
روٹیوں کے دانتوں میں
ریت اور کنکر ہیں
دال کے پیالوں میں
زرد زرد پانی ہے
چاولوں کی صورت پر
مفلسی برستی ہے
سبزیوں کے زخموں سے
پیپ سی ٹپکتی ہے
پتھروں کی دیواریں

(پتھر کی دیوار) [۱]

ان نظموں کے مزاج سے اندازہ ہوتا ہے کہ جعفری نے معاشرتی وسماجی صورت حال پر جو کچھ کہا ہے، وہ انمٹ نقوش ہیں۔ انہوں نے حیات و کائنات، انسان، معاشرتی انحطاط کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں ہمیشہ واضح طور پر اقبال کے فکری، معنوی اور اسلوبیاتی اثرات نظر آتے ہیں۔اقبال کے نظریہ اشتراکیت پر ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ''اقبال اس حقیقت کو اس وقت سمجھ گیا تھا جب کہ ہندوستان کی سرزمین سوشلزم کے نام سے آشنا نہ ہوئی تھی۔یہ ظاہر ہے کہ مزدور اور غریب سوشلزم کا خیر مقدم بڑی خوشی سے کرتے ہیں۔اقبال کا تعلق ایک ایسی قوم سے ہے جو غربت اور افلاس کے گرداب میں پھنسی ہوئی ہے۔اقبال نے اس نظام سرمایہ داری کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔'' [۲]

۱۔ پتھر کی دیوار، ص ۲۴

۲۔ اقبال شعاعِ صد رنگ، ص ۱۷۱

کیفی اعظمی......۲۰۰۲ء-۱۹۱۸ء:

کیفی اعظمی ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور سے ہی شریک ہوگئے تھے- اس کی ترقی میں معاون اور اس کے عروج میں شانہ بہ شانہ رہے- انہوں نے غزلیں اور نظمیں دونوں لکھیں تاہم ان کی نظموں کو جومقبولیت حاصل ہوئی وہ غزلوں کو نہ ہوئی- ان کی نظموں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں انسانی ہمدردی وطن سے محبت، معیشت کی بدحالی کا جس طرز پر اظہار ہوا ہے، اس میں اقبال کی شاعری کا بڑا دخل ہے- اقبال نے ''خضر راہ'' میں ''سلطنت''، ''سرمایہ ومحنت'' کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیہ انّ الملوک | سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری
بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے | خضر کا پیغام کیا ہے، یہ پیام کائنات

کیفی کی نظم ''عوام'' ملاحظہ کیجئے ؎

متحد ہوگئے کسان مگر | آنکھ جھپکی بدل گیا منظر
گونجتے ہیں ہرے بھرے میدان | دھان کتنا ہے گا رہے ہیں کسان
بھیڑ سی لگ گئی ہے کھیتوں پر | لاٹھیاں جمع ہیں منڈیروں پر
نوجواں پینترے بدلتے ہیں | اس طرف، اس طرف اچھلتے ہیں
ہیں زمیندار دم بخود سارے | آگے بڑھتے نہیں ہیں ہر کارے

بھوک حق اپنا آج پاتی ہے
فصل کٹتی ہے مٹی جاتی ہے

(عوام) [1]

کیفی کی نظموں میں وہ خطابیہ انداز پایا جاتا ہے جو خالصتاً اقبال کے ساتھ مخصوص ہے- اقبال کی نظموں میں ''گل رنگیں''، ''عہد طفلی''، ''عقل ودل''، ''انسان اور بزم قدرت''، ''رخصت اے بزم جہاں''، یہ وہ نظمیں ہیں جو بیانیہ کے ساتھ خطابیہ بھی ہیں- اسی طرح کیفی کی نظموں میں ''تجدید''، ''پہرہ''، ''تلنگانہ'' میں ترقی پسند رجحان کو بھی دیکھا جاسکتا ہے- ''عوام'' میں فصل کٹتے وقت مزدوروں اور کسانوں کو جوخوشی حاصل ہوتی ہے، اس عمل سے سرمایہ دار حیرت میں بھی ہے اور پریشاں خاطر بھی- اس لئے کیفی کی شاعری کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری عوام کی شاعری ہے- اختر اورینوی اقبال کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اقبال ان شعراء میں سے تھا جو زمانے کی رو کو بدل دیتے ہیں- ان کی شاعری کا زبردست اثر اور قوت نفوذ روایات ادب میں ایک لافانی جگہ بنالیتی ہے- اقبال کی شاعری نے نہ صرف بت شکنی کی بلکہ اس نے نیا حرم بھی تعمیر کیا- اس جدید قبلۂ شعر کی طرف رخ کرنے والے بکثرت پیدا ہوئے اور ہوتے رہیں گے- اقبال کی امت بہت بڑی ہے اور ابدی، اس کی مجددانہ شاعری نے شعراء کو پیروی اور تجربات کی کم نگہی

۱- آخر شب، ص ۱۴۳

سے آزاد کیا اور اس طرح ادراک و تخیل کا افق وسیع تر ہو کر نئے نئے تجربات کے لئے راہیں کھل گئیں۔'' [۱]

زیادہ تر شعراء نے نظموں کی ہیئت و اسلوب کے ساتھ موضوعات کے پھیلاؤ میں بھی خاصہ اضافہ کیا ہے۔ کیفی نے اثر قبول کرتے ہوئے اقبال کی فکر سے استفادہ کیا ہے۔ کیفی کی نظم ''تلنگانہ'' پر اقبال کے ''ساقی نامے'' کا اثر دیکھئے، دونوں کا ایک ہی آہنگ ہے۔

پرانی سیاست گری خوار ہے زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دور سرمایہ داری گیا تماشا دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

ساقی نامہ (بال جبریل)

کیفی کی نظم ملاحظہ ہو، کیفی کے ہاں نظم کی ہیئت بدلی ہوئی ہے ؎

یہ شہر یاری، یہ تاج داری، وجود پر بار ہوگئی ہے
جفا کی خوگر غریب دنیا جفا سے بیزار ہوگئی ہے
زمیں پر چھاؤنی نگلنے پہ آج تیار ہوگئی ہے
کہ بھوک بیدار ہوگئی ہے
نہ صرف خاص کر حد بندیاں نہ جاگیریں
ہر ایک گام پہ ٹوٹی پڑی ہیں زنجیریں
وہ کھیت کون اجاڑے کون لوٹے گا
اُگی ہیں منڈیروں پہ جن کے شمشیریں

تلنگانہ [۲]

کیفی کی شاعری پر محمد علی صدیقی لکھتے ہیں:

''کیفی اعظمی کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کے ہاں رومان، کشمکش حیات اور انقلاب ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے کارزار حیات کی منزلوں کو سر کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کی شاعری ایک احتجاج ہے، مسلسل احتجاج، عام انسانوں کے ساتھ یکجا ہونے کی زبردست خواہش کے ساتھ شیر و شکر ہو کر طاقتور احتجاج۔ یہ احتجاج فتح مندی کی نوید دیتا ہے اور عین محبت و وصل کے ہنگام بھی انقلاب کی دعوت سے دست کش نہیں ہونے پاتا۔'' [۳]

۱۔ اقبال، ص ۱۰۵

۲۔ آوارہ سجدے، ص ۲۵

۳۔ آخر شب، ص ۷

ترقی پسند شاعر ہونے کی حیثیت سے کیفی نے بھی ان موضوعات کو برتا ہے جیسا کہ اقبال نے ''ملت اسلامیہ'' پر اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے ؎

وادی گل خاک صحرا کو بنا سکتا ہے یہ
خواب سے امید دہقاں کو جگا سکتا ہے یہ
ہو چکا گو قوم کی شان جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شان جمالی کا ظہور

ان اشعار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کے دل میں ملت اسلامیہ کے مستقبل کا کتنا خیال ہے۔ خاص اسی نظریہ کو کیفی نے اپنی نظم ''پہرہ'' میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے ؎

ترا احسان جو لیں اپنی بہاریں بھولیں
کھیت میں قحط اگیں باغ میں سنکٹ پھولیں
پیاس بن جائے مقدر جو پئیں تیری شراب
آبلے ہاتھ میں پڑ جائیں جو ساغر چھو لیں
یہ رہا جام ترا زہر پلانے والے
(پہرہ) [۱]

کیفی اعظمی کا پہلا مجموعہ ''جھنکار'' ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا تھا۔ ان کی نظموں میں انسانی مسائل کی بازیافت کے ساتھ معاشی بحران اور احساس اجتماعیت کا ملا جلا رجحان پایا جاتا ہے۔ اقبال کی فکری اور سیاسی شاعری کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیفی نے اپنی شناخت ''احتجاج'' سے کرائی۔ مندرجہ بالا اشعار میں خودی کی سرمستی چھلک رہی ہے۔ خودداری کے درس کو نہایت لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ اس نظم میں انگریزوں سے بغاوت کا اظہار بھی ہے۔

احمد ندیمؔ قاسمی ...... ۱۹۱۶ء۔ تا حال:

ان کی نظموں میں مایوسی نہیں امید کے روشن چراغ جلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ندیمؔ کے موضوعات زیادہ تر انسانی اقدار سے متعلق ہیں۔ یہ دکھ درد کے شاعر ہیں۔ روح عصر کو سمجھنا ہو تو پھر ہمیں ندیم کی نظموں کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے۔ ان کے کلام میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی، وسعت افکار بھی ہے، سوز و ساز بھی، نت نئے تجربے بھی ہیں، محبت بھرے گیت بھی، ندیم کے متعلق یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ ہمارے عہد کا عظیم شاعر ہی نہیں ایک عظیم انسان بھی ہے۔ اقبال کی شاعری سے بے پناہ متاثر اور ان کی شخصیت سے ایک خاص عقیدت رکھتے ہیں۔ دیگر ترقی پسند شعراء کی طرح ندیم بھی اشتراکی نظریہ رکھتے ہیں۔ ان کی بیشتر نظمیں اس بات کی آئینہ دار ہیں۔ اقبال نے ''لینن خدا کے حضور میں'' سرمایہ داری کا سفینہ کس طرح ڈبویا ہے، ملاحظہ کیجیے ؎

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

۱۔ آخر شب، ص ۵۴

اقبال کے شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں حکیمانہ نظر اور سماجی شعور کا جو ادراک ملتا ہے، اس میں وہ انسان کو تحت الثریٰ سے اٹھا کر اوج ثریا پر بٹھانا چاہتے ہیں- یہی شعور ہمیں ندیم کی نظموں میں نظر آتا ہے مثلاً ان کی نظم ''شکست و ریخت'' ملاحظہ کیجئے ـــ

اک فلک بوس محل میں تنہا سیج پر سو رہی ہے شاہزادی
اور افلاس کے نشیمنوں میں بلبلاتی ہے روح آزادی
درسگاہوں کے سرخ برجوں پر
بھوکی چمگادڑیں تڑپتی ہیں

(شکست و ریخت) [۱]

اس نظم میں اقبال کی تشبیہات و تراکیب ملاحظہ ہوں مثلاً فلک بوس محل، سرخ برجوں، بھوکی چمگادڑیں، افلاس کے نشیمنوں، اس نظم سے پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے یعنی سرمایہ دارانہ نظام اور مزدور کی سسکتی آہیں- اس روشنی میں آزادی کی جو روح ہے، اس کا بلبلانا درست ہے- مستقبل قریب میں آزادی کے روشن امکان ہیں-

تراکیب کے بارے میں سید حامد لکھتے ہیں:

''ہر بڑا شاعر تراکیب اختراع کرتا ہے- شاعر کو بالعموم وہی الفاظ اختراع کرنے پڑتے ہیں، شاعری میں جن کا چلن ہوتا ہے- نئے شاعر کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ اپنے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ان الفاظ کو نئی ترتیب دے- ایسا کرتے ہوئے وہ دو خطروں کی زد میں آتا ہے ایک تو یہ گھسے ہوئے الفاظ تازگی کھو بیٹھتے ہیں، ان کے ذریعہ ادا کی ہوئی نئی بات بھی پرانی معلوم ہوتی ہے لہذا بڑے شاعر ایک طرف تو پرانے لفظوں کو فکر کی توانائی اور زور بیان سے نیا رخ دیتے ہیں اور دوسری طرف وہ اظہار مطالب کے نئے سانچے بناتے ہیں-'' [۲]

اقبال کے بعد تراکیب بنانے کا عمل چند شعراء کے ہاں بڑی آب و تاب سے ملتا ہے مثلاً جوشؔ، پروفیسر شورؔ، احمد ندیم قاسمی، ان شعراء کے ہاں نئی نئی تراکیب کا ذخیرہ نظر آتا ہے- ندیم نے ہیئت کے اعتبار سے بھی تبدیلیاں کی ہیں- نظم ''ادب و سیاست'' اس نظم میں ندیم کا فکری وطنی اجتہاد مستحکم نظر آتا ہے- نظم میں واقعہ نگاری اور منظر کشی نہایت عمدہ طریقے سے کی ہے- جیسے اقبال اپنی نظموں میں منظر کشی کرتے ہیں مثلاً ''فرشتوں کا گیت''، ''لینن خدا کے حضور میں''، ''فرمان خدا''، ''ضرب کلیم'' میں ''سیاست مشرق و مغرب''، ''جمہوری اصول اور مساوات'' کو اشتراکیت کے آئینے میں دیکھتے ہیں- دو شعر ''سیاست افرنگ'' کے دیکھئے جو ''ضرب کلیم'' میں ہیں ـــ

تری حریف ہے یا رب سیاست افرنگ
مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس

۱- ندیم کی نظمیں، ص ۹۰۵

۲- اقبال کا فن، ص ۸۰

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس
(سیاست افرنگ) ضرب کلیم

اقبال کی فکر اور اسلوب کی روشنی میں ندیم کی نظم ''ادب وسیاست'' ملاحظہ کیجئے ـــ

اگر لاشوں کے قتلوں کی تجارت ہی سیاست ہے — اگر دستور آدم افگنی جزو ریاست ہے
اگر روٹی طلب کرنا جہالت ہے، بغاوت ہے — توکل کا عقیدہ ہی اگر محنت کی اجرت ہے
اگر علم و ادب پر ایک طبقے کا اجارہ ہے — اگر دانشوروں کو فن پہ پابندی گوارا ہے
(ادب وسیاست) [۱]

۷ فروری ۱۹۳۱ء میں چین کی حکومت نے چھ ترقی پسند ادیبوں کو موت سے ہمکنار کیا۔ ۷ فروری ۱۹۴۹ء کو لاہور میں ان کی یاد میں ترقی پسند مصنفین نے ایک اجلاس منعقد کیا۔ ندیم نے ''نیا ایشیاء'' کے عنوان سے نظم پڑھی جو خاص اسی دن اور اسی اجلاس کے لئے لکھی گئی تھی۔ اقبال نے تین شعری نظم ''عصر حاضر'' کے عنوان سے کہی۔ یہ نظم ''ضرب کلیم'' میں ہے ـــ

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی — اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر — چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نگام
مردہ، لادینی افکار سے افرنگ میں عشق — عقل بے ربطی افکار سے مشرق میں غلام

ندیم کی نظم ''نیا ایشیاء'' ملاحظہ کیجئے ـــ

زندگی کے ہیولے بنا تا رہا ایشیاء
زندگی سے بہت دور جاتا رہا ایشیاء
ایشیاء ایک ایسا کھلونا رہا جس میں یورپ سدا کوک بھرتا رہا
ایشیاء کے ذخیروں میں غلے کے بدلے فرنگی سدا بھوک بھرتا رہا
ایشیاء ایشیائی کے ہاتھوں سے پیہم نکلتا رہا
ایشیاء ایک ایسے خطرناک سانچے میں ڈھلتا رہا
(نیا ایشیاء) [۲]

ندیم نے نظم کو نئی ہیئت کا جامہ دے کر اسے متعارف کرایا ہے۔ اس میں شعری ارکان بحور کے لحاظ سے مختلف ہیں یقیناً ان کا یہ اچھا تجربہ ہے۔ اس نظم میں اقبال کا اشتراکی نظریہ جو اسلام سے مملو ہے، پیش کیا گیا ہے۔ اشتراکی نظریہ کو ہندوستان میں متعارف کرانے والے ہی اقبال ہیں۔ مرزا صفدر بیگ اشتراکیت پر لکھتے ہیں:

''اقبال کی شاعری سوشلزم کی تقویت کے لئے وہ کچھ کر رہی ہے جو شاید ہمارے دھواں دھار مقرر سوشلسٹوں سے بھی نہ ہو سکا۔ یقیناً شاعر کا پیام جانی قربانی سے بھی گراں قدر ہے اور یہ اقبال کے فیضان کا ہی اثر ہے کہ آج ہندوستان کے چپے چپے

۱- ندیم کی نظمیں، ص ۶۸۷
۲- ندیم کی نظمیں، ص ۷۰۳

میں اشتراکیت کا غلغلہ ہے۔'' [1]

اشتراکیت اور ندیم لازم و ملزوم ہیں۔ ندیم کے مجموعۂ کلام ''جلال و جمال''، ''دشت وفا'' کی نظمیں بتاتی ہیں کہ ان کے ہاں مضامین اور مسائل کو واقعات و حالات کی روشنی میں نئے آہنگ سے روشناس کرایا ہے۔ جس طرح اقبال نے حیات انسانی اور تصور انسانی کو ''خودی'' میں پیش کیا ہے، اقبال کا یہ شعر خود شناسی کا اظہار ہے ؎

تو اگر خود دار ہے محنت کش ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسانگوں پیمانہ کر

اب ندیم کے اشعار اسی قبیل سے ملاحظہ کیجئے ؎

ابھی نسلوں کے انبوہ میں محبوس ہوں میں
آدمیت کے تقاضے نہیں بیدار ابھی
تم نے افراد سے پیمان محبت باندھا
آدمیت کے تقاضوں کا وفادار ہوں میں

ندیم کی نظموں میں آفاقی و عالمگیری پھیلاؤ اس بات کا پتہ دیتا ہے۔ ان کے ہاں احترام آدمیت، انسان اور انسانیت کی اعلیٰ قدریں، رنگ و نسل، ہر ایک سے محبت ہی محبت، ان کی شاعری میں انقلاب اور جبر و استبداد جیسے موضوعات پر معیاری نظمیں ملتی ہیں۔ اقبال نے اپنی نظم ''مسلمان کا زوال'' میں مادیت اور زر پرستی کے نقصانات بتائے ہیں، احترام آدمی کا تصور دیکھئے ؎

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے ہے میسر، تونگری سے نہیں

(مسلمان کا زوال) ضرب کلیم

ندیم کے دو شعر ملاحظہ ہوں، ان شعروں میں پورے عالم کے انسانوں کی آواز سنائی دیتی ہے ؎

میرا غم صرف میرا غم تو نہیں، کم کیوں ہو
آدم اس دور میں بھی کشتۂ آدم کیوں ہو
آدمیت ہی جب اس دور میں پامال ہوئی
اپنی اک ذات کے لٹنے کا مجھے غم کیوں ہو

اقبال کا اپنا ایک نظام فن ہے، اسی طرح ندیم نے اپنے فن کو نکھارنے میں ان کا اپنا لب و لہجہ، فکر و خیال جو اقبال سے بہت قریب ہے، ان کی نظموں میں اقبال کے فن کے نقوش مجموعۂ کلام ''شعلہ و گل'' اور ''رم جھم'' میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

اختر الایمان......۱۹۹۶ء-۱۹۱۵ء:

ترقی پسند شعراء میں ان کا اسلوب و آہنگ نظم میں نئے انداز سے جلوہ گر ہوا ہے۔ ان کے ہاں لفظوں کا استعمال اور دروبست اور علامتی نظام ہیئت کے نئے تجربے، ان تجربوں میں کرب و غم کی طویل داستان نظر آتی ہے۔ ''گرداب''، ''تاریک سیارہ''،

۱۔ اقبال شعاع صد رنگ، ص ۱۸۳

''یادیں''، ''سروساماں''، یہ مجموعے اس کی روشن مثال ہیں- حیرت اس بات پر ہے کہ ڈاکٹر وقار احمد رضوی نے اپنا تحقیقی مقالہ ''تاریخ جدید اردو غزل'' میں اختر الایمان کو غزل کا شاعر ثابت کرنے میں اپنی پوری قوت صرف کی ہے، جو کسی بھی لحاظ سے درست نہیں- اختر الایمان کے بارے میں وقار احمد رضوی کی رائے ملاحظہ کیجئے:

> ''ان کے اسلوب میں ندرت اور غزلوں میں تجربے کا آہنگ ہے- رومان کی بہ نسبت ان کا سیاسی احساس زیادہ بیدار نہیں ہے- جو وضاحت احمد ندیم قاسمی کی غزلوں میں ہے، وہ اختر الایمان کی غزلوں میں نہیں ہے- اختر الایمان کی غزلوں میں رمزیت، اشاریت اور علامتوں کا استعمال میراجی کے اثر سے آیا ہے-'' [1]

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وقار احمد رضوی اختر الایمان کی شاعری سے قطعاً واقف نہیں- اختر الایمان تو خالصتاً نظم کا شاعر ہے- ان کی کتاب سے ایک اقتباس اور ملاحظہ کیجئے:

> ''اختر الایمان نے احمد ندیم قاسمی کی طرح غزل کو ترقی پسند شاعری کی محفل میں سجائے رکھا- ان کی غزلوں میں چٹیلا پن ہے، انہوں نے غزل کو جدید ذہن سے قریب کرنے کی کوشش کی ہے- ان کا اسلوب علامتی ہے، ان کی غزلیں یاس و ناامیدی کے درمیان کشمکش کی غمازی کرتی ہیں- اسی لئے اختر الایمان کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے اردو غزل کو نیا لب ولہجہ دیا-'' [2]

وقار رضوی نے جو شعر غزل کے حوالے سے دیا ہے، یہاں بھی ان سے سہو ہوا ہے- وہ شعر نظم ''تنہائی میں'' میں شامل ہے- یہ نظم کلیات ''سروساماں'' میں صفحہ ۶۹ میں دیکھی جاسکتی ہے-

اب ارادہ ہے کہ پتھر کے صنم پوجوں گا
تاکہ گھبراؤں تو ٹکرا بھی سکوں سر بھی سکوں

ہمارے معتبر ناقدین نے اختر الایمان کی نظمیہ شاعری پر بسیط مقالے تحریر کئے ہیں- ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی کتاب ''نظم جدید کی کروٹیں'' میں اختر الایمان کی نظم پر طویل بحث کی ہے- احمد ہمدانی نے اپنی کتاب ''نئی شاعری کے ستون'' میں لکھا ہے کہ:

> ''اختر الایمان پہلے شاعر ہیں جنھوں نے تغزل سے اپنا دامن بچائے رکھا اور اردو شاعری کو نظمیہ شاعری کی تازہ ترجہت سے روشناس کرایا-''

بہر کیف اختر الایمان نظم کا نمائندہ شاعر ہے- ان کی ابتدائی شاعری میں رومانی نظمیں ملتی ہیں، جو ان کی محبت اور عشق کا اظہار ہے- نظم ''شکست خواب'' سے اختر الایمان کی دلی کیفیات کا اندازہ ہوتا ہے- اس کے علاوہ ''اجنبی''، ''تجھے گمان ہے''، ''لغزش''، ''ایک یاد''، ''جمود''، ''آمادگی'' وغیرہ نظمیں رومانیت پر اچھی نظمیں کہی ہیں- ''تاریک سیارہ'' میں زیادہ تر نظمیں ڈرامائی طور پر ہیں- فلسفیانہ اور فکری طرز پر بھی اختر نے بہترین نظمیں کہی ہیں- ''ایک سوال''، ''آبادی''، ''خاکدان'' اور ''ایک کاوش اور جستجو'' ان نظموں کا مزاج اور تخلیقی آہنگ نئے اسلوب کا اظہار یہ ہے- اختر الایمان کی نظم ''یادیں'' پر اقبال کی نظم ''نوائے غم'' کا واضح

۱- تاریخ جدید اردو غزل، ص ۷۵۶

۲- تاریخ جدید اردو غزل، ص ۷۵۷

اثر آیا ہے ؎

زندگانی ہے مری مثل رباب خاموش
جس کی ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش
بربط کون و مکاں جس کی خموشی پہ نثار
جس کے ہر تار میں ہیں سینکڑوں نغموں کے مزار

(نوائے غم)

اقبال نے زندگی کو رباب خاموش سے تشبیہہ دے کر اپنے کرب وغم کا جو اظہار کیا ہے، اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اختر الایمان نے اقبال کے فکری اثرات قبول کیے ہیں اور یہ اثرات ان کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ اختر کی نظم ''یادیں'' ملاحظہ کیجیے ؎

کبھی غنیم جور و ستم کے ہاتھوں کھائی ایسی مات
ارض الم میں خوار ہوئے ہم بگڑے رہے برسوں حالات
اور کبھی جب دن نکلا تو بیت گئے جگ ہوئی نہ رات
ہر سو، مہوش سادہ قاتل لطف و عنایت کی سوغات
شبنم ایسی ٹھنڈی نگاہیں پھولوں کی مہکار سی بات
جوں توں یہ منزل بھی سر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

(یادیں) [۱]

اس نظم میں ہیئت بدلی ہوئی ہے، مفہوم اور رنگ دونوں پر اقبال کی چھاپ ہے۔ نظم میں تکنیک کے بدلنے کا سہرا اختر الایمان کے سر ہے۔ نظم میں اختر نے اپنے حال و احوال سے آگاہ کر دیا۔ جیسے اقبال نے زندگانی کو رباب خاموش سے مثال دے کر اپنے شب و روز کا ماجرا کہہ دیا۔ اختر کی نظم ''تجدید'' پر اقبال کی نظم ''پیوستہ رہ شجر سے، امید بہار رکھ'' کے اثرات ملاحظہ کیجیے ؎

ڈالی گئی جو فصل خزاں میں شجر سے ٹوٹ　　ممکن نہیں ہری ہو سحاب بہار سے
ہے لازوال عہد خزاں اس کے واسطے　　کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے

(پیوستہ رہ شجر سے، امید بہار رکھ) بانگ درا

اختر الایمان کی نظم ملاحظہ کیجیے ؎

آپ ہی نہ جانے کیوں بجھ گئے دیے گھر کے　　ایک شعلۂ غم سے خاک ہوگئی محفل
نیش خار، پھولوں کے دل میں چبھ گیا جا کر　　قافلے بہاروں کے لٹ گئے سر منزل
ایک بار پہلے بھی تیرگی کے دامن میں　　مرگ نغمہ و گل پر آنسوؤں سے کھیلا ہوں
آج تم نے پھر آ کر سب دیے جلائے ہیں　　غم کدے کی دیواریں جگمگا اٹھی ہیں پھر

(تجدید) [۲]

۱- سرو ساماں، ص ۱۸

۲- سرو ساماں، ص ۱۷۵

نظم ''تجدید'' میں تراکیب لفظی ملاحظہ کیجئے، جسے اقبال کی فکر کہا جاتا ہے، نیش خار، مرگ نغمہ وگل، غمکدے کی دیواریں، اختر کے ہاں یہ تخلیقی عمل جسے تازہ کاری کہہ سکتے ہیں، اس نظم میں زندگی کے رنج وآلام کی مکمل تصویر آنکھوں میں گھوم جاتی ہے۔فکر تازہ کے یہ نقوش اقبال کی تمام شاعری میں نظر آتے ہیں اس لئے اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کسی شاعر نے اقبال کی فکر سے بچ کر نظم کے دامن کو وسیع کیا ہو۔

اختر الایمان کی نظم ''تاریک سیارہ''، اس میں انہوں نے کرۂ ارض کو علائم میں پیش کیا ہے یعنی جمہوری، سماجی، معاشرتی اور ترقی پسندی کے رجحانات کو واضح کیا ہے۔ اقبال نے یہی خیالات ''ہندی اسلام'' میں پیش کئے ہیں، دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہے زندہ فقط وحدت افکار سے ملت　　وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

وحدت کی حفاظت نہیں بے قوت بازو　　آتی نہیں کچھ کام یہاں عقل خداداد

(ہندی اسلام) ضرب کلیم

اختر کی ''تاریک سیارہ'' ملاحظہ کیجئے ؎

جانِ من حجلۂ تاریک سے نکلو دیکھو　　کتنا دلکش ہے یہ رات میں تاروں کا سماں

آسماں چھلکے ہوئے جام کے مانند حسیں　　خلد میں دودھ کی اک نہر سی ہے کاہکشاں

آسماں دور ہے اب خواب گراں سے اٹھیے　　ظلمت شب سے ہویدا ہیں سحر کے آثار

ایک سیارہ ہے یہ اپنی زمیں بھی لیکن　　اس کو انسان نے کر رکھا ہے خود تیرہ تار

(تاریک سیارہ)[1]

حجلۂ تاریک کتنی نئی ترکیب ہے، آسماں چھلکے ہوئے جام، خلد کی نہر، آسماں دور، مغرب زدگی کی طرف اشارہ ہے۔ یہاں ''انسان'' انگریز سے مراد ہے جس نے برصغیر کی سرزمین کو اپنے شکنجے میں کسا ہوا ہے، انسان کہہ کر معاشرتی قدروں کی طرف بھی اشارہ ہے۔ یہ وہ جدید آہنگ ہے جو صرف اختر الایمان سے شروع ہو کر انہیں پر ختم ہو جاتا ہے۔ گوکہ دیگر شعراء نے بھی ایسی کوششیں کیں مگر یہ جگر کاری نہ کر سکے۔ جو اختر الایمان کا خاصہ اور شناخت ہے۔ اشعار میں اقبال کے رنگ وآہنگ کی جھلک نظر آتی ہے۔ اختر الایمان کی جدید علامتیں بھی ان کی پہچان ہیں۔ ان علامتوں میں اقبال کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

جاں نثار اختر......۱۹۱۴ء-۱۹۷۶:

جاں نثار اختر کی نظمیں رومان اور انقلابی کیفیت کی حامل ہیں۔ اپنے معاصر شعراء کی طرح انہوں نے بھی انہی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جو وقت کا تقاضا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے ہاں جمالیاتی حس تیز نظر آتی ہے۔ گوکہ مجاز کا رنگ وآہنگ بھی یہی کچھ ہے۔ مگر فکر اور انقلابی ذہن نے جاں نثار اختر کی نظموں کا رنگ دوآتشہ کی کیفیت لئے ہوئے ہے۔

حسن گفتار ایک آرٹ ہے۔ وہ بات کو سجا کر کہنے کے عادی تھے۔ پیرائے اظہار سادہ مگر جاذب نظر جیسے کوئی مجسمہ تراش کر رکھ دیا۔ پیکر تراشی ایک ہنر ہے۔ شعری زبان میں یہ ہنر اور بھی مشکل ہے لیکن ان کی شاعری میں روایت کی ایک طویل اور گہری فکر کارفرما ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جاں نثار کی شاعری سچی اور سجی ہوئی شاعری ہے۔ ان کی شاعری میں ترقی پسند رجحانات کو

۱۔ سروساماں، ص ۱۸۰

دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کی نظموں میں پیغام بھی ہے اور خطابت بھی۔ توپ و تفنگ بھی۔ شعلوں کی طرح وہ الفاظ جو شعری قالب میں ڈھل گئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نظم کیا ہے دہکتی ہوئی آگ ہے۔ نظموں کے موضوعات اور مشق سخن اپنے شوق کے لئے نہیں بلکہ معاشرتی اور معاشی زبوں حالی کو بیان کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ قلم کے جہاد میں جاں نثار اختر نے تحریک کا بھرپور ساتھ دیا۔ انگریزوں کے خلاف ہر اس شاعر کے ہاں ترقی پسند رجحانات کی نظمیں ملتی ہیں، جو انسانیت سے محبت کرتے ہیں۔ درندگی، جہالت اور مفاد پرست لوگوں سے سخت نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ ترقی پسند شعراء میں قدر مشترک یہی ایک چیز ہے کہ یہ ایک ذہن ہو کر سوچتے ہیں اور اس کا اظہار ایک ہی طرز پر کرتے ہیں۔ یہ آوازیں مل کر ہی انقلاب کی آواز بنتی ہیں۔ جاں نثار اختر ان شاعروں میں سے ہیں جو انسانیت سے پیار کرتے ہیں اور یہی پیغام ان کا آدرش ہے۔

جاں نثار کی نظموں میں اقبال کی تراکیب اور اسلوب فن صاف نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز کو اپناتے ہوئے جدید اصولوں پر جو نظمیں کہی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماضی سے انہوں نے اپنا رشتہ نہیں توڑا بلکہ اس میں نئی تراکیب، تشبیہات و استعارات اور ترجیع بند میں شاعری کر کے اقبال کے اسلوب و آہنگ کی پیروی کا اعتراف کیا ہے۔ جاں نثار اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

سیکھے کوئی کاش تجھ سے حسن گفتار
ہر بات کا ایک خوب صورت اظہار
یہ رنگ ادب کا، یہ روایت کا رچاؤ
جملوں میں سلیقے سے پروئے اشعار

اقبال کی نظم ''شمع و شاعر'' میں جو ایمائی کیفیت ملتی ہے، دراصل اس میں مکالماتی انداز کے ذریعہ نظم کے پیرائے میں نیا آہنگ دیا ہے۔ یہ نظم ترکیب بند ہیئت پر ہے۔ ملت اسلامیہ کو موضوع بنا کر مسلمانوں کو بیداری کا جو درس دیا ہے، یہ نظم صنائع بدائع کے لحاظ سے بھی بے مثال ہے۔ اسی طرح جاں نثار نے اپنی نظم میں ان باتوں کا خیال رکھا ہے، جیسے اقبال نے پرانی اور روایتی علامتوں سے پرہیز کیا ہے۔ اقبال کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش ۔۔۔ اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں باد بہار ۔۔۔ نکہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی

(شمع و شاعر)

جاں نثار کی نظم ''معلوم نہ تھا'' ملاحظہ کیجئے ؎

زندگی شعلہ بجاں ہے مجھے معلوم نہ تھا ۔۔۔ قلب گیتی بھی تپاں ہے مجھے معلوم نہ تھا
شبنم برگ گل تر کے خنک سینے میں ۔۔۔ ایک شعلہ بھی نہاں ہے مجھے معلوم نہ تھا
نغمہ ساز بھی بے کیف ہے محفل کے لئے ۔۔۔ کیف صہبا بھی گراں ہے مجھے معلوم نہ تھا
وادی نغمہ و مستی میں بھٹکتا ہوا وقت ۔۔۔ عہد شمشیر و سناں ہے مجھے معلوم نہ تھا
حرم و دیر میں گونجی ہوئی آہوں کی صدا ۔۔۔ غرق ناقوس و اذاں ہے مجھے معلوم نہ تھا
عرصہ خوں میں بغاوت کا ابھرتا سورج ۔۔۔ شمع کاشانۂ جاں ہے مجھے معلوم نہ تھا

(معلوم نہ تھا) [1]

۱۔ کلیات جاں نثار اختر، ص ۱۸۸

جاں نثار کی کسرِ اضافی، تراکیب لفظی اور رنگ و آہنگ اقبال کا سا ہے مثلاً شبنم برگ گل، قلب گیتی، نغمۂ ساز، وادی نغمہ و مستی، عہد شمشیر و سناں، غرق ناقوس و اذاں، عرصۂ خوں، شمع کاشانہ و جاں، جاں نثار کی شاعری میں اقبال کا نظام فن بڑا توانا اور طاقتور نظر آتا ہے- جاں نثار اختر کی نظموں پر اقبال کے اثرات ملاحظہ ہوں، اقبال کے دو رشعر دیکھئے ؎

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دست دولت آفریں کو مزدیوں ملتی رہیں
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

(خضر راہ)

اقبال نے جمہوری نظام کو متعدد جگہ تنقید کا نشانہ بنایا ہے، اسی طرح جاں نثار اختر نے انسان کی ہمدردی میں اپنے جذبات کو شامل کرتے ہوئے نظموں میں ان دکھوں کا علاج کیا ہے ؎

شدت افلاس سے جب زندگی تجھ پہ تھی تنگ
اشتہا کے ساتھ تھی جب غیرت و عصمت کی جنگ
گھات میں تیری رہا یہ خود غرض سرمایہ دار
کھیلتا ہے جو برابر نوع انساں کا شکار
یہ تمدن کے خدا، تہذیب کے پروردگار

(حوا کی بیٹی) [۱]

اقبال کے فکر و فن کی مختلف جہتیں ہیں، ان میں سیاسی افکار بڑی آب و تاب لئے ہوئے ہیں- جاں نثار اختر کے ہاں اقبال کا اسلوب اور فن کے جو نقوش ملتے ہیں ان میں تراکیب لفظی، جن سے نئے لفظ بنائے گئے ہیں، دیکھے جا سکتے ہیں- غیرت و عصمت کی جنگ، تمدن کے خدا، تہذیب کے پروردگار، یہ وہ ترکیبیں ہیں جو اقبال کے اسلوب کی نشاندہی کرتی ہیں، اقبال کے شعر ملاحظہ کیجئے ؎

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر، خواب آوری

(خضر راہ)

جاں نثار اختر کی نظم ''زندگی'' ملاحظہ کیجئے ؎

تیر افلاس سے کتنوں کے کلیجے ہیں فگار
کتنے سینوں میں ہے گھٹتی ہوئی آہوں کا غبار
کتنے چہرے نظر آتے ہیں تبسم کا مزار

(زندگی) [۲]

۱- کلیات جاں نثار اختر، ص ۱۹۹

۲- کلیات جاں نثار اختر، ص ۱۹۱

ساغرنظامی......۱۹۸۴ء-۱۹۰۵ء:

ساغر کا پورا نام محمد صدیار خاں تھا، علی گڑھ میں پیدا ہوئے، ابتداء صحافت سے کی اور شہرت شاعری سے ملی، سیماب اکبر آبادی کے تلامذہ میں ابھرتا ہوا نام، جسے آج کل لوگ ساغر نظامی کہتے ہیں-

ساغر خواجہ حسن نظامی سے بیعت تھے- اسی لئے تخلص کے ساتھ نظامی لکھتے ہیں- ساغر کا شعری قامت بہت بلند ہے- عربی، فارسی، اردو، ہندی، سنسکرت، ان زبانوں پر عبور رکھتے تھے-

زمانے کے لحاظ سے جو شعراء اپنا مقام بنا چکے تھے، ان میں جگر، جذبی، سیماب، حفیظ جالندھری، یاس یگانہ اور جوش- ان شعراء کے درمیان رہتے ہوئے ساغر نظامی نے اپنا پہلا مجموعۂ کلام، جو کہ رباعیات پر تھا، ''شبابیات'' کے نام سے ۱۹۲۵ء میں شائع کیا- یوں تو ساغر کی اردو ادب میں کئی جہتیں ہیں مثلاً نظم، نثر، ادب اور صحافت، ساغر کے نظریات اور آرٹ کی صحیح ترجمانی شاعری کے ذریعہ ہوتی ہے- ''بادۂ مشرق'' میں ساغر نے قومی نظمیں، غزلیں اور گیت پیش کئے ہیں- اس کے علاوہ ''موج و ساحل'' میں بھی قومی نظمیں لکھی ہیں- اس مجموعہ میں گیت اور غزلیں بھی ہیں- ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہندوستان کی منظوم تاریخ آزادی بعنوان ''مشعل آزادی'' لکھی- ساغر نے اس کتاب کا پہلا حصہ ۱۸۵۷ء جنگ آزادی تک رکھا- ساغر کے مزاج میں رومان بھی تھا اور انقلاب بھی- دل رومان سے لبریز تھا اور دماغ انقلاب کی بھٹی میں دہک رہا تھا- ساغر کی شاعری میں تہذیبی اقدار، حب الوطنی اور انقلابی شاعری کے خدوخال نظر آئیں گے- وہ ایک سچے انسان دوست تھے- ساغر کی ایک طویل نظم ''نہرو نامہ'' ہے، اس میں انہوں نے زندگی اور موت کا فلسفہ بتایا ہے- ساغر ترقی پسند نظریات کے حامل تھے- سماجی و معاشرتی قدروں کا بھی احساس تھا- ساغر کو جدید شعراء میں ایک مقام حاصل ہے- زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا اثر بھی ان کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے- یہ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار، وطنیت اور آزادی کی کوششوں میں سرگرداں رہے- ان کی زیادہ تر نظمیں وطن ہی کے حوالے سے ہیں- ان نظموں میں اقبال کی فکر کے اثرات بہ آسانی دیکھے جا سکتے ہیں- خواجہ حسن نظامی، ساغر کی شاعری اور فکر کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''ساغر کے کلام میں شاعری ہوتی ہے، فلسفہ ہوتا ہے، تصوف ہوتا ہے اور روزمرہ زندگی کے نظارے ہوتے ہیں- ان کے اشعار میں پرشوکت الفاظ اور پرکیف بندشیں اور جدت آمیز پیرایۂ بیان ہوتا ہے- ان کا کلام شاعری کے سب ہتھیاروں سے مسلح معلوم ہوتا ہے- اسی لئے میں ان کو شاعری کا ہٹلر کہتا ہوں-'' [۱]

خواجہ صاحب کی یہ باتیں اپنی جگہ درست ہیں لیکن ساغر کی شاعری میں یہ بازگشت کیسے اور کہاں سے آئی، اس کا جواب صرف یہ ہے کہ ساغر تحریکات کے دور میں رہے، ان تحریکات سے جو حالات و واقعات ظہور پذیر ہوئے ان کا ذکر ترقی پسند تحریک میں کر دیا گیا ہے- یہاں، ہم ساغر کی شاعری میں اقبال کی فکر اور ان کی نظموں کے اثرات تلاش کریں گے-

اقبال نے اپنی نظم ''شکوہ اور جواب شکوہ''، جو شعری ہیئت مسدس کی رکھی ہے، اسی طرح ساغر نے بھی اپنی نظم ''ہندوستان'' کہہ کر اقبال سے تقلید کا اظہار کیا ہے- یہ نظم خالصتاً وطنیت کا اظہار ہے- ساغر ایک سچے محب وطن تھے- وطن کی اہمیت اجاگر کرنے میں یوں تو ساغر نے اور بھی نظمیں لکھی ہیں مثلاً ''صبح وطن''، ''کشمیر''، ''نغمۂ صلح کل'' وغیرہ- ساغر کے تخیل کی پرواز اس قدر بلند تھی کہ اگر کوئی ان کا مدمقابل شاعر ہے تو وہ صرف جوش ہے-

---

۱- ساغر نظامی فن اور شخصیت، ص ۳۷۰

ساغر کی نظم ''ہندوستان'' ملاحظہ کیجئے، جس میں اقبال کے ''شکوہ'' کا صوت و آہنگ صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے ؎

ہند کی اے سرزمیں اے خطۂ پاک وطن غازۂ روئے مہ و خورشید اے خاک وطن
اے گلستان وفا، اے سینۂ چاک وطن اے محبت خیز آغوش طربناک وطن
جوش عشرت تجھ میں ہے ہنگامہ غم تجھ میں ہے
اے بساط دو جہاں ہر ایک عالم تجھ میں ہے
نغمہ راز روح بھی گہوارۂ الہام بھی جنت نظارہ تیری صبح بھی ہے شام بھی
مرکز احرار تو ہے مرجع اقوام بھی میکدہ بھی، کعبہ بھی، کاشانۂ اصنام بھی
مسکرائی ملک قدرت تیرا نقشہ دیکھ کر
تجھ کو خالق نے بسایا عطر دنیا دیکھ کر

(ہندوستان) [1]

یہ نظم تیرہ بندوں پر مشتمل ہے- اس کے ہر بند میں وطنیت کی گونج ملے گی، جیسے اقبال کی نظمیں ''تصویر درد''، ''ترانۂ ہندی'' اور ''ترانۂ ملی'' یہ نظمیں ''بانگ درا'' میں ہیں- ساغر کی نظم ہیئت کے اعتبار سے مسدس میں ہے اور موضوع کے لحاظ سے ترانۂ ہندی سے قریب ہے- وطنیت کے لحاظ سے دونوں کے ہاں ایک جیسے خیالات نظم ہوئے ہیں- ساغر اپنی نظموں میں ڈرامائی عنصر کو بھی شامل کرتے ہیں جیسے اقبال نے اپنی نظم ''زمانہ''، جو بیانیہ فکری شاعری کی مثال ہے، گوکہ یہ نظم طویل بحر میں کہی گئی ہے- اس کے علاوہ ساغر نے ایک نظم کہی جس کا عنوان ''نانا صاحب پیشوا'' ہے- اس نظم میں گرونانک کے اوصاف اور ان کی خدمات کا اعتراف کس انداز سے کیا ہے، نظم پڑھ کر اندازہ ہوگا- اقبال نے بھی ''نانک'' عنوان سے ایک نظم جو ''بانگ درا'' میں کہی ہے، گرونانک کی عقیدت میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے- اقبال کی نظم کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

بت کدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا نور ابراہیم سے آذر کا گھر روشن ہوا
پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے

(نانک) بانگ درا

ساغر نظامی کی نظم ''نانا صاحب پیشوا'' ملاحظہ کیجئے ؎

نہیں آسان اس دنیا میں نانا پیشوا ہونا
شکستہ کشتیوں کے کارواں کا ناخدا ہونا
جہاں ہوں چار سو اے دوست زنجیریں ہی زنجیریں
کرامت ہے وہاں دام غلامی سے رہا ہونا
کلید زیست آزادی ہے آخر پیشوا سمجھا
بغیر اس کے نہیں آسان زنداں سے رہا ہونا
نہیں آسان اس دنیا میں نانا پیشوا ہونا

(نانا صاحب پیشوا)

۱- ساغر نظامی فن اور شخصیت، ص ۴۷۶

ساغر کی مندرجہ بالا نظم ہیئت کے اعتبار سے ترکیب بند میں ہے- انہوں نے اپنی نظم کو تشبیہات و استعارات سے مزین کیا ہے اور آزادی کے صحیح مفہوم کو واضح کیا- نانک کے پیغام میں توحید کا فلسفہ بھی کارفرما ہے- ساغر کی ایک اور نظم ''ابوالفتح ٹیپو سلطان'' ہے- اقبال نے ''ضرب کلیم'' میں ''سلطان ٹیپو کی وصیت'' کے عنوان سے نظم کہی ہے- اقبال کی نظم مختصر ہے جبکہ ساغر کی نظم طویل ہے- اقبال کی نظم کے اشعار ملاحظہ کیجیے:-

تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول — لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز — ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول
صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے — جو عقل کا غلام ہو، وہ دل نہ کر قبول
باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے — شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

(سلطان ٹیپو کی وصیت) ضرب کلیم

ساغر نظامی کی نظم ملاحظہ کیجیے:-

ہوں مرہٹے کہ محمد علی کہ میر دکن — کسی کو فکر کی آسودگی نصیب نہ تھی
ہے موت قوم کی شیرازے کا بکھر جانا — غرور ذات کو یہ آگہی نصیب نہ تھی
تھے ماہ و خورشید جس کی کرنیں وہ پرتو شمع انجمن تھا — وہ فخر لالۂ چمن تھا، وہ افتخار عمل و سمن تھا
وہ مرد میدان سرفروشی، وہ بزم آرائے علم و فن تھا — وہ عاشق آزادی وطن تھا کہ سر سے باندھے ہوئے کفن تھا
شہید آزادی وطن کو سلام ہو بار بار ساقی

(ابوالفتح ٹیپو سلطان)

دراصل ساغر کی یہ نظم ترکیب بند میں ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اس میں وطن کی آزادی، حریت کا جذبہ، انگریزوں کا عمل دخل اور ٹیپو سلطان کی شخصیت کا رعب و دبدبہ، جلال و جمال کے عکس صاف نظر آتے ہیں- اس کے علاوہ بھی ساغر نے وطنیت پر اور نظمیں کہی ہیں جس میں ''صبح وطن'' اہمیت کی حامل ہے- اس نظم میں ساغر نے آزادی کا پرچم لہرادیا- جس صبح وطن کا انتظار تھا- آخر وہ صبح وطن دیکھنا نصیب ہوئی یعنی انگریزوں کی روانگی اور ہندوستان کا آزاد ہونا، تراکیب لفظی سے بھی کام لیا گیا ہے مثلاً انوار سحر، افکار بشر، بستر سے خذف ریزے یہ وہ تراکیب ہیں جو صرف اقبال کی فکر کے اثرات کہے جاسکتے ہیں-

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری......۱۸۹۶ء-۱۹۸۲ء:

فراق نے غزل کے علاوہ رباعی اور نظمیں بھی لکھی ہیں- ان کا مجموعہ کلام ''روح کائنات'' جو کہ نظموں پر مشتمل ہے- ان کی نظموں میں وقت کی آواز صاف سنائی دیتی ہے- ان کی نظر حال اور مستقبل پر تھی- ان کی مثنوی ''حسن فطرت'' اردو ادب میں ایک اعتبار کی حیثیت رکھتی ہے- رباعیات ''روپ'' کے عنوان سے شائع ہوئیں- فراق نے انگریزی ادب سے بھی کسب فیض کیا ہے- مغربی اور مشرقی علوم کے امتزاج سے وقت اور حالات کی نبض پر ہاتھ رہا- فراق کی نظموں میں دیومالا، ہندو کلچر، ایرانی تہذیب اس کے علاوہ آرٹ، حسن اور پیکر تراشی اپنی راہ الگ نکالی- فراق نے تمام زندگی کرب و غم اور ناآسودگی میں گزاری اس لئے ان کی نظموں میں جذبات اور جنسیات کو بڑا دخل ہے- فراق کا صحیح رنگ و آہنگ ۱۹۳۰ء کے بعد ہی تلاش کیا جاسکتا ہے-

ہندوستانی ہونے کے ناتے ایسی نظمیں کہی ہیں جو زبان و بیان کے معاملے میں ایک نئی آواز ہے- اس نئی آواز میں عہد کی گونج بھی ہے اور قلبی واردات بھی، وطن سے محبت بھی ہے اور قفس و پا بجولاں کے تذکرے بھی- ''روح کائنات'' کی نظموں سے پتا چلتا ہے کہ وہ وقت کی دہکتی ہوئی بھٹی میں اپنے آپ کو جلا کر راکھ کر چکے تھے- قدیم وجدید رنگ کے ساتھ اس میں حیات و کائنات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے- ان کے فن کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ نزاکتوں اور نفاستوں کو دلی کیفیات اور احساس کی آمیزش سے ایک ہیجانی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں- اس کے علاوہ فراق کا ذوق شعری پروان چڑھانے میں ان لوگوں کا زیادہ ہاتھ ہے جوان کے ساتھ قید و بند کی صعوبتوں میں ہمرکاب رہے- دوسرے یہ کہ ازدواجی زندگی کی ناآسودگی بھی شاعری پر اثر انداز ہوئی -فراق کی انقلاب آمیز نظم کے تیور جس میں مخاطبہ ہے- فراق دراصل فکر اور جذبے کے امتزاج سے ایک ایسی فضا قائم کرتے ہیں جس میں داخلی اور خارجی کیفیات کو اپنی افتادطبع سے شعری زبان، جنھیں تراکیب کہتے ہیں، سے اقبال کی فکر کا اندازہ ہوتا ہے-

فراق کی نظم ''دنیا کا بحرانی دور'' اس میں انقلابی رجحان ملاحظہ کیجیے، جبکہ اقبال نے ''ہندی اسلام'' میں انقلابیت کی طرف اشارہ کیا ہے- یہ نظم ضرب کلیم میں ہے ؎

ہے زندہ فقط وحدت افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد
وحدت کی حفاظت نہیں بے قوت بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقل خداداد

(ہندی اسلام) ضرب کلیم

فراق کی نظم ملاحظہ کیجیے ؎

پڑنے لگتی ہیں جبین وقت پر جب سلوٹیں
رات دن چکر میں پڑ جاتے ہیں اب کیونکر کٹیں
سرمگیں چشم سحر سے اڑتی ہیں چنگاریاں
ڈسنے کو پھنکارتی ہیں لیلی شب کی لٹیں
خون تھوکا منہ بندھی کلیوں نے یوں گلزار میں
ٹھیس لگ کر جس طرح انگور زخموں کے پھٹیں
اٹھ رہے ہیں شش جہت سے نعرہ ہائے انقلاب
اہل دنیا سے کہو اب جی اٹھیں یا مر مٹیں

(دنیا کا بحرانی دور)[1]

جس طرح اقبال نے تراکیب لفظی سے کام لیا ہے، فراق نے بھی یہ اثر قبول کیا ہے- مثلاً ''سرمگیں چشم سحر''، ''لیلیٰ شب''، ''خون تھوکا''، ''انگور زخموں کے پھٹیں'' یہ وہ تراکیب ہیں جسے اقبال کے اثرات کہے جا سکتے ہیں-

فراق کی نظم ''آج کی بات'' میں انقلاب یعنی ظلم و استبداد کا خاتمہ اور قدروں کا بدلنا محسوس ہو رہا ہے- شعر و ادب کے

۱- روح کائنات، ص ۱۵۴

موضوعات اور الفاظ و معنی کے مطالب سے بھی بحث کی ہے۔ اقبال کی نظم ''اشتراکیت'' اسی قسم کا اظہار ہے۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم　　بے سود نہیں روس کی یہ گرمی رفتار
اندیشہ ہوا شوخی افکار پہ مجبور　　فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
(اشتراکیت)

فراق کی نظم ملاحظہ کیجئے۔

دنیا کو انقلاب کی یاد آ رہی ہے آج
تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے آج
وہ سر اٹھائے موج فنا آ رہی ہے آج
موج حیات موت سے ٹکرا رہی ہے آج
کانوں میں زلزلوں کی دھمک آ رہی ہے آج
ہر چیز کائنات کی تھرا رہی ہے آج
ہر لفظ کے معانی و مطلب بدل چکے
ہر بات اور بات ہوئی جا رہی ہے آج

(آج کی بات)[1]

فراق اپنے ادبی ماحول اور سیاسی رجحان سے کبھی غافل نہیں رہے۔ فراق کی شاعری کا چراغ جس آب و تاب سے روشن ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے وقت کے ساتھ ساتھ نئے تجربے بھی کئے اور اس میں اپنی فکر اور تخیل سے اضافہ بھی کیا۔ ان کے معاصرین بھی ان کی شاعری سے متاثر تھے۔ نظم ''آج کی بات'' میں جو کیفیت ہمیں ملتی ہے، اس سے ہمیں فراق کے ذہن اور فکر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس نظم کو محمد حسن عسکری نے اپنی پسند کے لحاظ سے میری ''بہترین نظم'' میں انتخاب کے طور پر شامل کیا ہے، جسے نگار نے شمارہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۰ء صفحہ ۱۰۴ پر شائع کیا ہے۔

پروفیسر منظور حسین شور......۱۹۱۵ء-۱۹۹۴ء:

شور نے شاعری کی ابتداء غزل سے کی، علی گڑھ کی شعری فضا اور ماحول نے انہیں نظم کی طرف متوجہ کیا۔ ان کی نظمیں انقلابیت، رومان اور تاریخی موضوعات پر ملتی ہیں۔ خاص کر نظموں میں عالمگیر انسانیت، سماج، انسان، جمالیات جیسی فکر نظر آتی ہے۔ مشرق و مغرب کے ادب و فلسفہ نے بھی ان کی شاعری پر گہرا اثر ڈالا۔ موضوعات کی ہمہ جہتی و ہمہ رنگی فکر و بصیرت اور رموز فکر و نظر سے بھی واردات حاضرہ اور زخم ہائے ماضی کو رموز نکات کے آئینے میں پیش کیا ہے۔ پروفیسر سحر انصاری نے اپنے ایک مضمون میں شور کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے:

''ہمارے شعراء میں غالب، اقبال اور جوش اسی رومانیت کے زمرے میں آتے ہیں اور شور صاحب کی شاعری پر بھی اسی رومانیت کا پرتو ہے، جس کے اظہار کے لئے انہوں نے پابند نظم، غزل، رباعی کو اختیار کیا۔ شور صاحب ایک خلاق ذہن اور

۱۔ روح کائنات، ص ۱۲۴

ارفع تخیل کے مالک ہیں- انہوں نے فطرت انسانی، تاریخی ارتقاء اور مسائل حیات پر
غور وفکر کر کے اپنی شاعری کے وزن ووقار میں اضافہ کیا ہے-'' [۱]

شوؔر کی شاعری اور خاص کر نظموں میں سماج کی عکاسی نظر آتی ہے کیونکہ یہ قلب وروح کی گہرائی کے ساتھ انسانی اقدار اور اس کے وقار کی بات کرتے ہیں، ان کے ہاں اقبال کی فکر اور فلسفہ کا بڑا دخل ہے- ڈاکٹر سید عبداللہ، شوؔر کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جذبات کو عقل کے لباس میں ملبوس کرنا اور عقلیات کو جذبات کے معنی میں
محسوس کرنا شور صاحب کے کلام کی امتیازی خصوصیات ہیں- واردات قلبی اور وقت
کے حوادث اور مسائل ان کے فن میں یکساں آب ورنگ کے ساتھ موجود ہیں اور ان
کی شاعری ہر حال میں خلوص کی شاعری ہے-'' [۲]

شوؔر نے جن موضوعات کو اپنی شاعری میں موضوع بحث بنایا ہے ''صلیب انقلاب'' میں اس کی تقسیم کچھ اس طرح سے ہے، انقلاب، سماج، تاریخ اور رومان وسیاست، بہ نظر غائر اقبال کے موضوعات کو دیکھا جائے تو یہی کچھ ہمیں اقبال کی نظموں میں ملے گا- شوؔر کی نظم ''دولت کی کبریائی'' پر اقبال کی مشہور نظم ''خضر راہ'' میں ''سرمایہ ومحنت'' کے اثرات واضح دکھائی دیتے ہیں- اقبال کی نظم کے دو شعر ملاحظہ کیجئے ؎

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

(خضر راہ)

اب شوؔر کے خیالات سرمایہ داری کے حوالے سے ملاحظہ کیجئے ؎

مرہم حج و زیارت، زخم دینار و درم
میرے ناسوروں سے چھلنی سینۂ مصر و عجم
سیم و زر میرے نبی، لعل و گہر میرے رسول
میرا اعجاز خلافت کھیتوں کا عرض و طول
نخوتیں میری وراثت عشرتیں میری برات
ساغر و مینا کی صبحیں، عارض و گیسو کی رات
میر و سلطان و وزیر و کج کلاہ و تاجدار
میرے فتراکوں کے آہو، میرے تیروں کے شکار

(دولت کی کبریائی) [۳]

۱- ماہنامہ طلوع افکار، ص ۲۰

۲- ذہن وضمیر، فلیپ

۳- صلیب انقلاب، ص ۲۳۶

جس طرح اقبال نے طویل نظمیں لکھ کر نظم میں منظر کشی اور فطرت نگاری کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس طرح شور نے بھی طویل نظمیں لکھی ہیں۔ ''شعلۂ شاداب''، ''آشوب حرم''، ''آدمی نامہ''، ''خدا کا آخری فرمان''، ''جبر مشیت''، اقبال کی طویل نظمیں، ''تصویر درد''، ''شمع و شاعر''، ''خضر راہ''، ''طلوع اسلام'' وغیرہ۔ اس روشنی میں شور کی شاعری اقبال کی نظموں کے طرز پر ہیں۔ موضوعات، تشبیہات واستعارات پر ویسی ہی قدرت ہے جیسی کہ اقبال کو ہے۔

شور کی فکر کو کسی ایک زاویہ سے نہیں دیکھا جاسکتا، ان کی شاعری میں فطرت نگاری، منظر کشی کے علاوہ بھی جہتیں نظر آتی ہیں مثلاً انقلابیت اور تاریخی واقعات پر ویسی ہی قدرت رکھتے ہیں، جیسے اقبال کی فکر میں ہمہ جہتی اور ہمہ رنگی پائی جاتی ہے۔ شور کی نظم ''زہر خند'' میں اقبال کی نظم ''نمود صبح'' کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ اقبال کی نظم کے دو شعر ملاحظہ کیجیے ؎

ہو رہی ہے زیر دامان افق سے آشکار
صبح یعنی دختر دوشیزۂ لیل و نہار
پا چکا فرصت درود فصل انجم سے سپہر
کشت خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار

(نمود صبح) [۱]

اقبال کی تشبیہات واستعارات، زیر دامان افق، دختر دوشیزۂ لیل ونہار، درود فصل انجم، کشت خاور اور آفتاب آئینہ کار، ستارے ڈوبنے کا عمل اور پو رکا پھٹنا، یعنی صبح کا نمودار ہونا، پوری نظم فطرت کی عکاسی پر ہے۔ شور کی نظم ''زہر خند'' ملاحظہ کیجیے ؎

پھوٹ کر جس میں سویرے کی کرن ڈوب گئی
خون ارباب وطن تھا مجھے معلوم نہ تھا
میرے سورج کا اجالا، میری صبحوں کا فروغ
میرے ماتھے کی شکن تھا، مجھے معلوم نہ تھا
سحر لالہ و نسرین و سمن کا انجام
ظلمت دشت و دمن تھا مجھے معلوم نہ تھا

(زہر خند) [۲]

شور کے ہاں اقبال کی سی تراکیب اور تشبیہات واستعارات، عمل عطف کے ذریعہ نئے معنی کی تلاش جو فن پر قدرت رکھنے کی علامت ہے مثلاً ''سحر لالہ و نسرین و سمن'' یہی وہ تراکیب لفظی ہے جو شور نے اقبال سے متاثر ہو کر نظم میں گراں بہا اضافہ کیا ہے۔ شور کی نظم ''زوال شاہی''، اقبال کی نظم ''گورستان شاہی'' سے متاثر ہو کر لکھی ہے، اقبال کی نظم کے دو شعر ملاحظہ کیجیے ؎

آسماں، بادل کا پہنے خرقہ دیرینہ ہے
کچھ مکدر سا جبین ماہ کا آئینہ ہے
چاندنی پھیکی ہے اس نظارۂ خاموش میں
صبح صادق سو رہی ہے رات کی آغوش میں

(گورستان شاہی)

۱۔ کلیات اقبال، ص ۲۳۴

۲۔ صلیب انقلاب، ص ۳۲۰

''گورستان شاہی'' اقبال کی طویل نظموں میں سے ہے۔ اسی طرح شوؔر ''زوال شاہی'' میں اقبال کے افکار و خیالات کی ترسیل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نظم ملاحظہ کیجئے ؂

حجاب چنگ ونے میں کتنے نغمے نا دمیدہ ہیں
ترے سینے میں اب بھی کتنی آہیں ناکشیدہ ہیں
جہاں کہرام میں میری و شاہی مسکراتی ہے
وہاں جمہور خود تابوت سلطانی اٹھاتی ہے
جہاں تاریک ہوں سورج فروغ کجکلاہی سے
وہاں ہر ناؤ ٹکراتی ہے، طوفان تباہی سے
فروزاں خون سے ہوتے ہیں جب قشقے جبینوں پر
چٹانیں ٹوٹ کر گرتی ہیں نازک آبگینوں پر
نئے سورج نئی صبحوں کے طوفاں لے کے آئیں گے
اجالوں کے تھپیڑوں میں اندھیرے ڈوب جائیں گے

(زوال شاہی)

حجاب چنگ ونے، نغمے نادمیدہ، کہرام میں میری شاہی، لاشوں کی چغلی، چٹانوں کا ٹوٹنا، ان تراکیب لفظی کی روشنی میں ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اقبالؔ کے اثرات شوؔر کی نظموں میں کثرت سے آتے ہیں۔ پروفیسر شور کی نظموں میں تاریخی پس منظر اور پیش منظر کے علاوہ ادبی رچاؤ اور فن پر گرفت، ترقی پسند ہونے کا اظہار، احساسات اور جذبات کی شاعری میں جو ادراک انسانی اقدار کے حوالے سے ہے، یہ شور کے اندر کے آدمی کا عکس ہے، اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ حال ہی کا نہیں مستقبل کا بھی شاعر ہے کیونکہ شوؔر کا ہاتھ کائنات کی نبض پر ہے۔

باب چہارم

اقبال کے بعد کے شعراء پر ان کے اثرات

اقبالؔ ایک ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک دبستان کی حیثیت بھی رکھتے تھے- ان کے فلسفے اور شاعری کو بین الاقوامی دانشوروں کے برابر رکھا جاسکتا ہے- اقبال نے انگلستان اور جرمنی کی اعلیٰ درسگاہوں میں تعلیم حاصل کی- مشرقی اور مغربی فلسفیوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا- اقبال وہ گنجینۂ علم ہیں، جنہیں ان کی شاعری میں دیکھا جاسکتا ہے- کیونکہ اقبال کی شاعری مجدّدانہ شاعری ہے- شاعری میں ''مردکامل'' اور ''زماں ومکاں'' کا جو تصور ہمیں ملتا ہے اس سے علم وعشق کی گتھیاں سلجھائی گئی ہیں- اقبال کا ذہنی اور تخیل کا افق اس قدر وسیع ہے کہ اس روشنی میں ہم اقبال کی فکر کا تعین کرسکتے ہیں- اقبال نے جس اسلوب کو اپنایا، وہ انفرادی طور پر ان ہی سے مخصوص ہے- انہوں نے خطابیہ اسلوب کو اپناتے ہوئے اپنے افکار ونگارشات کو عوام کے سامنے پیش کیا- ان کی زیادہ تر نظموں میں مخاطبہ پایا جاتا ہے، جیسے کسی سے ہمکلام ہیں مثلاً ''طفل شیر خوار''، ''حرف ندا''، ''شمع وشاعر''، ''والدہ مرحومہ''، ''بزم انجم''، ''شکوہ''، ''جواب شکوہ''- ان نظموں میں خطیبانہ اسلوب پایا جاتا ہے- اقبال کے اسلوب میں جو آہنگ ہمیں نظر آتا ہے، اس میں نغمگی اور موسیقیت پائی جاتی ہے- غزلوں میں غنائی، موسیقیت، خطابت اور لفظوں کا دروبست رمزیت کی طرف اشارہ کرتا ہے- اس رمزیت میں اسلوب جھانکتا ہوا نظر آتا ہے- اقبال کے سامنے کئی اسلوب پر پھیلائے بیٹھے تھے، اس کے باوجود انہوں نے خطابت کے اسلوب کو اپناتے ہوئے اپنی انفرادیت قائم کی اور وہ اس میں خاصے کامیاب ہوئے- پروفیسر عابد علی عابد اپنی کتاب ''اسلوب'' میں اقبال کے نظریہ کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''اقبال کے خیال میں عمل تخلیق کی شکل یہ ہے کہ فنکار جس عالم باطنی کو خارج میں متشکل کرنا چاہتا ہے، وہ پہلے اس کے ذہن میں پرافشاں ہوتا ہے، پھر فنکار فطرت کی مزاحمتوں سے معرکہ آرا ہو کر اپنی دنیائے باطنی کو فطرت کے علی الرغم صورت پذیر کرتا ہے- اس سلسلے میں فنکار کا خلوص، اس کی شخصیت کی دیانت وصیافت، اس کا ریاض یہ تمام اجزاء ایسے ہیں جو مل کر فن پارے کو عالم وجود میں لاتے ہیں-''[1]

اقبال نے جن فلسفیوں سے استفادہ کیا، ان کے نام درج ذیل ہیں:

افلاطون، ارسطو، مولانا رومؒ، امام رازی، امام غزالیؒ، امام ابن تیمیہؒ، ابن سینا، گوئٹے، ہیگل، برگساں، شوپنہار، نیٹشے اور بہت سے نام جن سے اقبال متاثر ہی نہیں بلکہ ان کے نقطۂ نظر اور فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا اور اسلامی نظریہ کے مطابق اپنی فکر کو اپنے مخصوص اسلوب کے ساتھ واضح کیا- اس کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر غور وفکر کے نمایاں پہلو نظر آتے ہیں- اقبال کی شاعری میں

۱- اسلوب، ص ۱۷

یاسیت اور قنوطیت جیسی چیزیں نام کو نہیں- شاعری میں جو اعتماد پایا جاتا ہے وہ ان کے جذبات، خیالات اور تصورات کا آئینہ دار ہے- ان کی شاعری میں زندگی اور کائنات کے سربستہ راز کا جو اظہار ہمیں ملتا ہے، اس کی ایک خاص وجہ تو یہ ہے کہ وہ تمام تر افکار اور فکر وفن کی بنیاد تصوف پر رکھتے ہیں- مولانا روم کو مرشد روحانی تسلیم کرتے ہوئے اس بات کا اظہار جس عقیدت سے شعر میں کیا ہے ملاحظہ کیجئے ؎

تو بھی ہے اسی قافلۂ شوق میں اقبال
جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومی

اقبال کی قلمرو میں ہمیں وہ تمام مضامین ہیں جو حیات سے شروع ہو کر کائنات پر ختم ہوتے ہیں- اگر ہم الگ الگ تجزیہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی سے متعلق کس قدر موضوعات ہیں جو توجہ طلب ہیں- ان پر کما حقہ اقبال نے اپنی جودت طبع سے اور اعلیٰ تخیل سے انہیں اوج کمال پر پہنچا دیا اور اگر ہم کائنات پر نظر ڈالتے ہیں تو مناظر فطرت اور حقیقت نگاری میں بھی اقبال نے کمال کر دکھایا- اقبال کی شاعری ایک ایسا مینارۂ نور ہے جس میں جذبات کی ترجمانی کے ساتھ فن اور صناعی بھی ملتی ہے، ان میں تراکیب لفظی، تلمیحات، تشبیہات واستعارات، علامت، حسیات وتخیلات اور عروض وبحر کا وہ لامتناہی سلسلہ ملتا ہے جسے ہم تنوع کہہ سکتے ہیں-

ڈاکٹر سید اختر اورینوی کی رائے کے مطابق کہ اقبال کے تجربات کی دنیا بہت وسیع ہے لکھتے ہیں:

''یہ تو اقبال کے عام طالب علم پر بھی ظاہر ہے کہ اقبال کے تجربات کی دنیا بہت وسیع ہے- وہ مناظر فطرت، انسانی سیرت، قومی کیفیت اور بین الاقوامی مسئلوں سے متاثر ہوا ہے- وہ انسانیت اور الوہیت کے تعلقات کا بھی راز داں ہے- غرض اس کی نظر زمین وزماں اور کون ومکاں پر محیط ہے-''[۱]

اقبال کی شاعری، فکر وفن، اسلوب اور فلسفہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعد کے شعراء کا متاثر ہونا لازمی امر تھا مثلاً جوش کی شاعری کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ جوش نے اپنی نظموں میں مذہبی رجحانات کے علاوہ مناظر فطرت اور ملی ووطنی شاعری میں اقبال کی فکر اور شاعری سے استفادہ کا شعور ملتا ہے- اقبال کا مخصوص اسلوب ''بانگ درا'' کی نظم ''خطاب بہ جوانان اسلام'' میں دیکھا جا سکتا ہے- اقبال کے اسلوب کی پہچان وہ تخاطب ہے جس میں تو اور میں کو واضح کیا ہے ؎

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاج سردارا

''خطاب بہ جوانان اسلام'' (بانگ درا)

جوش ملیح آبادی نے اپنی خطیبانہ شاعری کے متعلق ایک جگہ ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میں لڑکپن میں بلا کا سفلہ خو تھا- میرے مزاج کی یہی بنیادی سختی ہے جو میری سیاسی خطیبانہ شاعری میں تلخ وترش لہجہ بن کر آج بھی نمودار ہوتی ہے-''

مثلاً تخاطب کا یہ انداز ''حیف اے ہندوستان''، ''مقتل کانپور''، ''پیمان محکم''، ''شکست زنداں کا خواب''، سیاسی اور

۱- اقبال، ص ۳۹

انقلابی نظموں میں اقبال کے اسلوب کو دیکھا جا سکتا ہے۔

جوش کی ایک انقلابی نظم ملاحظہ کیجئے جس میں اقبال کے اسلوب کی نشاندہی ہوتی ہے ؎

اٹھ کھڑے ہوں آؤ تکمیل عبادت کے لئے اک نیا نقشہ بنائیں آدمیت کے لئے
آ رہا ہے تازہ وارث عالم ایجاد کا جلد تر اعلان کر دو اک نئے میلاد کا

جوش کی شاعری میں رعب، دبدبہ، گھن گرج، حسن و عشق کے معرکے، زمین و زماں کے حکایتیں، وطن سے محبت، انگریزوں سے نفرت وغیرہ موضوعات کثرت سے پائے جاتے ہیں ؎

ہاں بغاوت! آگ، بجلی، موت، آندھی میرا نام
میرے گرد و پیش اجل، میری جلو میں قتل عام
کنگرے ایوان شاہی کے جھکا دیتی ہوں میں
جبر و استبداد کی چولیں ہلا دیتی ہوں میں

جوش کا حسن بیان اور شاعرانہ تخیل اس کے علاوہ جذبات کی عکاسی اور فطرت کی مصوری میں ''سہاگن بیوہ''، ''فتنۂ خانقاہ''، ''البیلی صبح''، ''کوہستان دکن کی عورت'' وغیرہ نظموں پر اقبال کے اسلوب کی چھاپ نظر آتی ہے مثلاً ''البیلی صبح'' کے یہ شعر دیکھئے ؎

ستارۂ صبح کی رسیلی جھپکی آنکھوں میں ہیں فسانے
نگار مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے
کلی پہ بیلے کی کس ادا سے پڑا ہے شبنم کا ایک موتی
نہیں، یہ ہیرے کی کیل پہنے کوئی پری مسکرا رہی ہے
فلک پہ اس طرح چھپ رہے ہیں، ہلال کے گرد و پیش تارے
کہ جیسے کوئی نئی نویلی، جبیں سے افشاں چھڑا رہی ہے

(البیلی صبح)

یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ جوش نے نظم کو اپنا کر اس میں موضوعات اور اسالیب سے بے پناہ اضافہ کیا ہے، ان کی شاعری کسی ایک رخ پر نہیں بہتی بلکہ مختلف پہلو نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ یہ اقبال کے افکار و خیالات کا فیض تھا کہ اکثر شعراء نے ان کی فکر، اسلوب اور فلسفے سے نئے رجحانات اور نئی جہتوں کا سراغ لگایا کیونکہ اقبال ایک دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس دبستان کے اثرات اس قدر گہرے ہیں کہ اقبال سے پہلے کی شاعری میں تلاش کرنا کارعبث ہے۔ اقبال ایک فلسفی، مفکر اور قومی شاعر کی حیثیت سے مشخص ہو چکے تھے۔ مغربی علوم سے واقفیت اور اسلامی فکر اور نظریات کے مطالعے سے ان کے ذہنی افق میں جو تابنا کی اور روشن خیالی پائی جاتی ہے، وہ ان کا تحقیقی ذوق تھا، جس سے شعر و ادب کی مستحکم عمارت تعمیر ہوئی۔ اس عمارت کے ستون چکبست، حسرت، جوش، فراق، ظفر علی خاں، ان کے علاوہ جدید شعراء ان میں ندیم قاسمی، فیض، مجاز، جاں نثار اختر، اختر الایمان، پروفیسر شور، ساحر اور بہت سے نام ان سب نے احساسات اور آہنگ کے امتزاج سے نظم میں جو اسلوب ہمیں دیا ہے، وہی اسلوب اقبال کی دین ہے۔ اختر شیرانی اور عظمت اللہ خان نے عشقیہ شاعری میں خاصہ اضافہ کیا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ان کے متعلق لکھتے ہیں:

''اس عشقیہ رجحان کو نئے نئے رنگوں سے آراستہ و پیراستہ کرنے میں دو نام

خاص طور پر سامنے آتے ہیں- ایک تو عظمت اللہ خان اور دوسرے اختر شیرانی اردو
شاعری کے عشقیہ رجحان کو نئے راستوں پر چلانے میں وہ خصوصیت کے ساتھ اہمیت
رکھتے ہیں-عظمت اللہ خاں نے اردو کی عشقیہ شاعری میں بھاشا کی شاعری کا رنگ
دیا- ان کی نظموں میں اظہارِ عشق عورت کی طرف سے ملتا ہے اور اس سلسلے میں جو کچھ
وہ کہتے ہیں اس میں ہندوستانیت ہوتی ہے-''[۱]

اقبال نے نظم میں جو موضوعات اور جداگانہ اسلوب متعارف کرایا ہے، اس عمل سے نظم میں وسعت پیدا ہوگئی- معاصرین اور بعد کے شعراء کا راستہ شعری اسلوب کے حوالے سے خاصہ ہموار ہوگیا- اگر ہم اقبال کے اسلوب کا غائر نظر سے مطالعہ کریں تو ان کی نظمیں حکمت کے وہ موتی ہیں جنہیں غور وفکر کے ذریعہ حل کرنا پڑے گا مثلاً ''چاند اور تارے''، ''موٹر''، ''آفتاب صبح''، ''انسان اور بزم قدرت''، ''کنار راوی''، ''طفل شیر خوار'' ان کے علاوہ اور بھی نظمیں ہیں جو اس زمرے میں آتی ہیں-

اقبال کے نظریات وخیالات کو عالمی سطح پر سراہا گیا ہے- اس کی ایک خاص وجہ تو یہ ہے کہ انہوں نے فارسی اور انگریزی زبان میں جو تصنیفات تحریر کی ہیں وہی ان کی وجہ شہرت ہے ''فلسفۂ عجم'' اور ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' ہی سے مغربی مفکرین کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوئے- اقبال نے کسی ایک پلیٹ فارم سے اپنے آپ کو ظاہر نہیں کیا- ان کے ہاں فکر کی مختلف جہتیں پائی جاتی ہیں- یہی وہ آفاقی پھیلاؤ ہے جہاں معاصرین اور بعد کے شعراء نے اقبال کی شاعری کی طرف رخ کیا- ان کے فکر وفلسفہ، جدید آہنگ اور مخصوص اسلوب سے استفادہ کیا- ڈاکٹر فرمان فتح پوری اقبال کی وسعت فکر کا اندازہ لگاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انہوں نے اردو شاعری کو انسان کی حقیقی زندگی اور اس کے مسائل سے ہمکنار
کر کے تامل وتفکر کے عناصر سے ہم آہنگ کیا- سچے جذبوں، روحانی قدروں اور
حیات افروز خیالات کو جگہ دے کر اس کے لہجہ کو پر وقار اور محترم بنایا- مغرب سے وہی
چیزیں اخذ کیں جن کی ضرورت تھی اور جو انسانی مسائل کے حل میں معاون ہوسکتی
تھیں- زندگی کے بارے میں منفی رجحانات کو ترک کر کے مثبت رجحان کو جگہ دی اور
ادب کو زندگی سے اس طرح ہم رشتہ کر دیا کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن
نہ رہا- ہیئت میں بھی وہ لکیر کے فقیر نہ رہے بلکہ مغرب کے زیر اثر نظموں کے ڈھانچوں
میں نئی نئی تبدیلیاں کیں-''[۲]

یہ ایک ایسی سچائی ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اقبال نے ایک طرف تو اپنے معاصرین کو متاثر کیا تو دوسری طرف مغربی مفکرین کو اپنی مشہور زمانہ تصنیف ''اسرار خودی''، جس کی اشاعت ۱۹۱۵ء میں ہوئی، پورے یورپ کو اپنے خیالات اور نظریات سے آگاہ کیا یعنی ہر مکتبۂ فکر کا ہر وہ شخص اقبال سے متاثر دکھائی دیتا ہے کیونکہ اقبال کے فکر وفن اور اسلوب کی بنیادیں اس قدر مستحکم ہیں کہ انہیں وقت کی آندھی بھی ہلا نہیں سکتی- اقبال کے معاصرین اور بعد کے شعراء نے ان اثرات کا کھل کر اعتراف کیا ہے-

---

۱- جدید شاعری، ص ۷۷

۲- نگار، نومبر- دسمبر، ص ۲۲۱

نظم میں نئے اسالیب اور ہیئت کے تجربے:

اسالیب اور ہیئت کے اعتبار سے علامہ اقبال کے افکار خاصے متنوع نظر آتے ہیں۔ اردو شاعری میں اقبال نے جو اضافے کیے ہیں اس میں اسلام کے حوالے سے مابعد الطبیعات کا ایک مستحکم اور جامع نظام ملتا ہے۔ اقبال کے بعد کے شعراء پر یہ لازم ہو گیا ہے کہ وہ انفرادی طور پر ان کے افکار و خیالات سے گریز کرتے ہوئے اپنی نگارشات کی پرورش کریں۔ کیونکہ اقبال کے افکار نے اردو ادب اور شاعری کے کینوس میں جو اضافہ کیا ہے، اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اپنے عہد میں ان کے نقوش اور اثرات جو بعد کے شعراء میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں، ایک مذاکرہ کی بحث میں سے یہ اقتباس دیکھئے:

> ''اقبال کے افکار نے ان کے اپنے عہد کے اردو ادب پر بھی گہرے نقوش مرتسم کیے اور بعد کے ادوار میں لکھے جانے والے شعر و ادب کو بھی بھرپور تاثیر عطا کی۔ ان کی شاعری میں موجود شکوہ الفاظ اور ارتقائی معنویت کی جھلکیاں ہمیں ان کے معاصرین کے اشعار میں بھی نظر آتی ہیں اور بعد کے شعراء پر بھی۔ اردو نظم کو انہوں نے جو تعقلاتی رجحان بخشا اس کے اثرات بھی اقبال کے بعد کی شاعری میں دیکھے جا سکتے ہیں۔'' [۱]

ترقی پسند شاعری مین اس کی واضح مثالیں ملتی ہیں۔ خارجی دنیا کی تبدیلی میں اقبال نے جو کارہائے نمایاں خدمات انجام دیں۔ اس کی اس دین کو ردعمل ہی کہا جا سکتا ہے۔ اقبال کے خیالات کی بازگشت ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق دونوں میں دیکھی جا سکتی ہیں کیونکہ اردو نظم میں جو ارتقائی عمل نظر آتا ہے اس میں بھی اقبال ہی کے اثرات نظر آتے ہیں لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ طے شدہ ہے کہ ترقی پسند رجحانات پر اقبال کے اثرات کم اور حلقہ ارباب ذوق میں زیادہ نظر آتے ہیں کیونکہ موخر الذکر نے شاعری میں جو تجربات کیے ہیں، اس سے اقبال کی مماثلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حلقہ ارباب ذوق کا مطمع نظر جمالیاتی حسیات پر زیادہ تھا، ڈاکٹر سلیم اختر کا کہنا یہ ہے:

> ''علامہ اقبال کے اثرات کی دو جہات ہیں۔ ایک اسالیب پر اور دوسرے افکار پر۔ علامہ اقبال نے اپنے بعض خطوں میں اس امر پر زور دیا ہے کہ اردو شاعری کے کلاسیکی مزاج کو اس حالت میں قائم رہنا چاہئے۔ ان کے دور میں جو نظم معریٰ کے تجربے ہوئے ان پر انہوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ ان کی شاعری میں افکار کے حوالے سے کلاسیکی مزاج سے بغاوت کا انداز ہے۔ شاعری کے ڈکشن میں ہونے والے جدید تجربات علامہ اقبال کے اسلوب سے براہ راست متصادم تھے۔ ہیئت کے میدانوں میں تجربے کرنے والے شاعروں کو اس میدان میں علامہ اقبال سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے، اقبال کے ہاں اسلام کے حوالے سے مابعد الطبعیات کا ایک خاص نظام ملتا ہے اور اس نظام کی انہوں نے جو فلسفیانہ تشکیل کی وہ اپنی جگہ پر بہت بڑا کارنامہ ہے۔'' [۲]

۱۔ صحیفہ۔ جنوری، مارچ، ص ۲

۲۔ صحیفہ۔ جنوری، مارچ، ص ۵

اقبال کے ہاں اسلوب اور ہیئت کے اعتبار سے بھی ایک نیا آہنگ اور نیا ڈکشن نظر آتا ہے- اس میں تشبیہات و استعارات، صنائع و بدائع، تلمیحات، طرز احساس، عقل وعشق کے معرکے، سیاسی و اخلاقی افکار، انسانی ہمدردی اور مذہب پر جونظمیں ہمیں ملتی ہیں وہ اسلوب اور ہیئت کے بہترین نمونے ہیں-

نظم میں نئے اسالیب روشناس کرانے والے حالی اور آزاد ہی تھے- مروجہ اسالیب کی تاریخ ۱۸۵۷ء پر آ کر ختم ہو جاتی ہے اور یہیں سے جدید اردو شاعری کا آغاز ہوتا ہے- اس میں سرسید اور ان کے رفقائے کار نے گرانقدر اضافہ کیا- یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ اسالیب وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں اگر ہم اردو شاعری میں اسالیب کا بہ نظر غائر مطالعہ کریں تو ان میں خطیبانہ، بیانیہ، رومانی، نثری، طنزیہ اور علامتی اسلوب کی کثرت پائی جاتی ہے- مقصدی شاعری میں دو اسلوب واضح صورت میں سامنے آئے- ایک تو خطیبانہ اور دوسرے بیانیہ، یہی وہ دو اسلوب ہیں جو شاعری میں وعظ و نصیحت اور براہ راست خطاب کو اہمیت دی- ایک ایسا اسلوب اختیار کیا جس میں سادگی، روانی اور افادیت کو پیش نظر رکھا گیا-

اکبرالہ آبادی نے طنزیہ اسلوب اختیار کرتے ہوئے معاشرتی برائیوں کو اپنے خاص طرز میں ادا کرنے کی کوشش کی- محاورے اور ضرب المثال کی کثرت سے بھی شاعری کو نیا اسلوب دیا- طنز و مزاح میں انگریزی کا استعمال مغرب کا مضحکہ اڑانے کے لئے تھا- اقبال اور ظفرعلی خاں کے ہاں بھی نظموں میں اکبر کے اسلوب کا تتبع ملتا ہے- اس کی واضح مثال ''مخزن'' اور دلگداز کے پرچے ہیں- ہندی اسلوب کو صرف عظمت اللہ خاں نے اختیار کیا- یہی اسلوب گیتوں میں کثرت کے ساتھ ملتا ہے مثلاً حفیظ جالندھری، افسر میرٹھی، آرزو لکھنوی کی ''سریلی بانسری'' اس بات کی شاہد ہے-

اقبال کے ہاں زور خطابت عروج پر نظر آتا ہے- اقبال رمزیت کا شاعر ہے- ان کی شاعری میں کلاسیکی اور جمالیاتی اسلوب کا جو انداز ہمیں ملتا ہے- ان دو اسلوب سے مل کر ایک نیا اسلوب تخلیق ہوا، وہی اقبال کا اسلوب ہے- ڈاکٹر ساجد امجد اقبال کے اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''رومانی ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی زبان کو پرشکوہ الفاظ اور خوبصورت تشبیہات سے سنوارتے ہیں، جس سے ان کے اسلوب میں ایک لطافت پیدا ہوتی ہے جو معنوی حسن سے مل کر شان دلربائی پیدا کرتی ہے- اقبال تشبیہوں کا بادشاہ ہے اور تشبیہہ حسن کلام کا زیور ہے- وہ مضمون کی طرفگی اور حسن کو اپنی تشبیہوں سے دوبالا کر دیتا ہے- اقبال کے اسلوب کی ایک اہم صفت اس کا آہنگ ہے اس نے ایسی بحریں استعمال کی ہیں- الفاظ کی دروبست ایسی ہے جو موسیقیت اور لحن پیدا کرتی ہے، نغمگی کا وافر حصہ اقبال کے حصہ میں آیا ہے- اقبال ایک خطیب ہے اور اس کا اسلوب خطیبانہ، لہذا خطابت کی بلند آہنگی اس اسلوب کی شاید سب سے اہم صفت ہے-'' [۱]

اقبال کے اسلوب سے بعد کے شعراء نے بھرپور استفادہ کیا مثلاً سردار جعفری، ندیم قاسمی، فیض، جوش، کیفی اعظمی، ضیاء جالندھری اس فہرست میں مزید شعراء کے نام لئے جاسکتے ہیں- اسلوب کے اس بدلتے ہوئے رجحان کو پیش نظر رکھتے ہوئے نثری اسلوب کو بھی فراموش نہیں کر سکتے- آزاد نظم کا جو طرز خاص ہے، وہ نثری ادب سے زیادہ قریب ہے- اس اسلوب کو یورپ کا ردعمل ہی کہہ سکتے ہیں- اس اسلوب میں میراجی، تصدق حسین خالد، دین محمد تاثیر، فیض احمد فیض، ن-م- راشد وغیرہ- ان کے علاوہ قیوم

۱- اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، ص ۲۸۴

نظر، یوسف ظفر اور مختار صدیقی کے ہاں اس اسلوب کو دیکھا جا سکتا ہے- یہ سب وقت کے ساتھ بدلتے ہوئے اسلوب اور ہیئت کا مختصر جائزہ تھا-

اقبال کی فکر کے اثرات شعراء پر:

اقبال سے پہلے کی شاعری میں ہمیں وہ آفاقیت نظر نہیں آتی- اٹھارویں اور انیسویں صدی میں طرز خاص اپنایا ہوا تھا- اظہار بیان کے لئے غزل، مثنوی اور قصیدہ یا پھر رباعیات میں خاصہ مواد شعراء نے فراہم کر دیا، جسے ہم کلاسیکی ادب سے تعبیر کرتے ہیں- لیکن بیسویں صدی میں اقبال نے اپنی شاعری سے شاعری میں ایک انقلاب برپا کر دیا- مفکر اور فلسفی ہونے کے ساتھ وہ قدیم اور جدید علوم کے شناور بھی تھے- ذہنی ترقی اور تخیل کی بلند پروازی سے شعر و ادب میں جو اضافہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے- اس شعری تخلیق میں اقبال نے زبان کو اپنی فکر سے جو آہنگ دیا ہے، اس میں زبان و اسالیب، فطرت کی عکاسی، حقیقت نگاری، قومی و ملی احساس، تاریخی و مذہبی میلانات، صنائع بدائع، جمالیاتی طرز اور عشق و محبت، غرض اقبال ایک ہمہ جہت ہونے کے ساتھ ان کی فکری قوت آفاقیت کے اس مقام پر نظر آتی ہے جہاں ان کا مد مقابل کوئی نہیں- ان کے ہاں انسان کامل کا جو تصور ملتا ہے، اس سے ان کی دلبستگی، وارفتگی اور آدم کا عروج پیش نظر رہتا ہے- ان کا پیغام عالمگیر انسانیت کے لئے ہے، ان کے فکر اور فلسفے میں یہ بات طے ہے کہ مسلمانوں کی بدحالی اور پستی سے مایوس نہیں بلکہ ایک لائحہ عمل اور ایک ایسا خاکہ دینے میں شب و روز ایک کر دیئے- اقبال نے اپنی فکر سے اور اپنے خاص اسلوب سے ظلمت کے سینے سے سورج نکال کر عالم کو منور کر دیا-

''بانگ درا'' کی پہلے دور کی نظمیں جو حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر لکھی گئیں، اس بات کی آئینہ دار ہیں مثلاً ''ہمالہ''، ''تصویر درد''، ''صدائے درد''، ''نالۂ یتیم''، ''نیا شوالہ'' یہ وہ نظمیں ہیں جو انجمن حمایت اسلام میں پڑھی گئیں- یورپ سے واپسی پر اقبال نے فکر اور فلسفہ کے اعتبار سے ''اسرار خودی'' کا تحفہ دیا- اقبال کی فکر کے اثرات ان کے معاصرین سرور جہاں آبادی، نادر کاکوروی، چکبست، حفیظ و جوش کی شاعری میں دیکھے جا سکتے ہیں- اقبال نے ہر زاویے سے شعراء کو اپنی طرف متوجہ کیا- اردو شاعری پر اقبال کے اثرات کے بارے میں سراج منیر کی رائے ہے:

> ''بعض شاعروں کے کلام کو دیکھ کر اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان دنوں اردو میں اقبال کے خیالات کی نئے سرے سے بازگشت سنائی دینے لگی ہے- اقبال کا شعری اور نثری کلام جس تاریخی شعور سے پھوٹا، اگر وہ شعور یا وہ آرزو کسی شاعر کے کلام میں نظر آ جائے تو ہم کہیں گے کہ اس پر اقبال کا اثر ہے- اقبال مسلم تاریخ کے دھارے کو عروج پر لے جانے کی آرزو میں وارفتہ اور سرشار ہو کر شعر کہہ رہے تھے- آج جدید اردو نظم کا روایتی ریڈیم کی جانب جو رجحان ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں جو ایک وارفتگی کی کیفیت نظر آ رہی ہے، اسے ہم اقبال کا جزوی اثر بھی کہہ سکتے ہیں-''[۱]

اقبال نے اپنی فکر اور شاعری سے متاثر ہی نہیں کیا بلکہ ان میں ایک نئی روح بھی پھونکی ہے جسے بیداری کا نام دیا جاتا ہے اور یہ بیداری خودی کے ذریعہ ممکن ہے- مرد مومن کا تصور جب ہی اجاگر ہوتا ہے، جب انسان کی خودی بیدار ہو- اقبال کا تمام زور

۱- صحیفہ- جنوری، مارچ، ص۳

خودی پر رہا، وہ اس لئے کہ اس جذبے سے قومیں مستحکم ہوتی ہیں۔ اخلاقی قدریں پروان چڑھتی ہیں۔ ملک وملت میں وہ نظام رائج ہوتا ہے جس میں مساوات اور اشتراکِ عمل پایا جاتا ہو۔ ڈاکٹر محمد حسن فلسفۂ خودی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اقبال نے مشرق ومغرب کے اشتراکِ عمل کی بنیاد فلسفۂ خودی کو قرار دیا ہے۔ عالمگیر آرزومندی اور ان آرزوؤں کے حاصل کرنے کی کوشش کرنا ہی زندگی کا مقصد ہے۔ یہ آرزوئیں اور یہ خودی تخریبی بھی ہوسکتی ہیں، جو سماج اور عام انسانوں کے مفاد کے خلاف ہو اور تعمیری بھی ہوسکتی ہے جو ملت کے مفاد کو آگے بڑھا سکے اور خود ارتقاء کے سلسلے میں مدد کر سکے۔ اقبال کے نزدیک وہی خودی مکمل ہے جو آرزومندی اور عمل سے شروع ہوتی ہے اور اپنے آپ کو ملت کے تابع کر دیتی ہے۔ یہ ان کی مردِ مومن کی تصویر ہے۔ مشرق آرزومندی اور حرکت سے ناآشنا ہے، مغرب ملت کی اطاعت اور عشق سے محروم ہے۔ اگر انسانیت عشق وعقل، عمل اور تنظیم، خودی اور اطاعت کے ان جوہروں سے آشنا ہو جائے تبھی وہ اپنی منزل تک پہنچتی ہے۔''[۱]

اقبال کے موضوعات اتنے ہمہ گیر ہیں، ان سے نظر بچا کر نہیں گزرا جا سکتا مثال کے طور پر اقبال کی نظم ''خضرِ راہ'' ہی کو دیکھ لیجئے، اس میں انہوں نے خضر کی زبان سے حقیقت کی ترجمانی کی ہے۔ اس نظم میں ''زندگی'' کی اہمیت اور اس کی مقصدیت، ''سلطنت'' میں مغربی جمہوریت کا تانا بانا ملتا ہے۔ ''سرمایہ ومحنت'' میں ایک ایسی تنقید ملتی ہے جو سرمایہ داراوں اور جاگیرداروں کے خلاف ہے۔ غرض ایسے بہت سے موضوعات شاعری میں فن وآرٹ کے اعتبار سے بھی اقبال کے ہاں ایک اعتبار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال کے انہی افکار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے دیگر شعراء کے ہاں جو اثرات مرتب ہوئے، یا بعد کے شعراء میں اقبال کی فکر کی بازگشت نظر آتی ہے، وہ اقبال کی مرہونِ منت ہے۔

رسالہ ''سوغات'' میں ن۔م۔ راشد نے اپنے مضمون ''ہیئت کی تلاش میں'' نئے فکری رجحانات کا سراغ لگایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ہماری شاعری پرانی روایت سے بالکل آزاد ہو چکی ہے کیونکہ ابھی تک نہ صرف غزل باقی ہے بلکہ جدید تجربات کے خلاف تعصب کا زور بھی کم نہیں ہوا۔ خود ان نئے تجربوں نے ابھی اپنی حیثیت پورے طور پر قائم نہیں کی لیکن ان تجربوں کا اثر یہ ضرور ہوا ہے کہ ہماری شاعری کا پرانا جمود ٹوٹ گیا ہے۔ شاعری میں ایک نئی لچک، ایک نئی حرکت پیدا ہو رہی ہے۔ اس لچک اور اس حرکت نے ہماری شاعری میں نئے خیالات اور تاثرات کو ہضم کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی ہے اور شاعری کے وہ زیورات جو اس کے زوال کی دلیل تھے، کم ہو گئے ہیں۔ نئی نظموں میں تسلسل، جامعیت اور وحدت زیادہ نظر آتی ہے۔ جن پرانے استعاروں اور کنایوں کے ہم سالہا سال سے عادی تھے، وہ اب اپنا روپ بدل رہے ہیں۔''[۲]

۱۔ ادبی تنقید، ص ۱۷۰

۲۔ سوغات۔ جدید نظم نمبر، ص ۱۷۰

شاعری میں یہ رنگارنگی اور رعنائی دراصل اقبال کی فکر ہی سے دیگر شعراء کے ہاں منتقل ہوئی - اقبال کی فکر کے بنیادی عنصر یا ستون، جس سے شاعری کی عمارت مزین ہے، اس میں فطرت، مذہب، انسانیت اخلاق اور سیاست یہ تمام چیزیں تصورِ حیات کی غمازی کرتی ہیں- اقبال کے انہی افکار پر ڈاکٹر یوسف حسین خاں رقمطراز ہیں:

''انسانیت کی فلاح اس میں ہے کہ دین و دنیا اور اخلاق و سیاست ساتھ ساتھ رہیں اور قوت و جبروت اور فقر و انکسار ہمرکاب ہوں- جنیدی و اردشیری کے امتزاج ہی سے ایسا نظامِ فکر و عمل وجود میں آ سکتا ہے جس سے انسانیت اپنی تقدیر کی تکمیل کرے، جدید تمدن کی سیاست ایک دیوِ بے زنجیر ہے کہ جدھر رخ کرتا ہے، اپنے جلو میں تباہ کاریاں چھوڑ جاتا ہے-''[۱]

نئی نظم کے سفر میں راشد کے ساتھ میرا جی اور فیض نے برابر کا ساتھ دیا- فیض ان دونوں سے الگ مزاج رکھتے ہیں جبکہ اسلوب، جذبہ اور خیال کو یوسف ظفر، قیوم نظر نے آگے بڑھایا ہے- قیوم نظر کی فکر میں اقبال کے نظریات کی آمیزش ملاحظہ ہو ؎

عشق کی حقیقت کو خون دل سے لکھ ڈالو
تم نے ہنس کے چاہا تھا میں غلط نہ سمجھا تھا
زیست کے بیاباں میں اب ہوں جیسے دیوانہ
جس کے رشتۂ جاں میں خشک روشنائی کا
رنج نارسائی کا منضبط ہو افسانہ

(المیہ)

بلراج کومل کا مضمون ''شاعری میں علامتوں کا مسئلہ'' میں استعارے، علامتیں اور جذباتی کیفیت کا جو اظہار ہے، وہی جدید شعراء کا فخر و امتیاز ہے- علامتی شاعری پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علامتی شاعر اختصار پسند ہے بلکہ وہ مختصر نظم کہنے پر مجبور ہے- براہ راست بیان میں بات عام طور پر پھیل جاتی ہے- علامتی انداز میں سمٹ جاتی ہے- صحیح علامت ایک ہی مصرع میں وہ کام کر جاتی ہے جو براہ راست بیان کے ذریعے شاعر ان گنت مصرعوں میں کرتا ہے لیکن یہ کام اس قدر آسان نہیں ہے جس قدر آسان یہ بظاہر دکھائی دیتا ہے- اختصار اور طوالت اضافی اصطلاحات ہیں- اگر کسی نظم کو دس مصرعوں کی ضرورت ہے اور اسے سو مصرعوں میں لکھا جائے تو اسے ناکام نظم کہیں گے اور اگر کسی نظم کو سو مصرعوں کی ضرورت ہے اور اسے دس مصرعوں میں کہا جائے تو یہ نظم بھی ناکام کہلائے گی- اختصار اور طوالت کی اصطلاحات کو مطلق اصطلاحات سمجھنا غلط ہوگا- اختصار پسندوں کی نظمیں جملے بازی کی سطح سے اوپر اٹھنے سے قاصر رہتی ہیں- کچھ پہیلیاں بن جاتی ہیں اور کچھ معمے اور کچھ الفاظ کی قلابازیاں- شاعری کا مقصد محض

۱- روحِ اقبال، ص ۱۷۲

الفاظ کے خاکے پیش کرنا نہیں ہے بلکہ شاعر کے تجربات کو پیش کرنا ہے اور چونکہ شاعر
کے تجربات کا تعلق براہ راست زندگی سے ہے۔''[۱]

اقبال کے فکری نظام میں اختصار کی جو نظمیں ہمیں ملتی ہیں، وہ ''ضرب کلیم'' کی مربوط نظمیں ہیں مثلاً ''خودی کی تربیت''، ''آزادی فکر''، ''خودی کی زندگی''، ''حکومت''، تربیت''، ''مرگ خودی''، ''عصر حاضر''، ''مہمان عزیز''، ''طالب علم''، ''امتحان''، ''اقوام مشرق''، ''مغربی تہذیب''، ''مصلحین مشرق''، ''ضرب کلیم'' کی یہ وہ نظمیں ہیں جن میں ایک فکری نظام کے ساتھ بھرپور علامتوں اور تشبیہات واستعارات کا نادر استعمال بھی ملتا ہے۔ ان مختصر نظموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر نظم اپنی جگہ مکمل ہے اور یہی فن اختصار کی جان ہے۔ اس فکر کو آگے بڑھانے میں جدید شعراء نے اقبال سے کسب فیض کیا ہے۔ چند جدید شعراء پر اقبال کے فنی وفکری اثرات کا جائزہ ملاحظہ کیجئے:

افسر آذری:

افسر آذری نے نظم نگاری میں جو اسلوب اور ہیئت کے تجربے کئے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ جو اسلوب اور فکر ''بانگ درا'' کی نظم ''ارتقاء'' میں نظر آتا ہے، وہی اسلوب افسر کی نظم ''بحران'' میں ظاہر ہوا ہے۔ اقبال کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی
اسی کشاکش پیہم سے زندہ ہیں اقوام — یہی ہے راز تب و تاب ملت عربی

(بانگ درا)

افسر آذری کی نظم کے چند شعر بطور نمونہ ملاحظہ کیجئے ؎

مری محبوب! مرے ہوش ٹھکانے ہیں ہنوز — جسم بیمار سہی ذہن تو بیمار نہیں
ترے پتھر کے خداؤں سے مجھے کیا لینا — میری ہستی کسی رحمت کی طلب گار نہیں
کوئی سیلاب بہا کر نہیں لے جاسکتا — کہ مرا عزم جواں ریت کی دیوار نہیں
میرے امروز کی رعنائی کو حاصل ہے دوام — میں کسی وعدۂ فردا کا خریدار نہیں

(بحران)

افسر آذری کی نظم ''ظلمت سے سویرا پھوٹے گا'' کی ہیئت اور اسلوب کا آہنگ اقبال کی نظم ''زمانہ'' میں ہے۔ رنگ و آہنگ کے اعتبار سے اور فکری میلانات سے بھی بلند پایہ نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ اقبال کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرف محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ
مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

(بال جبریل) زمانہ

۱۔ ادبی دنیا، خاص نمبر، ص ۲۲۳

افسر آذری کی نظم ملاحظہ کیجئے ؎

ظلمت سے سویرا پھوٹے گا، پستی سے ابھارے ابھریں گے
کچھ اور امیدیں ٹوٹیں گی، کچھ ادر سہارے ابھریں گے
کشتی کی طلب کیسی ساتھی؟ ملاح سے کیا لینا ہے ہمیں
موجوں کے بھروسے ڈوبے ہیں طوفاں کے سہارے ابھریں گے
ان مردہ مردہ روحوں پر صدیوں سے غلامی چھائی ہے
اے دوست! انہیں جھنجھوڑ ذرا یہ لوگ ابھارے ابھریں گے

(ظلمت سے سویرا پھوٹے گا)

راجہ مہدی علی خاں:

راجہ مہدی علی خاں کی نظم نگاری میں جو بات ابھر کر آئی ہے، وہ یہ کہ عام رجحانات سے ہٹ کر نظم میں نئی فضا قائم کی ہے۔ انہوں نے قدیم رنگ اور اسلوب کو نئے زاویے سے برتا ہے۔ ان کی نظموں میں مسرت آمیز رجحان کو فروغ ہوا ہے۔ ان کا خاص موضوع محبت ہے۔ مرد اور عورت کی کہانی پر جس چابکدستی سے راجہ صاحب نے نظمیں کہی ہیں، ان سے پہلے اقبال ضرب کلیم میں ''عورت'' کے عنوان سے کئی نظمیں کہہ چکے ہیں۔ ''عورت کی حفاظت''، ''عورت اور تعلیم''، اقبال اپنی نظم ''عورت'' میں کہتے ہیں ؎

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

(عورت)

راجہ مہدی علی خاں کی نظموں کے عنوان ملاحظہ ہوں ''بنت عم''، ''نگوڑا''، ''بھائی بہن''، ''دستک نیم شب''، ''جلال زادہ''، ''بیوی کی سہیلیاں''، ''اس سے اور اسی سے''، ''ایک چہلم''، ان نظموں میں مزاح کے ساتھ ایک وارفتگی اور شوخی ملتی ہے، جو نظموں کی جان ہے ؎

کھٹکھٹاتا ہوں بہت دیر سے، دروازہ کھول
اے مری روٹھی ہوئی بیوی ذرا منہ سے بول
شک نہ کر مجھ پہ مری جان سے پیاری ممتاز
پڑھ رہا تھا کسی مسجد میں تہجد کی نماز
ایک ہی صف میں کھڑے تھے وہاں محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ وہاں تھا نہ کوئی بندہ نواز

(دستک نیم شب)

راجہ مہدی کی ایک اور نظم جس میں مضحکہ خیزی اپنے عروج پر ہے ؎

آئی جو ایک، اور بھی آتی چلی گئیں
چھوٹے سے ایک گھر میں سماتی چلی گئیں

بچوں کی فوج لے کے ہوئیں گھر پہ حملہ زن
ہم دشمنوں کے ہوش اڑاتی چلی گئیں

غنچہ دہن اگلتے رہے دودھ بار بار
یہ بار بار دودھ پلاتی چلی گئیں

(بیوی کی سہیلیاں)

ظریفؔ جبلپوری:

اردو شاعری میں ظرافت نگاری اکبرالہ آبادی کے دم سے تھی لیکن اقبالؔ نے ''بانگ درا'' کے آخری حصہ میں ظریفانہ کلام کہہ کر سنت اکبرادا کی ہے۔ ان کے اس ظریفانہ کلام سے چند شعراء میں جو تحریک پیدا ہوئی ان میں ظریفؔ جبلپوری ایک اہم نام ہے، نمونے کے طور پر اقبال کا ظریفانہ کلام ملاحظہ کیجئے ۔

مشرق میں اصول دین بن جاتے ہیں مغرب میں مشین بن جاتے ہیں
رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلّے واں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مدنظر وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ

ناداں تھے اس قدر کہ نہ جانی عرب کی قدر حاصل ہوا یہی، نہ بچے مار پیٹ سے
مغرب میں ہے جہاز بیاباں شتر کا نام ترکوں نے کام کچھ نہ لیا اس فلیٹ سے

ظریفانہ شاعری کا تانا بانا دراصل مغربی ادب میں یونان سے ملتا ہے۔ درحقیقت ظریفانہ شاعری اس بات کا اظہار ہے کہ اس سے اجتماعی، انفرادی اصلاح درکار ہوتی ہے۔ ظریف جبلپوری نے اپنی نظموں میں اسی بات کو ملحوظ رکھا ہے۔ اپنے مجموعۂ کلام ''تلافی مافات'' میں اقبال کے اسلوب اور ہیئت میں نظمیں کہی ہیں۔ ان کی بہت سی نظمیں ''مسدس'' کی ہیئت پر ہیں۔ ان کے ہاں طویل نظمیں بھی ہیں جو کمال فن کی عکاس ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام ''فرمان ظرافت'' ہے۔ جو داد تحسین وصول کر چکا ہے۔ ظریف کی نظموں کے عنوان ملاحظہ ہوں جس سے ان کی ظرافت جھلکتی ہے، ''کچا چٹھا''، ''پنڈی میں''، ''شب میں گلابی''، ''جہنم میں جائے''، ''بریانی کے دن ہیں''، ''رقیب درمیاں''، ''مچھروں کی سلور جوبلی''، ظریفؔ کی نظم ''کہاں گئے'' ملاحظہ کیجئے ۔

پچھلی وزارتوں کے نظارے کہاں گئے وہ اونچی کرسیوں کے سہارے کہاں گئے
جمہوریت! بتا تو جموروں کو کیا ہوا تیرے مداریوں کے پٹارے کہاں گئے
ہم لوگ سو رہے تھے ہمیں کچھ خبر نہیں وہ اقتدار و حرص کے مارے کہاں گئے
غم قوم کا جو کھاتے تھے زردے پلاؤ میں غمخوار قوم سارے کے سارے کہاں گئے

(کہاں گئے)

ظریفؔ جبلپوری کی نظم ''دیکھتے تھے'' ملاحظہ ہو، اس نظم میں وزارت اور سیاست کتنا حسین مذاق اڑایا ہے ؎

وطن میں جو ہم ابتری دیکھتے تھے
سیاست کی بازی گری دیکھتے تھے
تراشے گئے تھے نئے بت سیاسی
نئے رنگ میں آذری دیکھتے تھے
سیاست کے حق میں جو تھے اہل عرفاں
وہ ایوان میں سروری دیکھتے تھے
عروس وزارت کا گھونگھٹ الٹ کر
کچھ لوگ چندریگری دیکھتے تھے
(دیکھتے تھے)

ظریفؔ جبلپوری کی طویل نظم ''یاد ماضی'' اس نظم پر اقبال کے ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' نظم کا اثر ہے، دو بند ملاحظہ ہوں ؎

ہم نشیں قصہ ماضی مجھے دہرانا ہے
خود تو ہنسنا ہے مگر اوروں کو رلانا ہے
کوئی عاقل ہے یہاں اور کوئی فرزانہ ہے
وہی سمجھے گا حقیقت ہے کہ افسانہ ہے
سن تھا بچپن جو ستمبر کا مہینہ آیا
سرد موسم میں بھی یاروں کو پسینہ آیا
ہم نے اوروں سے الگ اپنی بنالی دنیا
عملی کب تھی وہ بالکل تھی خیالی دنیا
نام اللہ کا لے کر تو سنبھالی دنیا
تھی مگر خیر سے توحید سے خالی دنیا
غیر سے کام جو نیوی کے تھے ایسے چھینے
جس طرح ہاتھ کے منہ سے کوئی گنے چھینے
(یاد ماضی) [1]

ظریفؔ جبلپوری کے کلام کی سب سے بڑی خوبی سیاسی مد و جزر کی کیفیت، اس کی مثال انتقال وزارت میں دیکھی جاسکتی ہے۔ صنف مزاح میں ظریفؔ کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ ان کی مزاح نگاری میں پڑھنے والوں اور سننے والوں کے لئے زعفرانی سامان موجود ہے۔

۱۔ تلافی مافات، ص ۲۲۵

مخمور سعیدی:

مخمور سعیدی نظم نگاری میں اپنا ایک اعتبار رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عتیق اللہ مخمور سعیدی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مخمور سعیدی پورے وقار اور کلاسیکی استقلال کے ساتھ غزل کے ساتھ نظم کی طرف مائل ہیں۔ انہوں نے لسانی حرمتوں کا لحاظ رکھا مگر نظم کو داخلی حبس کا شکار نہیں ہونے دیا۔'' [۱]

مخمور سعیدی کی نظم ''چراغ جادۂ شب'' میں اقبال کی نظم ''ذوق وشوق'' کے نقوش ملتے ہیں ؎

روشنی دن کی سمٹتی ہے تو ہر رہگزر
بے کراں دشت شب تار میں کھو جاتی ہے
گہر کے پردے نگاہوں پہ گرے جاتے ہیں
گرد خوف آئینۂ فکر کو دھندلاتی ہے
جاگ اٹھتے ہیں خیالوں میں تلاطم دکھ کے
موج غم ساحل احساس سے ٹکراتی ہے
میری بڑھتی ہوئی آشفتہ نگاہی مجھ کو
آئینہ مرگ پراسرار کا دکھلاتی ہے

(چراغ جادۂ شب)

نظم ''پڑاؤ'' اور ''زادسفر'' میں زندگی اور اس کا طویل سفر دکھایا ہے۔ جہد مسلسل کا پیغام ہے، یہی پیغام ہمیں اقبال کی نظموں میں ملتا ہے۔

مخمور سعیدی کی ایک اور نظم ''ایک پرانا شہر'' اقبال کی نظم ''تسلیم ورضا'' کا عکس ملاحظہ کیجیے ؎

مہر بہ لب ویران دریچے، دروازے سنسان
دور پہاڑوں کی چوٹی پر شاہی گورستان
نیم کی شاخوں میں الجھی ہے کنکوے کی کانپ
دیواروں پر رینگ رہا ہے شکستگی کا سانپ
سڑکیں راہگیروں پر ڈالیں ٹھنڈی سرد نگاہ
شرم عریانی سے چپ ہے بوڑھی شہر پناہ

(ایک پرانا شہر)

مخمور کی یہ نظم دیکھئے جس کا عنوان ''موسم بہار کی ایک نظم'' اسلوب اور فکری نظام اقبال کا سا ہے ملاحظہ کیجیے ؎

پھر موسم نو بہار آیا
ایک کیف نمو فضا پہ چھایا

۱۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظم، ص ۳۷

سوئی ہوئی روح ارض جاگی
مردہ ذرات کسمسائے
مدفون سمن بروں کے پیکر
شاید تہہ خاک رسمسائے
بے جان زمین کے بدن میں
آثار حیات لوٹ آئے

آہنگ کے اعتبار سے اقبال کی نظم ''نوید صبح'' سے میل کھاتی ہے۔فطرت نگاری میں اقبال نے بے مثال نظمیں کہی ہیں۔ ان میں ''سیر فلک'' بہترین نظم شمار کی جاتی ہے۔اسی طرح نظم ''چاند'' فطرت نگاری پر عمدہ نظم ہے۔مخمور سعیدی نے اقبال کی فطرت نگاری سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی نظموں کی اساس داخلی حسیت اور فطرت نگاری پر رکھی ہے۔مخمور کا شمار کامیاب نظم گو شعراء میں ہوتا ہے۔

ضیاء جالندھری:

ضیاء جالندھری حلقہ ارباب ذوق کے سرگرم رکن تھے۔ان کی شاعری پر میرا جی کے افکار وخیالات کا گہرا اثر تھا۔لیکن خاص طور پر انہوں نے نظموں میں ہیئت اور لسانی نقطۂ نگاہ سے خارجی مسائل پر زیادہ توجہ رہی۔فطرت نگاری کے بھی اعلیٰ نمونے ان کی شاعری میں ملتے ہیں جو صرف اقبال کی فکری آہنگ کا نتیجہ ہے۔ضیاء جالندھری کی نظم ''سورج'' پر اقبال کی نظم ''چاند'' کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔یہی وہ اقبال کا اسلوبی نظام ہے جسے ضیاء جالندھری نے اپنایا ہے۔نظم ''چاند'' کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

اے چاند! حسن تیرا فطرت کی آبرو ہے طوف حریم خاکی تیری قدیم خو ہے
یہ داغ سا جو تیرے سینے میں ہے نمایاں عاشق ہے تو کسی کا؟ یہ داغ آرزو ہے

(چاند) بانگ درا

ضیاء جالندھری کی نظم ''سورج'' ملاحظہ کیجئے ؎

شانوں پہ سفید لٹیں بکھرائے
اک پھٹی پرانی شال بدن سے لپٹائے
سانسوں کی بھاپ سے ٹھٹھری پوریں تاپ تاپ کے
آنکھوں کے حلقے سکیڑے
ملگجے دودھیا دھاگوں سے
روئی کی اجلی رضائی میں
ٹھہر ٹھہر کے ٹگندے ڈالتا جاتا ہے
کبھی کبھی رک کر
اک خواب سا دیکھنے لگتا ہے

(سورج)

آہنگ واسلوب کے اعتبار سے اس نظم میں وہی خوبی پائی جاتی ہے جیسا کہ ہم اقبال کی نظم میں فطرت کے مناظر کی عکاسی دیکھتے ہیں۔

ظہیرؔ کاشمیری:

ظہیرؔ کاشمیری کی نظم نگاری میں اقبال کے اسلوب اور افکار کو بہ آسانی دیکھا جاسکتا ہے۔ظہیر کی نظم ''گل رخ'' پر اقبال کی نظم ''وصال'' کے اثرات نظر آتے ہیں۔دونوں کی نظم ہیئت کے لحاظ سے ترکیب بند پر ہے۔''وصال'' کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

جستجو جس گل کی تڑپاتی اے بلبل مجھے — خوبی قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے
خود تڑپتا تھا چمن والوں کو تڑپاتا تھا میں — تجھ کو جب رنگیں نوا پاتا تھا شرماتا تھا میں
میرے پہلو میں دل مضطر نہ تھا، سیماب تھا — ارتکاب جرم الفت کے لئے بے تاب تھا

(وصال) بانگ درا

ظہیر کاشمیری کی نظم ''گل رخ'' کے چند شعر ملاحظہ کیجئے ؎

دامن کہسار میں اک وادی گلبار تھی — جس کی ہر اک کنج، کیف حسن سے سرشار تھی
ہر طرف پھیلے تھے، خوش رنگ ثمر آور درخت — جابجا آراستہ تھے، خوشنما پھولوں کے تخت
ندیا مثل شعاع مہر و ماہ تابندہ تھیں — آبشاریں سرحدی نغمات سے رخشندہ تھیں
اپنی ہی دھن میں رواں تھے چشمہ ہائے تابناک — آب حیواں چومتا تھا، اس جواں وادی کی خاک
سبزہ زاروں کے پرے، اس کی چراگاہوں میں تھے — بستر مخمل بچھے، اس کی حسین راہوں میں تھے
ثبت تھے پگڈنڈیوں پر پائے خوباں کے نشاں — ہر روش اس کی مثال زلف خوباں جہاں
اس سواد عنبریں پر ابر پارے تھے نثار — یہ سواد بھمن دوے تھا بہار اندر بہار

رنگ و بو ہر دم جواں تھے وادی گلبار میں
خلد کا نقشہ کھنچا تھا دامن کہسار میں

(گل رخ)

ظہیرؔ کاشمیری کی نظم کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں لفظوں کا دروبست تراکیب لفظی، ہیئت اور اسلوب میں قطعی کوئی فرق نہیں ہے۔یہی خوبیاں اقبال کی نظم نگاری کا امتیاز ہیں، اس لئے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ظہیر کی نظموں پر اقبال کے اثرات مرتسم ہوئے ہیں۔نمونے کے طور پر ''گل رخ'' نظم اس بات کی تائید میں پیش کی گئی ہے۔

مصطفیٰ زیدی:

حسن ومحبت کا شاعر ہونے کے علاوہ وقت کا ادراک رکھنے والا شاعر بھی ہے۔اس کی شاعری میں سماجی ومعاشرتی پہلوؤں کی جونشاندہی ہوئی ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظموں میں نعرہ بازی یا پروپیگنڈہ نہیں بلکہ مادیت سے ہٹ کر ماورائیت

اور ماہیئت کو گلے لگایا ہے۔

ان کی شاعری کا مزاج اور آہنگ، اقبال اور جوش کی فکر کا وہ آفاقی پھیلاؤ ہے، جسے مصطفیٰ زیدی نے اعتراف کرتے ہوئے خود لکھا ہے:

''میری بالکل ابتدائی نظموں پر، جن کو میں نے اس مجموعے میں شامل نہیں کیا، جوش ملیح آبادی کی گرم آہنگی کا بڑا نمایاں اثر تھا۔ ان ساری چیزوں کو میں مشق سمجھتا ہوں اور مشق پر ندامت کی کوئی ضرورت نہیں لیکن میری اپنی شاعری جس نے رفتہ رفتہ اپنا مزاج سمجھنے کی کوشش کی ہے، ان ابتدائی چیزوں سے بہت مختلف ہے۔ ان نظموں میں دیکھنے سے زیادہ سوچنے اور چھونے سے زیادہ محسوس کرنے کا رجحان نظر آتا ہے۔'' [۱]

مصطفیٰ زیدی کی نظم ''بہ نام وطن'' مسدس ہیئت میں ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے، جس طرح اقبال نے ''شکوہ جواب شکوہ'' مسدس میں کہی ہے، زیدی کی نظم میں اقبال کا خطابیہ اسلوب ملاحظہ کیجئے ۔

کون ہے آج طلبگار نیاز و تکریم
وہی ہر عہد کا جبروت وہی کل کے لیئم
وہی عیار گھرانے وہی فرزانہ حکیم
وہی تم، لائق صد تذکرہ و صد تقویم
تم وہی دشمن احیائے صدا ہو کہ نہیں
پس زنداں یہ تمہیں جلوہ نما ہو کہ نہیں
(بہ نام وطن) [۲]

مصطفیٰ زیدی نے غزلیں اور نظمیں خاصی تعداد میں کہی ہیں۔ ان کی نظموں میں جو تازگی اور ٹھہراؤ نظر آتا ہے، وہ ان کی ذہنی اپج اور جدید علمیت کا اظہار ہے نظموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال سے بے حد متاثر تھے کیونکہ شاعری میں ہیئتی نظام اور رنگ و اسلوب اقبال کے توسط سے آیا ہے مثلاً زیدی کی نظموں کے عنوانات سے بھی اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اقبال کے اثرات قبول کئے ہیں۔ چند عنوانات ملاحظہ ہوں ''وصال''، ''اندوہ وفا''، ''ماہ وسال''، ''جہاں میں ہوں''، ''طلسم''، ''تنہا''، ''شہر جنوں میں چل''، ''کارواں''، ''بے سمتی''، ان نظموں کا فکری رجحان اور آہنگ اقبال کے اسلوب سے مماثلت رکھتا ہے، ''جہاں میں ہوں'' کے دو شعر ملاحظہ ہوں ۔

نفس کو فکر جوہر ہے جہاں میں ہوں — سمندر ہی سمندر ہے جہاں میں ہوں
بجھی جاتی ہیں قندیلیں توہم کی — طلوع عقل خاور ہے جہاں میں ہوں
(جہاں میں ہوں)

۱۔ کلیات مصطفیٰ زیدی، ص ۹

۲۔ کلیات مصطفیٰ زیدی، ص ۱۵

زیدی کی نظم ''کس وقت اجالا پھیلے گا'' پر اقبال کی نظم ''نمودِ صبح'' کا اثر دیکھیے ۔

ہو رہی ہے زیرِ دامانِ افق سے آشکار صبح، یعنی دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار

پا چکا فرصت درودِ فصلِ انجم سے سپہر کشتِ خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار

(نمودِ صبح) بانگِ درا

مصطفیٰ زیدی کی نظم ملاحظہ کیجئے ۔

کس وقت اجالا پھیلے گا، اے صبح و مسا کی تیرہ شبی

کب آئے گا دورِ ساغرِ دل، اے کوثرِ جاں کی تشنہ لبی

سب سنگ بہ جیب تھے، سر ہی نہ تھا، زخموں کا کوئی خوگر ہی نہ تھا

ہر شخص میں تھی درماں طلبی، کیا کج کلہی، کیا کم لقبی

ہم بات کریں تو کس کریں، بنیاد رکھیں تو کس پر رکھیں

اے اہلِ ہنر کے عجزِ سخن، اے زندگیوں کی بے بسی

میں سفلگیوں سے کھیلا ہوں، مٹی کی تہوں سے لایا ہوں

تہذیب کا یہ معیارِ نظر، اخلاق کی یہ عالی نسبی

(کس وقت اجالا پھیلے گا) [۱]

ڈاکٹر وزیر آغا:

شاعری اور نثر دونوں میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کی شخصیت عہد ساز ہے کیونکہ یہ تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہوئے قدیم اور جدید کا احسان لینا گوارہ نہیں کیا لیکن اقبال کے فکری آئینے سے خود کو نہ بچا سکے۔ ان کی شاعری میں بالواسطہ یا بلاواسطہ اقبال کی شاعری کے اثرات نظر آتے ہیں۔ اقبال کی طرح انہوں نے بھی انسان، فطرت اور سماج کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ احمد ہمدانی نے اپنی کتاب ''نئی شاعری کے ستون'' میں وزیر آغا کی شاعری اور ان کی فکر پر مبسوط مقالہ لکھا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''وزیر آغا اس حقیقت کے رمز آشنا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی علامتیں نہ مہمل ہیں اور نہ سپاٹ اور بے مزہ، ان کی علامتیں ان کی اندرونی پکار کا نتیجہ ہیں اور ان کی اس اندرونی پکار کا محور ان کا زمین سے وابستگی کا جذبہ ہے۔ زمین سے وابستگی کا جذبہ ہی دراصل جدید حسیت کی پہچان ہے۔'' [۲]

وزیر آغا کی نظم میں اقبال کا آہنگ ملاحظہ کیجئے ۔

آج میرے اور تیرے درمیاں

بُعد کیسا، فاصلہ باقی کہاں

۱۔ کلیاتِ مصطفیٰ زیدی، ص ۲۷

۲۔ نئی شاعری کے ستون، ص ۱۱۱

لے ذرا مٹی کی ایک چکنی ڈلی
ڈال پانی، گوندھ اس کو زور سے
اور بنا دو بت حسین ولا جواب
ایک بت کی شکل ہو تیری طرح
دوسرا بت ہو مرا
بت شکن بن کر انہیں اب توڑ دے

(من وتو) [۱]

وزیر آغا کی ایک اور نظم ملاحظہ کیجئے، اس میں رومان پرستی کے ساتھ فطری عناصر پر بھی غور کیا گیا ہے کیونکہ وزیر آغا داخلی اور خارجی حسیت کا شاعر ہے۔نظم ''تیرے سپنے'' میں تشبیہات و استعارات اور علامات کا جو نظام ہمیں ملتا ہے، وہ اقبال کا خصوصی آہنگ ہے کیونکہ اقبال کی شاعری میں عقل اور عشق پر بہترین نظمیں ملتی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالمغنی اقبال کے استعارات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ہر استعارہ اپنی جگہ تاریخ کا ایک اشارہ ہے اور واقعہ کو علامت بناتا ہے۔
> اقبال کا یہی علامتی انداز بیان ہے جو زندگی کے ٹھوس حقائق کو لطیف شاعری میں تبدیل
> کر دیتا ہے اور حکمت وسحر کا ایک طلسم قائم کرتا ہے۔'' [۲]

وزیر آغا کی نظم ''تیرے سپنے'' ملاحظہ کیجئے، اس میں استعارات اور علامتیں اقبال کی فکر کا ثمر ہیں ؎

تو مری جان نہ رو، رونے کا یہ وقت نہیں
یہ مچلتے ہوئے غنچے، یہ چھلکتے ہوئے جام
یہ ہوا سرد، ندی تیز، سنہرے ایام
اس طرف کاہکشاں جیسے یہاں پھول کھلیں
اس طرف روئے حسیں جیسے وہاں ماہ تمام
مسکراتی ہوئی آتی ہے یہاں موج نسیم
منہ بسورے ہوئے جاتے ہیں یہاں سے آلام
نہ جگاتی ہے خموشی کی مسلسل آواز
نہ سلاتا ہے یہاں نرم ہواؤں کا خرام
ہیں مگر سپنے فقط چشم تصور کے رفیق
اور تو ان کی حقیقت کو ترستی ہے مدام

(تیرے سپنے) [۳]

۱- ادبی دنیا، اشاعت خاص، ص ۱۶۷

۲- اقبال اور عالمی ادب، ص ۳۰۳

۳- ادبی دنیا، اشاعت خاص، ص ۱۳۴

وزیر آغا نے نظم میں علامتی نظام کو جس طور برتا جائے، اگر ہم اقبال کی شاعری کے گرد و پیش نظریں اٹھا کر دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ علامتیں کس چابکدستی سے برتی گئیں ہیں- وزیر آغا کی یہ نظم داخلی حسیت پر عمدہ نظم ہے-

عزیز حامد مدنی:

مدنی کے تین مجموعے ''دشت امکاں''، ''چشم نگراں''، ''نخل گماں'' منظر عام پر آ چکے ہیں- ان کی نظموں میں ہیئت اور اسلوب کے لحاظ سے بڑا تنوع ہے- وقت کی نبض دیکھتے رہنا ان کا مزاج ہے- مدنی روایت کے منکر نہیں بلکہ اس میں اضافے کے قائل ہیں- اقبال سے کسب فیض کرتے ہوئے مدنی نے اپنی نظموں میں علامتیں، استعارات اور خیال انگیزی کو پیش نظر رکھا ہے، یہی وہ ادراک ہے جو انہیں دوسرے شعراء سے منفرد کرتا ہے- احمد ہمدانی، مدنی کی شاعری اور نظام فن پر رقمطراز ہیں:

> ''مدنی کے ہاں بیشتر استعارے، علامات، تخیلی پیکر اور تراکیب، وقت اور رفتار وقت کے شانہ بشانہ رونما ہونے والی تبدیلیوں کا فکر انگیز اشاریہ ہونے کے ساتھ شعریت سے پوری طرح آراستہ نظر آتی ہیں، جس کی وجہ ان کے ہاں ہیئت اور موضوع کے درمیان مکمل ہم آہنگی قرار دی جا سکتی ہے-'' [۱]

مدنی کی نظم ''خواب گاہ'' ملاحظہ کیجئے، اس میں اسلوب کا اچھوتا پن بھی ہے اور علامتوں کا جدید نظام بھی ~

آج یہ خواب گاہ ہے بے نور
جال بنتے ہیں یہاں ماہ و سال یہاں
زندگی آ مجھے سنبھال یہاں
ایک بجھتے ہوئے تبسم کی
لرزش نیم جاں بھی ختم ہوئی
راحتوں کے جو خواب تھے، ان کی
شوخی داستاں بھی ختم ہوئی
شکوے لطف و کرم، فراق و وصال
سعی خون جواں بھی ختم ہوئی

(خواب گاہ) [۲]

عزیز حامد مدنی نے بھی وہی اسلوب اختیار کیا ہے، جسے ہم اقبال کا اسلوب کہتے ہیں، پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ ان کی فکر کے زاویے اور تشبیہات و استعارات اقبال کی سی ہیں، جیسا کہ اقبال کی شاعری میں عظمت آدم اور فلسفۂ حیات کا مربوط نظام ملتا ہے- اسی طرح مدنی کی نظموں میں عقل و وجدان کے گل بوٹے کھلتے دکھائی دیتے ہیں- ان کے عنوانات اور نظموں سے اندازہ ہوتا

۱- نئی شاعری کے ستون، ص ۱۱۴

۲- چشم نگراں، ص ۵۲

ہے کہ مدنی نے غالب اور اقبال ہی کو پیش نظر رکھا ہے، چند نظمیں ملاحظہ ہوں ۔

کبھی ایک کاسہ دریوزہ گری فرصت زیست
کبھی اک نیم تبسم کی سکت بھی ہے وبال
کبھی بیمار کی ڈوبی ہوئی نبضوں کی طرح
آہنی نیند میں سوتا رہا صدیوں کا جلال

(بدلتے ہوئے عنواں)

افق کی ڈوبتی خونیں کفن فضاؤں میں
نگاہ سوز شراروں کا ایک مبہم رقص
فسردہ شمعوں کو آواز دے کر تیز ہوا
نکل ہی آئے ہیں زنداں سے چند زندانی

(سرگوشی)

زندگی کا ہر نفس ہے دیدہ و دل کا رقیب
مہوشوں کے قہقہے ہیں اور ہم ہجراں نصیب
ایک فضائے چاک دامانی سی ہے دل کے قریب
جنبش نبض جنوں کچھ آرزو انگیز ہے
وہ ہوا جو شوق کا رخ ہی بدل دے تیز ہے

(موسم کا تغیر)

مدنؔی کی نظموں میں جہد و عمل کے درس کے ساتھ ادبی تشکیل نو کا سامان بھی ہے- ان کی فکر میں عصری گونج اور نظری و عملی شعریات کا تانا بانا اس سلیقے سے ملتا ہے، جیسے اقبال کے اسلوب میں تخاطب زوروں پر نظر آتا ہے، اسی طرح مدنی کی نظمیں پختہ مغز اور آفاقی پھیلاؤ لئے ہوئے ہیں- ان کی شاعری کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان کے ہاں حال اور مستقبل دونوں جھلکتے دکھائی دیتے ہیں- ان کی شاعری عالمی ادب کے حوالہ سے معتبر شاعری کہی جا سکتی ہے-

جگن ناتھ آزاد:

جس طرح اقبال کی نظموں میں تغزل پایا جاتا ہے- اسی طرح آزاد کی نظموں میں بھرپور تغزل ملتا ہے- غزل میں عموماً عورت سے گفتگو کا تصور ملتا ہے- اس کا سراپا اور نقش و نگار پر جذبات کی دھونی رومائی جاتی رہی لیکن اقبال نے اس رجحان کو نظموں میں پاکیزہ طور پر ادا کیا ہے- ان کے یہ اثرات بعد کے شعراء میں دیکھے جا سکتے ہیں- اسلوب احمد انصاری اقبال کی نظموں میں تغزل

بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''یہ امر بدیہی ہے اور کسی تفصیلی ثبوت کا محتاج نہیں کہ اقبال کی نظموں ہی کے مماثل ان کی غزلوں کا دائرۂ کار بھی بہت وسیع ہے، ان میں جن محرکات اور موضوعات کی سمائی ہے، وہ حسن وعشق سے منسلک اور وابستہ روایتی یا پیش پا افتادہ تجربات سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں- ان کی جذباتی فکر کا مرکز ومحور انسان دوستی یا بشریت کے علاوہ انسان اور خدا کے مابین رشتہ بھی ہے اور انسان اور کائنات کے مابین ربط وتعلق کو ماہیئت کی تفتیش یعنی Exploration بھی اقبال کی غزل کی شاعری محض حسی تجربات پر اپنے جواز اور وقعت کا انحصار نہیں رکھتی کہ یہ مابعد الطبعیاتی رشتوں کی شاعری ہے-'' [1]

اس روشنی میں جگن ناتھ آزاد کی نظم ''ایک مشکل'' ملاحظہ کیجئے، اقبال کی نظم ''گل رنگیں'' کا عکس اس میں نظر آئے گا- دونوں نظموں کی ہیئت بدلی ہوئی ہے، اقبال کی مسدس میں ہے جبکہ آزاد کی نظم مسلسل ہے ؎

تو شناسائے خراش عقدۂ مشکل نہیں
اے گل رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
زیب محفل ہے، شریک شورش محفل نہیں
یہ فراغت بزم ہستی میں مجھے حاصل نہیں
اس چمن میں سراپا سوز و ساز آرزو
اور تیری زندگانی بے گداز آرزو

(گل رنگیں) بانگ درا

تخاطب کا یہ انداز جگن ناتھ کی نظم میں ملاحظہ کیجئے ؎

سکون دل کہ نظر کا تمہیں قرار کہوں!
نشاط درد کہوں، کیف انتظار کہوں
تمہارے نام سے تم کو پکار گر نہ سکوں
جو دل پہ بار خرد ہے اتار گر نہ سکوں
تو پھول تم کو کہوں، پھول کا نکھار کہوں
تمہیں بہار کہوں، نغمۂ بہار کہوں
خبر نہیں تمہیں محبوب یا حبیب کہوں
کہ تم اپنی رگ جاں سے بھی قریب کہوں
کہوں میں اپنے تخیل کی انتہا تم کو
لکھوں خموشی احساس کی نوا تم کو
شفق کا رنگ کہوں یا سحر کا نور کہوں
کہ تم کو جلوۂ مہتاب کا ظہور کہوں
ریاض دل کے لئے جنبش نسیم سحر
کہوں میں کیف تم کو یا شمیم سحر
تمہیں تلاطم نغمہ کہوں کہ ساز کہوں
کہ راز اصل پس پردۂ مجاز کہوں
جہان کیف کہوں عالم سرور کہوں
کہ اپنے ذوق نظر کا تمہیں غرور کہوں
شباب حسن کہ حسن شباب تم کو کہوں
کہ پچھلی رات کا ایک کیف خواب تم کو کہوں

۱- اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں ص ۲۲۴

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہوں تو کیا تم کو دوا کہوں کہ کہوں درد لا دوا تم کو
جو خط لکھوں تو کروں کس طرح خطاب تمہیں

(ایک مشکل)

جگن ناتھ آزاد کی نظم ''ظہور آدم'' ترکیب بند میں ہے۔ یہ طرز خاص اقبال کا ہے۔ یوں تو جگن ناتھ کے کلام میں جابجا اقبال کے اثرات اور مماثلت پائی جاتی ہے مثلاً اقبال کی نظم ''انسان اور بزم قدرت'' یہ بھی ترکیب بند پر ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

صبح خورشید درخشاں کو جو دیکھا میں نے بزم معمورۂ ہستی سے یہ پوچھا میں نے
پر تو مہر کے دم سے ہے اجالا تیرا سیم سیال ہے پانی ترے دریاؤں کا

(انسان اور بزم قدرت) بانگ درا

جگن ناتھ آزاد کی نظم ''ظہور آدم'' ملاحظہ کیجئے ؎

ہماری یہ زمین یہ غم کا گھر خوشیوں کا گہوارہ خلا میں رقص کرتا، گھومتا روشن تریں تارہ
تمدن کا مہکتا بوستاں، تہذیب کا گلشن ہنر کی آبرو، سائنس کا گھر، علم کا مسکن
کہانی فلسفے کی، داستاں عشق و محبت کی مسلسل آج تک جاری فغاں عشق و محبت کی
یہ دنیا شاعروں کی اور افسانہ نگاروں کی یہ مسکن حسن بینوں کا یہ محفل حسن کاروں کی
حسینوں کا یہ جمگھٹ، انجمن روشن جبینوں کی یہ محفل ماہ پاروں کی یہ منزل نازنینوں کی
گرجتی شور کرتی ایک دنیا کارخانوں کی کہانی حوصلوں کی، ولولوں کی اور اٹھانوں کی
یہ نور و نار کا ٹکڑا بھی ہے ظلمت کدہ بھی ہے
سرا ماتم کی بھی ہے اور یہ عشرت کدہ بھی ہے

(ظہور آدم)

شادؔ عارفی:

شادؔ عارفی طنزیہ شاعری میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں میں بانکپن اور شوخی کا پایا جانا ہی اس بات کی علامت ہے کہ ان کے ہاں فنی شعور اور عوام کے دکھ درد کا شدید احساس پایا جاتا ہے۔ ان کی نظموں میں گھن گرج نہیں بلکہ ترم اور نازک لب و لہجہ اختیار کیا ہے۔ جس میں پہلودار معنویت پائی جاتی ہے۔ ان کے اشعار میں جذبات و احساسات کے نئے زاویے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں خارجی حسن اور فطری مناظر پر جو فکر آمیز رجحان پایا جاتا ہے، اس میں اثر انگیزی بھی ہے اور یاد رفتگاں بھی۔ فطرت نگاری میں اقبال نے جو نظمیں لکھی ہیں، اس کے اثرات ہمیں شاد عارفی کی نظموں میں نظر آتے ہیں مثلاً اقبال کی نظمیں ''جگنو''، ''چاند''، ''موج دریا''، ''پیام صبح'' کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

اجالا جب ہوا رخصت جبین شب کی افشاں کا نسیم زندگی پیغام لائی صبح خنداں کا
جگایا بلبل رنگیں نوا کو آشیانے میں کنارے کھیت کے شانہ ہلایا اس نے دہقاں کا

(پیام صبح) بانگ درا

شادؔ عارفی کی نظم ''گوالن'' ملاحظہ کیجیے، اس نظم میں اقبال کے فطری مناظر کا عکس دیکھا جاسکتا ہے ؎

گرمیوں کی صبح کیف آور کا عکس بے ضرر
حدت شعلہ بجاں تڑپی فضا میں ہر طرف
ابر کے ٹکڑوں سے ٹکرا کر ہوا زیر و زبر
آتش برق تپاں جھپٹی ہوا میں ہر طرف
پھر ہمالہ کی اٹھی چوٹی پہ ڈالی روشنی
اب کے سورج آچکا تھا ٹھیک سمت الراس پر
برف کے گلتے ہوئے ہیرے میں ڈھالی روشنی
اور سیدھی ہو کے کرنیں پڑ رہی تھیں گھاس پر
پھر حسیں چشموں سے مل کر، وادیوں تک آگیا
تازگی پودوں میں شاخوں میں عزو بت سو گئی
دامن فطرت سے فطرت زاویوں تک آگیا
جا ملے ذرے بگولوں سے، رطوبت کھو گئی

(گوالن)

شادؔ عارفی کے ہاں تراکیب لفظی اور صنائع کا جو اہتمام ملتا ہے مثلاً ''حدت شعلہ بجاں''، ''سمت الراس''، ''عزو بت'' وغیرہ اس سے انداز ہ ہوتا ہے کہ شاد کی نظموں میں رطب ریاس کا ملا جلا رجحان پایا جاتا ہے، جسے ہم اقبال کے افکار کا اثر کہہ سکتے ہیں۔ شادؔ عارفی کی نظموں میں طنز کے نشتر بھی ہیں اور ظرافت بھی۔ ان کی نظم ''شکار ماہی'' میں طنز کے خوبصورت نشتر کے علاوہ فطرت کی عکاسی اور منظر کشی بھی پائی جاتی ہے۔ اقبال نے ''بانگ درا'' کے آخر میں ظریفانہ کلام دیا ہے۔ اس میں طنز لطیف بھی ہے اور آئینہ ایام کی جھلک بھی، دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

رات مچھر نے کہہ دیا مجھ سے
ماجرا اپنی ناتمامی کا
مجھ کو دیتے ہیں ایک بوند لہو
صلہ شب بھر کی تشنہ کامی کا
اور یہ بسوہ دار، بے زحمت
پی گیا سب لہو اسامی کا

(بانگ درا)

شادؔ عارفی کی نظم ''شکار ماہی'' میں طنز نگاری ملاحظہ کیجیے ؎

رات بھر اک جھیل پر جھک مار کر
صبح کو پلٹا ہوں ہمت ہار کر
دل میں ہے مچھلی نہ پھنسنے کی جلن
ہیں وبال جاں، تبر ششتیں ڈگن

اپنی استادی کے دعوؤں کا لحاظ
شرط کا افسوس، وعدوں کا لحاظ
دوستوں کے مسکرانے کا خیال
''طنز گوں'' باتیں بنانے کا خیال

کھل گیا اک بوٹ کا فیتہ مگر
جھک نہیں سکتی نقاہت سے کمر
باڑھ کے جھانکڑ چلے آتے ہیں ساتھ
کون ڈالے کوٹ کے دامن پہ ہاتھ

(شکار ماہی)

اقبال کی طنز اور ظریفانہ کے اثرات شاد عارفی کی نظموں میں دیکھے جا سکتے ہیں-

عرش صدیقی:

اقبال نے ''من وتو'' کا فلسفہ خودی کی صورت میں پیش کیا ہے- ''ضرب کلیم'' کی ان نظموں کا مطالعہ کیجئے ''بیداری''، ''خودی کی تربیت''، ''خودی کی زندگی'' اور ''مرگ خودی''، گو کہ نظمیں مختصر پیرایہ میں ہیں لیکن ہر نظم اپنی جگہ مکمل فلسفہ پیش کرتی ہے- ''من وتو'' کی ترکیب سب سے پہلے اقبال نے استعمال کی، اقبال کہتے ہیں ؎

من عیش ہم آغوشی دریا نہ خریدم
آں بادہ کہ از خویش رباید نہ چشیدم

عرش صدیقی کی نظم ''من وتو'' ملاحظہ کیجئے ؎

آرزو ہے کہ تمیز من وتو مٹ جائے
تو مرے اتنا قریب آئے میں تو ہو جاؤں
میری ہستی تری ہستی میں فنا ہو جائے
جب مری روح تری روح کا اک حصہ ہے
پھر یہ دوگام کی دوری کے بھلا کیا معنی؟
مجھ کو ہر لحظہ ترے قرب کا احساس تو ہے
میں مگر تو جو نہیں ہوں تو مٹا جاتا ہوں
آ، کہ احساس فنا کو ہی مٹا ڈالیں ہم
یوں ملیں ہم کہ انا الحق کی صدا بن جائیں
وقت کو روک دیں ہم اس کے خدا بن جائیں

(من وتو)

یہ طویل نظم ہے یہاں اقتباس دیا گیا ہے- اس نظم میں فلسفیانہ فکر، خیال کی گہرائی اور تازگی اظہار خوبصورت پیرایہ میں ہوا ہے، اسلوبیاتی لحاظ سے یہ نظم خودی کے نظریات سے مماثلت رکھتی ہے- تلمیحات میں ''انا الحق'' کا استعمال ہی اقبال کے اثرات کا اظہار ہے، عرش صدیقی کی یہ ایک کامیاب نظم کہی جا سکتی ہے-

منیب الرحمٰن:

منیب الرحمٰن کی نظموں میں روحانی فضا کے ساتھ ساتھ قومی و وطنی کا جو شعور ہمیں ملتا ہے۔ اس سے ہمیں تہذیبی اقدار کا ہی پتا نہیں چلتا بلکہ انسانوں کا ایک باہمی تعلق بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کی نظمیں اس بات کا بھی ثبوت ہیں کہ انہوں نے انسانی محبت کو دردمندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ فطرت نگاری میں اقبال سے کسب فیض کیا ہے۔ منیبؔ کی نظم ''شب رو'' پر اقبال کی نظم ''بزم انجم'' کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ منیب کی نظم میں استعاراتی نظام اقبال ہی کے فیض کا ثمر ہے۔ اقبال کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

یہ رسم ہے پرانی رہتے ہیں درد والے
بے خواب مثل انجم راتوں کی خامشی میں
سمجھیں گے کیا وہ ناداں آئین سروری کو
ناقص ہیں اب تلک جو آداب بندگی میں

(بزم انجم) بانگ درا

منیب الرحمٰن کی نظم ''شب رو'' ملاحظہ کیجئے، اقبال کا استعاراتی نظام اس نظم میں نظر آئے گا:

بھٹک رہے ہیں ستاروں کے دشت میں شب رو
نگاہ یاس میں سر مستی امید لئے
اٹھائے دوش پہ سوز و خلش کا بار نشاط
تجسس افق دید و باز دید لئے
یہ جستجوئے مسلسل، یہ راہ بے پایاں
رواں ہوں سوئے فلک مثل آہ نیم شبی
مہک رہے ہیں سر شاخ انتظار کے پھول
ٹپک رہا ہے فضا میں سرور تشنہ لبی

(شب رو)

''ستاروں کا دشت''، ''نگاہ یاس''، ''دوش پہ سوز و خلش''، ''آہ نیم شبی''، ''تشنہ لبی''، جیسی تراکیب اور استعارے اقبال ہی کی وجہ سے نئے آنے والے شعراء نے اپنائے۔

استعارہ کے لغوی معنی ادھار لینے کے ہیں۔ اصطلاح علم بیان میں حقیقی و اصلی معنی کے بجائے مجازی معنی میں استعمال کیا جائے۔ ان دونوں میں تشبیہ کا بھی تعلق و ربط ہو تو اسے استعارہ کہتے ہیں۔ منیب الرحمٰن نے اقبال کے استعاراتی نظام کے پیش نظر اپنی نظموں میں مربوط استعارے پیش کئے ہیں مثلاً عنوان ''نظم'' میں اقبال کی نظم ''آفتاب صبح'' کی بازگشت ملاحظہ کیجئے:

شورش میخانہ انساں سے بالا تر ہے تو زینت بزم فلک ہو جس سے وہ ساغر ہے تو
ہو در گوش عروس صبح وہ گوہر ہے تو جس پہ سیمائے افق نازاں ہو وہ زیور ہے تو
صفحہ ایام سے داغ مداد شب مٹا
آسماں سے نقش باطل کی طرح کوکب مٹا

(آفتاب صبح) بانگ درا

منیب کی نظم ملاحظہ کیجئے ؎

تیری آنکھوں میں سحر ہنستی تھی
تیرے ہونٹوں پہ مہکتے تھے گلاب
تیری ہر سانس میں چلتی تھی نسیم
تیری زلفوں میں مچلتی تھی ضیائے مہتاب
دل میں اک ہوک اٹھی
کاش میں اپنا بنالوں تجھ کو
خلش روح کو آسودہ کروں
جسم سوزاں سے لگالوں تجھ کو
سفر شوق میں موجوں کی طرح ساتھ رہے
ہاتھ میں ہاتھ رہے

(نظم)

اقبال کی نظموں میں ایک انداز تخاطب کا ہے جو نہایت جاندار اور توانا انداز کا اشاریہ ہے۔ اسی طرح منیب الرحمٰن نے بھی تخاطب کو ملحوظ رکھتے ہوئے نظموں کو بے روح نہ ہونے دیا۔ ان کی نظمیں علامتوں اور فطری عناصر کے امتزاج سے تخلیق پائی ہیں۔

پروفیسر سحر انصاری:

سحر کی نظموں میں جو صنعتیں ہمیں ملتی ہیں۔ ان سے کلام میں وہ خوبیاں پیدا ہوگئیں، جیسے اقبال کے کلام میں صنائع اور بدائع کا استعمال ہوا ہے۔ صنائع صنعت کی جمع ہے، کلام میں صوری ومعنوی لحاظ سے دلکشی پیدا کرنا صنائع کہلاتی ہیں۔ سحر کی نظمیں اس بات کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی نظم ''زمستاں'' گو کہ آزاد نظم ہے لیکن صنائع کا اہتمام کس خوبصورتی سے کیا ہے۔ اقبال کی نظم ''بچہ اور شمع'' میں صنائع کی آرائش دیکھیے ؎

کیسی حیرانی ہے یہ اے طفلک پروانہ خو — شمع کے شعلوں کو گھڑیوں دیکھتا رہتا ہے تو
یہ مری آغوش میں بیٹھے ہوئے جنبش ہے کیا — روشنی سے کیا بغل گیری ہے تیرا مدعا
اس نظارے سے ترا ننھا سا دل حیران ہے
یہ کسی دیکھی ہوئی شئے کی مگر پہچان ہے

(بچہ اور شمع) بانگ درا

سحر کی نظم ''زمستاں ملاحظہ کیجئے ؎

رات خاموش
نگاہوں سے مناظر مہجور
منجمد، برف کی مانند ہیں، بام و دیوار

صحن میں برگ خزاں دیدہ کا رقص پیہم!
جسم لرزاں، دل و جان طالب سیال حیات
طاق و محراب میں قندیل، نہ فانوس میں شمع
شہر ویران، گلی کوچوں کے ذرے بے جان
آسماں جیسے کسی جوگی کی خالی کٹیا
تیرہ و تار و خموش:
چاند یک گام افق سے ابھرا
اور پھر ڈوب گیا رات کی پہنائی میں
ذہن پھر جاگ اٹھا عالم تنہائی میں

(زمستاں)

سحر کے صنائع ملاحظہ کیجئے ''دل و جاں طالب سیال حیات''، ''برگ خزاں دیدہ''، ''طاق و محراب میں قندیل''- سحر انصاری کی طویل نظم ''آثار خانہ'' پر اقبال کی طویل نظم ''تصویر درد'' کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں- اسی طرح سحر انصاری نے صنائع کے ساتھ ساتھ بدائع پر بھی بھرپور توجہ دی ہے- بدائع دراصل کلام میں وہ خوبیاں کہلاتی ہیں جن سے شعر کے معنوی محاسن و اوصاف ظاہر ہوتے ہیں- سحر کے کلام کو اگر ہم گنجینہ معنی کا طلسم کہیں تو بے جا نہ ہوگا- وہ اس لئے کہ ان کے تصورات میں جو تلمیحات و اشارات رقص کناں ہوتی ہیں، انہیں وہ چابکدستی سے شعر کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں- ویسے بھی سحر کی نظمیں معتبر جرائد و رسائل میں زینت بنتی رہی ہیں- ''رسالہ افکار'' اس لحاظ سے سرفہرست ہے- اقبال کا رنگ و آہنگ سحر کی نظم ''یادیں'' میں ملاحظہ کیجئے، اس سے پہلے اقبال کی نظم ''بزم انجم'' کا یہ بند دیکھئے ؎

اے شب کے پاسبانو! اے آسماں کے تارو — تابندہ قوم ساری گردوں نشیں تمہاری
چھیڑو سرود ایسا، جاگ اٹھیں سونے والے — رہبر ہے قافلوں کی تاب جبیں تمہاری
آئینے قسمتوں کے تم کو یہ جانتے ہیں — شاید سنیں صدائیں اہل زمیں تمہاری
رخصت ہوئی خموشی تاروں بھری فضا سے
وسعت تھی آسماں کی معمور اس نوا سے

(بزم انجم) بانگ درا

سحر انصاری کی نظم ''یادیں'' ملاحظہ کیجئے ؎

دل سوچ رہا ہے کہ ترا پیکر رنگیں — مہتاب کی بہتی ہوئی چاندی میں نکھر کر
ممکن ہے کہ ہو زیر قبائے گل و لالہ — تاروں کے شبستاں میں درخشاں و منور
ہونٹوں پہ ترے تازگی غنچۂ تازہ — آنکھوں میں تری نرگس رنگین گلشن
ہاتھوں میں ترے شبنم خوش آب کی مالا — قدموں میں ترے فصل خزاں دیدہ کا مدفن
یہ چاند دریچے میں جو در آئے تو شاید — تقریب کلام دل برباد ہو پیدا
ورنہ یونہی کچھ سوچ کے سوجائے گا چپ چاپ — اس ڈر سے، نہ اب عالم فریاد ہو پیدا

(یادیں)

سحر کے ہاں تراکیب لفظی، صنائع بدائع کا اہتمام ملاحظہ کیجئے، ان نظموں میں اقبال کے اثرات واضح دکھائی دیتے ہیں- چند تراکیب لفظی مثلاً ''قبائے گل لالہ''، ''نرگس رنگینی گلشن''، ''شبنم خوش آب کی مالا''، ''فصل خزاں دیدہ کا مدفن''، ''تقریب کلام دل برباد''، یہی وہ انداز سخن ہے جو ہمیں اقبال سے پہلے کی شاعری میں نہیں ملتا- اقبال نے زبان کے لحاظ سے شاعری میں بے پناہ وسعت دی- سحر کی متعدد نظمیں اس بات کا پتا دیتی ہیں کہ انہوں نے بھی اقبال کے رنگ و آہنگ فکری و اسلوبیاتی نظام سے بہت کچھ اخذ کیا ہے-

زبیر رضوی:

زبیر رضوی کے ہاں شعری اصناف کے نہایت عمدہ تجربے ملتے ہیں- انہوں نے پابند اور آزاد نظم دونوں میں جدیدیت کو اولیت دی ہے- مغربی شعراء نے آزاد نظم میں گراں بہا اضافہ کیا- یورپ کے متعدد شعراء جس میں ازرا پاؤنڈ، ایلیٹ، فلیچر وغیرہ، انہوں نے انقلابی تبدیلی کر کے نظم کے نئے سانچے تخلیق کیے- اردو میں یہ نظم عبدالحلیم شرر نے اپنے رسالہ ''دلگداز'' میں سب سے پہلے ''فلورنڈا'' لکھ کر ابتداء کی- نظم کی اس ہیئت کو آگے بڑھانے میں اسماعیل میرٹھی نے بے شمار نظمیں لکھیں- اس طرح یہ نظم کی ہیئت شہرت کے عروج تک جا پہنچی- زبیر رضوی نے بھی بڑی معرکتہ الآ راء نظمیں کہہ کر اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ نظم کے دامن میں ابھی بہت وسعت ہے-

زبیر رضوی نے اقبال کی تلمیحات و اشارات سے استفادہ کیا ہے- اس کے علاوہ بھی انہوں نے رومانی نظمیں بھی نہایت عمدہ کہی ہیں- اقبال نے تلمیحات کثرت سے استعمال کی ہیں- ''بانگ درا'' کی نظم ''صدیق'' اس کی بہترین مثال ہے جبکہ زبیر رضوی نے ''علی بن متقی رویا'' نظم کہہ کر اقبال کے اثرات قبول کیے ہیں- اقبال کی نظم 'صدیق' ایک مشہور واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے، جس میں مال کا جمع کرنے کا ذکر ہے- دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

اک دن رسول پاکؐ نے اصحاب سے کہا ۔۔۔ دیں مال راہ حق میں جو ہوں تم میں مالدار
ارشاد سن کے، فرط طرب سے عمر اٹھے ۔۔۔ اس روز ان کے پاس تھے درہم کئی ہزار

(صدیق) بانگ درا

زبیر رضوی کی نظم ''علی بن متقی'' ملاحظہ کیجئے ؎

پرانی بات ہے
لیکن یہ انہونی سی لگتی ہے
علی بن متقی مسجد کے منبر پر کھڑا
کچھ آیتوں کا ورد کرتا تھا
جمعہ کا دن تھا
مسجد کا صحن
اللہ کے بندوں سے خالی تھا

یہ پہلا دن تھا مسجد میں کوئی عابد نہیں آیا
علی بن متقی رویا

(علی بن متقی)

زبیر رضوی کی نظم ''حسن طلب'' جس میں جمالیاتی پیکر تراشے ہیں۔ اقبال نے ضرب کلیم میں ''عورت'' پر نظم لکھ کر عورت کے وقار میں اضافہ کیا ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ   اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی   کہ ہر شرف ہے اسی دُرج کا دُر مکنوں

(عورت) ضرب کلیم

زبیر رضوی کی نظم ''حسن طلب'' ملاحظہ کیجئے ؎

مجھے خبر ہے کہ اس شہر کے غزالوں میں
تمہارے نام نے شہرت کا حسن پایا ہے
دیار قفس میں لیلیٰ آرزو بن کر
تمہاری ذات نے دھومیں بہت مچائی ہیں
شفق بھی، پھول بھی، شبنم بھی، ماہ تاب بھی تم
صبا بھی، رنگ بھی، خوشبو بھی، آفتاب بھی تم
طلسم نغمہ بھی، رنگین بہار بھی تم
فسوں طراز بھی، تصویر طرحدار بھی تم
چلی جو بات تو کتنے ہی تم کو نام دیئے
جنوں پرستوں نے دامان شوق چاک کئے

(حسن طلب)

زبیر کی ایک اور نظم ''سیاہ پٹی'' ملاحظہ کیجئے ؎

ہم ابھی کچھ دیر پہلے ساتھ تھے
شہر سارا یوں لگا تھا
جیسے اپنے ہی تعاقب میں
کرن سورج کی تھامے چل رہا ہے
اس کی آنکھیں بن کے پتھر اٹھ رہی تھیں
قرب کے آئینے چھن سے ٹوٹ کر ریزہ ہوئے تھے
ہونٹ اپنے سل گئے تھے
جسم اپنے جل گئے تھے

(سیاہ پٹی)

ان نظموں میں اقبال کا فکری پرتو بھی ہے اور ساختیاتی نظام بھی۔ طرز اسلوب بھی اپنایا گیا ہے۔ زبیر رضوی نے آزاد نظم اختیار کرتے ہوئے اپنے جذبات واحساسات کا اظہار نہایت بے تکلفی سے کیا ہے۔ اس لئے ان کی نظمیں زندہ رہنے والی ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی:

ان کی نظم ''مناجات نامقبول'' میں جو تراکیب استعمال ہوئی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ فاروقی اقبال کی نظم مسجد قرطبہ سے متاثر ہوئے ہیں۔ اقبال کی اس نظم میں زمان ومکاں، فن تاریخ اور انقلاب کے جودھارے آپس میں ملتے ہیں، یہی کچھ کیفیت فاروقی کی نظم مناجات نامقبول میں پائی جاتی ہے۔ اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' طویل نظم ہے اور یہ ترکیب بند میں ہے۔ دو شعر ملاحظہ کیجئے ؎

سلسلہ روز و شب، نقش گر حادثات　　　سلسلہ روز و شب، اصل حیات و ممات
سلسلہ روزو شب، تار حریر دو رنگ　　　جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

(مسجد قرطبہ) بال جبریل

''مناجات نامقبول'' ملاحظہ کیجئے، اس نظم میں حسرت بھری تمنا اور تجدید احیائے ملت کے ساتھ جو اضطرابی کیفیت ملتی ہے، بلاغت کے لحاظ سے بھی اور صنائع بدائع کے اعتبار سے بھی یہ نظم اقبال کے فکری زاویے سے بھی قریب نظر آتی ہے ؎

اس سے پہلے کہ
نقاب گل وگل زار میں پوشیدہ کہیں
اپنے پیوند لگے جبۂ صد رنگ میں ملبوس
مسخرہ موت کا میرے چمنستاں ودرو بام پہ کالک لیپے
ہانپتے جسم تھیٹر کے کھلاڑی کی طرح
ہستی موہوم کا اک سایۂ بے وزن بنیں
صورت بے شکل بنیں
اس سے پہلے کہ
سمندر لب افسوں کو ہلا کر شب مہتاب
کے ٹکڑے کردے

(مناجات نامقبول)

لفظی تراکیب ملاحظہ کیجئے ''نقاب گل وگلزار''، ''جبۂ صد رنگ''، ''مسخرہ موت کا''، ''سایہ بے وزن بنیں''، ''صورت بے شکل''، ''سمندر لب افسوں''۔ فاروقی کہ یہ تراکیب جوانہوں نے اقبال سے استفادہ کرتے ہوئے وقت کے ادراک میں سیندور بھر دیا، نئی تراکیب سے جدید شاعری میں نئے امکانات نظر آنے لگے۔

یوسف ظفر:

یوسف ظفر حلقہ ارباب ذوق کے نمائندہ شاعر ہیں- انہوں نے نظم میں متعدد تجربے کئے ہیں، جو ان کی ذہنی اپج اور اختراع ہے- ان کی نظموں میں تنوع بھی ہے اور جدید علامتیں بھی، اسی طرح اقبال نے اس روش سے گریز کیا جو اس وقت میں شاعری کا مزاج تھا- نظم میں ایک نئے رجحان کو اجاگر کیا اور وہ رجحان فطرت نگاری اور منظر نگاری کی طرف خود کو مائل کرنا، اس کے بعد اقبال نے اسلامی نقطۂ نگاہ سے اپنی تہذیب، ثقافت اور اپنی اقدار پر بڑی جاندار نظمیں لکھیں، جنہیں ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے- یوسف ظفر نے نظم ''منزل'' پر اقبال کی نظم ''التجائے مسافر'' سے استفادہ کیا ہے ؎

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری فیض عام ہے تیرا
ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم
نظام مہر کی صورت نظام ہے تیرا
(التجائے مسافر) بانگ درا

یوسف ظفر کی نظم ''منزل'' ملاحظہ کیجئے ؎

مسافر! وہاں
بادلوں میں نہاں ...... ایک جنت نشاں ہے ٹھکانا
جہاں ریشمیں راگ ستار ہے ہیں، اکسا رہے ہیں، شمع بہاراں
جہاں کاخ در کاخ بوئے غزل خواں
سحر کے لئے کھولتی ہے دریچے
جہاں شاخ در شاخ گل جھانکتے ہیں
وہاں ...... چاند تاروں کے نیچے
مسافر وہاں زندگی گا رہی ہے جوانی کی لے پر محبت کا گانا
مگر تم نہ جانا ...... وہاں تم نہ جانا

(منزل)

پوری نظم میں جو استعارے اور تراکیب استعمال ہوئی ہیں، وہ تمام اقبال کا ہی فیض ہے مثلاً مشرقی ظلمتوں میں نہاں، آب دریا کی موج خراماں، رسیلے تبسم، خوابوں کے سیمیں دریچے، پیٹ کی آگ میں راگ، ان تراکیب لفظی کو دیکھ کر بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یوسف ظفر بھی اقبال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے-

یوسف ظفر کی ایک اور نظم ''الہامات'' تشبیہات واستعارات کا اعلیٰ نمونہ ہے- اس نظم میں تلمیحات کا استعمال بھی اقبال ہی کی فکر کا نتیجہ ہے- اقبال کی نظم ''مومن'' ملاحظہ کیجئے ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن
جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں
جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن

(مومن) ضرب کلیم

یوسف ظفر کی نظم ''الہامات'' ملاحظہ کیجئے ؂

زلف و رخ بہتر ہیں صبح و شام سے — کون الجھے گردش ایام سے
جب چھلک کر مے گرے گی جام سے — سورج ابھرے گا بساط شام سے
بزم انجم، دور مے، فصل بہار — سب کو نسبت ہے تمہارے نام سے
اب نہ بجلی ہے نہ صیاد و خزاں — میں قفس میں ہوں بڑے آرام سے
ہے جو کچھ اندھیر صبح عشق میں — کیا کہوں آسودگان شام سے
یہ ستارے، یہ قمر، یہ آفتاب — گردشیں پاتے ہیں مرے جام سے

شہ پر جبریل ہے فکر بلند
شاعری منسوب ہے الہام سے

(الہامات)

اس نظم میں بھرپور تغزل ہے- یہی وہ خوبی ہے جو اقبال کا فخر و امتیاز سمجھا جاتا ہے- اقبال کی نظموں میں تغزل ہی تغزل نظر آتا ہے، اسی وجہ سے دیگر شعراء نے اس آہنگ کو اپنایا- یوسف ظفر کی نظموں میں بھی اقبال کا صوتی آہنگ پایا جاتا ہے- جیسے اقبال کی نظم ''ذوق و شوق'' کا مطالعہ کریجئے - ایک تسلسل اور تفصیل و تشریح کے ساتھ قلب و روح کی گہرائی اور ارفع احساس نظر آتا ہے- اسی طرح یوسف ظفر نے بھی یہی طرز اپناتے ہوئے غنائیہ اور تخاطب کو پیش نظر رکھا اور نہایت عمدہ نظمیں لکھ کر اپنی انفرادیت کو قائم رکھا- یوسف ظفر کی وہ نظمیں جو تحریکات کا آئینہ ہیں، وہ یہ ہیں ''اینٹ کے بت''، ''آگ''، ''جنگ''، ''نئی تہذیب''، ''انصاف'' وغیرہ- ان کے ہاں حسی تصورات اور تلازمات کا انتخاب نہایت عمدہ ہے- نظموں میں اصوات کا عمل تیز ہے- تشبیہات و استعارات نہایت دلکش اور معنی خیز ہیں-

احمد ریاض:

ان کی نظموں میں اقبال کی تاریخی تلمیحات و اشارات کا زیادہ اثر پایا جاتا ہے- ''مسجد قرطبہ'' اقبال کی نظم تاریخی اعتبار سے نہایت اہم ہے- دو شعر ملاحظہ ہوں ؂

سلسلہ روز و شب، نقش گر حادثات — سلسلہ روز و شب، اصل حیات و ممات
سلسلہ روز و شب، تار حریر دو رنگ — جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

(مسجد قرطبہ) بال جبریل

احمد ریاض کی نظم ''نئی داستان'' ملاحظہ کیجئے ،،اس میں تاریخی اور تخاطب اسلوب اپنایا گیا ہے، جسے خالصتاً اقبال کا اثر کہا جاسکتا ہے ؎

قاہرہ کے طلائی محلات میں، خواب گاہان بغداد و عمان میں
دجلہ و نیل کے ساحلوں کے قریں جگمگاتے ہوئے کاخ و ایوان میں
فتنہ آشام فاروق و فیصل کے مغرور خوابوں کی پائندگی کے لئے
کج کلاہوں کی پیاسی نگاہوں میں مخمور نیندوں کی دل بستگی کے لئے
اب کوئی شہزاد، اب کوئی اپسرا داستانیں سنانے نہیں آئے گی
اب کوئی خوش بیاں کوئی شیریں دہن کوئی شاداب نغمہ نہیں گائے گی
وقت اک داستاں کہہ رہا ہے سنو، اک نئی بات بتلا رہا ہے سنو
اک نیا دور پرچم اٹھائے گیت گاتا ہوا آ رہا ہے سنو

(نئی داستان)

''قاہرہ''، مصر کا دارالخلافہ ''بغداد و عمان''، ''دجلہ و نیل''، کاخ و ایوان''، ''فتنہ آشام فاروق و فیصل''، ان تراکیب سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ احمد ریاض کی نظموں پر اقبال کی تاریخی نظموں کا رجحان پایا جاتا ہے-بعد کے شعراء میں احمد ریاض نظم کے حوالے سے ایک اعتبار رکھتے ہیں-ان کی نظموں میں دلکشی بھی ہے اور سوز و گداز بھی نظم کے شاعروں میں منفرد مقام رکھتے ہیں-

عارف عبدالمتین:

عبدالمتین کی نظموں میں جو نئے رجحان ملتے ہیں، اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اقبال اور ان کے معاصر شعراء نے نظم کو جدید پیرائے میں اس قدر وسیع کر دیا کہ لاکھ ہا موضوعات سر اٹھائے نظر آتے ہیں- ہیئت اور تکنیک کے آئے دن کے تجربے اس بات کا ثبوت ہیں کہ نئے شعراء میں عارف عبدالمتین نے نظم میں اپنا ایک منفرد مقام بنا لیا ہے- ان کے ہاں نظموں میں تیکھا پن اور کٹیلا اسلوب پایا جاتا ہے، جسے ہم طرح نو کا اظہار کہتے ہیں- ان کے نرالے انداز اور روزمرہ کے تجربے نے انہیں مشخص کر دیا-نظم ''سقوط'' میں افکار اور جذبات کی سرد جنگ ملاحظہ کیجئے، اقبال کی نظم ''شعاع امید'' میں اقبال کا اسلوب پختہ تر نظر آتا ہے ؎

مدت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہری ایام
نے ریت کے ذروں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثل صبا طوف گل ولالہ میں آرام

(شعاع امید)

عارف عبدالمتین کی نظم ''سقوط'' میں تشبیہات اور استعارات، نئے فکری زاویے، جس سے جدیدیت کا اظہار ہوتا ہے ؎

خستخانۂ احساس کو شعلے کی ادا دوں ‏ ‏ ادراک کی زنجیر پگھلنے کا مزا لوں
میں روح کے رہوار کو مہمیز لگا دوں ‏ ‏ یوں تن کے بیاباں میں کہیں خاک اڑا دوں

پیراہن جذبات کو صد پارہ کروں میں　　افکار کی تخریب کا نظارہ کروں میں
ہر تشنہ تمنا کا پہلو چاٹ کے خوش ہوں　　ہر سوختہ ارماں کا جگر کاٹ کے خوش ہوں
تدبیر کو تقدیر کے چنگل میں پھنسا دوں　　امید کو میں یاس کا زہراب پلا دوں
میں بند کروں روزن انفاس کسی طور　　دے دوں میں خیالات کو بن باس کسی طور
جی چاہتا ہے خود سے گزر جاؤں کہیں میں　　اس طرح سے بگڑوں کہ سنور جاؤں میں

(سقوط)

عارف عبدالمتین کی نظموں میں فطرت کی عکاسی اسی طرز پر پائی جاتی ہے جیسے کہ اقبال کی نظموں میں پائی جاتی ہے مثلاً ''ابر کوہسار''، ''ہمالہ''، ''آفتاب صبح''، ''ایک آرزو'' وغیرہ۔ متین کی نظم ''مرگ مہتاب'' پر اقبال کی نظم ''چاند'' کا اثر دیکھا جاسکتا ہے۔ اقبال کی نظم ''چاند'' کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

میرے ویرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن
ہے مگر دریائے دل تیری کشش سے موج زن
قصد کس محفل کا ہے؟ آتا ہے کس محفل سے تو
زرد رو شاید ہوا رنج رہ منزل سے تو

(چاند) بانگ درا

عارف عبدالمتین کی نظم ''مرگ مہتاب'' ملاحظہ کیجئے ؎

تیری رعنائی کے دل نشیں تذکروں کے کنول
میری بزم سماعت میں احباب ہر دم جلاتے رہے
میرے مخمور احساس پر بجلیاں سی گراتے رہے
میں بہت دور سے خود بھی ہر اک گھڑی
تیری قندیل زیبائی کی جانفزا ضو سے مسحور ہوتا رہا
اپنے سینے میں تیری محبت کے نشتر چبھوتا رہا
لیکن احباب کی دل کشا ہمرکابی میں جب
جادۂ شوق سے سرفروشانہ بڑھ کر چمٹنے لگا
منزل وصل کی سمت اڑنے لگا
میں نے دیکھا ان آنکھوں میں آنسو آئے
دامن صبر تھامے لبوں کو سیے
ایک اک ہم سفر راہ کی گرد میں کھو گیا

(مرگ مہتاب)

تراکیب لفظی ملاحظہ کیجئے ''تذکروں کے کنول''، ''بزم سماعت''، ''مخمور احساس''، ''قندیل زیبائی''، ''منزل وصل''، یہ وہ تراکیب ہیں جو اقبال کی وجہ سے نئے طرز پر وضع ہوئیں۔ اس لئے بعد کے شعراء پر اقبال کے اثرات مرتب ہونا لازمی تھے۔

سلام مچھلی شہری:

اقبال نے اپنے اسلوب کی بنیاد خطابیہ پر رکھی ہے۔اسی طرح سلام مچھلی شہری نے ہیئت کے اعتبار سے نظم آزاد اختیار کی ہے۔اسلوب اقبال سے لیا ہے۔اقبال کی نظم ''آزادی'' ضرب کلیم کی نمائندہ نظم ہے، دوشعر ملاحظہ ہوں ؂

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے حریت افکار کی نعمت ہے خداداد
چاہے تو کرے کعبے کو آتشکدۂ پارس چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
ہے مملکت ہند میں اک طرفہ تماشا اسلام ہے محبوس، مسلمان ہے آزاد

(آزادی) ضرب کلیم

سلام مچھلی شہری کی یہ نظم ہیئت کے اعتبار سے آزاد نظم ہے،فکری میلانات اقبال سے مستعار لئے ہیں ؂

نہیں فاروقی! اس دھرتی کو میں ہرگز نہ چھوڑوں گا
مجھے جس دور نے پالا ہے، وہ بے شک پرانا ہے
مجھے محبوب اب بھی عہد رفتہ کا فسانہ ہے
مگر یہ دور نو
یہ ضو
شعاع آگہی کی رو
میں اتنی خوب صورت زندگی سے منہ نہ موڑوں گا
اجل برحق سہی لیکن
رہے گا جب تک ممکن
میں چاہوں ں گا کہ لپٹا ہی رہوں دھرتی کے دامن سے
یہ دھرتی آسمانوں سے زیادہ خوب صورت ہے

(یہ دھرتی خوبصورت ہے)

سلام مچھلی نے فطرت کی عکاسی پر بھی اچھی نظمیں کہی ہیں، ان میں سے ایک نظم ''گیتوں کی کوئلیا بولے'' حسن فطرت پر بہترین نظم ہے، اقبال نے ''پرندے کی فریاد'' میں فطرت نگاری کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے، سلام مچھلی کی نظم ملاحظہ کیجئے ؂

میرے گیتوں کی من بھاوَنی کوئلو!
جب تک ہو سکے گنگناتی رہو،
ان دنوں نبض عالم ذرا تیز ہے!
میری کوتیاؤں کے باغ کی تتلیو!
اپنے رنگین آنچل اڑاتی رہو،
جو بھی ہو، یہ فضا بھی جنوں خیز ہے!

اقبالؔ نے ''بانگ درا'' میں ''مرزا غالب'' عنوان سے جو نظم لکھی ہے، اس نظم میں جو خصوصیت سامنے آئی ہے، وہ یہ کہ اقبال جیسا شاعر جو علوم شرقی اور غربی کا شناور ہو، غالب کا اعتراف کرتے ہوئے عقیدت اور تحسین کے پھول نچھاور کرتا ہے، اسی طرح سلامؔ مچھلی شہری نے بھی ''مرزا غالب'' نظم کہہ کر اقبال کی فکری جہتوں کا اعتراف کیا ہے، اقبال کا یہ بند ملاحظہ ہو ـــ

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا　　ہے پر مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

تھا سراپا روح تو، بزم سخن پیکر ترا　　زیب محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے

بن کے سوز زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

(مرزا غالب) بانگ درا

سلامؔ مچھلی شہری کی نظم ''مرزا غالب'' ملاحظہ کیجئے ـــ

''قطب'' کی محفل تخیل کی اک ماہ پارہ تھی

جو موج رنگ و نکہت، نور نغمہ تھی، شرارہ تھی

مگر گھبرا بھی جاتی تھی خود اپنے خواب رنگیں سے

ابھی کم سن تھی اور واقف نہ تھی آداب تزئیں سے

زمانہ گزرا، اور اس مہ جبیں پر بھی شباب آیا

یہی دن تھے کہ فن شاعری میں انقلاب آیا

دیار تاج سے اک شاعر اعظم ہوا پیدا

سراپا شعلۂ گل، نغمۂ شبنم ہوا پیدا

قطب کی محفل تخیل میں اک روشنی آئی

نگار ناز اب آئینے میں لیتی تھی انگڑائی

نکھر کر ایک دیوتا بن گیا تھا شعر و نغمہ کا

''مگر اک عندلیب گلشن نا آفریدہ تھا''

(مرزا غالب)

سلامؔ کی یہ نظم ''ہم قلم'' اپریل ۶۳ میں شائع ہوئی تھی۔ طویل نظم ہے۔ طرز ادا خطابیہ ہے۔ تراکیب لفظی ملاحظہ کیجئے۔ موج رنگ و نکہت، دیار تاج، نغمۂ شبنم، نگار ناز، نو بہار ناز، ضیائے علم و دانش اور بہت سی تراکیب جو ہمیں اقبال کے استعارات اور صنائع بدائع سے اخذ شدہ حاصل کلام جسے ہم سلام مچھلی شہری کی افتاد طبع سے تعبیر کرتے ہیں۔

قتیلؔ شفائی:

قیام پاکستان کے بعد نمایاں مقام حاصل کرنے والے شاعر قتیلؔ شفائی ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کی بنیاد حب الوطنی اور انسان دوستی پر رکھی۔ ان کے ہاں پابند نظم کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ نظم میں ہیئت اور تکنیک کے تجربے بھی کئے ہیں۔ زندگی،

سماج اور انسانیت جیسے موضوعات پر نظمیں لکھ کر اقبال کے افکار کو قبول کرتے ہوئے نئی تراکیب لفظی کو فروغ دیا۔قتیل کی نظم ''مینار پاکستان کے آس پاس'' پر اقبال کی نظم ''شفا خانہ حجاز'' کے اثرات ملاحظہ ہوں ؂

اک پیشوائے قوم نے اقبال سے کہا　　کھلنے کو جدہ میں ہے شفا خانہ حجاز
ہوتا ہے تیری خاک کا ہر ذرہ بے قرار　　سنتا ہے تو کسی سے جو افسانہ حجاز

(شفا خانہ حجاز) بانگ درا

قتیل کی نظم جس میں وطن کی محبت اور اس کی مٹی سے پیار کا جذبہ ظاہر ہو رہا ہے، ملاحظہ کیجئے ؂

بلندی سے جس فرش پر گر کے میں آج زخمی ہوا ہوں
وہ اک فرش سنگین ہے، کوئی پستی نہیں ہے
اگر میں بھی کچھ خاص لوگوں کی مانند پستی میں گرتا
تو ہڈی مرے پاؤں کی ریزہ ریزہ نہ ہوتی
بجائے سزا کے
مرے پاؤں کو چوم لیتی زمیں
اور پھر میرا سارا بدن ایک گہوارہ باد میں جھول جاتا
ہواؤں میں اڑتا ہوا دیکھ کر، ہر کوئی مجھ کو حیرت سے تکتا
مری ذات کو برگزیدہ سمجھتا،
مری حرکتوں کو کرامات گردانتا
مجھ کو پہنچا ہوا اک ولی مانتا
اور اگر چند کج فہم لوگوں کی رائے الگ سب سے ہوتی
تو کیا فرق پڑتا؟

قتیل شفائی کے اب تک جو مجموعے شائع ہو کر مقبول ہوئے ہیں، ان میں ''ہریالی''، ''روزن''، ''بازار''، ''جلترنگ''، ''گجر'' اور ''کلیات قتیل'' جدید شعراء میں معتبر مقام رکھتے ہیں۔

شہاب جعفری:

شہاب جعفری نے اپنی نظموں میں فطرت نگاری اور منظر نگاری کو اقبال کی تقلید میں پیش کیا ہے۔ اقبال کے ہاں فطرت نگاری پہ بے شمار نظمیں ہیں، انہی میں ''نسیم و شبنم'' بھی ہے۔اس میں مکالماتی طرز اختیار کیا ہے جبکہ شہاب نے بھی فطرت نگاری کے ساتھ مکالماتی طرز اختیار کرتے ہوئے اقبال کے اثر کا اعتراف کیا ہے، اقبال کی نظم کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؂

انجم کی فضا تک نہ ہوئی میری رسائی　　کرتی رہی میں پیرہن لالہ و گل چاک
کھینچیں نہ اگر تجھ کو چمن کے خس و خاشاک　　گلشن بھی ہے اک سر سرا پردہ افلاک

(شبنم) ضرب کلیم

شہاب جعفری کی نظم ''پس پردہ'' پر اقبال کی فکر اور مکالماتی اسلوب ملاحظہ کیجئے ؎

سورج کے پجاریوں نے دیکھا
رات اپنی اداسیوں کے بدلے
سورج کو گہن میں لے کے شاداں
کس شان سے آسماں سے اتری
رات اتنی سیاہ، سرد، خاموش
بے حس، بے رحم، بے اماں ہے
تصویر عذاب جاوداں ہے
سرچشمۂ نور کے نگہباں
لرزاں ہیں، کھڑے ہیں، دست بستہ
اقرار گنہ کی خامشی کے
خنجر نے زباں تراش دی ہے

(پس پردہ)

''ضرب کلیم'' میں مختصر نظمیں اور ان کا اسلوب اس بات کا اظہار ہیں کہ اقبال نے اپنی فکر کے تانے بانے مستقبل سے جوڑے ہوئے تھے، اس لئے بعد کے شعراء پر اثرات کا مرتسم ہونا لازمی تھا۔ شہاب جعفری کی نظم ''پس پردہ'' اس کا اظہار ہے۔

امجد اسلام امجد:

اقبال کی شاعری کا موضوع انسان ہے، اسی طرح دوسرے شعراء کے ہاں بھی اسی موضوع پر اچھی نظمیں نظر آتی ہیں۔ فطرت انسانی کے سربستہ راز اور اسرار کو شعری پیکر تراش کر فاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کا فلسفۂ خودی انسان دوستی کی ایسی دلیل ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا مثلاً اقبال کے چند شعر، جس سے یہ تائید ہوتی ہے، ملاحظہ ہوں ؎

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

یہی مقصود فطرت ہے، یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی

(اقبال)

ان اشعار کی روشنی میں امجد اسلام امجد کی نظموں کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اقبال کی خودی کی روشنی میں اپنی نظموں کی بنیاد رکھی ہے۔ امجد کی نظم ''شاید'' آزاد طرز پر ہے لیکن فکری آہنگ اقبال سے لیا ہے ؎

یہ ''آج'' جو کل میں زندہ تھا
وہ ''کل'' جو آج میں زندہ ہے

وہ ''کل''، جو ''کل'' کے ساتھ گیا
وہ ''کل'' جو ابھی آئندہ ہے
گزر چکے اور آنے والے
جتنے ''کل'' ہیں، جتنے ''کل'' تھے
ان کا کوئی وجود نہ ہوتا
ہم اور تم بے رسم ہی رہتے
''آج'' اگر موجود نہ ہوتا!

(شاید)

امجد کی نظم میں ''آج'' اور ''کل'' کے آئینے میں انسان کی یاد رفتگاں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اپنے ہونے سے وجود باری تعالیٰ کا اقرار جذبہ کا اظہار ہے۔

امجد اسلام کی دوسری نظم ''اس بھید بھری چپ میں'' جو تاثر ابھر کر آتا ہے۔ وہ یہ کہ انسان ہر دور میں عظیم ہے۔ اسی کیفیت کو اقبال نے اپنی نظم ''میں اور تو'' میں ظاہر کیا ہے، دو شعر ملاحظہ کیجئے ؎

مذاق دید سے ناآشنا نظر ہے مری تری نگاہ ہے فطرت کی رازداں پھر کیا
رہین شکوۂ ایام ہے زباں مری تری مراد یہ ہے دور آسماں، پھر کیا

(میں اور تو) بانگ درا

امجد کی نظم علامتی نظم ہے، اس میں پیغام ہے یعنی خود تکلیف برداشت کرو اور لوگوں کو آرام پہنچاؤ۔ شمع کو علامت ٹھہرایا ہے، ایک ایسے انسان سے جو سراپا عجز بھی ہے اور انکسار بھی، نظم ملاحظہ کیجئے ؎

اے شمع کوئے جاناں
ہے تیز ہوا، مانا
لو اپنی بچا رکھنا، رستوں پہ نگہ رکھنا
ایسی ہی کسی شب میں
آئے گا یہاں کوئی، کچھ زخم دکھانے کو
اک ٹوٹا ہوا وعدہ، مٹی سے اٹھانے کو
پیروں پہ لہو اس کے
آنکھوں میں دھواں ہوگا
چہرے کی دراڑوں میں
بیتے ہوئے برسوں کا، ایک ایک نشاں ہوگا
بولے گا نہ کچھ لیکن، فریاد کناں ہوگا

(اس بھید بھری چپ میں)

امجد اسلام امجد نے انسان کی مختلف تصویریں کھینچ کر انسانی عظمت کو فوقیت دی ہے۔ ان کی نظموں میں انسان کے دکھ

آلام، رنج ومصائب اور سب سے بڑھ کر انسان سے پیار کرنے کا جذبہ ملتا ہے اور یہ جذبہ ہمیں اقبال کی فکر اور ان کے اشعار میں خاصہ جاندار نظر آتا ہے- امجد اسلام امجد کی نظموں میں فطری عناصر اور داخلی حسیات پر بھی اقبال کے اثرات پائے جاتے ہیں-

مجید امجد:

موت اور حیات قدرت کی طرف سے ہے لیکن اقبال حیات کو حیات جاوداں کے معنی میں لیتے ہیں، وہ موت سے خوفزدہ ہونے کی تعلیم نہیں دیتے یعنی اقبال کے ہاں موت کا خوف بزدلی کی علامت بن کر ظاہر ہوا ہے، اقبال کہتے ہیں ؎

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقام حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحان ثبات

مجید امجد نے اپنی نظموں میں فلسفۂ موت وحیات کو موضوع بنا کر استعاروں کی مدد سے خود کو اقبال کے دبستان میں شامل کر لیا ہے، ان کی نظم ''ہیولیٰ'' میں ''بجھتی شمع'' موت کی علامت بن کر ابھری ہے، نظم ملاحظہ کیجئے ؎

برگ در پر، بام ودر پر، برف برف
کوئی نگری، کوئی نگری، برف برف
زرد سورج،، سیمگوں میداں رپہلی سیڑھیاں
سیڑھیوں کی موج اندر موج، ڈھلوانوں پہ چہرے چتر چتر
سیڑھیوں پر، سوقمر قوس، آئینوں کی اوٹ اوٹ
منتظر نظروں کی دنیا، عکس عکس
کتنے رنگوں سے، جو زیب دامن احساس تھے
بھر گئے تھے، سیڑھیوں تک راستے
جانے کس کے واسطے

(ہیولیٰ)

نظم میں نئے الفاظ کی ترکیب ہی اقبال کے اثرات کا پتہ دیتی ہے مثلاً ''سوقمر قوس'' نہایت اچھوتی ترکیب ہے- اس کے علاوہ اس نظم میں رپہلی سیڑھیاں، ڈھلوانوں پہ چہرے، نظم میں نئی علامتیں سامنے آئی ہیں- مجید امجد کا فکری اجتہاد دراصل اقبال کا مرہون منت ہے-

فطری مناظر پر مجید امجد نے نہایت عمدہ نظمیں کہی ہیں مثلاً ''ایک شام'' شام کے پرکیف مناظر کو بڑی چابکدستی سے نظم کیا ہے- اس نظم پر اقبال کی نظم ''نمود صبح'' کے آثار دیکھے جاسکتے ہیں، دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہو رہی ہے، زیر دامان افق سے آشکار — صبح، یعنی دختر دوشیزہ، لیل و نہار
پا چکا فرصت درود فصل انجم سے سپہر — کشت خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار

(نمود صبح) بانگ درا

اقبال کی شاعری میں ایک عظیم مقصد کار فرما ہے- ان کی نظمیں معنی ومفہوم کے لحاظ سے دیگر شعراء سے ممتاز ہیں کیونکہ

نظموں میں غنائی لہجہ، نغمگی اور الفاظ کی فصاحت و بلاغت کا برمحل استعمال، اس کے علاوہ مترنم بحروں نے نظموں میں جان ڈال دی، اسی طرح مجید امجد کی نظم میں یہ تمام خوبیاں نہایت عمدگی سے پائی جاتی ہیں، نظم ملاحظہ کیجئے ؎

دیکھ، پھر آج بھی اس نگری میں
شام کی کرنیں، تیرے ساتھ چلی ہیں
تیرے ساتھ چلی ہیں!
دیکھ اب، کہیں کہیں ان لمبی، لال، لوؤں کی لڑیاں، میلی دھوپ میں بجھ کے،
رستوں سے پیوست پڑی ہیں،
کہیں کہیں، یہ زرد سلگتے، تیکھے، بان دلوں میں چبھ کر ٹوٹ گئے ہیں
آسمان سے لے کر سطح زمیں تک
ہر سو پھیل گئی ہیں لاکھ خراشیں
دکھتی خراشیں، گہری، الجھی ہوئی لہریلی،
پگھلی ہوئی، بے جسم، سلاخیں، پتلی پتلی، پیلی پیلی
دیکھ، اب ان سیال سلاخوں کی چمکیلی باڑھ پہ جتنے پھول تھے، ان کو
توڑ کے لے گئے بے سدھ جھونکے،
باقی صرف اک سرد سیاہ الجھاؤ!

(ایک شام)

مجید امجد کے ہاں تراکیب لفظی اور صنائع بدائع کا جو عمل ہمیں ملتا ہے، ان میں میلی دھوپ، لوؤں کی لڑیاں، بان دلوں، سرد سیاہ الجھاؤ، ایسی تراکیب ہیں، جو اقبال کی شاعری کے بعد شعراء کے ہاں نمودار ہونا شروع ہوئیں۔

شاد امرتسری:

جدید نظم نگاروں میں شاد امرتسری کا نام اہمیت کا حامل ہے، وہ اس لئے کہ انہوں نے نظم کو موضوع اور اسالیب کے علاوہ بھی ایک نئے ڈکشن سے متعارف کرایا ہے مثلاً ان کے ہاں ہیئت کے تجربے بھی ہیں اور جنسی جبلت کا اظہار بھی۔ نظم میں جو علامتیں برتی گئی ہیں مثلاً کالا کبوتر، سفید سایہ، ان علامتوں سے جدیدیت کو تقویت ملتی ہے اور نظم کو ایک نیا رخ ملا ہے، اقبال نے اپنی نظم ''آدم'' میں جس انسان کا نقشہ کھینچا ہے، وہی انسانی عظمت کی دلیل ہے، دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

طلسم بود و عدم جس کا نام ہے آدم — خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن
اگر نہ ہو تجھے الجھن تو کھول کر کہہ دوں — وجود حضرت انساں نہ روح ہے نہ بدن

(آدم) ضرب کلیم

شاد امرتسری کی نظم ''اپنا مکان''، جس میں اقبال کے انسان کی جھلک نظر آتی ہے، جسے اقبال کا علامتی نظام کہا جا سکتا ہے،

نظم ''اپنا مکان'' ملاحظہ ہو ـــ

رات کی گہری تاریکی میں
دروازے کی جھپکی آنکھیں
خاموشی کو دیکھ رہی ہیں
آنگن میں اک کالا کبوتر
بیٹھا رستہ دیکھ رہا ہے
آنے والے ایسے پل کا
جب سورج کا دہکتا سینہ
بالکل ٹھنڈا ہو جائے گا

(اپنا مکان)

شاد امرتسری نے اپنی تہذیب اور ثقافت کو علامتی پیکر میں پیش کر کے لفظ ''آنگن'' کو علامت کے طور پر پیش کیا ہے جیسا کہ اقبال کے ہاں علامتی طرز ہمیں ملتا ہے- ان کی شاعری میں داخلی حسیات کا رجحان زیادہ ہے-

عبدالحمید عدم......۱۹۰۹ء-۱۹۸۱ء:

عدم کا شمار ان شعراء کے ساتھ ہوتا ہے جنہوں نے اپنی اساس خمریات اور جمالیات پر رکھی ہے- اختر شیرانی، ریاض خیر آبادی، جگر مراد آبادی- ان کے ہاں ناؤ نوش بھی ہے اور رخ جاناں کی حکایتیں بھی- عدم بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن ان کی نظمیں اس پایہ کی ہیں جنہیں محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے کیونکہ ان کی آواز دل کی آواز ہے- یہ آواز اس وقت اور پر اثر ہو جاتی ہے جب اس میں رندی کی سرمستی اور بیبا کی شامل ہو جاتی ہے- یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاعری کبھی ایک جیسی نہیں رہی- اس میں تغیر آتا رہتا ہے، جہاں عہد کروٹ بدلتا ہے، وہاں شاعری اپنا رخ خود بخود موڑ لیتی ہے- کوئی بھی شاعر حالات سے بے خبر نہیں رہ سکتا- مغلیہ سلطنت سے لے کر جنگ آزادی تک جو بھی ملکی حالات رہے ہوں، اس میں جاگیردارانہ نظام کو تقویت حاصل رہی، اسی لئے شعراء نے ان کے خلاف نظموں میں بھرپور طریقہ سے احتجاج کیا- عدم کا اولین مجموعہ ''نقش دوام'' ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا- یہ نظموں کا مجموعہ ہے- اس کے علاوہ بیشتر مجموعوں میں بھی نظمیں ہیں اور یہ نظمیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ عدم کو اپنے سماج اور معاشرتی زبوں حالی کا بھی احساس ہے- ''رنگ و آہنگ'' میں بھی چند نظمیں لکھ کر مناظر فطرت اور جمالیات پر ایک اچھوتا کام کیا ہے- ان کی نظموں کا رنگ و آہنگ اقبال اور حفیظ کے طرز پر ہے- عدم نے ایک مثنوی بھی لکھی ہے، بعنوان ''داستان ہیر''-

عدم نے اپنی نظموں میں تشبیہات و استعارات کو نئی علامتیں دے کر فن شاعری کو سجا کر پیش کیا ہے- محاکاتی نقطۂ نظر سے عدم کی نظموں میں تخیل کی پرواز دیکھنے کے قابل ہے-

ان کی نظموں کی سب سے اہم خصوصیت جو ہے وہ موسیقیت ہے جس میں صوتی آہنگ اور ترنم اس امتزاج نے ایک ایسا کیف و سرور پیدا کر دیا ہے، روانی و سلاست کو بھی پیش نظر رکھا- انہوں نے نظموں میں بے تکلفی اور حسن ادا کا جو خیال رکھا ہے، اس سے سحر کاری کا گمان ہوتا ہے- ان کے لہجہ میں کھنک بھی ہے اور دھیمہ پن بھی- ان کی شاعری غنائی شاعری ہے- عدم کی نظموں پر

تاجورؔ نجیب آبادی جیسے نابغہ نے بھی تحسین کے پھول چڑھائے ہیں- ان کی نظموں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی نظموں میں انسانی زندگی کا گہرا مشاہدہ اور انسان دوستی جیسے جذبے کو پیش نظر رکھتے ہوئے امید اور نشاط کے نغمے الاپتے رہے ؎

غریب انساں کی سادہ لوحی فریب میں مبتلا رہے گی
جو آسمانوں پہ پس چکے ہیں وہ دیوتا سرگرداں رہیں گے

عدمؔ کی نظموں میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ روزمرہ کی گفتگو کو شاعری میں استعمال کرتے ہیں- ان کی چند نظموں کے عنوان دیکھئے ''سنگ ریزے''، ''خمیازہ''، ''سوسائٹی''، ''خدا خدا کیجئے''، وغیرہ- ان نظموں میں مناظر فطرت، جمالیات اور سماجی انتشار کو موضوع بحث بنایا گیا ہے- عدم کی نظم ''انقلاب'' جس میں وطن کی بحالی اور رزق کی فراوانی کا ذکر اپنے خاص انداز میں کیا ہے ؎

خدا کا کام چل پڑا نیا نظام چل پڑا
جو غاصبوں کا مال تھا وہ رزق عام چل پڑا
وطن عروج کی طرف یہ تیز گام چل پڑا
سعادتوں کا سلسلہ بہ اہتمام چل پڑا
ہر اک فقیر کے لئے سخی کا جام چل پڑا
بہ آب و تاب آ گیا
وہ انقلاب آ گیا

(انقلاب) [1]

مندرجہ بالا نظم میں یاسیت نام کو نہیں، امید کے چراغ جل رہے ہیں، رزق، وطن، نیا نظام اور وہ انقلاب، علامتیں ہیں- جو بہتر اور تابناک مستقبل کی نوید بن کر ظاہر ہوا ہے- عدم کی دوسری نظم ملاحظہ کیجئے، اس میں بھی ترقی پسند رجحانات کی عکاسی ملتی ہے- ترقی پسند شعراء پر اقبال کے اثرات اور نقوش ملتے ہیں اس لئے عدم ایک ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے مشخص ہو چکے تھے اس لئے ان کی نظموں میں بھی اقبال کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں ؎

رزق کی افراط سے دیہات مالا مال ہے جس کو کہتے ہیں کساں وہ رحمت سیال ہے
رازق کونین کا دست کرم دیہات ہے شہر یاروں کے خزانوں کا بھرم دیہات ہے
بعد میں جو کچھ ہوا محتاج تفصیلات ہے
اس جہاں کی سب سے پہلی روشنی دیہات ہے

(دیہات) [2]

''رحمت سیال'' نئی اور نرالی ترکیب ہے- ''دیہات'' کو علامت بنا کر عدم نے اصل کیفیت کو ظاہر کیا ہے کہ محنت کسان کرے، محرومیوں کی دھوپ میں کسان کھڑا رہے، رقص و سرود کی محفلیں شہروں میں سجائی جائیں، اس دیہات کی طرف سرمایہ داروں کی توجہ مبذول کرانا ہی عدم کی نظموں کا مقصد ہے- مندرجہ ذیل نظم میں خودداری، وقار اور عزت نفس اجتماعی اعتبار سے نظم کو سجایا

۱- رنگ و آہنگ، ص ۱۰۶

۲- رنگ و آہنگ، ص ۱۰۰

ہے۔ترقی پسند رجحان ملاحظہ کیجئے ؎

اگرچہ صید غم روزگار ہیں ہم لوگ　　قسم خدا کی سراپا بہار ہیں ہم لوگ
فقیہہ شہر ادب سے کلام کر ہم سے　　ستم ظریف بڑے باوقار ہیں ہم لوگ
یہ گلستاں، یہ صبا، یہ پرند، یہ جھرنے　　ہزار رنگ کے نقش نگار ہیں ہم لوگ
عجیب سرور مشقت میں ہم نے پایا ہے　　عجیب رنگ کے بادہ گسار ہیں ہم لوگ
زمیں کے پیٹ سے سونا کشید کرتے ہیں
ہنر فروز و ہنر آشکار ہیں ہم لوگ

(ہم لوگ)[1]

زمیں کے پیٹ سے سونا کشید کرنا، مزدور کی محنت کی طرف اشارہ ہے یعنی محنت ہی ہماری شناخت ہے اور مزدور کو محنت ہی سے سرور ملتا ہے۔ ہنر فروز کیا اچھی اور نئی ترکیب ہے۔

جمیل ملک:

جمیل ملک کی نظموں کا آہنگ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انہوں نے حالات و واقعات کی منظر نگاری کے ساتھ فطرت کے ان حسین مناظر کا نقشہ بھی کھینچا ہے، ان نظموں میں اقبال کی فکر کے اثرات بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں مثلاً ''طلوع''، نظم میں اقبال کی نظم ''نوید صبح'' کے اثرات ملاحظہ کیجئے، اقبال کی یہ نظم ترکیب بند میں ہے ؎

آتی ہے مشرق سے جب ہنگامہ در دامن سحر
منزل ہستی سے کر جاتی ہے خاموشی سفر
محفل قدرت کا آخر ٹوٹ جاتا ہے سکوت
دیتی ہے ہر چیز اپنی زندگانی کا ثبوت

(نوید صبح) بانگ درا

جمیل ملک کی نظم ''طلوع'' ملاحظہ کیجئے، اس میں تشبیہات و استعارات سے انسانی زندگی کو بیدار کر کے اعلیٰ مقام عطا کیا ہے ؎

شب کا مہمان ہوں میں، نیند کہاں سے آئے
دل سے اک ٹیس اٹھے، پھیلتی، بڑھتی جائے
زندگی، وقت کی رو بن کے، خلا میں جھولے
دور سے آتی ہوئی چاپ، زمیں کو چھولے
رات کا پچھلا پہر، اور گھنا سناٹا
کتنی صدیوں کا سفر ایک ہی پل میں کاٹا

۱۔ عدم شخصیت وفن، ص ۹۶

چھوڑ جائے گی مجھے رات بھی آخر، تنہا
میرے اس جذبۂ خاموش کا پھر کیا ہوگا
طفل معصوم ہوں، تنہائی میں کھو جاؤں گا
دن کی دہلیز پہ روتا ہوا سو جاؤں گا

(طلوع)

یہاں ''طلوع'' سے مراد زندگی کا ادراک ہے، جسے خودی سے تعبیر کیا گیا ہے-یہی وہ آہنگ اور اسلوب ہے جو اقبال سے مخصوص ہے-جمیل ملک کی بیشتر نظموں میں آہنگ کے ساتھ ہیئت کے تجربے بھی ملتے ہیں-وہ نظمیں جو جدید رجحان کی حامل ہیں، ان میں ''معصومیت''، ''مشرق''، ''پرکھ''، ''امر'' اس قبیل سے ہیں جن میں اقبال کے اثرات کو دیکھا جا سکتا ہے مثلاً فطری مناظر پر ''مشرق'' بہترین نظم ہے، اقبال کی نظم ''جمعیت اقوام مشرق'' کے اثرات ملاحظہ کیجیے ؎

پانی بھی مسخر ہے ہوا بھی ہے مسخر
کیا ہو جو نگاہ فلک پیر بدل جائے
دیکھا ہے ملوکیت افرنگ نے جو خواب
ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے

(جمعیت اقوام مشرق) ضرب کلیم

جمیل ملک کی نظم ''مشرق'' ملاحظہ کیجیے، ہیئت کے اعتبار سے آزاد نظم ہے لیکن خیالات کی ترسیل اقبال کی فکر سے ماخوذ ہے ؎

پہاڑوں پہ یلغار کرتے ہوئے کالے بادل
درختوں سے دست و گریباں
کھلی وادیوں میں چھما چھم برستی ہوئی موسلا دھار بارش
گرج، رعد، طوفاں
قیامت کے ساماں
مگر اب
نہ بادل نہ طوفاں
نہ شورِ قیامت
ہری وادیاں ڈھل گئی ہیں
ہر اک سمت شاداب مخمل کے قالیں بچھے ہیں
پہاڑوں کی اونچائیوں پر
درختوں کی لمبی قطاریں
سپاہ محافظ کی مانند تن کر کھڑی ہیں
افق کا دریچہ کھلا ہے

مسرت کی کرنیں لٹاتا ہوا
آفتاب جہاں تک جلوہ نما ہو رہا ہے

(مشرق)

احمد ظفر:

احمد ظفر کی نظمیں اس بات کی آئینہ دار ہیں کہ انہوں نے اقبال کے افکار سے کما حقہ کسب فیض کیا ہے کیونکہ اقبال غالب کے بعد وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے موضوعات کو وسعت دی اور اپنے اسلوب کو اجاگر کیا۔ اپنے افکار اور فنکارانہ صلاحیت سے ایک ایسا نظام فکر عطا کیا، جس کی تقلید لازم ملزوم ہوگئی۔ احمد ظفر کی نظموں میں عصری گونج اور فطری تقاضے بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ نظم ''آئینہ کون یہاں دیکھے گا'' پر اقبال کی نظم ''مخلوقات ہنر'' کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں ؎

ہے یہ فردوس نظر اہل ہنر کی تعمیر
فاش ہے چشم تماشا پہ نہاںخانۂ ذات
نہ خودی ہے نہ جہان سحر و شام کے دور
زندگانی کی حریفانہ کشاکش سے نجات

(مخلوقات ہنر) ضرب کلیم

احمد ظفر کی نظم ''آئینہ کون یہاں دیکھے گا'' میں آئینہ کو علامت بنا کر مختلف روپ منعکس کیے ہیں جس میں ظاہر و باطن کے خدوخال واضح نظر آتے ہیں ؎

آئینہ کون یہاں دیکھے گا
ذہن پتھر ہیں سر راہ گزار
ہاتھ کشکول ہیں آنکھیں صحرا
ہونٹ جلاد ہیں شمشیر بدست
اور سماعت پہ گراں نغمۂ عمل
آئینہ یہاں کون دیکھے گا
شاخ کا پھول بھی آئینہ ہے
راہ کی دھول بھی آئینہ ہے
سنگریزے بھی تو آئینے ہیں
نقش پا ریت کے آئینے ہیں

(آئینہ کون یہاں دیکھے گا)

احمد ظفر کی نظموں کے عنوانات ملاحظہ کیجیے ''خوشبو کا ستم''، ''ایک شام''، ''ماں''، ''رت جگا''، ''پس دیوار''، ''سنیٹوریم''، ''گمنام''، ''دوات''۔ اقبال کی نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' جو تخاطب کا اسلوب اپنایا گیا ہے، دو شعر ملاحظہ ہوں ۔

علم کی سنجیدہ گفتاری، بڑھاپے کا شعور
دنیوی اعزاز کی شوکت، جوانی کا غرور
زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم
صحبت مادر میں طفل سادہ رہ جاتے ہیں ہم

(والدہ مرحومہ کی یاد میں) بانگ درا

احمد ظفر نے اپنے تاثرات ''ماں'' کے عنوان سے اس طرح ظاہر کئے ہیں کہ جیسے اقبال کی نظم کا ترجمہ پڑھ رہے ہوں، ملاحظہ کیجیے ۔

دھند میں لپٹی میلی رات ہے تیری چادر
تارے وہ پیوند ہیں جن میں
تیری لاج سمٹ جاتی ہے
پیڑ کی چھال بدن ہے تیرا
بیوہ آنکھیں
برگ و بار سے عاری شاخیں
سوکھے پتے، تیرے ہونٹ ہیں
خاموشی آواز کا پیکر
چاک گریباں تیرے بیٹے
پھول ہیں جن کی دھیمی خوشبو
دشت و دمن میں پھیل رہی ہے

(ماں)

کیا یہ اقبال کے کلام کی اثر انگیزی نہیں کہ انہوں نے اپنی فکر سے شعراء کا انداز نگارش ہی بدل دیا، فکر کی نئی راہیں تلاش کی جانے لگیں۔ اقبال کے کلام میں معانی و مطالب کا ایک دفتر نظر آتا ہے۔ بعد کے شعراء میں اقبال کی فکر کو بہ آسانی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ احمد ظفر کے عنوانات اس بات کا اظہار ہیں اور ان نظموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مناظر فطرت، خطابیہ انداز اور جذبہ حب الوطنی کو مختلف ہیئت اور تکنیک سے، جس میں آزاد اور معریٰ نظم کو اپناتے ہوئے خیالات کی ترسیل کی ہے۔

شاذ تمکنت:

اقبال کی طویل نظموں میں ''والدہ مرحومہ کی یاد میں''، ''تصویر درد''، ''خضر راہ''، ''شمع و شاعر''، ''گورستان شاہی''، ''شمع'' اقبال کی یہ نظمیں ترکیب بند میں ہیں۔ اسی طرح اقبال کے بعد کے شعراء نے اس طرز کو اپناتے ہوئے طویل نظمیں لکھی ہیں۔ ان

شعراء میں منظور حسین شور جن کی نظم ''تضاد آدم'' خاصی طویل نظم ہے۔نظم ''سند باد'' عمیق حنفی نے لکھی ہے۔'' پیمان وفا سے پہلے'' وحید اختر نے طویل نظم لکھی ہے، سحر انصاری نے اپنی طویل نظم کا عنوان ''آثار خانہ'' رکھا ہے۔شاذ تمکنت کی نظم ''درد پذیرائی'' اقبال کے اسلوب کا اظہار ہے ؎

جی میں ہے مرحمت شوق کا افسانہ لکھوں
حال جاناں نہ کہوں، نازش ترکا نہ لکھوں
جانب شہر تمنا دل دیوانہ چلے
گل کھلے، ساز چھڑے، رنگ اڑے شمع جلے
عقل کو صید کروں، عشق کو صیاد کروں
وہی اسباق جواز بر ہیں، انہیں یاد کروں
پھول سی خوشبو ہے دہرائی ہوئی باتوں میں
کتنی صبحوں کا اجالا ہے میری راتوں میں
میری تقویم محبت کے شب و روز وفا
ادب و شعر کی تاریخ و روایت سے جدا
آدمی زاد کو قاتل نہیں کہتا زنہار
زلف کو مار سمجھتا ہوں، نہ ابرو کو کٹار
فطرت حسن ہے سر تا بہ قدم سوز و گداز
میں نے دیکھے ہی نہیں جورو جفا کے انداز

(درد پذیرائی)

اردو نظم کو اقبال نے تلمیحات واستعارات سے مالا مال کر دیا۔اقبال نے پرانے رموز وعلائم کو نئے سانچے میں ڈھال کر نئے معنی پہنائے۔اسی طرح شاذ تمکنت نے بھی نظموں میں رموز وعلائم برتے بلکہ مطالب ومعنی کا ایک دفتر ہمارے سامنے رکھ دیا۔ ان کی نظموں میں سیاسی شعور کے علاوہ فطرت کی عکاسی اور جذبہ حب الوطنی پر بہترین نظمیں اقبال کی فکر اور اسلوب کا اظہار ہیں۔

شاذ تمکنت کی نظم ''باردگر'' فطری مناظر پر عمدہ نظم ہے۔اقبال کی نظم ''رات اور شاعر'' فطرت کی عکاسی پر بہترین نظم ہے، دو شعر ملاحظہ کیجیے ؎

کیوں میری چاندنی میں پھرتا ہے تو پریشاں　　خاموش صورت گل، مانند بو پریشاں

(رات)

میں ترے چاند کی کھیتی میں گہر بوتا ہوں　　چھپ کے انسانوں سے سحر روتا ہوں

(شاعر) بانگ درا

اقبال کے نقوش اور تراکیب لفظی شاذ تمکنت کی نظم ''بارگرد'' میں ملاحظہ کیجیے ؎

اتر آئی ہے گہری شام صدیوں کے لبادے میں　　شجر خاموش ہیں سنولا گئی شاخوں کی برنائی
یہ گلشن باعث افزائش احساس تنہائی　　میں کب سے چپ کھڑا ہوں سن رسیدہ پیڑ کے نیچے

غبار سرمگیں، سناٹا، رنج بے سرو ساماں
میں آنے والے یا بیتے دنوں کی چاپ سنتا ہوں
کبھی یہ زندگی بے کار سی معلوم ہوتی ہے
سن آسودگی پر بھی نفس کی آمد وشد ہے
نظر کے سامنے ہیں سینکڑوں رنگین تصویریں
یہ نقش زندگانی عارضی یا مستقل کیا ہے

یہ آنکھیں، انتظار کاروان گم شدہ جیسے
مسلسل جیتے جیتے کون تھکتا ہے، مگر پھر بھی
قدم اٹھتے نہیں زنجیر ارماں کتنی بھاری ہے
غرض اک نشۂ بے نام صہبا ہم پہ طاری ہے
طلسم خواب کی دیوار سی معلوم ہوتی ہے
یہ دنیائے جواں شیرازۂ بند آب و گل کیا ہے

(باردگر)

شاذ تمکنت کی یہ نظم طویل ہے یہاں اختصار کے ساتھ پیش کی ہے۔ شاذ کی تراکیب لفظی ملاحظہ کیجئے شاخوں کی برنائی، افزائش احساس تنہائی، سن رسیدہ پیڑ، غبار سرمگیں، رنج بے سروساماں، زنجیر ارماں، نشۂ بے نام صہبا، شیرازۂ بند آب وگل جیسی تراکیب ہمیں صرف اقبال کی نظموں میں نظر آتی ہیں۔ تراکیب لفظی اور صنائع بدائع کی جو بنیاد اقبال نے رکھی تھی بعد کے شعراء نے اس طرز میں نئے علائم داخل کر کے نظم کو وسیع تر کر دیا۔ اقبال نے اپنی نظموں میں زیادہ تر فلسفیانہ، بیانیہ، خطابیہ یا مفکرانہ انداز میں خارجی اور داخلی تاثرات پیش کئے ہیں۔ شاذ تمکنت کی نظمیں اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ انہوں نے جمالیاتی قدروں کے ساتھ اپنے افکار و تصورات کو نئے زاویے سے برتا ہے۔ نظموں میں ندرت، تازگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اقبال کے بعد کے شعراء میں اقبال کی فکر اور اسلوب نہ پایا جاتا ہو کیونکہ ہر شاعر نے اپنے مزاج اور طبیعت کے موافق اپنی راہ کا تعین کر کے اکتساب فن کیا ہے۔ اس طرح اقبال کی تقلید میں نظمیں کہی جانے لگیں۔ شاذ تمکنت کا اعتراف نظموں سے ظاہر ہے۔

عرش ملسیانی:

غزل اور نظم دونوں میں یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ جدید رنگ سخن کی نظمیں نہایت عمدہ کہی ہیں۔[1] زبان اور فن پر عبور ہے لیکن سادہ زبان میں شعر کہنا ان کی طبیعت میں شامل ہے۔ نظموں میں زیادہ تر مکالماتی طرز اپنایا ہے۔ اقبال کی نظموں میں جو مکالماتی شعور ہمیں ملتا ہے ان میں ''جبریل و ابلیس''، ''خضر راہ'' اس کے علاوہ رومانی شاعری میں ''دردِ عشق''، ''حقیقت حسن''، ''جلوۂ حسن''، ''عاشق ہرجائی''، ''پیام''، ''دل''، ''محبت'' وغیرہ۔ اقبال کی یہ نظمیں عشق و محبت کے جذبے سے لبریز ہیں۔ یہی جمالیاتی طرز عرش ملسیانی نے اپنا کر اپنی نظموں میں جمالیات کے عنصر کو شامل کیا۔ اقبال کی نظم ''دردِ عشق'' کے دو شعر ملاحظہ کیجئے ؎

اے دردِ عشق! ہے گہر آب دار تو نامحرموں میں دیکھ نہ ہو آشکار تو
پنہاں تہہ نقاب تری جلوہ گاہ ہے ظاہر پرست محفل نو کی نگاہ ہے

(دردِ عشق) بانگ درا

۱۔ محمد حسن عسکری کی تالیف ''میری بہترین نظم'' ۱۹۴۲ء میں اشاعت کے لمس سے آشنا ہوئی تھی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اسے ''نگار'' اکتوبر اور نومبر ۱۹۹۰ء میں دوبارہ شائع کیا ہے۔ اس انتخاب میں زیادہ تر ترقی پسند شعراء کا انتخاب دیا گیا ہے۔

عرش ملسیانی کی نظم ''میں کیوں ن بھول جاؤں'' میں اقبال کا مکالماتی طرز اپنایا گیا ہے، دو بند ملاحظہ کیجئے ۔

تری چشم مے گوں کا لبریز ساغر جوانی تری کیف آور جوانی
گلستاں در آغوش حسن تبسم وہ تیرے لب سرخ کی گل فشانی
تکلم کے انداز خاموشیوں میں زبان نظر پر حیا کی کہانی
تو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں

وہ سانسوں کی تیزی وہ سینے کی دھڑکن وہ دونوں کا چھپ چھپ کے آنسو بہانا
وہ تجدید الفت کے سو سو بہانے وہ اک دوسرے سے یوں ہی روٹھ جانا
وہ ترک محبت کے الزام دے کر کسی کا کسی کو ہنسی میں رلانا
تو ہی مجھ سے کہہ دے میں کیوں بھول جاؤں

(میں کیوں بھول جاؤں)

تصویر کاری اور تشبیہات نے نظم کے تاثر اور جمالیاتی حسن میں جو اضافہ کیا ہے، اس میں تراکیب لفظی کا بڑا دخل ہے۔ چشم مے گوں، لب سرخ کی گل فشانی، در آغوش حسن تبسم، زبان نظر پر، نہایت اچھوتی تراکیب ہیں۔

آل احمد سرور:

سرور نے شاعری میں جو کچھ کہا ہے وہ جدید نظم میں اضافہ ہے۔ ۱۹۳۵ء میں انہوں ں نے شعری مجموعہ ''سلسبیل'' کے نام سے شائع کیا۔ ان کی زیادہ تر توجہ نثر خصوصاً تنقید پر رہی۔ نظموں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کے رنگ و آہنگ میں شعر کہنے کا شوق اور اس کا اظہار خود ان کی نظموں سے ظاہر ہے۔ ان کی نظم ''مرد درویش'' پر اقبال کی نظم ''دین و ہنر'' کا اثر ہے۔ دوسرے یہ کہ دونوں نظموں کے قافیے ایک جیسے ہیں۔ موضوع اور فکری اسلوب بھی ایک جیسا ہے۔ نظم کا یہ نیا طرز اقبال نے ایجاد کیا ہے، دو شعر ملاحظہ کیجئے ۔

سرور شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ہوئی ہے زیر فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

(دین و ہنر) ضرب کلیم

اب اسی انداز پر سرور کی نظم ''مرد درویش'' ملاحظہ کیجئے، عنوان ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ سرور اقبال سے کس قدر متاثر تھے ۔

زمانہ جس کی تلاش میں تھا، یہی ہے ہمدم وہ مرد دانا نگاہ جس کی ہے عارفانہ، مزاج جس کا قلندرانہ
وہ جس کا دستور حق پسندی، وہ جس کا آئین دردمندی وہ جس کے ایثار بیکراں کا ہے معترف آج تک زمانہ
جلال بھی ہے جمال بھی ہے، یہ شخصیت کا کمال کہئے خیال میں بجلیاں پر افشاں لبوں پہ اک دلربا ترانہ

چمن بھی آتش فشاں بھی دیکھے نئے نئے آشیاں بھی دیکھے
کہیں سنی داستانِ انجم کہیں سنا جنگ کا ترانہ

(مردِ درویش) [۱]

اقبال کی نظموں میں ''طارق کی دعا''، ''سلطان ٹیپو کی وصیت''، ''لینن خدا کے حضور میں''، ان نظموں میں شخصیات کی شاعرانہ کرداری کی گئی ہے۔ اقبال کا یہ اسلوب تمثیلی کہلاتا ہے، اسی طرح سرور نے ''مردِ درویش'' میں وہی طرز اختیار کیا ہے جو اقبال کا ہے مثلاً تلمیحات ملاحظہ کیجئے ''حکمت کلیمی''، تشبیہات میں داستانِ انجم، خیال میں بجلیاں، آلِ احمد سرور اور اقبال کا آہنگ شعر ایک ہی ہے۔

عبدالعزیز خالدؔ:

خالدؔ وہ واحد شاعر ہے جس نے صحیح معنی میں اقبال کی شاعری کی روح کو سمجھا ہے۔ ان کے ہاں طویل نظمیں بھی ہیں اور مختصر نظمیں بھی۔ الفاظ کا دروبست اور محاسن شعری ہر شعر سے عیاں ہے، ابن انشاء نے عبدالعزیز خالد کے لئے کیا اچھی بات کہی ہے:

''اقبال سے خالد نے لفظیات نہیں بلکہ دروں نگری اور دردمندی کا لہجہ لیا۔''

خالد کی نظموں میں علمی نقوش کے علاوہ اقبال کا لہجہ اور آہنگ بھی نظر آتا ہے۔ نظموں میں تلمیحات واشارات کا کثرت سے استعمال ہوا ہے، اسی طرح اقبال کے ہاں تلمیحات وتشبیہات نہایت عمدہ طریقے سے نظم کی گئی ہیں۔ اقبال نے بانگِ درا میں طویل نظمیں کہی ہیں جن میں ''خضرِ راہ''، ''تصویرِ درد''، ''شکوہ''، ''جوابِ شکوہ''، ''حسن عشق'' وغیرہ۔ اسی طرح خالدؔ نے اقبال کی تقلید میں طویل نظمیں کہی ہیں۔ ان میں ''حکایت نے'' خاصی طویل نظم ہے۔ ''سوغات'' یہ بھی طویل نظم ہے۔ ''برزخ'' طویل نظم ہے۔ ''نامۂ نقش گرا ک پیکر تصویر کے نام'' خاصی طویل نظم ہے۔ ان تمام نظموں پر یہاں لکھنا تو ممکن نہیں البتہ ان نظموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ خالد نے اپنی نظموں میں رومیؒ اور اقبال کو رہنما بنایا ہے۔ اقبال کی نظموں کے موضوعات اسلامی تصوف، عشقیہ شاعری اور سیاسی رجحان کی حامل ہیں اسی طرح خالد نے ان واقعات کو موضوع بحث بنایا ہے، جو تاریخی بھی ہیں اور سیاسی بھی۔ عشقیہ شاعری میں ''نامۂ نقش گراں پیکر تصویر کے نام'' جدید شعری آہنگ میں ایک اضافہ ہے۔ نظم ''سوغات'' بھی جمالیاتی طرز پر کہی ہے۔ خالدؔ کی ایک نظم کا عنوان ''ہم'' ہے۔ اس میں صحابۂ کرام کے نام، اربابِ سیر کے نام یعنی یہ نظم تلمیحات پر ہے۔ ملاحظہ کیجئے ؎

ہم البیرونی عصرِ رواں ہیں رہینِ خانہ و بے خانماں ہیں
ایاز و غزنوی دونوں کے محرم سکوتِ گل، عنا دل کی زباں ہیں
ہمارے ہم قدح بوذر غفاریؓ ابو بکرؓ و عمرؓ، پیر مغاں ہیں
اولوالعزی میں جنبلؒ کو کہاں فرد بقدر ہمت اس کے ہمعناں ہیں
تصرف میں ہے اورنگ سلیماں سربام سائے کہکشاں ہیں
اگرچہ رہنے والے ہیں زمیں کے مگر دانائے رازِ آسماں ہیں

(ہم) [۲]

۱۔ نگار۔ میری بہترین نظم، ص ۱۰

۲۔ حدیث خواب، ص ۶۲

اقبال نے ''ضرب کلیم'' میں مختصر نظمیں لکھ کر ہیئت اور تکنیک میں جو اضافہ کیا ہے، اسے خالد نے اپناتے ہوئے جدید رنگ و آہنگ کے سانچے میں ڈھال کر اقبال کے اثرات کا ثبوت دیا ہے۔ اقبال کی نظمیں جو صرف تین شعروں پر ہیں عنوانات درج ذیل ہیں ''سیاسی پیشوا''، ''نفسیات غلامی''، ''شام و فلسطین''، ''جمعیت اقوام''، ''جمہوریت''، ''یورپ اور سوریا''، ''جمعیت اقوام مشرق''، ''اہل مصر سے''، ''خواجگی''، ''غلاموں کے لئے''۔ یہ عنوانات بطور نمونہ دیئے گئے ہیں۔ خالد نے جو مختصر نظمیں لکھی ہیں ان کے عنوانات ملاحظہ کیجئے ''سوال و جواب''، ''بتاؤ''، ''کہاں''، ''چپ''، ''سائباں''، ''پکار''، ''خزاں کا چاند''، ''خاموشی''۔

اقبال کی نظم ''سیاست افرنگ'' ملاحظہ کیجئے، اس میں دو شعر ہی لکھے گئے ہیں ؎

تری حریف ہے یا رب سیاست افرنگ
مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

(سیاست افرنگ) ضرب کلیم

خالد کی نظم ''خزاں کا چاند'' ملاحظہ کیجئے، اس میں تقلید کی عکاسی نظر آئے گی ؎

خزاں کا چاند، گئے سال جس کو دیکھا تھا
اکٹھے دونوں نے، پھر آسماں پر ابھرا
لئے زمیں نے قدم، چاندنی نے کھیت کیا
مگر وہ شخص کہ تھا جو حبیب جاں میرا
کبھی کا رسم ذرہ آشنائی بھول چکا
نہ عہد رفتہ اسے یاد ہے نہ عہد وفا

(خزاں کا چاند) [۱]

خالد کی نظم ''پکار'' میں فطری مناظر ملاحظہ کیجئے ؎

آئی آواز جونہی کُو کُو کی
میں نے دونہی سوئے افق دیکھا
صبح کے چاند کے سوا کچھ بھی
تو نہ تھا، چاندنی پکاری تھی

(پکار) [۲]

موضوعات اور فکری آہنگ میں خالد، اقبال کے مقلد ہیں۔ ان کی نظموں میں اقبال کے فکری رجحانات اور بازگشت سنائی دیتی ہے۔

۱۔ حدیث خواب، ص ۷۹

۲۔ حدیث خواب، ص ۸۱

انجم اعظمی:

انجم اعظمی کی نظموں کا محور زندگی کی جدلیات، انسان اور فطری مناظر کی عکاسی ہے- جدید اردو شاعری میں وہ خود کو مشخص کر چکے ہیں- ان کی نظموں میں الفاظ وتراکیب نہیں بلکہ سادگی وسچائی کا اظہار ملے گا- ان کے ہاں تشبیہات واستعارات بھی کم کم ہیں- انجم زندگی کے شاعر ہیں اس لئے نظموں میں قومی وملی شعور زیادہ ہے- اس کے علاوہ نظموں کے موضوعات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے ہاں اقبال کے نظریات ونگارشات کا احترام بھی ہے اور اعتراف بھی- موضوعات کی ہم آہنگی ملاحظہ کیجئے، اقبال کی نظم ''فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں'' یہ نظم ''بال جبریل'' میں ہے- انجم اعظمی کی نظم ''گناہ آدم خاکی'' ان دونوں نظموں کا آہنگ ایک ہے- اقبال کے دو شعر ملاحظہ کیجئے-

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بے تابی   خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن   تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی

(فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں)

انجم اعظمی کی نظم ''گناہ آدم خاکی'' جس کا آہنگ اقبال کا سا ہے، ملاحظہ کیجئے-

ہوا ہے چار سو اعلان، ساز ہستی پر
گناہ آدم خاکی کی پڑ چکی مضراب
چلا بہشت بریں سے جو قافلہ آگے
زمیں وادی ویراں کو کر گیا شاداب
کھڑے ہوئے وہ فرشتے مثال دیتے ہیں
کسی کے گیسوئے مشکیں کو شاخ سنبل سے
خرام مشتری و زہرہ دیکھ کر اک بار
الجھ گیا دل ہاروت پیچ کاکل سے
کرے گی لذت عصیاں سے آشنا سب کو
صدا جو اٹھتی ہے رہ رہ کے چاہ بابل سے

(گناہ آدم خاکی)

یہاں نظم کا اقتباس دیا ہے- دل ہاروت کی ترکیب اور خرام مشتری زہرہ قرآنی تلمیحات میں ان کا ذکر قرآن میں آیا ہے- یہ ہاروت ماروت آج بھی سزا بھگت رہے ہیں- پہلا بند بالکل اقبال کے اسلوب پر ہے-

انجم اعظمی نے ''ستارۂ صبح'' کے عنوان سے ایک نظم کہی ہے جبکہ اقبال کی نظم ''اختر صبح'' کے عنوان سے ''بانگ درا'' میں ہے- دونوں نظموں میں فکری مماثلت پائی جاتی ہے- اقبال کی نظم کا بند ملاحظہ کیجئے-

ستارہ صبح کا روتا تھا اور یہ کہتا تھا   ملی نگاہ مگر فرصت نظر نہ ملی
ہوئی ہے زندہ دم آفتاب سے ہر شئے   اماں مجھی کو تہ دامن سحر نہ ملی

بساط کیا ہے بھلا صبح کے ستارے کی
نفس حباب کا، تابندی شرارے کی

(اختر صبح) بانگ درا

انجم اعظمی کی نظم ''ستارۂ صبح''، میں اقبال کا اسلوب اور فطری مناظر کا عکس دیکھئے ؎

ستارہ صبح کا چمکا،
جہاں میں عشرت فردا کا وہ پیغام لایا ہے
وہ اپنے ساتھ عہد نو کی صبح و شام لایا ہے
کوئی بستی اجڑتی تھی تو میں آنسو بہاتا تھا
جہاں کا غم مرے حساس دل کو خوں رلاتا تھا
میں اکثر ناامیدی کے بھنور میں ڈوب جاتا تھا
مگر پھر آج امیدوں نے آئینہ دکھایا ہے
یہ آخر کون آیا ہے
عدم کی تیرگی کو چیر کر پہنائے عالم میں

(ستارۂ صبح)

علامہ اقبال نے ''بانگ درا'' میں ''طلبہ علی گڑھ کالج کے نام'' سے نظم لکھی ہے۔ اسی طرح انجم اعظمی نے ''علی گڑھ یونیورسٹی'' کے عنوان سے نظم لکھی ہے، ملاحظہ کیجئے ؎

مرکز علم و ہنر میکدۂ سوز و ساز
سجدۂ شوق سے آباد ہے رندوں کا حرم
جام در جام ہے صہبائے جنون حکمت
دیکھنا ہو تو کوئی دیکھ لے ساقی کا کرم
میکساری کا یہ انداز نہ دیکھا ہم نے
سب کے دکھ درد کا احساس نشے کا عالم

(علی گڑھ یونیورسٹی)

انجم اعظمی کی نظم ''شاعر مشرق کے نام'' میں جو اعتراف ہمیں اقبال کے اثرات کا ملتا ہے، ملاحظہ کیجئے ؎

''میرے نغموں میں تری شوخی افکار تو مل سکتی ہے لیکن اے شاعر مشرق۔''

(شاعر مشرق کے نام)

احسان دانش:

جدید نظم نگار کی حیثیت سے احسان دانش کا نام شہرت اور مقبولیت سے کہیں آگے ہے۔ شاعر مزدور کی حیثیت سے بھی اپنی

جداگانہ شناخت رکھتے ہیں- ان کی نظموں میں اقبال کی ''خضرراہ'' کا تاثر دیکھا جاسکتا ہے- علامہ اقبال نے نظم ''شاعر'' لکھی ہے، جو''بانگ درا'' میں ہے، اسی طرح احسان دانش نے بھی ''شاعر'' عنوان کے تحت نظم کہی ہے، اقبال کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

قوم گویا جسم ہے، افراد ہیں اعضائے قوم　　منزل صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفل نظم حکومت، چہرۂ زیبائے قوم　　شاعر رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

(شاعر) بانگ درا

احسان دانش کی نظم ''شاعر'' میں وہی خیالات اخذ کئے گئے ہیں جو ہمیں اقبال کے ہاں ملتے ہیں، نظم ملاحظہ کیجئے ؎

انسان و خداوند کے مابین ہے شاعر
اک جنس درخشندہ و پائندہ و بیدار
ملتی ہے ازل سے جسے احساس کی دولت
فطرت جسے کرتی ہے عطا جذبۂ خوددار
جبریل کی پرواز، پیمبر کی رسائی
قرآن کی عظمت، دل فرعون کا انکار

(شاعر) [1]

احسان دانش نے جبریل، پیمبر، قرآن کی عظمت، دل فرعون کہہ کر ان تلمیحات کی طرف اشارہ کیا ہے جسے اقبال اپنی نظموں میں پہلے ہی نظم کر چکے ہیں- نظم میں سادگی بھی ہے اور تخاطب کا طرز بھی- احسان دانش کی بیشتر نظمیں اقبال کے اسلوب پر کہی گئی ہیں- احسان ایک کہنہ مشق شاعر کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت اور منفرد مقام بنا چکے ہیں- سماجی و معاشرتی اور قومی و ملی نظمیں بڑی جاندار ہیں- ان نظموں میں بھی اقبال کے اثرات کو دیکھا جاسکتا ہے- یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اقبال کے عہد اور ان کی وفات کے بعد کسی شاعر کا شہرت کے بام پر پہنچنا نہایت مشکل تھا- احسان دانش نے اپنی نظموں میں معاشی پہلوؤں کو اجاگر کیا- ان کی نظموں میں غموں کی چلچلاتی دھوپ کے واقعات و حالات نظر آتے ہیں- منظر کشی میں بے پناہ قدرت رکھتے تھے- نظموں میں خاص طور پر جو بات واضح ہوئی ہے اس میں نئی تراکیب اور نیا آہنگ، تشبیہات و استعارات سے نظم کے دامن کو وسیع کر دیا- جدید شاعری میں احسان دانش نے اپنی جدت فکر اور اسلوب کے نئے انداز سے پاکیزہ خیال کی ترسیل کی ہے- احسان کی نظم ''طوفانی نغمہ'' پر اقبال کی نظم ''موج دریا'' کی منظر کشی اور تراکیب لفظی ملاحظہ کیجئے، پہلے اقبال کا یہ بند نمونے کے طور پر ؎

مضطرب رکھتا ہے میرا دل بیتاب مجھے　　عین ہستی ہے تڑپ صورت سیماب مجھے
موج ہے نام مرا، بحر ہے پایاب مجھے　　ہو نہ زنجیر کبھی حلقۂ گرداب مجھے

آب میں مثل ہوا جاتا ہے توسن میرا
خار ماہی سے نہ اٹکا کبھی دامن میرا

(موج دریا) بانگ درا

احسان دانش کی نظم ''طوفانی نغمہ'' ملاحظہ کیجئے، اس میں نرالی تراکیب اور تشبیہات و استعارات کا نئے افکار اور نئے اسلوب

۱- نگار- میری بہترین نظم، ص ۷

سے اظہار ہوا ہے ؎

زمانہ ہوگیا گنگا میں اک آئی تھی طغیانی جلو میں جس کے دامن تھام کر چلتی تھی ویرانی
تھا جل تھل ایک کوسوں تک مسافر تھے نہ راہیں تھیں یہ عالم تھا ہوائے شام کے لب پر بھی آہیں تھیں
جو ریلا ہڑبڑا کر ناگہاں کروٹ بدلتا تھا بیابانوں کی پیاسی ریت کا دم سا نکلتا تھا
تھی دہشت آخریں پھنکارتی موجوں کی بیباکی سر ساحل سراسیمہ تھی پیراکوں کی پیراکی
درختوں کے قدم جمتے نہ تھے طوفان کے آگے فلک کی گردشیں بیکار تھیں گرداب کے آگے
عجب بپھری ہوئی موجوں کا نقشہ تھا روانی میں کہ جیسے بتی ہوں جل دیویاں قالین پانی میں
جدھر پانی کا رخ ہوتا تھا ساحل گرتا جاتا تھا کسانوں کی عرق ریزی پہ پانی پھرتا جاتا تھا
ہر ایک ریلے میں خونی موت کے قدموں کی آہٹ تھی فضائے بحر میں سیل بلا کی سنسناہٹ تھی
فلک سے ہانپ کر بیمار سورج گرنے والا تھا زمیں کی نعش پر کالا کفن فطرت نے ڈالا تھا

اسی نازک سمے میں جب تھے دونوں وقت ملنے کو
زمیں پر غش تھا طاری چرخ پر تھے پھول کھلنے کو

(طوفانی نغمہ)

احسان دانش کی نظم ترکیب بند میں ہے، تراکیب لفظی ملاحظہ کیجئے پیاسی ریت، درختوں کے قدم، پھنکارتی موجیں، جل دیویاں قالین، سیل بلا کی سنسناہٹ، بیمار سورج، زمیں کی نعش، چرخ پر تھے پھول کھلنے کو- ان تراکیب میں جدت بھی ہے اور دلآویزی بھی- ان تراکیب کو کس چابکدستی سے نظم کیا ہے- فطری مناظر آنکھوں میں گھوم جاتے ہیں- دیگر اصناف میں بھی احسان دانش نے بہترین کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں- ان کی شناخت نظم گو کی حیثیت سے مسلم ہے-

رفعت سروش:

رفعت کی نظموں میں دعوت انقلاب کے ساتھ نیچر کو بھی بہت دخل ہے- ان کے ہاں نیچر مقصدیت کا اظہار ہے- علامتی شاعری میں رفعت نے جو تشبیہات سے کام لیا ہے وہ نئی اقدار کا ایسا تذکرہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا- اسلوب و بیان کے اعتبار سے بھی ان کی نظمیں قدیم آہنگ کی روایت سے جدید میلان کی طرف ایک خوش آئند سفر ہے- ان کی نظمیں ''نوحہ''، ''بے صدا الفاظ''، ''تنہائی میں''، ''لڑکپن''، ''سیاہ رات'' ان نظموں میں نئی تراکیب، تشبیہات واستعارات کا ایک نیا نظام ہمیں ملتا ہے- رفعت کی نظم ''سیاہ رات'' پر اقبال کی نظم ''رات اور شاعر'' کا اسلوبیاتی طرز ملاحظہ کیجئے ؎

کیوں میری چاندنی میں پھرتا ہے تو پریشاں خاموش صورت گل مانند بو پریشاں
تاروں کے موتیوں کا شاید ہے جوہری تو مچھلی ہے کوئی میرے دریائے نور کی تو

(رات اور شاعر) بانگ درا

رفعت سروش کی نظم ''سیاہ رات'' میں جو تشبیہات استعمال ہوئی ہیں، وہ اقبال کی تشبیہات سے مماثلت رکھتی ہیں، نظم

ملاحظہ کیجئے ؎

یہ رات ہے کس قدر بھیانک
سیاہیاں رقص کر رہی ہیں
سیہ فلک پر سیہ ستاروں کی کہکشاں ہے
سیہ زمینوں کی کوکھ میں ہیں سیاہ گلشن
سیاہ پھولوں ں کی ناگنوں کی
سیہ زبانیں لپک رہی ہیں
سیاہ خنجر سیاہ سینے
سیاہ دل ہیں، سیاہ خوں ہے
سیاہ پتھر پہ کالے حرفوں سے لکھ رہا ہے، سیہ زمانہ
سیاہ شب کا سیہ فسانہ

(سیاہ رات)

اقبال نے ''تاروں کے موتیوں'' سے جو تشبیہہ دی ہے، اسی طرح رفعت نے ''سیہ فلک پر سیہ ستاروں کی کہکشاں'' سے نئی بات پیدا کی ہے- لفظ ''سیاہ'' کو علامت بنا کر سماج اور معاشرے کی پستیوں کا ذکر کیا ہے- اس نظم میں انسانی اقدار اور تہذیبی اقدار کا جو خاکہ پیش کیا ہے وہ یقیناً اس دور کا عکاس ہے- رفعت سروش کی نظم ''نوحہ'' پر اقبال کی نظم ''سرگزشت آدم'' کے نقش ملاحظہ کیجئے ؎

سنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے بھلایا قصۂ پیمان اولیں میں نے
لگی نہ میری طبیعت ریاض جنت میں پیا شعور کا جب جام آتشیں میں نے

(سرگزشت آدم) بانگ درا

اقبال نے اپنی نظم میں انسان کے خصائل پر علامتی انداز میں اظہار کیا ہے- ''قصۂ پیمان اولیں'' کی ترکیب استعمال کر کے ''ریاض جنت'' میں بے چینی کا جو خیال پیش کیا ہے، وہی کچھ ہمیں رفعت سروش کی نظم ''نوحہ'' میں انسانی کرب و آلام اور زیست و موت کا فلسفہ نظر آتا ہے، نظم ملاحظہ کیجئے ؎

نوحہ ان کا نہیں
گزر گئے جو،
زندگی کی اداس راہوں سے
پھینک کر بوجھ اپنے کاندھوں کا
نوحہ، ان کا
جواب بھی جیتے ہیں
جبر کو زندگی بنائے ہوئے
مرنے والوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے

(نوحہ)

رفعت سروش کی ایک اور نظم ''لڑکپن''، جس میں فطری مناظر کو نہایت سلیقے سے نظم کیا ہے، ان کی نظموں میں ٹھہراؤ اور زندگی سے محبت کے آثار ملتے ہیں۔ شاعری میں خلوص اور احساس واضح طور پر نظر آتا ہے۔ نظم ''لڑکپن'' پر اقبال کی نظم ''نوید صبح'' کے اثرات ملاحظہ ہوں ؎

دیکھ یہ صبح زمستاں اوس میں بھیگی ہوئی
کہر میں لپٹی ہوئی
ٹھنڈ میں ٹھٹھرے کھڑے ہیں اس گلی کے سب مکاں
دھوپ آتی ہے فقط مسجد کے اس مینار پر
اک شکستہ گھر کا دروازہ کھلا
ایک لڑکا ننگے سر اور ننگے پاؤں
گھر سے نکلا ہاتھ بغلوں میں دبائے
اور بستہ اپنے سینے سے لگائے
ملگجی سی ہے کرن امید کی

(لڑکپن)

سرشارؔ صدیقی:

سرشارؔ کے فکر و فن کی بصیرت اس بات کی آئینہ دار ہے کہ جس میں انہوں نے فکرِ اقبال کو شامل کر کے نظموں میں نئے رجحان اور نئی تراکیب سے قدیم کو جدید پیرائے میں ادا کیا ہے۔ تلمیحات و استعارات جو اقبال کے ہاں ملتی ہیں مثلاً اقبال کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے، اس میں انہوں نے کلیم اور خلیل کہہ کر دو پیغمبروں کی طرف اشارہ کیا ہے، ہلاک جادوئے سامری کہہ کر فرعون کے ظلم کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں جو کہ نظم ''میں اور تو'' میں سے ہے، حق و باطل کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت علیؓ اور عرب کے مشہور پہلوان مرحب اور عنتر کا ذکر کیا ہے ؎

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاک جادوئے سامری، تو قتیل شیوۂ آزری
نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی، نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرت اسد اللہی وہی مرحبی وہی عنتری

(میں اور تو) بانگ درا

سرشارؔ صدیقی کی نظم ''خلا'' ملاحظہ کیجئے، تلمیحات و علامات اقبال کی فکر کا ثمر ہیں ؎

نہ حکیموں کا مقدر، نہ رسولوں کا نصیب
نہ کہیں زہر کے پیالے، نہ کہیں دار و صلیب
نہ کوئی سچ کا پجاری، نہ کوئی حق کا نقیب

یہ زمانہ، کہ ترستا ہے اجالوں کے لئے
زہر ہے روشنی طبع خیالوں کے لئے
نشترِ فکر نہیں ذہن کے چھالوں کے لئے

ذہن سے نطق تک حبس ہے سناٹا ہے
ہر طرف لوگ ہیں، ہر شخص مگر تنہا ہے
سچ جو کہتا ہے، یہاں سب سے بڑا جھوٹا ہے

(خلا)

''زہر کے پیالے'' کہہ کر سرشار صدیقی نے سقراط کو ظاہر کیا ہے، ''دار وصلیب'' میں منصور حلاج کو ظاہر کیا ہے، اس دور کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ حکمائے وقت اور رسولوں پر جو افتاد پڑی یہ انہی کا حوصلہ تھا، یہ ہستیاں تو حق پر تھیں، لیکن آج اگر کوئی سچ بولے تو لوگ اسے جھوٹا گردانیں گے۔

سرشار کی نظم ''خوشۂ گندم'' پر اقبال کی نظم ''عالم نو'' کے فکری اثرات ملاحظہ کیجئے، اقبال کے دو شعر بطور نمونہ ملاحظہ کیجئے ۔

زندہ دل سے نہیں پوشیدہ ضمیر تقدیر
خواب میں دیکھتا ہے عالم نو کی تصویر
بدن اس تازہ جہاں کا ہے اسی کی کف خاک
روح اس تازہ جہاں کی ہے اسی کی تکبیر

(عالم نو) ضرب کلیم

سرشار صدیقی نے ''خوشۂ گندم'' میں آدم وحوا کی اس دانائی کی طرف اشارہ کیا ہے، جہاں اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے ''عقل سلیم'' جیسا تحفہ عطا کیا ہے، اس کے باوجود ابلیس کے دام میں آ گئے لیکن اقبال نے ''زندہ دل'' اور پوشیدہ ضمیر تقدیر کہہ کر اس راز کو فاش کر دیا۔ سرشار نے یہی بات واضح طور پر بیان کر دی، نظم ''خوشۂ گندم'' ملاحظہ کیجئے ۔

ایک ہی راہ پر گامزن
لیکن اٹھتا ہوا ہر قدم اجنبی
اک طرف شوخیوں کا ہجوم جواں
بے کراں
اک طرف صرف محتاط سنجیدگی کا سماں
جسم وجاں ں کا دھواں
دور تک .... دیر تک
ہم کم آمیز وخاموش چلتے رہے
دل سلگتے رہے، جسم جلتے رہے
اور یہاں تک کہ اک اجنبی موڑ پر
اس کی آنکھوں میں

کچھ ان کہے سے پیام آ گئے
ہم، کہ دانا تھے
زیرک تھے ہشیار تھے
جانتے بوجھتے زیرِ دام آ گئے

(خوشۂ گندم)

نظم میں جنت کا نقشہ اور انسانی تقاضے، جس میں انسانی فطرت اور جبلت بھی کارفرما ہے۔ تازہ جہاں کی تلاش میں گندم کے ذائقہ سے آشنا ہونا لازمی تھا۔ نظم ہیئت کے اعتبار سے آزاد پیرایہ میں ہے لیکن ایک تسلسل اور منظر کشی نے نظم کو خوبصورت بنا دیا۔

افتخار عارف:

افتخار عارف کو جمالیاتی حسیت کا شاعر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کی نظموں میں نت نئے تجربے اور تصویر تراشی کے نقش، جس میں مذہب، تصوف اور خیالی پیکر کو سادگی سے ادا کیا گیا ہے۔ نظموں میں مٹی کی خوشبو، وطن سے محبت اور انسان سے سچا پیار اور خلوص خاص موضوعات ہیں۔ ان کے صوتیاتی نظام میں اقبال کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ نظموں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا بنیادی موضوع ''انسان'' اور اس کی قدریں ہیں۔ افتخار اور اقبال میں ایک قدر مشترک ہے، وہ یہ کہ دونوں نے مکالماتی اسلوب میں نظمیں کہی ہیں مثلاً افتخار کی نظم ''مکالمہ'' پر اقبال کی نظم ''خضر راہ'' کی تصویر کاری اور محاکات قابل تعریف ہے۔ ''خضر راہ'' میں صنعت تلمیح، صنعت حسن تعلیل اور صنعت مراعاۃ النظیر سے نظم کو مزین کیا ہے، افتخار عارف نے اپنی نظم میں مذہبی عقائد، رسم و رواج اور اصول و نظریات سے بھی نظم میں دیگر موضوعات سے اضافہ کیا ہے۔ ''خضر راہ'' میں سے اقبال کے دو شعر ملاحظہ کیجئے ـــ

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

(خضر راہ)

افتخار عارف کی نظم ''مکالمہ'' ملاحظہ کیجئے ـــ

ہوا کے پردے میں کون ہے جو چراغ کی لو سے کھیلتا ہے
کوئی تو ہوگا
جو خلعت انتساب پہنا کے وقت کی رو سے کھیلتا ہے
کوئی تو ہوگا
حجاب کو رمزِ نور کہتا ہے اور پرتو سے کھیلتا ہے
کوئی تو ہوگا
کوئی نہیں ہے
کہیں نہیں ہے
یہ خوش یقینوں کے، خوش گمانوں کے واہمے ہیں جو ہر سوال سے

بیعت اعتبار لیتے ہیں

(مکالمہ)

افتخار عارف کی نظموں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ مختصر مصرعوں اور چند مصرعوں سے نظم کو مکمل کرتے ہیں- ان کا یہ اختصار اقبال کے ''ضرب کلیم'' میں ملاحظہ کیجئے، رومانی تجربوں سے جمالیاتی پیکر تراشنا افتخار عارف ہی کا حصہ ہے- نظموں میں اقبال کی طرح ایمائی تشبیہات سے کام لیا گیا ہے- ایمائی تشبیہ دراصل خیال کی وہ صورت ہے جو اپنے اندر بے پناہ معنویت اور وسعت رکھتی ہے- اس گہرے شعور کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ نئے فکری زاویے اجاگر ہوئے ہیں- یہی وہ تکنیک ہے جو افتخار عارف نظم میں منفرد مقام رکھتے ہیں- ان کی دیگر نظمیں مثلاً ''صحرا میں ایک شام''، ''سوغات''، ''سرگوشی''، ''آخری آدمی کا رجز''، ''شہر علم کے دروازے پر'' اور ''اعلان نامہ'' جو ادراک و آگہی کا عرفان ہوتا ہے وہ یقیناً اقبال سے عقیدت کا اظہار ہے-

افتخار کی نظم ''ایک سوال'' پر اقبال کی نظم ''چاند اور تارے'' کا عکس ملاحظہ کیجئے ؎

ڈرتے ڈرتے دم سحر سے
تارے کہنے لگے قمر سے
نظارے رہے وہی فلک پر
ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر

(چاند اور تارے) بانگ درا

افتخار عارف کی نظم ایک سوال ملاحظہ کیجئے، اس میں اسلوب کی دلآویزی، شاعری کی زبان اور ہیئت کی رعنائی، محاکات و تلمیحات کے ساتھ فکر و معنی کی گہرائی سبھی کچھ نظم میں نظر آتا ہے ؎

تھکے ہوئے آسمان کے مضمحل ستارے
جوان راتوں کے ہم نصیبوں سے کہہ رہے ہیں
وفور وارفتگی کے صحرا میں
نور کی ندیوں کا دیوانہ پن بھی کب تک
لہو کی یہ انجمن بھی کب تک
بدن کی بیساکھیوں سے تنہائیوں کے
یہ سنگلاخ رستے
گزر سکیں تو گزار لو پھر بدن بھی کب تک

(ایک سوال)

نظم میں نئی تراکیب اور نئے الفاظ وفور وارفتگی، نور کی ندیوں، لہو کی یہ انجمن، بدن کی بیساکھیوں، سنگلاخ رستے، یہ اقبال کا وہ کینوس ہے جسے بعد کے شعراء نے مشعل بنا کر تقلید کے رشتے سے منسلک ہو کر اقبال کے افکار کی تائید کی ہے-

جعفر طاہر:

جعفر طاہر ان چند شاعروں میں سے ایک ہیں جن کی شاعری میں پاکستانیت وطن پرستی کا جذبہ ملتا ہے، ان سے پہلے اقبال کی شاعری میں پاکستان کی تہذیب وثقافت کے آثار ملتے ہیں۔ جعفر طاہر نے اقبال کے اسی نظریے کو آگے بڑھاتے ہوئے نظم میں مختلف موضوعات سے ایک ارفع مقام عطا کیا۔ سمیع اللہ قریشی ان کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''برصغیر میں اپنی ملی بقاء کا سوال اور اس کے جواز جعفر طاہر کے ذہن میں
ابھرتے ہیں تو وہ اقبال کی فکر کو خراج تحسین پیش کرنے کے بعد ہی آگے چلتے ہیں۔
میں اسے بھی ان کے شعری رویے کی ثقافتی سعادت مندی شمار کرتا ہوں۔''[۱]

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ جعفر طاہر کی شاعری پر اقبال کے زیادہ اثرات مرتب ہوئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جعفر طاہر کے اشعار اقبال نے کہے ہیں۔ اقبال نے جس طرح تضمینیں باندھی ہیں، اسی طرح جعفر نے بھی اقبال کے مصرعہ پر تضمین کی ہے مثلاً ''ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود وایاز''، جعفر کے ان اشعار میں تلمیحات واشارات کی کثرت ملاحظہ کیجئے ؎

موج در موج اسیران سمرقند و مزار   غزنہ و غور و سمنگاں کے سبک سیر سوار
ہنہناتے ہوئے گھوڑوں کی عنانیں تھامے   سیل در سیل نیزک دار سنانیں تھامے
''ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز''   اہل دیں پڑتے ہیں اس دیس میں لو پہلی نماز
آنکھ اٹھائیں تو فرشتوں کو پسینے آئیں   سعد سلماں کی سمینہ بدن سلمائیں

جعفر طاہر نے جو تلمیحات استعمال کی ہیں ملاحظہ کیجئے ''غزنہ وغور''، ''سمرقند ومزار''، نیزک دار، سعد سلماں، اردو زبان کا پہلا شاعر، سلمائیں، محبوبائیں، ان میں شخصیات بھی ہیں اور شہروں کو متعارف کرانے کا یہ طریقہ اشعار میں احسن قرار دیا گیا۔

اقبال نے ایک نظم ''کنارراوی'' کے عنوان سے کہی ہے۔ اس نظم سے متاثر ہو کر جعفر طاہر نے بھی نظم کہی جو یقیناً وطن پرستی کی اعلیٰ مثال ہے۔ اس نظم میں اقبال کی پیروی بھی ہے اور عقیدت کا اظہار بھی، اقبال کے دو شعر ملاحظہ کیجئے ؎

سکوت شام میں محو سرود ہے راوی   نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی
پیام سجدے کا یہ زیر و بم ہوا مجھ کو   جہاں تمام سواد حرم ہوا مجھ کو

(کنارراوی)

جعفر طاہر کی نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

یہ راوی کا ہم چشم لاہور دیکھو   میری سرزمین کا یہ شہر معلیٰ
یہ شہر پاک تو جاں ہے وفا شعاروں کی   یہ آبرو ہے پیاروں کی ماہ پاروں کی
یہی ہے داتا کی نگری یہی ہے چاند نگر   شہر خاک پہ یہ بستیاں ستاروں کی
اسی صدف کا ہے پروردہ مادھو لال حسین   سنائی کافیاں دیتی ہیں غم کے ماروں کی

جعفر طاہر نے ''وفا شعار'' کہہ کر شہادت کی طرف نشاندہی کی ہے۔ ''داتا کی نگری'' حضرت سید علی ہجویریؒ سے منسوب ہے۔ ''مادھو لال حسین'' پنجابی شاعری کا نمائندہ شاعر، جس کی کافیاں بہت مشہور ہیں۔ اسی روشنی میں یہ بات پائے ثبوت کو پہنچتی ہے

۱۔ صحیفہ۔ ستمبر، دسمبر، ص ۵۵

کہ جعفر طاہر کی نظم نگاری میں اقبال کے اثرات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ جعفر طاہر نے نظم میں مختلف ہیئت کے تجربے بھی کیے ہیں جس میں وہ خاصے کامیاب رہے ہیں۔ اس کے ساتھ مناظر فطرت پر بھی عمدہ نظمیں کہی ہیں، ان علامتوں میں پاکستان کی ثقافت کو دیکھا جا سکتا ہے، چند شعر ملاحظہ کیجیے ۔

سندھ جیئے پنجاب جیئے اور جیئے بلوچستان
جیئیں مری سرحد کے شیر دلیر جوان پٹھان
ہاری پھولیں پھلیں، جیئیں مزدور، غریب کسان
میرا تیرا رہے سلامت شالا پاکستان

جعفر طاہر کے ثقافتی شعور کو اقبال کے فکری آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ نظم میں اقبال کا لب ولہجہ اور اسلوب اپنایا گیا ہے، گویا جعفر طاہر کی نظم نگاری اور شاعری کو پاکستان کی تاریخ کہا جا سکتا ہے۔

صہبا اختر:

صہبا اختر کا نام شاعری کی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کی نظموں کا مطالعہ کرتے وقت یہ احساس ضرور ہو جاتا ہے کہ یہ شاعری کے کس قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی یہ شناخت دیگر شعراء میں امر ہے۔ ان کی طویل نظموں کا مزاج اور آہنگ جن شعراء سے ملتا ہے ان میں میر حسن کی ''سحر البیان''، شوق قدوائی کی ''زہر عشق''، پنڈت دیا شنکر نسیم کی ''گلزار نسیم''، نظیر اکبر آبادی۔ رزمیہ شاعری میں طویل نظمیں انیس و دبیر کی کوششوں کا ثمر ہے۔ جوش ملیح آبادی نے بھی خاصی طویل نظمیں کہی ہیں۔ حفیظ اور چکبست کے ہاں بھی طویل نظمیں ملتی ہیں۔ حالی نے شاعری کے مزاج کو بدلتے ہوئے طویل نظم ''مسدس حالی'' لکھی اور پھر اقبال، جو آسمان سخن کہلائے، ان کی طویل نظموں میں جو ''بانگ درا'' میں ہیں ''شمع و شاعر''، ''شکوہ''، ''جواب شکوہ''، ''خضر راہ''، ''طلوع اسلام''، ''والدہ مرحومہ کی یاد میں''، بال جبریل میں ''مسجد قرطبہ''، ''ساقی نامہ'' اور ''ذوق وشوق''، اسی طرح صہبا اختر کے ہاں طویل نظمیں ہمیں ملتی ہیں جن کے موضوعات اقبال کی فکر اور اسلوب سے اس قدر مماثلت رکھتے ہیں۔ اقبال کے ہاں ڈرامائی طرز پر نظمیں ہیں تو صہبا اختر کے ہاں بھی منظوم ڈرامہ ''رنگ محل'' کے نام سے ہے۔ دوسرا ڈرامہ ''تاب دوام''۔ یہ ایک مغربی ڈرامے سے ماخوذ ہے۔ طویل نظموں میں ''ایک نوحہ ایک آواز''، ''لوری''، فطرت نگاری پر ''سمندر''، ''برسات''، ''بہار و خزاں''، '''خواب و تعبیر کے درمیان'' نہایت عمدہ نظمیں ہیں۔ قومی و ملی شاعری میں بھی صہبا نے ''رہ وادی خیال''، ''پرچم''، بہر کیف صہبا اختر بیسویں صدی کے آخر کا نمائندہ نظم گو شاعر کہا جا سکتا ہے۔

صہبا اختر کی نظم ''لوری'' پر اقبال کی نظم کا صوتیاتی اسلوب ملاحظہ کیجیے ''والدہ مرحومہ کی یاد'' اقبال کی طویل نظموں میں ہے۔ دونوں کا آہنگ ایک ہی ہے، دو شعر نمونے کے طور پر ۔

یاد سے تیری دل درد آشنا معمور ہے ۔۔۔ جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے
زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم ۔۔۔ صحبت مادر میں طفل سادہ رہ جاتے ہیں ہم

(والدہ مرحومہ کی یاد میں)

صہبا کی نظم ''لوری'' ملاحظہ کیجئے ۔

میری آنکھوں کی روشنی مت سو میرے خوابوں کی زندگی مت سو
چاند تاروں کی طرح تو بھی جاگ میرے زخموں کی طرح تو بھی جاگ
میری لوری کے رس میں نیند کہاں میری پلکوں پہ آنسوؤں کا دھواں
میرے دل میں الاؤ شعلوں کے میری نس نس میں گھاؤ شعلوں کے
اک جہان سلوک ہے تیرے ساتھ میرے سینے پہ رکھ یہ ٹھنڈے ہاتھ

(لوری)

''ایک نوحہ ایک آواز'' میں صہبا نے ہیئت کا تجربہ کیا ہے-ترکیب بند میں یہ نظم خاصی طویل ہے-اس نظم پر اقبال کی نظم ''ذوق وشوق'' کے اثرات بہ اعتبار موضوع دیکھے جاسکتے ہیں-صہبا نے یہ نظم فلسطینیوں کے قتل عام پر لکھی تھی اور اقبال نے اپنی نظم ''ذوق وشوق'' کے اکثر اشعار فلسطین میں کہے تھے،اقبال کے دو شعر ملاحظہ کیجئے ۔

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
حسن ازل کی ہے نمود، چاک ہے پردۂ وجود دل کے لئے ہزار سود ایک نگاہ کا زیاں

(ذوق وشوق) بال جبریل

صہبا کی نظم ملاحظہ کیجئے ۔

دشمن بیکساں ہر ستم زاد ہے
کوئی حداد ہے، کوئی جلاد ہے
آج بھی زندگی، زندگی ہے کہاں
آج بھی آدمی، آدمی ہے کہاں
آج بھی کشور خاک پر حکمراں
کوئی نمرود ہے کوئی شداد ہے
زلزلوں میں کہاں نغمگی کا ظہور
آج داوٗدؑ ہے اور رنج زبور
آج تخت سلیماں ہے ظلمت نشیں
آج ہر صومعہ، نور ہیکل سے دور
سامری کا خدا ہے، خدائے یہود
اور سونے کا بچھڑا دلوں کا سرور
گو ہے قارون، مدفون خاک سیاہ
پھر بھی زندہ ہے قارونیت کا غرور

(ایک نوحہ ایک آواز)

صہبا کے ہاں اقبال کی سی تلمیحات واشارات ملاحظہ کیجئے مثلاً حداد،عربی میں لوہار کو کہتے ہیں اور یہ ابوحفص کی کنیت ہے

کیونکہ آپ لوہار کا کام کرتے تھے اور اپنے وقت کے نامور بزرگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ''نمرود''، شداد اور قارون بے پناہ دولت کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ بادشاہت بھی ان کے پاس تھی۔ حضرت داؤدؑ اور ان پر نازل کی گئی کتاب زبور کی تعلیم کا ذکر ہے۔ اسی طرح تخت سلیماں، حضرت سلیماں کا تخت، ''نوریکل'' ایک بڑے بت کا نام ہے۔ سامری فرعون کے زمانے کا جادوگر تھا جس نے رسیوں کو رستے میں ڈال کر اژدھے بنا دیئے۔ قارون کہہ کر آج کے مغرور دولت مند کی طرف طنز ہے۔

صہبؔا نے ملی قومی نظمیں نہایت عمدہ کہہ کر اقبال کی تقلید ہی نہیں کی بلکہ دل و جاں سے ان کی شاعری کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اقبال کے نقوش صہبا کے مجموعے ''سرکشیدہ'' اور ''سمندر'' میں ملاحظہ کیجئے۔ صہبا کی نظم ''پرچم'' قومی شاعری پر ہے۔

سید عابد علی عابدؔ:

عابد علی نظم اور غزل دونوں کے شاعر تھے۔ افتادِ طبع نظموں میں زیادہ کھلی ہے۔ ان کی زیادہ تر نظمیں طویل پیرائے میں ہیں مثلاً ''سراپا''، ''شام بہار''، ''چاندنی رات'' ان کے فنی ارتقاء کو سمجھنے کے لئے شاعری میں جو تلازمے فکر اور خیال استعمال ہوئے ہیں ان کی تہہ میں اترنا پڑے گا۔ عابد علی نے انگریزی ادب اور شعراء سے خاصہ تاثر قبول کیا ہے۔ اقبال سے فطری طور پر متاثر تھے۔ نظموں میں اقبال کی تراکیب صنائع بدائع، فارسی الفاظ کا استعمال۔ ایسے الفاظ استعمال کرنا جس میں فکر اور خیال کی آمیزش ہو۔ ان کے اس عمل سے نئے لفظوں کا اظہار ہوتا ہے۔ یوسف ظفر عابد علی کی فسوں گری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''عابد صاحب کے ہاں لطافت خیال کو لفظوں کی فسوں گری سے جدا نہیں کیا جاسکتا کہ اس کو انہوں نے اپنا فن ٹھہرایا ہے۔ الفاظ خیال کا لباس ہیں، اگر قامت خیال پر الفاظ چست نہ ہوں، موزوں نہ ہوں، عمر اور مزاج کے مطابق نہ ہوں، تو خیال دوسرے کے ذہن تک رسائی حاصل نہیں کر سکے گا۔ اس معاملے میں وہ صناع ہیں کہ ان کی نادرہ کاری اور نازک مزاجی کے امتزاج نے الفاظ کو پتھر سے نگینہ بنا کر مناسب اور متناسب کیا اور خیال کے خالص سونے پر یہ جڑاؤ کام اور بھی دیدہ زیب ہو گیا۔''[۱]

یوسف ظفر کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہ ان کے ہاں الفاظ نے نیا روپ دھارا ہے اور یہ نیا روپ اقبال کے فکر و نظر کے نور سے ممکن ہوسکا۔ عابد علی کی طویل نظمیں اس ثبوت کے لئے پیش کی جاسکتی ہیں۔ یہ طویل نظمیں زیادہ تر ترکیب بند میں ہیں اور تراکیب لفظی کا باقاعدہ ایک نظام ملتا ہے۔ عابد علی کی نظم ''سراپا'' طویل پیرائے میں ہے، جیسے اقبال کی نظمیں ''طلوع اسلام''، ''خضر راہ''، ''والدہ مرحومہ''، ''شمع شاعر'' وغیرہ۔ عابد علی کے الفاظ میں شیرینی بھی ہے اور سیمابی کیفیت بھی ہے۔ پابند نظمیں اقبال کے طرز اور اسلوب میں کہی ہیں۔ ان کے ہاں جمالیاتی حسیت بھی تیز ہے۔ اقبال کے فکر و آہنگ سے مماثلت رکھتی ہوئی نظم ''سراپا'' ملاحظہ کیجئے ؂

اسی سے جادوئے بابل کی شمع روشن تھی — جو رنگ ناز تری چشم نیم خواب میں ہے
بنے تھے جس کی لطافت سے جسم پریوں کے — اسی بہار کی خوشبو تیرے شباب میں ہے
فروغ مہتاب اک فسانہ ہے اس کے رخسار آتشیں کا — بہار فردوس اک ترانہ ہے اس کی رنگینی جبیں کا

۱۔ میں کبھی غزل نہ کہتا، ص ۲۸۱

یہ تابشیں جسم مرمریں کی یہ رنگ ملبوس ریشمیں کا ۔۔۔ شرارہ ہے آتش وفا کا ستارہ ہے عرش ہفتمیں کا
یہ اور بھی پر لگے ہوئے ہیں نگاہ کے تیر دلنشیں کو ۔۔۔ لرز رہا ہے شراب غم سے جو میکدہ چشم سرگیں کا
جبیں کی رنگینیوں پہ سائے غم محبت کے چھا گئے ہیں ۔۔۔ ہٹیں جو یہ بادلوں کے ٹکڑے چمک اٹھے چاند چودھویں کا

(سراپا)

اسی طرح عابد علی کے ہاں فطرت سے بھرپور اور نہایت عمدہ منظر کشی نظموں میں نظر آتی ہے۔ اقبال نے ''ساقی نامہ'' نظم، میر حسن کی بحر میں کہی ہے اسی طرح عابد نے اپنی مثنوی کا عنوان ''چاندنی رات'' رکھا ہے۔ نظم کا موضوع جمالیات پر ہے۔ اقبال کے ''ساقی نامہ'' سے چند شعر ملاحظہ کیجیے ؂

ہوا خیمہ زن کاروان بہار ۔۔۔ ارم بن گیا دامن کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن ۔۔۔ شہید ازل لالہ خونیں کفن
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں ۔۔۔ لہو کی ہے گردش رگ سنگ میں
فضا نیلی نیلی، ہوا میں سرور ۔۔۔ ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

(ساقی نامہ) بال جبریل

عابد علی کی نظم ''چاندنی رات'' ملاحظہ کیجیے، اس نظم میں اقبال کا پرتو اور تقلید نظر آئے گی ؂

وہ مہتاب کا نور وہ آب و تاب ۔۔۔ کسی بت کے منہ پر سنہری نقاب
فضاؤں میں انوار کھوئے ہوئے ۔۔۔ شعاؤں میں موتی پروئے ہوئے
وہ جلوے ہواؤں میں بکھرے ہوئے ۔۔۔ وہ ذرے گلستاں کے نکھرے ہوئے
وہ شبنم سے بھیگا ہوا سبزہ زار ۔۔۔ کہ فرش زمرد یہ ہیروں کا بار

(چاندنی رات)

ان چند اشعار سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ عابد علی نے اپنے معاصر شعراء سے الگ ہٹ کر اپنی راہ بنائی، جس کا اعتراف معاصر شعراء نے بھی کیا ہے۔ اردو اور فارسی تراکیب میں بے پناہ اضافہ کیا، جیسے اقبال نے ''ساقی نامہ'' میں کیا ہے ؂

شراب کہن پھر پلا ساقیا ۔۔۔ وہی جام گردش لا ساقیا

اسی طرح عابد علی نے اپنے ایک شعر میں جسے تقلید کہا جا سکتا ہے، اس شعر میں اقبال کا آہنگ واضح طور پر دکھائی دیتا ہے ؂

خرد ہے زمانے میں دامن کشاں ۔۔۔ اٹھا ساقیا ساغر گلفشاں

منیر نیازی:

منیر خالصتاً نظم کا شاعر ہے اور معاصرین میں طرز خاص کا موجد ہے۔ انہوں نے نظم آزاد اور پابند نظم میں اپنے خیالات کی ترسیل کی ہے۔ اگر ان کی شاعری کو خوشبو سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ یہ ہمارے عہد کی وہ منفرد آواز ہے جس میں ذات سے کائنات کا سفر ہے اور یہ سفر اتنا آسان نہیں، ان کے تلازمات ہی ان کے کرب کے ترجمان ہیں۔ انہوں نے اپنی ذات میں انسان کی تلاش کی ہے اور کائنات میں فطرت کو تلاش کیا ہے۔ ان کے کئی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں، ان میں ''تیز ہوا اور تنہا

پھول‘‘، ’’جنگل میں دھنک‘‘، ’’دشمنوں کے درمیان شام‘‘، ’’ماہ منیر‘‘، ’’چھ رنگیں دروازے‘‘، ’’آغاز زمستاں میں دوبارہ‘‘، ’’ساعت سیار‘‘، ’’پہلی بات ہی آخری تھی‘‘، ’’ایک دعا جو میں بھول گیا تھا‘‘۔منیر کی مختصر نظموں پر اقبال کی فکر، جو ’’ضرب کلیم‘‘ میں ظاہر ہوئی ہے، کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ان کے ہاں جو علامتیں استعمال ہوئی ہیں ان میں اقبال کی تشبیہات واستعارات سے خاطر خواہ اکتساب فن کیا ہے۔ان کے کلام میں تصوف کی چاشنی کے ساتھ ذاتی کرب کا اظہار بھی پایا جاتا ہے۔جدید شعراء کی صف میں منیر اپنا علیحدہ مقام بنانے میں خاصے کامیاب ہوئے ہیں۔ان کی غزلوں میں روایت پسندی کے رجحانات کے ساتھ جدید فکری حسیت کا اظہار ہے لیکن جدید نظم ان کی شناخت ہے اور نظم ہی کے حوالہ سے ان کی شاعری اور منیر زندہ رہیں گے۔منیر کی نظم ’’موسم سرما کی بارش کا یہ پہلا روز ہے‘‘ پر اقبال کی نظم ’’ابر کوہسار‘‘ کے نقوش، جس میں جمالیاتی شعور کارفرما ہے، اقبال کا یہ بند ملاحظہ کیجئے ؎

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا   ابر کہسار ہوں گل پاش ہے دامن میرا
کبھی صحرا کبھی گلزار ہے مسکن میرا   شہر و ویرانہ میرا، بحر مرا، بن میرا
کسی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھ کو
سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو

(ابر کوہسار) بانگ درا

منیر نیازی کی نظم ملاحظہ کیجئے ؎

موسم سرما کی بارش کا یہ پہلا روز ہے   دھند ہے اطراف میں سورج کے خواب گرم پر
میں کہ جو محصور ہوں آرام حسن یار میں   اک حفاظت سی ہے مجھ کو جسم کی مہکار میں
یاد اور موجود دونوں کی حقیقت اس میں ہے   غم کی طاقت کو غلط کرنے کی ہمت اس میں ہے
سحر اتنے ہیں جمال مہربان یار میں   جتنے اس سرما کی بارش کے حسیں اسرار میں

(موسم سرما کی بارش کا یہ پہلا روز ہے)

اس نظم میں تشبیہات کا نظام اقبال کے آہنگ کا مرہون منت ہے مثلاً سورج کے خواب گرم پر، آرام حسن یار، جسم کی مہکار، کسرا ضافی کا نظام بھی اقبال ہی کی عطا ہے۔

منیر کی نظموں کے عنوانات ’’سورج گرہن کے دن‘‘، ’’میرا اصل وجود‘‘، ’’نئی رت‘‘، ’’سانپ کی صفات‘‘، ’’صبح صادق کا پھیلاؤ‘‘، ’’ثابت وسیار ساعتیں‘‘، ’’جادو گھر‘‘، ’’ساکت زندگی‘‘، ’’میں اور وہ‘‘، یہ منیر کی مختصر نظمیں ہیں جیسے اقبال نے ’’ضرب کلیم‘‘ میں لکھی ہیں۔ان نظموں سے پختگی ذہن کا اندازہ ہوتا ہے۔محب وطن ہونے کی حیثیت سے بھی منیر نے نہایت عمدہ نظمیں کہی ہیں۔ان کی نظم ’’اپنے وطن پر سلام‘‘، جس جذبہ اور وطن کی محبت میں لکھی گئی ہے اس کا اندازہ نظم پڑھنے کے بعد ہوگا۔اقبال کے ابتدائی دور کا کلام وطن کی محبت میں ہے۔’’ہندوستانی بچوں کا قومی گیت‘‘ کے اثرات منیر کی نظم میں دیکھئے، اقبال کا یہ بند ملاحظہ کیجئے ؎

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا   نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا   جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

(ہندوستانی بچوں کا قومی گیت) بانگ درا

منیر کی نظم ''اپنے وطن پر سلام'' ملاحظہ کیجئے ۔

اے وطن! اسلام کی امید گاہ آخری، تجھ پر سلام
کل جہاں کی تیرگی میں اے نظر کی روشنی، تجھ پر سلام
تو ہوا قائم خدا کی برتری کے نام پر
بازوئے حیدرؓ جمال احمدیؐ کے نام پر
مرگ دانش کے جہاں میں لہلاتی زندگی تجھ پر سلام
تو بھی ہے ہجرت کدہ شہر مدینہ کی طرح
ہم نے بھی دہرائی ہے اک رسم آبا کی طرح
اے جلال حق کے مظہر، اے نشان سرخوشی تجھ پر سلام
میں ہوں فانی، حسن تیرا مستقل
یاد رکھنا مجھ کو بھی اے شمع دل
سایۂ افلاک نو میں اے بہار دائمی، تجھ پر سلام

(اپنے وطن پر سلام)

منیر نیازی نے اپنی نظموں میں ہیئت کے تجربے بھی کئے ہیں۔ ان کی نظم ''اے ہلال عید'' پر اقبال کی نظم ''غرہ شوال'' یا ''ہلال عید'' خوشی کا اظہار ہے، جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ منیر کا یہ بند ملاحظہ کیجئے ۔

اے ہلال عید! تیرا حسن وجہ راحت و آرام ہے
اے نشان نور تیری دید میرے صبر کا انعام ہے
دیکھتی ہے آنکھ تیرے روپ نیلے آسماں کے درمیاں
ہے بہت ہی دور شہر خاک تجھ سے اے نگار زرفشاں
اے ہلال عید......!

(اے ہلال عید)

منیر کی نظموں کے عنوانات اور تخلیقی اپج سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے وجدان میں اقبال کے افکار تازہ محفوظ ہیں۔

فیض احمد فیض:

''نقش فریادی'' اور ''دست صبا'' کی نظموں میں جو بُعد ہے اس ارتقائی عمل میں فیض کی شاعری کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی نظموں میں جذبات اور احساسات کی مختلف کیفیات ملتی ہیں۔ نظم میں نئی زندگی اور نئے نظام کا پرچار بھی ہے۔ ''نقش فریادی'' کی نظموں میں جذبات کا سیلاب دیکھنے میں آتا ہے۔ ان کا پیرایۂ اظہار نہایت سادہ اور دلکش تھا۔ فیض، حسن اور عشق دونوں کے شاعر ہیں اسی لئے نظموں میں جلال و جمال، زندگی کی نیرنگیاں، جو نظریۂ حیات کی صورت میں واضح ہوا ہے۔ ان کا لہجہ رجائی ہے۔ اگر ہم فیض کی پوری شاعری کا بہ نظر غائر جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غم عشق اور غم روزگار کا شاعر ہے۔ ن۔م۔ راشد نے فیض کے

بارے میں لکھا تھا کہ ''فیض کسی مرکزی نظریے کا شاعر نہیں-صرف احساسات کا شاعر ہے-''فیض کی نظموں کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا رقمطراز ہیں:

''فیض کی نظموں کا امتیازی وصف یہ ہے کہ ان میں رومان اور حقیقت کا ربط باہم نمودار ہوا ہے اور ان میں عرفان ذات اور عرفان کائنات کی حدود ملتی اور ایک دوسرے میں ضم ہوتی دکھائی دیتی ہیں-'' [1]

فیض کی نظموں میں وقت کے ساتھ ساتھ جو تجربے ہوئے ان میں نیا علامتی نظام، شعری روایت سے گریز کرتے ہوئے نئی فکر اور نئے جذبے سے ایک نیا اسلوب دیا، جو صرف فیض کی شناخت بن گیا-احمد ہمدانی نے فیض کے بارے میں لکھا ہے:

''فیض صاحب نے شاعری کی ابتداء رومانی نظموں سے کی- ان کی ان نظموں میں انگریزی کے رومانی شعراء کی چھوٹیں بھی پڑتی نظر آتی ہیں لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ وہ کسی صورت میں بھی اپنے احساس، اپنے تجربے اور اپنی معاشرتی فضا کو فراموش کر دیں-ان کا تصور جمالیات ان کے تصور انسان و کائنات سے الگ کوئی چیز نہیں-'' [2]

ان دو آراء کی روشنی میں فیض کی شاعری کا رجحان واضح ہو جاتا ہے-فیض کی نظموں میں اقبال کی فطرت نگاری اور منظر کشی کو محاکاتی انداز میں دیکھا جا سکتا ہے مثلاً ''زنداں کی ایک شام'' میں چاند اور چاندنی، حسن اور شمع حسن اور جذبات کی آمیزش نظر آتی ہے- یہی وہ اقبال کی دین ہے- اقبال کی نظم ''انسان اور بزم قدرت'' میں جو جذبات اور احساسات پائے جاتے ہیں، وہی فیض کی نظم ''زنداں کی ایک شام'' میں پائے جاتے ہیں- یہ نظم منظر کشی کے اعتبار سے نہایت عمدہ نظم ہے-منظر کشی میں فیض کو ملکہ حاصل تھا- ان کی دوسری نظم ''زنداں کی ایک صبح'' مناظر فطرت پر بہترین نظم ہے-

اقبال کی نظم ''انسان اور بزم قدرت'' کے دو شعر ملاحظہ کیجئے، جو مناظر فطرت پر بہترین نظم ہے ؎

صبح خورشید درخشاں کو جو دیکھا میں نے بزم معمورۂ ہستی سے یہ پوچھا میں نے
پرتو مہر کے دم سے ہے اجالا تیرا سیم سیال ہے پانی ترے دریاؤں کا

(انسان اور بزم قدرت) بانگ درا

فیض کی نظم ''زنداں کی ایک صبح'' میں اقبال کی فطرت نگاری ملاحظہ کیجئے ؎

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اتر رہی ہے رات
یوں صبا پاس سے گزرتی ہے
جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات

صحن زنداں کے بے وطن اشجار
سرنگوں محو ہیں بنانے میں

۱- نظم جدید کی کروٹیں، ص ۱۰۸

۲- نئی شاعری کے ستون، ص ۲۳

دامن آسمان پہ نقش نگار
شانۂ بام پر دمکتا ہے

مہرباں چاندنی کا دست جمیل
خاک میں گھل گئی ہے آب نجوم
نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل
سبز گوشوں میں نیلگوں سائے

لہلاتے ہیں جس طرح دل میں
موج درد فراق یار آئے
دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل

ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہوسکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

(زنداں کی ایک شام)

اس نظم میں اقبال کی سی تراکیب لفظی، علامتیں اور انداز اسلوب اختیار کیا ہے۔ مثال کے طور پر ''بے وطن اشجار'' ''چاندنی کا دست جمیل''، ''آب نجوم''، ''عرش کا نیل'' یہ وہ تراکیب ہیں جس سے نئی علامتیں اور تشبیہات وضع کی ہیں۔ مناظر کے حسن میں اور زندگی کے حسن میں جو توازن و تسلسل پایا جاتا ہے جذبات اور تخیل سے نظم میں توانائی آگئی۔ نظموں میں فلسفیانہ یا مفکرانہ طرز بالکل نہیں ہے بلکہ حالات و واقعات کی عکاسی کی ہے۔ فیض کی نظم ''زنداں کی ایک صبح'' کے دو شعر ملاحظہ کیجیے ۔

دور نوبت ہوئی پھرنے لگے بیزار قدم زرد فاقوں کے ستائے ہوئے پہرے والے
اہل زنداں کے غضب ناک فروشاں نالے جن کی بانہوں میں پھرا کرتے ہیں بانہیں ڈالے

(زنداں کی ایک صبح)

فیض کے ہاں حب الوطنی کا جذبہ نت نئے انداز سے ظاہر ہوا ہے۔ ''دست صبا'' میں ''صبح آزادی'' کی یہ نظم اس بات کی ترجمان ہے ۔

ابھی گرانی شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

(صبح آزادی)

فیض کی یہ نظم ''درد آئے گا دبے پاؤں'' پر اقبال کی طویل نظم ''تصویر درد'' کے نقوش ملاحظہ کیجئے ؂

ہو نہ ہو اپنے قبیلے کا بھی کوئی لشکر
منتظر ہوگا اندھیرے کی فصیلوں کے ادھر
ان کو شعلوں کے رجز اپنا پتہ تو دیں گے
خیر ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی صدا تو دیں گے
دور کتنی ہے ابھی صبح، بتا تو دیں گے

(درد آئے گا دبے پاؤں) زنداں نامہ

اقبال نے اپنے شعر میں ''سحر گاہی'' کو یوں باندھا ہے ؂

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

اسی طرح فیض نے سحر کو اٹھنے والوں اور سحر کے منظر کو قلمبند کیا ہے، ملاحظہ کیجئے ؂

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے قریب تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

(ملاقات) زنداں نامہ

اسی طرح کی نظمیں جس میں مناظر فطرت، حسن وعشق اور جذبات واحساسات کی دلآ ویز حکایتیں، جو دھیمے دھیمے انداز میں نظموں کا بانکپن اور نکھار دیکھنے کی چیز ہے۔ چند نظموں کے عنوانات ملاحظہ کیجئے جس میں سماجیات واشتراکیت کے رجحانات بھی پائے جاتے ہیں ''شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں''، ''میرے ہمدم میرے دوست''، ''دل من مسافر من''، ''موضوع سخن''، ان نظموں میں غم جاناں اور غم دوراں کی خونچکاں حکایتیں تحریر کی گئی ہیں۔ فیض کی نظموں میں اقبال کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

باب پنجم

اقبال کے بعد ہیئت، اسالیب، موضوعات، طرز فکر

اظہار کا وہ سانچہ جسے چند اجزائے ترکیبی کے ساتھ مخصوص کر دیا جائے اسے ہیئت کہتے ہیں- ہیئت کے طور پر اپنی شناخت رکھنے والے اصناف ادب یہ ہیں- قصیدہ، غزل، واسوخت، رباعی، قطعہ، مرثیہ، مستزاد، مربع مخمس، مسدس، مثنوی، ترجیع بند، ترکیب بند، نظم معریٰ، آزاد نظم، مسبع، مثمن، متسع، معشر، سانیٹ وغیرہ شامل ہیں- ان تمام ہیئتوں کی جامع تعریف وتوضیح متعلقہ کتب میں دیکھی جا سکتی ہیں-

اردو شاعری نے جو نیا طرز اختیار کیا- اس نئے رجحان میں مغربی اثرات کی چھاپ نمایاں رہی- اس وقت مغرب میں امیجیسٹ تحریک، سوشلزم تحریک سرگرم عمل تھیں- پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے بعد مغربی ممالک کے شعراء کے ہاں خوف، تنہائی، موت اور حسرت و ناکامی کی جو فضا قائم ہو چلی تھی اس کی مثال ٹی ایس ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ ہے- ہیوم ازرا پاؤنڈ اور ہلدہ دولٹل کی نظمیں اس دور کی عکاس ہیں لیکن صحیح معنی میں دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء کے بعد مغربی افکار و خیالات کے جدید رجحان میں تیزی آ گئی-

مغرب میں ہیئت اور اسالیب کے تجربوں کے ساتھ الفاظ کی قدر و قیمت کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا جا رہا تھا- اوزان اور بحور کے استعمال میں بھی جدید پیرائے کو ملحوظ رکھا گیا- ہیئت کے اعتبار سے آزاد شاعری اور معریٰ نظم کو اختیار کیا گیا- امیجیسٹ تحریک زیادہ عرصہ تک نہ چل سکی لیکن اسی تحریک کے وجود سے ایک نئی تحریک نے جنم لیا، جو اسٹول گروپ کہلایا- یہ تحریک تین افراد پر مشتمل تھی جن میں دو بھائی اور ایک بہن، یہی اس کے بانی تھے- ان تحریکوں کے بعد سرریلزم تحریک وجود میں آئی:

> ''امیجیسٹ تحریک کا قلع قمع جلد ہی ہو گیا اور اسی تحریک کے شکم سے انگریزی ادب میں ایک نئی تحریک نے جنم لیا، جو اسٹول گروپ کے نام سے مشہور ہوئی اور جس کے عروج کا زمانہ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۱ء تک کا دور ہے-'' [1]

سرریلزم تحریک کے سربرآوردہ ڈیلن ٹامس، جارج بارکر اور ڈیوڈ گیس کوائن نہایت اہم حیثیت رکھتے تھے- اس تحریک کی مخالفت اور مذمت کرتے ہوئے امریکی ادیب ہنری ملر نے کہا کہ اس تحریک میں وہ لوگ شامل ہیں جو ذہنی اور روحانی طور سے قلاش ہو چکے ہیں- اس کی ایک خاص وجہ یہ بتائی کہ سرریلسٹ، بے اعتباری، تفرقہ پردازی اور تنہا پسندی ان کا مقصدی محور ہے:

> ''فریزر کے خیال میں سرریلسٹ، بے اعتباری اور تفرقہ پردازی کے خواہاں ہیں اور اس تنہا پسندی سے ان کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ادب کے قاری کو سماجی مسائل سے الگ کر کے ادب کے صحیح مقصد سے دور ہٹا دیں اور اس طرح عام لوگوں کا نقطۂ نظر ہی، ادب کے معاملے میں بالکل بدل جائے اور آخر کار انسان دیوانگی و

۱- نقوش- جولائی، ص ۳۰۵

انتشار کے سمندر میں ایک دن خود کود پڑے۔ اس تحریک کے چلانے والے درحقیقت
کسی واضح سمت کی نشاندہی نہیں کر رہے تھے۔'' [۱]

شاعری میں اس نئے رجحان کے تحت، بحور کی آزادی اور ہیئت کے تجربوں سے نئے ذہنوں میں ایک انقلابی لہر دوڑ گئی۔ شعراء نے اس نئے آہنگ کو اپنانے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں ترقی پسندوں نے خاصا نمایاں کردار ادا کیا، جس سے اردو نظم میں ایک ایسا تنوع آ گیا، جس کی مثال اس اقتباس سے واضح ہو جاتی ہے:

''ہیئت کا تعلق ظاہری روپ سے ہے لیکن ان دونوں باتوں کا فیصلہ لفظوں،
ان کی ترتیب اور ڈھانچے کی سطح پر نہیں، خیال کی سطح پر کیا جا سکتا ہے۔ ترقی پسند
شاعروں نے جو نئی ہیئتیں شاعری کو دیں، ان پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے پہلے دو
باتیں عرض کرنا ہیں، ایک یہ کہ جس طرح ادب میں ایک تسلسل ہوتا ہے، اسی طرح
ہیئت کے اعتبار سے بھی کوئی تجربہ بالکل انوکھا نہیں ہوتا۔ ماضی کے تجربوں سے اس کا
رشتہ ہوتا ہے۔'' [۲]

اقبال کی شاعری میں ہیئت کے تجربوں کو تلاش کریں تو ان کے ہاں ہیئت کا ایسا کوئی تجربہ نہیں ملتا جسے ہم ان کی ذات سے مخصوص کر سکیں۔ تاہم انہوں نے ہیئت کے ضمن میں انقلابی نوعیت کا اقدام یہ کیا کہ اردو شاعری کی دو فرسودہ یا تقریباً متروک ہیئتوں یعنی ترکیب بند اور ترجیع بند کو اپنے فکری اظہار کے لئے اس طرح نہ صرف منتخب کیا بلکہ انہیں اس انداز سے برتا کہ ان میں ایک نئی روشنی اور ایک نئی توانائی پیدا ہو گئی۔ علاوہ ازیں اقبال نے ہیئت کے حوالے سے ایک اور نمایاں کام یہ کیا کہ اپنے عہد کی سب سے مقبول اور پامال صنف سخن یعنی غزل کو صرف عشقیہ مضامین تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ ایک تنگ دائرے کو توسیع دے کر فکر و خیال کے لامحدود بحر ناپید کنار کی عظمت عطا کر دی۔

اقبال کے شعری اسلوب کی خصوصیت میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ جو زورِ خطابت اور بیداری کا عمل ان کی شاعری میں ہمیں ملتا ہے، وہ ان کے معاصر شعراء میں نہیں۔ البتہ حالؔی کے اسلوب میں وعظ اور اصلاح کی بازگشت نظر آتی ہے۔ اقبال کی شاعری میں تخاطب اسلوب کی نشاندہی کرتا ہے۔ نظموں میں ''حرف ندا'' یعنی خطاب کا وہ منفرد انداز ہے جو ہمیں اقبال سے پہلے نہیں ملتا۔ دوسری خاص بات جو نظموں میں پائی جاتی ہے وہ پیام رسانی ہے۔ پیام رسانی میں تین نام لئے جا سکتے ہیں، حالؔی، اکبؔر اور اقبالؔ لیکن ان تینوں کے اسلوب میں خاصہ فرق ہے۔ حالؔی ایک ناصح کی حیثیت سے اپنے اسلوب میں متشکل ہوئے۔ اکبؔر کے اسلوب کو طنز و ظرافت کے آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے جبکہ اقبال ایک حکیم کی حیثیت سے متشخص ہوئے۔ اقبال نے اپنے حکیمانہ انداز اور فلسفہ سے غور و فکر کا جو نظام مرتب کیا وہی ان کا اسلوبیاتی طرز کہلایا۔

اردو شاعری کی روایات میں حالؔی کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ بدلتے ہوئے حالات کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے قدیم سانچوں میں نئے موضوعات اور نئے مسائل کو نظموں میں پیش کیا۔ حقیقت نگاری اور فطرت پرستی، جو جمالیاتی تصور کی آئینہ دار ہے، حالی کی نظموں کے موضوعات میں مذہب، اخلاقیات کے علاوہ سماجی، معاشرتی، سیاسی موضوعات وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے برعکس اقبال کی نظموں کے موضوعات میں ہمہ گیری اور وسعت پائی جاتی ہے۔ اقبال کی شاعری کا رجحان دیگر شعراء

۱۔ نقوش۔ جولائی، ص ۳۰۶

۲۔ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر، ص ۴۷

سے مختلف ہے- ان کی فکر کا محور کسی ایک خاص موضوع کے لئے مخصوص نہیں بلکہ ہمہ جہتی اور منجملہ کیفیات کو موضوع بنا کر پیش کرنے کا ایک خاص ہنر جو انسانی اور سماجی لحاظ سے مربوط ہے، موضوعاتی زنجیر بنا دیتے ہیں اور اس زنجیر کی ہر کڑی موضوعاتی تاثر رکھتی ہے مثلاً اقبال کی ابتدائی شاعری میں وطنیت کا اظہار ملتا ہے- اس کے علاوہ مفکر کی حیثیت سے پیام رسانی کا عمل بھی خاصہ تیز ہے- انہوں نے انسانی اقدار پر بہترین نظمیں لکھی ہیں- ہندوستان کے بنیادی مسائل کو شاعری کا موضوع بنایا- مزید برآں اقبال کے موضوعات میں سب سے توانا موضوع خودی کا تصور ہے لیکن اقبال کہیں کسی جگہ رک کر نہیں بیٹھ گئے، نئے نئے موضوعات کی تلاش میں سرگرداں رہے مثلاً سماجی موضوعات کے علاوہ انہوں نے مناظر فطرت اور مظاہر قدرت کے علاوہ انقلابی موضوعات میں خاصہ اضافہ کیا- طنز و مزاح کے موضوع پر اقبال نے ''بانگ درا'' کے آخری حصہ میں اپنا ظریفانہ کلام شامل کیا ہے، جس سے ان کی بذلہ سنجی کا پتہ چلتا ہے- غرض اقبال کے ہاں حب وطن، قومی شعور اور مذہبی رجحان فکر و فلسفہ کی روشنی میں نئے موضوعات متعین ہوتے ہیں- بچوں کو اہمیت دیتے ہوئے اقبال نے ''بانگ درا'' کے پہلے حصہ میں ایسی نظمیں لکھی ہیں جو موثر بھی ہیں اور دلچسپی کا سامان بھی لئے ہوئے ہیں- اقبال کے تمام موضوعات میں انسانیت اور انسان دوستی کا جو شعور اور میلان کارفرما ہے، وہ تمام افکار و خیالات کا آئینہ دار ہے- تخاطب اقبال کی شناخت ہے، یہیں سے اسلوب پہچانا جاتا ہے- بیشتر نظمیں تخاطب کو ظاہر کرتی ہیں مثلاً اے ہمالہ، اے گل پژمردہ، اے محیط آب گنگا، اے چاند، اے برہمن، اے درد عشق، اے قطرۂ بے تاب، اے آفتاب، اے گل رنگیں، اے شمع، اے بزم جہاں، اے طفلک پروانہ خو، اے بلبل، اے دل، اے نوجواں- ع

''ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو''

اس روشنی میں اقبال کے اسلوب کو سمجھنا سہل ہو جاتا ہے کہ نظموں میں تخاطب، پیغام اور حکیمانہ انداز کی بازگشت جگہ جگہ نظر آتی ہے- یہ وہ کیفیتیں ہیں جنہیں رمزیت سے تعبیر کیا جاتا ہے- رمزیت تخیل کی وہ معراج ہے جہاں تخیل کی گلکاریاں نظر آتی ہیں- سننے اور پڑھنے والے پر محویت کا طاری ہو جانا ہی رمزیت کہلاتی ہے، اس لئے اقبال کا اسلوب خطیبانہ اسلوب ہی کہا جا سکتا ہے:

> ''شعر اقبال کی عام کیفیت ایک ایسے تخاطب کی ہے جس کو عمومی تخاطب کہنا
> مناسب ہوگا، یہ تخاطب بنی نوع انسان سے، رسالتمآب سے، اہل ہند سے، جوانان
> قوم سے، یا ملت اسلامیہ سے ہے- عموی تخاطب کی یہ کیفیت اقبال کی پوری شاعری
> میں موج تہہ نشیں کی طرح جاری و ساری ہے-'' [1]

شعری اسلوب میں فکر انگیزی، مترنم بحریں، خوش آہنگی اور پر اثر کیفیتیں پائی جاتی ہیں- یہی اقبال کے اسلوب کی خصوصیات ہیں- یہ طرز خاص انہی سے مخصوص ہے، اس میں انفرادیت کے ساتھ ہمہ جہتی اور ہمہ رنگی پائی جاتی ہے اور وہ اپنی شاعری میں جان دار یا بے جان چیزوں کو مخاطب کر کے اپنے افکار و خیالات کی ترسیل کرتے ہیں- اسے حرف ندا بھی کہا جاتا ہے- اس کے علاوہ ان کی نظموں میں پیغام کو بھی مرکزی حیثیت حاصل ہے مثلاً جاوید کے نام، ایک نوجوان کے نام، خطاب بہ نوجوانان اسلام، پنجاب کے دہقان سے، طلباء علی گڑھ کالج کے نام، امرائے عرب سے عبدالقادر کے نام وغیرہ شامل ہیں-

اقبال بنیادی طور پر ایک فلسفی تھے- ان کے افکار و خیالات اسلامی نظریات کے حامل تھے- یوں تو اقبال نے بیشتر فلسفیوں سے استفادہ کیا، جن میں نیٹشے، برگساں، کانٹ، ہیگل، مارکس وغیرہ شامل ہیں- مسلم فلسفیوں میں ابن سینا، محی الدین ابن عربی اور جمال الدین افغانی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں- اقبال کے فلسفہ میں سب سے اہم بات جو نمایاں طور پر محسوس کی گئی وہ انسانی اقدار اور

۱- اقبال کے فکری آئینے، ص ۱۶۲

انسانی تقاضوں کا پاس اسلامی اصولوں میں تلاش کرتے ہیں- اقبال کے فلسفے اور فکر وفن میں انسان اور انسانیت کو اول سے آخر تک دیکھا جاسکتا ہے-

اقبال اپنے طرز فکر میں اسلامی نظام فکر کو سمو کر جدید پیرائے میں ادا کرنے کا ہنر جانتے ہیں- اقبال کے فلسفے اور طرز فکر کو سمجھنے کے لئے ہمیں اسلامی الٰہیات یا اسلامی فکر کی تشکیل نو کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا پڑے گا- ان کی فکر کا انداز دیگر شعراء سے جداگانہ تھا- اقبال کی نظم ''شمع اور شاعر'' ہی کو لے لیجئے اس میں انہوں نے شمع کو معنوی اعتبار سے نئے تناظر میں پیش کیا ہے جبکہ اقبال سے پہلے شمع صرف محبوب کی علامت کے لئے وقف تھی- ان کی شاعری میں جو انقلابی فکر کارفرما ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیغام میں جہد مسلسل، سعی وعمل، تسخیر کائنات، قوموں کی تعمیر وترقی اور شب وروز محنت پیہم کو وہ اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں-فلسفۂ خودی اقبال کا وہ اہم موضوع ہے جس میں اقبال کے طرز فکر کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے- اقبال کا سب سے اہم کام یہ ہے کہ انہوں نے الفاظ کو تراکیب اور تشبیہات سے نئے معنی عطا کئے اور یہی ان کا وہ فکری اجتہاد ہے، جو بعد کے شعراء کے لئے مشعل راہ بنا- اقبال کے فکری میلان کو ان کے خطوط میں بھی دیکھا جاسکتا ہے ؎

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

اقبال کے اس پیغام میں اس فکر کو ملاحظہ کیجئے، جس میں اقبال کے اندر کا انسان اور اس کا جذبہ واضح دکھائی دیتا ہے- وہ انسان کو مجروح حالت میں نہیں دیکھ سکتے تھے اس لئے انہوں نے اپنی فکر کو نئے زاویے سے پیش کیا-

زندگی کے بارے میں نظریۂ زندگی کو کس خوبی سے نبھایا ہے، اسی طرح انسان کامل یا پھر اقبال کا مردِ مومن- حضور اکرمؐ کے خصائل وشمائل کا وہ جیتا جاگتا ثبوت ہے، جسے نگاہ مرد مومن ہی پہچان سکتی ہے- رومیؔ کے افکار میں وہ تمام موضوعات مثنوی میں ملتے ہیں جو ہمیں اقبال کے ہاں مختلف اصناف میں نظر آتے ہیں- اقبال اگر تصور معیشت کی بات کرتے ہیں تو دوسری طرف تصور مملکت کا باقاعدہ ایک نظام بھی دیتے ہیں- غرض اقبال کے طرز فکر میں وہ کونسا موضوع ہے جو ان کی شاعری میں نہیں ہے مثلاً وطن و ملت کے بارے میں حسین احمد مدنی سے سوال وجواب کے ذریعہ اس مسئلہ کو ثابت کرنا- اقبال کے طرز فکر میں اسلامی نظریات میں جدید نقطۂ نگاہ سے سامنے آتے ہیں- وہ ان کے خطبات ہیں جو انہوں نے مدراس یونیورسٹی میں دیئے تھے- ''تشکیل الٰہیات اسلامیہ'' کے نام سے یہ کتاب شائع ہوئی- یہ خطبات انگریزی میں دیئے گئے تھے، اسے سید نذیر نیازی نے ترجمہ کرکے کتابی صورت میں شائع کرایا، اس کتاب میں اقبال کی فکر کو واضح طور پر سمجھا جاسکتا ہے:

> ''اسلامی نظام فکر کے جھرنے پر ان کی پیاس بجھتی ہے لیکن دوسرے مکاتیب فکر سے انہوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اسے وہ ترک نہیں کرتے بلکہ اسلامی نظام فکر کی روشنی میں اس کا تخلیقی استعمال کرتے ہیں-'' [1]

اقبال نے اسلامی نظام فکر کو لالۂ صحرا کے استعارے سے ظاہر کیا ہے- لالہ اور اسلام میں جو مماثلت اقبال نے تراکیب کے ذریعہ پیش کی ہے وہ علامتی انداز ہے- اس علامت کے ذریعہ گل ولالہ انسان کی علامت کے طور پر ظاہر ہونے لگا- اقبال کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے ؎

جمیل تر ہیں گل و لالہ فیض سے اس کے
نگاہ شاعر رنگیں نوا میں ہے جادو

۱- اقبال کا فن، ص ۲۳۹

اقبال نے اظہارفن کے لئے زیادہ تر ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس اور مسدس کی ہیئت اختیار کی ہے- ان کے بعد ہیئت کے تجربوں میں مخدوم محی الدین، عظمت اللہ خان، راشد، میراں جی، اختر الایمان، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، قیوم نظر، یوسف ظفر، مختار صدیقی، مجید امجد، خلیل الرحمٰن اعظمی، عمیق حنفی، عادل منصوری، شہزاد احمد، ان میں اور بھی نام لئے جا سکتے ہیں- ان شعراء کی نظموں میں زیادہ تر جو موضوع ابھر کر سامنے آیا ہے، وہ مراجعت اور خواہش کا ہے، مثلاً عمیق حنفی کی نظم ''سندباد'' کا یہ بند دیکھئے

گاؤں کی یاد، فطرت سے وابستگی کی یاد
ایک کالے سخت تکیئے سے اٹھا کر اپنا سر
اوھ جگا سورج ابھر کر دیکھ لیتا تھا ہمیں
ہم سحر خیزوں سے شرما کر جھکا لیتا تھا سر

(سندباد) عمیق حنفی

میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مر چکا جس نے
کبھی چاہا تھا خاشاک دو عالم پھونک ڈالے گا
یہ لڑکا مسکراتا ہے، یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب و افترا ہے جھوٹ ہے دیکھو میں زندہ ہوں

(ایک لڑکا) اختر الایمان

وہ کیسی مسکراہٹ تھی، بہن کی مسکراہٹ تھی، مرا بھائی بھی ہنستا تھا
وہ ہنستا تھا، بہن ہنستی ہے اپنے دل میں کہتی ہے
یہ کیسی بات بھائی نے کہی، دیکھو وہ اماں اور ابا کو ہنسی آئی
مگر یوں وقت بہتا ہے، تماشا بن گیا ساحل

(مجھے گھر یاد آتا ہے) میراجی

اس بھیڑ کے میلے ٹھیلے میں
آدم زادوں کے ریلے میں
کیا حسن و ادا کیا عشق و ہوس
کیا خواہش و شوق اور کیا حسرت
کیا شرم و حیا، جرأت، غیرت
ہر منظر بھیڑ میں ڈوب گیا
میں خود بھی خود میں ڈوب گیا

(شہزاد) عمیق حنفی

آزادی سے پہلے اقبال، جوش، ساغر نظامی، حفیظ جالندھری، تلوک چند محروم، چکبست، عظمت اللہ خان، محی الدین مخدوم کے نغمے فضا میں گونج رہے تھے۔ لیکن آزادی کے بعد شاعری میں متواتر کئی انقلاب آئے۔ اس کی پہلی مثال ترقی پسند ادب، پھر حلقہ ارباب ذوق تحریک کے ذریعہ سریلسٹ نظریات کی ترسیل ہونے لگی۔ اظہار کے سانچوں میں بھی تبدیلیاں لائی گئیں یعنی نئے اسالیب، نئے موضوعات اور نئی علامتوں میں کثرت سے اظہار ہونے لگا۔ ان شعراء میں فیض، اختر شیرانی، راشد، میراجی، اختر الایمان، علی سردار جعفری نے نظم کے دامن کو وسیع تر کر دیا۔ خاص طور پر میراجی، قنوطی اور سریلسٹ شاعری کر رہے تھے جبکہ اندر جیت شرما، یوسف ظفر، مختار صدیقی، ن۔م۔راشد امیجیسٹ اور علامتی شاعری میں پیش پیش تھے:

> ''یہی وقت تھا جب اردو شاعری میں ایک طرف میراجی کی قنوطی اور سریلسٹ قسم کی شاعری اپنے لئے راستہ پیدا کرنے میں کوشاں تھی۔ ن۔م۔راشد، اندر جیت شرما، یوسف ظفر، مختار صدیقی، مطلبی فرید آبادی وغیرہ امیجیسٹ، علامتی اور دادیت کے دور سے گزر رہے تھے اور دوسری طرف فضا ترقی پسند شاعر جوش، فیض، مخدوم، فراق، سردار جعفری اور کیفی اعظمی کے انقلابی نغموں سے گونجنے لگی تھی۔ اردو میں پہلے قسم کے تجربوں نے کوئی گہرا نشان نہیں چھوڑا۔ میراجی کی شخصیت ہمیشہ مابہ النزاع رہی۔'' [1]

میراجی اور ن۔م راشد میں جو دوری نظر آتی ہے، راشد کی نظموں میں قافیہ، ردیف اور ارکان کی پابندیوں سے جو بغاوت برتی گئی، اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ ہیئت کے تجربوں میں مصروف تھے۔ وہ ابہام اور رمزیت میں اپنے فن کا اظہار کر رہے تھے۔ ان کی مقبول نظموں میں ''اجنبی عورت''، ''بے کراں رات کے سناٹے میں''، ''دریچے سے قریب''، ''انتقام''، ادبی حلقوں میں اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہوئے:

> ''میراجی کے ساتھ ہی ن۔م راشد آئے۔ ''ماوراء'' نے اپنا ایک راستہ الگ بنایا۔ راشد نے ایک گھسی پٹی طرز فکر سے الگ ہونے کی کوشش کی۔ تاہم 'ماوراء'' میں زندگی کی اس دوڑ کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا، جس سے ان کے دور کے تانے بانے تیار ہو رہے تھے۔ انہیں اپنے جہان گزراں کا احساس تھا۔ کبھی ترقی پسندوں کی طرح اور کبھی ان سے الگ ہٹ کر۔ راشد کو تھوڑی دیر کے لئے حقیقت پسند ان معنوں میں کہا جا سکتا ہے کہ باوجود ایک خاص مزاج شاعری کے، جو نئے تجربوں کی رمزیت سے قریب تھا، راشد نے اس تغیر کا بھرپور احساس کر لیا، جو دبے پاؤں اردو شاعری کی دنیا میں داخل ہو رہا تھا۔'' [2]

میراجی کے متعلق مشہور ہے کہ ان کی ذات متنازعہ فیہ کی حیثیت سے رہی۔ ان کی شاعری کے عروج کا زمانہ ۱۹۴۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ میراجی اپنی ذات میں ایک روایت ساز شاعر کہلائے کیونکہ شعری تخلیق نئی روایت کی آئینہ دار ہے۔ ترقی پسندوں کے ہاں تجربے کا رخ داخلیت کی طرف تھا لیکن جلد ہی انہوں نے خارج کی طرف توجہ دینا شروع کی۔ اس کے برعکس میراجی نے اپنے تخلیقی سفر کو داخلیت سے مربوط رکھا۔ انہوں نے داخلی شاعری کو بنیاد بنا کر ایک نئی روایت کی داغ بیل ڈالی۔

۱۔ نقوش۔ جولائی، ص ۳۰۷

۲۔ نقوش۔ جولائی، ص ۳۱۱

ترقی پسند تحریک اور میراجی کے نظریات میں مشرقین کے بُعد نظر آتا ہے، اس کا اندازہ اس اقتباس سے ہو جاتا ہے:

> ''ترقی پسند تحریک کا بیشتر زور اجتماعیت پر تھا جبکہ میراجی انفرادیت پر یقین رکھتے تھے- ترقی پسند تحریک نے مابعدالطبیعات کو اپنی لغت سے خارج کر دیا تھا- جبکہ میراجی کے مابعدالطبیعات سے گہرا انبساط موجود ہے اور مابعدالطبیعات تجربات ان کی دکھی روح کے لئے مسرت کا سامان فراہم کرتے ہیں- میراجی نے اس نظریے کی بھی تردید کی کہ ادب محض خارجی حالات کی پیداوار ہے اور ادیب کی تمام تر تخلیقی صلاحیتوں کا انحصار معاشرے کے تہذیبی اور سماجی ڈھانچے پر ہے- ان کا خیال ہے کہ فرد کا ذاتی تجربہ، اجتماعی تجربہ، خاندانی پس منظر، نفسیاتی پیچدگیاں اور جنسی الجھنیں مل کر تخلیقی تجربے کی اساس ہوا کرتی ہیں- میراجی اور ترقی پسند نقادوں کے اختلافات کم وبیش انہی بنیادوں پر چلتے رہے-''[۱]

اس اقتباس کی روشنی میں اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ میراجی نے نئے شعری پیکر اور تصورات شاعری میں داخل کیے- انہوں نے اس بات کا بھی احساس دلایا کہ وقت کے ساتھ الفاظ کے معنی بھی بدلتے رہتے ہیں اس لئے انہوں نے الفاظ کے نئے معنی تلاش کر کے شاعری کی وسعت میں گراں بہا اضافہ کیا ہے- الفاظ کی قدر و قیمت اور اس کا بانکپن جو روایتی لفظوں کو نئے معنی دے، اسے جدت سے تعبیر کیا جاتا ہے- میراجی کے اس تخلیقی سفر کا گہرائی سے جائزہ لیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہوں نے زبان کو نئے انداز سے برتا ہے اور معنوی اعتبار سے بہت آگے تک لے گئے ہیں- وہ ماضی سے بالکل کٹ نہیں گئے ہیں بلکہ ماضی کے سرمایہ کو اہمیت دیتے ہوئے موضوعات کے اضافے کی بات کرتے ہیں- شعری تصورات میں وقتی حالات کو فراموش نہیں کرتے، اسے ضروری سمجھتے ہوئے اعتدال سے کام لیتے ہیں-

نظم میں نئی جہتیں:

اردو نظم کے ارتقاء میں سب سے پہلے انجمن پنجاب کا نام آتا ہے- مغربی افکار و خیالات اردو نظم میں منتقل ہونا شروع ہوئے- انگریزی نظموں کے ترجمے اور ہیئت کے تجربے ہونے لگے- نظم معریٰ اور آزاد نظم کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا- مغرب میں سریلسٹ تحریک، سریلزم تحریک، اسٹول گروپ کا رجحان عام تھا- ان تحریکوں کے اثرات بھی شاعری میں رونما ہوئے-

بیسویں صدی کے آغاز ہی میں نظموں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا- ہیئت اور اسلوب کے تجربوں کو اس وقت کے رسائل میں دیکھا جاسکتا ہے- عبدالحلیم شرر نے (دلگداز) رسالہ کا اجراء کیا- مخزن کا اجراء شیخ عبدالقادر نے لاہور سے کیا- اقبال کی نظمیں مخزن میں شائع ہوتی تھیں- اقبال کے معاصرین بھی اپنی نگارشات مخزن ہی میں بھیجتے- اردو شاعری میں نئی جہتیں اور نئے موضوعات اکبرالہ آبادی، اقبال اور چکبست کے ہاں نظر آتے ہیں- ان شعراء کے ہاں حب الوطنی کا جذبہ بھی ہے اور سیاسی تصور بھی- ہندوستان کی سیاسی کشمکش کے پیش نظر اقبال کی نظم ''تصویر درد'' کو پیش کیا جاسکتا ہے- اقبال نے یورپ سے واپسی پر اپنے رجحان کو تبدیل کیا- روحانی نظام کے فروغ میں اپنی فکر کو بروئے کار لائے-

---

۱- نئے شعری تجربے، ص ۳۵

سیاسی اور سماجی لحاظ سے جوش کا گہرا تعلق رہا ہے۔ ان کی نظموں میں رومان، نیچرل، سیاسیات، سماجیات اور مناظر قدرت کی مکمل تصویریں ملتی ہیں۔ ہندوستان کی سماجی اصلاح کا جو کام اقبال نے کیا ہے، جسے سبک اور شستہ انداز ہی کہا جاسکتا ہے، ایک طرف سیاسی وسماجی رجحان کی نظمیں کہی جارہی تھیں تو دوسری طرف رومانی اسلوب اور موضوعات پر جوش اور اختر شیرانی کی نظمیں بے مثال ہیں۔ جاںنثار اختر اور فیض نے رومانی نظموں میں بے پناہ اضافہ کیا۔ ان کے علاوہ مجاز، ساغر نظامی، ن۔م راشد، اختر الایمان، احسان دانش اور حفیظ جالندھری نظم میں نئی جہتوں کا سراغ لگانے میں خاصے کامیاب رہے۔

ترقی پسندوں نے ادبی رجحانات کے علاوہ سیاسی تصور کو بھی نظموں میں اجاگر کیا۔ ترقی پسند تحریک سے پہلے اقبال اور معاصرین قومی و وطنی شاعری کررہے تھے، شعراء میں اکبر، اقبال، چکبست، ظفر علی خاں انسان کی بیداری کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ ادبی تاریخ کی روشنی میں یہ اندازہ تو ہو جاتا ہے کہ ترقی پسندوں نے نظم کو بین الاقوامی مسائل کے اظہار میں وسیع موضوعات دینے کے علاوہ ہیئت واسلوب اور نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ ڈاکٹر عتیق اللہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر نظم کے بارے میں رقمطراز ہیں:

> ’’ترقی پسند تحریک ایک ادبی تحریک تھی مگر اس کے سلسلے سیاست سے بھی ملتے تھے۔ ترقی پسند شعراء نے پہلی بار سیاسی نظم کے تصور کو فروغ دیا۔ اس تحریک سے قبل وطنی اور قومی نظموں کا رواج تھا، جو اپنی فکر اور موضوع کے لحاظ سے بڑا محدود کینوس رکھتی تھیں۔ ترقی پسند شعراء نے نئی دانش سے استوار کیا۔ موضوع سے زیادہ قدر اور نظریے کو اہمیت دی اور اس طرح پہلی بار نظریاتی شاعری کے تصور نے ہمارے یہاں بار پایا۔‘‘[1]

آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کی شاعری میں جو فرق اور تفاوت ہمیں ملتا ہے، وہ نظمیں اس بات کی عکاسی ہیں۔ اقبال اور جوش نے نظموں میں بیداری کے عمل کو ملحوظ رکھا لیکن ترقی پسندوں نے نظم میں نئے تجربات کرکے فرد اور سماج کی بات کی۔ اس کے علاوہ نظموں میں نئے اسالیب، نئے موضوعات، آزاد نظم میں وسعت دینا اور نئی علامتوں کو وضع کرنا، روایت سے بغاوت کا اظہار ترقی پسند نظم کا بنیادی رجحان تھا۔

ترقی پسندوں نے نظم میں نئی جہتوں کی تلاش کے علاوہ بھی نظم کو نئے رجحانات سے آشنا بھی کیا۔ سیاسی وملکی حالات کے تحت نظم میں انسان کی بے بسی اور مجبوری کو موضوع بناکر نئی شعری علامتیں وضع کیں۔ نظم کے اس بدلتے ہوئے رجحان کو محسوس کرتے ہوئے صدیق الرحمٰن قدوائی لکھتے ہیں:

> ’’آزادی سے قبل اردو نظم دو محوروں اقبال اور جوش کے گرد گھوم رہی تھی۔ نئے ادب اور ترقی پسند تحریک نے نظم کی روایت کو ایک نیا موڑ دیا، بدلتے ہوئے معاشرے میں فرد اور سماج کے پیچیدہ تر رشتوں اور ان سے پیدا ہونے والی الجھنوں کی بدولت شاعرانہ ادراک واحساس اور اس کے اظہار کی صورتوں میں زبردست تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔‘‘[2]

۱۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظم، ص ۱۷

۲۔ نگار۔ مارچ، اپریل، ص ۴۳

نظم میں نئے آدرش اور تبدیلی کا سہرا ترقی پسند شعراء کے سر بندھتا ہے- ان میں علی سردار جعفری، اختر الایمان، کیفی اعظمی، مخدوم محی الدین، جوش وفیض نے نظم کو ہیئت واسلوب سے قطع نظر نئی معنویت نے جذبہ وفکر کو برانگیختہ کر دیا-نثری اسلوب اور علامت نگاری دراصل دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں- علامت نگاری مغربی شعر وادب اور افکار کی ترسیل ہے-مغرب کی تقلید سے شاعری میں ایک نیا اسلوب جسے میرا جی نے متعارف کرایا- حلقہ ارباب ذوق سے متعلق شعراء میں داخلیت کا جو رجحان پایا جاتا ہے، اس میں میلارمے اور بودلیئر کے اثرات زیادہ ہیں- علامت نگاری کے اسلوب کو فروغ دینے میں فرانسیسی شعراء کا بھی دخل ہے-مغربی اثرات کے زیر اثر نظموں میں ابہام کے الزام لگنا شروع ہو گئے تھے- میرا جی اور ان کے رفقاء نے آزاد نظم پر خصوصی توجہ دی اور اسے ایک صنف کی حیثیت سے منوایا-

حلقہ ارباب ذوق کے تحت زندگی کو اقدار کا موضوع بنایا گیا کیونکہ یہ ادب میں کسی قسم کی پابندی کے قائل نہیں تھے- اظہار خیال کے لئے آزادی کا ہونا ضروری ہے- میرا جی، ن-م راشد، تصدق حسین خالد، قیوم نظر، یوسف ظفر اور مختار صدیقی نے نئی جہتوں کی دریافت میں نئے تجربے بھی کئے جس میں جذبہ، خیال اور احساس کو آزاد نظم اور معریٰ نظم میں پیش کیا- ایشیائی ممالک میں انسان کو یہ آزادی حاصل نہیں جو اسے یورپ میں حاصل ہے-مختلف موضوعات کو نئے سانچے میں ڈھالنا ایک آزاد ذہن کا کام ہے جو نفسیات اور جنسیات پر واضح طور پر اظہار خیال کر سکے- اردو نظم میں غم اور افسردگی کا جو رجحان تیزی لئے ہوئے ہے، اس کے متعلق ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے کو درست کہا جا سکتا ہے:

> ''۱۹۴۱ء کے بعد اردو نظم میں بتدریج غم اور افسردگی کی فضا پیدا ہوتی چلی گئی ہے- ایسا کیوں ہوا؟ اس کے جواب میں غالباً یہ کہا جائے گا کہ دوسری جنگ عظیم، کساد بازی، گھر کے شیرازے کا منتشر ہونا اور اس کے نتیجے میں انفرادیت کی نمو نے اس افسردگی کو جنم دیا تھا- ۱۹۴۱ء کے بعد نظم نے اپنی اصل جہت بھی دریافت کر لی تھی یعنی ظاہر سے باطن کی طرف آنے کی جہت! اس جہت کو اختیار کرنے والے کے ہاں کم مائیگی، تنہائی، خوف اور اس کے نتیجے میں غم اور اداسی کا پیدا ہو جانا ایک بالکل قدرتی بات تھی-'' [1]

جبکہ ۱۹۴۱ء سے پہلے کی شاعری میں ایک خاص نقطۂ نگاہ کو اجاگر کیا گیا، پھر بعد کی شاعری میں نظریات کا فرق آنا شروع ہوا- جن شعراء نے اس فرق کو تقویت دی ان کی فہرست خاصی طویل ہے- چند شاعروں کے نام جو اس کارواں میں شریک سفر رہے مختار صدیقی، سید فیضی، سلام مچھلی شہری، صفدر میر، منیب الرحمٰن، انجم رومانی، ظہور نظر، شہزاد احمد، قیوم نظر، منیر نیازی، عارف عبدالمتین اور شاذ تمکنت ان شعراء کے ہاں خوف، ہراس، موت، تنہائی جیسے موضوعات کو آزاد اور معریٰ نظم میں پیش کیا گیا- کیونکہ انسان اس ماحول میں رہتے ہوئے اپنی بقاء کا راستہ تلاش کر رہا تھا، کیونکہ موت، تنہائی اور خوف اس کے تعاقب میں ہے، جس سے فرار ممکن نہیں- ۱۹۴۷ء کا سیاسی انقلاب اس بات کا آئینہ دار ہے- ملک کی تقسیم پر جن شعراء نے حالات کی بھرپور عکاسی کی ہے، ان میں اختر الایمان کی نظم ''پندرہ اگست''، مختار صدیقی کی نظم ''بازیافتہ'' اور بلراج کومل کی نظم ''اکیلی'' میں حالات و واقعات کی صحیح ترجمانی ہوئی ہے- حلقہ ارباب ذوق نے اپنے جلسوں میں تنقیدی نقطۂ نگاہ سے نئے ادیبوں کو ذہنی طور سے تیار کر کے انہیں شہرت اور ساکھ بنانے میں بھی معاونت کی- یونس جاوید حلقۂ ارباب ذوق کی کوششوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''حلقۂ ارباب ذوق نے ان ادیبوں کی ابتدائی شہرت و ساکھ بنانے میں بڑا کام

۱- اردو شاعری کا مزاج، ص ۳۹۴

کیا- ان لکھنے والوں کے نزدیک، جو حلقۂ ارباب ذوق سے وابستہ تھے، معاشرہ اور فرد دونوں یکساں اہمیت کے حامل تھے، صرف یہی نہیں بلکہ حلقۂ ارباب ذوق کے نزدیک ہر لکھنے والے کو یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ ذات کے حوالے سے کائنات کا احاطہ جس طرح، جس رخ سے چاہے کرے اور ایسی اقدار کو اس انداز سے سامنے لائے جس سے عالمگیر انسانیت سے ہمدردی اور روح کی بالیدگی کی صورت پیدا ہو-'' [۱]

میراجی اور ان کے ساتھیوں نے جو تجربے کئے وہ اپنی نوعیت کے علیحدہ اور انفرادی تجربے تھے- اس میں سب سے پہلا تجربہ تکنیک کا تھا- الفاظ کی قدروقیمت، اوزان و بحور کے نئے ڈھنگ سے استعمال اس کے علاوہ کلاسیکی اور رومانوی طرز سے گریز برتا گیا- ان کے اس عمل سے کلاسیکیت اور رومانیت کی شاعری میں شگاف پڑ گیا- اس کے علاوہ دیگر مباحث بھی تھے جن میں جذبہ اور خیال کی اہمیت پر زور دیا گیا- اظہار یا ابلاغ، ادب اور جمالیات، ادب اور صحافت سب سے اہم بات شاعری میں ابہام کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا- ادب اور پروپیگنڈہ ہی کے تحت جدید شاعری موضوع پر جو مباحث ہوئے، ان سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ نگارشات و تخلیقات میں نئے زاویے، نئی جہتیں اور شعور کے نئے دروازے وا ہونے شروع ہو گئے- حلقہ ارباب ذوق میں شامل شعراء کی نظموں کے پہلے انتخاب کو جو پذیرائی ملی وہ ریورٹیں اپنی جگہ ایک حیثیت رکھتی ہیں- حلقہ ارباب ذوق کی جانب سے نظموں کا پہلا انتخاب ۱۹۴۱ء کی بہترین نظموں کی صورت میں متعارف ہوا- یونس جاوید اس مسائی پر اپنے خیال کا اظہار کرتے ہیں:

''حلقہ ارباب ذوق نے اپنی مسائی صرف شعروادب لکھنے کی ترغیب دینے اور اس پر تنقیدی نقطۂ نظر سے اظہار خیال کرنے تک ہی محدود نہیں رکھیں بلکہ ان کوششوں میں عملی صورتیں بھی پوری جزئیات سے ہمارے سامنے آتی ہیں اور یوں لگتا ہے کہ میرا جی کی شمولیت کے ساتھ ہی اس طرح کا احساس حلقہ ارباب ذوق کے ممبران میں پیدا ہو گیا تھا، تاہم ان کی کوششوں کا عملی اظہار ۱۹۴۱ء کی بہترین نظموں کے انتخاب اور اس کی اشاعت سے ملتا ہے-'' [۲]

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جدید ادب اور نظم نگاری کی پہلی آواز ''ادبی دنیا'' ہی سے اٹھی- اس رسالہ سے اردو شاعری اور اردو ادب کے نہایت اہم ستون متعارف ہوئے- حلقہ ارباب ذوق کے شعراء فرانسیسی ادب سے متاثر ہو کر منظوم تراجم میں اضافہ کر رہے تھے، جو آزاد خیالی کا نمونہ ہیں- اس کی مثالیں راشد کی ''ماورا''، مختار صدیقی کی ''منزل شب''، قیوم نظر کی ''قندیل'' یہی وہ مجموعہ ہائے کلام ہیں جس میں نئے نئے تجربے جو موضوعاتی اور تکنیکی طرز پر تھے- نظم میں ہیئت کے تجربے نظم آزاد، معریٰ نظم اور نثری نظم یا پھر ان تجربوں میں جنسی بے راہ روی، ابہام اور اشاریت نظم میں نئی جہتوں کا خاصہ رہا- حلقہ ارباب ذوق کا مطمع نظر صرف فن اور زندگی پر ہی مرکوز رہا- اس تحریک کے زیر اثر شعراء نے داخلیت کو اہمیت دینے کے علاوہ روحانیت کو بھی اولیت اور فوقیت دی-

مجاز کی نظم ''نغمۂ ٹیگور'' ہیئت کا تجربہ ہے- اختر شیرانی اور ن- م- راشد کے سانیٹ بھی ہیئت کے نئے تجربوں میں اہمیت کے حامل ہیں- اختر شیرانی کے مجموعہ ''شعرستان'' میں سانیٹ کے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں- اس نظم کو غنائی شاعری سے تعبیر کیا جاتا

۱- حلقہ ارباب ذوق، ص ۳۶

۲- حلقہ ارباب ذوق، ص ۳۹

ہے- اس کے دو مصرعے جو کہ قوافی کے لحاظ سے دونوں مصروں کو ملاتا ہے- اس صنف کو اختر جوناگڑھی نے پہلے پہل متعارف کرایا- اس صنف کی مختلف قسمیں ہیں مثلاً اسپنسری سانیٹ، شیکسپری سانیٹ اور پیٹرارکی سانیٹ ان سب میں مختلف مصرعے ترتیب دیئے جاتے ہیں-

''اختر شیرانی نے پہلے پہل سانیٹ کو اردو میں متعارف کرایا، جو ''نیرنگ خیال'' اور دوسرے رسائل میں شائع ہو کر مقبول ہوئے- جن کا ایک مجموعہ ''شعرستان'' کے نام سے اسی زمانے میں شائع ہوا تھا- ان میں ''تاثرات نغمہ''، ''جزیرۂ خواب''، ''وادی گنگا میں ایک رات''، ''ایک نوجوان بت تراش کی آرزو'' اور معصومیت شباب'' خاص طور پر اہم ہیں لیکن سانیٹ بہت جلد جدید نظم کی عام ہیئت میں ضم ہو گیا- بعض دوسرے شعراء کے علاوہ اختر شیرانی کے شاگرد ن-م- راشد نے شروع شروع میں بعض سانیٹ لکھے- ان کا سانیٹ ''زندگی'' اپریل ۱۹۳۰ء کے ہمایوں میں شائع ہوا تھا- لیکن بہت جلد انہوں نے سانیٹ ترک کر کے آزاد نظم کو اپنایا اور اپنی بہترین نظمیں اسی صنف میں لکھیں-''[۱]

راشد کے علاوہ سردار جعفری کی شاعری پر اقبال کے فکری اثر کو دیکھا جا سکتا ہے- سردار جعفری نے آزاد نظم میں نہایت کامیاب تجربے کئے ہیں- ان کی شاعری میں خطیبانہ انداز پایا جاتا ہے- اگر اقبال کو خطیبانہ شاعری کا امام کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا- ن-م- راشد کا شمار بھی ہیئت کے نئے تجربوں میں کیا جاتا ہے- ان کی شاعری میں پابند نظم، آزاد نظم اور سانیٹ ملتے ہیں- مجموعہ کلام ''ماوراء'' اور ''لاانسان'' کی نظمیں اس بات کی آئینہ دار ہیں- ہیئت کے تجربوں میں اختر الایمان نے بھی گراں قدر اضافہ کیا ہے- ان کی شاعری میں ڈرامائی کیفیت زیادہ ہے- یہ اقبال کی نظموں کا اثر ہے جو ''بانگ درا'' کے پہلے حصے کی ہیں- میرا جی اور یوسف ظفر نے مل کر ہیئت کے نئے تجربے کئے ہیں- ہیئت کے نئے تجربوں کے بارے میں یونس جاوید قمطراز ہیں:

''حلقہ ارباب ذوق کے ان شاعروں کو جن میں کسی حد تک بھی تجربے کو اہمیت دینے اور ہیئت کے پرانے اصولوں میں تبدیلیاں لانے کے ساتھ ساتھ کم الفاظ میں خیال افروزی کرنے کا رجحان تھا، ایک ایسا طرز احساس دیا کہ تبدیلی کے اس رجحان نے اولیت اور بنیادی حیثیت اختیار کر لی لہذا میرا جی کے ساتھ یوسف ظفر کی ذات بھی تجربے کے اس دور میں برابر کی شریک رہی اور پھر یہ کہ نہ صرف ہیئت اور اسلوب تک ہی تجربے کو محدود کر دیا بلکہ اس سے کچھ اور آگے جا کر بھی سوچا گیا-''[۲]

عظمت اللہ خان وہ واحد شاعر ہیں جنہوں نے ہیئت، آہنگ اور اوزان و بحور میں نئے تجربے کئے ہیں- سید جابر علی عظمت اللہ خان کے تجربوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''عظمت اللہ خان نے غزل کی غنایت کا بالکل اعتراف نہیں کیا، صرف روایت غزل کے تصنع، قافیہ پیمائی اور فرسودہ علامات اور مضامین کے خلاف نعرہ بلند کیا، جو اس

۱- سوغات، جدید نظم نمبر، ص ۱۰۹

۲- حلقہ ارباب ذوق، ص ۵۶

سے پہلے سرسید اور حالی کر چکے تھے۔عظمت اللہ خان نے عربی نظام عروض کی جگہ پنگل کے مقابلے میں عربی عروض اصطلاحات کا رچاؤ، مانوسیت، سائنٹفک نظام اور ہمہ گیری تھی۔عظمت اللہ خان ہندی شاعری اور اس کی نرمی، موسیقیت اور مقامیت سے ضرورت سے زیادہ متاثر ہوئے۔عظمت اللہ خان نے جو گیت بعض مجوزہ اور ایجاد کردہ بحور میں لکھے ہیں اور جن کی بنیاد نثر کے قریب ترنم پر رکھی گئی ہے۔'' [۱]

ہیئت اور اسلوب کے یہی وہ نئے تجربے تھے جن کی بعد کے شعراء نے بھرپور تقلید کی۔نظم میں قوافی کے نظام سے نئے آہنگ کو متعارف کرایا۔اس میں ترنم بھی ہے اور غنایت بھی۔اقبال کی وہ نظمیں جو انہوں نے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کہیں، ان میں زیادہ تر خطابیہ انداز پایا جاتا ہے۔اس کے علاوہ نظموں میں متصوفانہ، فلسفیانہ، متفکرانہ، قومی، اصلاحی اور ذاتی تاثرات کے رجحان پائے جاتے ہیں۔اقبال کے افکار و خیالات اور نئے موضوعات کو بعد کے شعراء میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اقبال کی شاعری اور بعد کے شعراء میں جن موضوعات پر کثرت سے نظمیں لکھی گئیں، شعراء میں یہ احساس بیدار ہو چکا تھا کہ مغربی طاقتیں انسان کو پارہ پارہ کرنے پر تلی ہوئی تھیں، ڈاکٹر سید عبداللہ اقبال کے فکری میلانات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال بیسویں صدی کے مفکر تھے، جس میں دنیائے فکر، سائنس کے جارحانہ افکار سے متاثر ہو چکی تھی اور اس میں ڈارون کے نظریۂ بقائے اصلح اور تنازع للبقا جیسے خیالات پھیل چکے تھے۔ان حالات میں انہوں نے ایک مثبت تصور (نیابت الٰہی اور پکار برائے مقاصد) دے کر، اپنی صدی کی ذہنی سطح کے مطابق بات کرنے کی کوشش کی ہے۔انہیں محسوس ہوا کہ محض سعادت کا تصور مسلمانوں کے دور سلطانی میں تو ٹھیک تھا لیکن اس صدی میں جب انسانیت اور امت مسلمہ دونوں کو نئے چیلنج درپیش تھے اور جہاد اور تنازع کے نئے میدان کھل چکے تھے، سعادت سے بہتر اور زیادہ ولولہ انگیز تصور درکار ہوگا چنانچہ انہوں نے نیابت الٰہی کی خاطر، عشق مقاصد اور جذب و استیلا کو ایک قدر اعلیٰ قرار دیا۔'' [۲]

اقبال کی نظموں میں اہم موضوع انسان دوستی کا ہے کیونکہ لوگ محرومی اور محکومی کی زندگی بسر کر رہے تھے اس لئے اقبال نے ایسے موضوعات وضع کئے اور ان کو اپنے انتخاب میں لائے جس میں نئی روشنی اور نیا آدرش ملتا ہے۔اس نئی روشنی میں خارجی مناظر، معاشی و معاشرتی غیر ہمواری، قومی اور سیاسی مسائل پر غور و فکر کے علاوہ جذبات و احساسات کی واضح ترجمانی ملتی ہے۔بعد کے شعراء نے حالات و واقعات کے پیش نظر انہی موضوعات کو اہمیت دی جن پر اقبال پہلے سے نظمیں کہہ چکے تھے۔ساغر نظامی نے جنگ آزادی کے موضوع پر ایک تاریخی نظم کہی، یہ ایک رزمیہ نظم ہے۔

مغلیہ دور حکومت میں معاشی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔جب انگریز ہندوستان پر قابض ہوا تو سب سے پہلے معاشی ڈھانچہ میں تبدیلی آنا شروع ہوئی۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، جسے ''انقلاب'' کا نام دیا جاتا ہے، اس انقلاب سے بے شمار

۱۔ صحیفہ۔جنوری، ص۱۰۴

۲۔ مطالعہ اقبال کے چند نئے رخ، ص۱۸۲

موضوعات نمو پذیر ہوئے - ہیئت اور موضوع میں کس کو برتری حاصل ہے، اس مفروضہ کی روشنی میں عارف عبدالمتین لکھتے ہیں:

''میں ہیئت پرستی کا مخالف ہوتے ہوئے بھی ہیئت کی طرف بھرپور توجہ صرف کرنے کا دعویدار ہوں بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ موضوع کا سب سے بڑا علمبردار ہی ہیئت کا سب سے بڑا پرچم بردار ہوسکتا ہے - اس میں اور ایک ہیئت پرست میں فرق صرف یہ ہے کہ وہ ایک زندہ پیکر تراشتا ہے اور ہیئت پرست ایک مردہ جسم کی تشکیل کرتا ہے-''[۱]

اقبال نے صرف ہیئت کے تنوع میں اپنے فکری احساسات اور قدیم روایت کو پیش نظر رکھا ہے - ان کی مثنوی نما نظمیں اور مختصر نظمیں اسی ہیئت میں ہیں - نظم ''شمع'' مثنوی کی ہیئت میں ہے - شکوہ، جواب شکوہ مسدس ہیئت میں ہے - ہیئت اور موضوعات اقبال کے ہاں جس کثرت سے نظر آتے ہیں ''بانگ درا'' اس کی واضح مثال ہے - قطعہ بند ہیئت میں اقبال نے اپنے فن کو ظاہر کیا ہے مثلاً تصویر درد، خضر راہ، والدہ مرحومہ کی یاد میں، طلوع اسلام، شمع، ہمالہ، شکوہ، جواب شکوہ - پروفیسر جابر علی سید ''بانگ درا'' کی نظموں کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''''بانگ درا'' ایک بہت بڑا شہر ہے جس کے مختلف اور متعدد حلقے اپنی الگ دنیا رکھتے ہیں - ''بال جبریل'' کی دنیا بھی بڑی وسیع ہے لیکن اس میں ''بانگ درا'' کے تنوع کی بجائے نظم کا ارتقاء زیادہ جاذب توجہ ہے-''[۲]

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اقبال نے اپنے ہم عصر شعراء کو اپنے افکار، موضوعات، ہیئت اور اسلوب سے اس قدر متاثر کیا غرض اقبال کی ہر اس جہت کی تقلید کی گئی، جو پہلے سے روشناس نہیں تھی - اقبال کے معاصرین نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اقبال کے فکر و فن کی دنیا بہت وسیع ہے اسی لئے اقبال کو ایک عالمگیر شہرت حاصل ہوئی - اقبال کے اثرات کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری رقمطراز ہیں:

''اقبال کا اثر اپنے ہم عصر اردو شاعروں اور ادیبوں پر ہمہ گیر تھا - موضوع، مواد، انداز فکر، ہیئت اور اسلوب، ہر اعتبار سے انہوں نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا - اصناف شاعری میں بھی ان کے تجربات کی تقلید کی گئی-''[۳]

اقبال نے صرف پابند نظم میں ہیئت کی مختلف اصناف کو استعمال کیا جبکہ اقبال کے بعد آزاد نظم ہیئت کو اپنایا گیا - اس کی ابتداء عبدالحلیم شرر سے ہوئی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس ہیئت میں تیزی کا رجحان آ گیا - ڈاکٹر تصدق حسین خالد کی ''سرو دنو''، ن-م-راشد کی ''لا انسان''، ''ماورا'' کی نظمیں آزاد نظموں پر مشتمل ہیں - سردار جعفری، میراجی، مختار صدیقی، قیوم نظر، یوسف ظفر، ضیاء جالندھری نے اس صنف کو آسمان تک پہنچا دیا - موضوعات اور ہیئت کے نئے تجربوں کے بارے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''جدید اردو شاری کا سب سے اہم رجحان یہ ہے کہ گزشتہ سو سالوں میں اس

۱- امکانات، ص ۱۵۵

۲- اقبال کا فنی ارتقاء، ص ۴۷

۳- اقبال سب کے لئے، ص ۵۱۲

نے اپنے آپ کو بہت وسیع کیا ہے اور اپنے دامن میں ان گنت موضوعات کو جگہ دی ہے۔ نئے نئے تجربے کئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک رجحان کی حیثیت رکھتا ہے۔'' [1]

جدید شاعری میں موضوعات اور اسالیب کا بڑا دخل رہا۔ اسلوب کے لحاظ سے شاعری میں جو طرز رائج تھے ان میں نثری، ہندی، طنزیہ، بیانیہ اور خطیبانہ اظہار ملتا ہے۔ اسلوب اور ہیئت میں جو تغیر عمل پذیر ہوا، اس میں آزاد نظم، نیچرل نظم، معریٰ نظم، سانیٹ، اصلاحی نظمیں اور فطری و حقیقی نظمیں لکھی جانے لگیں۔

آزاد، حالی اور شبلی کی نظموں کا بہ نظر غائر مطالعہ کریں تو ان کے ہاں بھی اسلوب جداگانہ نظر آتا ہے مثلاً حالی کے اسلوب کی شناخت ان کی سادگی اور مقصدیت ہے کیونکہ حالی نے حقائق و مشاہدات کی روشنی میں اپنے اسلوب کی بنیاد کو مستحکم کیا جبکہ آزاد کی نظم میں ادیبانہ اسلوب پایا جاتا ہے۔ اس میں تخیل، فارسی الفاظ و تراکیب کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ شبلی نے بیانیہ اسلوب اختیار کیا جس میں شگفتگی اور لطافت پائی جاتی ہے۔ اقبال کی شاعری اور ان کا اسلوب تمام شعراء سے جدا ہے۔ ان کی نظموں میں موسیقیت اور خطیبانہ اسلوب کا رجحان پایا جاتا ہے۔ دیگر شعراء جن میں جوش، ساغر نظامی، روش صدیقی، اختر شیرانی، احسان دانش، حفیظ جالندھری، ان شعراء کے ہاں رومانی اور جمالیاتی اسلوب پایا جاتا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی کا اسلوب طنزیہ ہے۔ اکبر کا یہ مخصوص اسلوب ہے جس میں علامتوں کو بھی برتا گیا ہے اور مکالمہ کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ ان کے محاورات بڑے جاندار اور سلیقے سے استعمال ہوئے ہیں، لیکن اقبال اپنے اسلوب کے خود موجد ہیں۔ اقبال کے شعری اسلوب کے بارے میں پروفیسر منظر عباس نقوی لکھتے ہیں:

''اقبال کی شخصیت کا یہ وہ پہلو ہے جس کا ان کے شعری اسلوب پر براہ راست اثر پڑا۔ ان کی بیشتر نظموں میں جو تخاطب کا انداز ملتا ہے، وہ ان کی شخصیت کے اسی پہلو کا آئینہ دار ہے۔'' [2]

اقبال کی حکیمانہ نظر اور سماجی شعور اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ وہ نوع انسانی کو اپنے خاص انداز میں پیغام دینا چاہتے ہیں اور اس پیغام رسانی کے عمل میں مکالماتی اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ اقبال کو مکالماتی اسلوب اور تخاطب بے حد مرغوب تھا۔ بانگ درا کی زیادہ تر نظمیں اسی اسلوب میں پائی جاتی ہیں۔ اسلوب اور ہیئت میں جدت کا جہاں تک تعلق ہے وہ عبدالحلیم شرر اور اسماعیل میرٹھی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ مثال کے طور پر شرر کا منظوم ڈرامہ ''فلورنڈا''، اسماعیل میرٹھی کی ''تاروں بھری رات''، اسلوبیاتی لحاظ سے نیا تجربہ تھا۔ لیکن ان سب حقائق کے باوجود اقبال اپنے اسلوب اور موضوعات کا رنگ گہرا کرتے رہے۔ اقبال کی شاعری کا زمانہ خالصتاً غزل کا زمانہ تھا جہاں مختلف مقام پر اساتذۂ فن غزل میں اظہار کر رہے تھے۔ ایسے میں اقبال نے اپنے موضوعات اور فکر سے شعراء کو چونکایا۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اقبال کے موضوعات، فکر اور تخیل پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اقبال کا شہرہ تمام ہندوستان میں سنائی دینے لگا جس کی شاعری کا موضوع اور اس کا انداز تفکر و تخیل اساتذۂ متقدمین و متاخرین سے بھی الگ تھا اور معاصرین میں سے بھی کوئی شاعر اس کے انداز کی نظمیں نہ کہہ سکتا تھا۔ اقبال میں حالی کی حقیقت شناسی اور خلوص، غالب کے تخیل کے ساتھ ہم آغوش ہو گیا۔ جذبۂ وطنیت اور درد ملت

۱۔ جدید اردو شاعری، ص ۱۰۴

۲۔ اسلوبیاتی مطالعے، ص ۱۳۶

کے ساتھ ساتھ گہرے فلسفیانہ مضامین، حکیمانہ افکار اور صوفیانہ وجدانات، اثر انگیز شاعری کا جامہ پہن کر عالم ادب میں جلوہ افروز ہوئے۔''[۱]

اقبال نے اپنی نظموں سے صرف شعراء ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ برصغیر کے عوام کو بھی بیدار کیا ہے۔ بیداری کے اس عمل میں انہوں نے خودی کا فلسفہ پیش کیا اور یہ ثابت کیا کہ جس نے اپنی خودی کا ادراک کر لیا، اس نے رازہائے بستہ کا سراغ لگا لیا۔ مغرب کی نئی روشنی پر اقبال نے جو تنقیدی نظمیں لکھی ہیں، اس سے صرف مغرب کی مادیت کی طرف اشارہ ہے۔ یہی وہ خودی ہے جس نے مشرق اور مغرب کی راہوں کو جدا کر دیا۔ اقبال نے مشرق کے رہنے والوں کے مسائل کا حل تلاش کیا اور اس پیغام کا اعادہ کیا جو چودہ سو سال پہلے انسان کو دیا گیا تھا، جسے مسلمان خاص طور پر فراموش کر چکے تھے۔ اقبال نے تصور ملت کو پیش نظر رکھتے ہوئے خودی، درویشی، حرکت اور عمل کا پیغام دیا۔ زبان و اسالیب کے لحاظ سے بیسویں صدی میں صرف اقبال ہی وہ واحد شاعر ہے، جس نے اپنے بعد کے شعراء کو متاثر ہی نہیں کیا بلکہ نئی راہوں سے روشناس بھی کرایا ہے۔

اقبال سے پہلے حالی اور شبلی نے عوام کی سماجی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ ''مسدس حالی'' کے علاوہ دیگر نظمیں، جو انجمن پنجاب کے تحت لکھی گئیں، موضوعاتی نظمیں ہیں۔ شبلی کی نظموں میں سیاسی، سماجی رجحانات کے علاوہ مذہبی اور تہذیبی موضوعات بھی ملتے ہیں۔ اس اجتماعی شعور میں اکبرالہ آبادی نے اپنے مخصوص رنگ میں زمانے کی سیاسی بساط کو نشانہ بنائے رکھا۔ اقبال کے معاصرین کے ہاں بھی ہندوستان کی سیاست ہی واحد موضوع تھا۔ انگریز کی مخالفت اور وطنیت نظموں کے موضوعات ٹھہرے لیکن اقبال کی نظموں کے موضوعات اپنے معاصرین سے مختلف ہیں۔ اقبال نے صرف حال کی بات نہیں کی بلکہ اپنے افکار تازہ سے ہندوستانی عوام کے مسائل کا حل بھی تلاش کیا۔ الغرض اقبال نے اردو شاعری کو ان گنت موضوعات دے کر منتہائے کمال پر پہنچا دیا۔ اقبال کے فکری رجحانات اور اثرات اتنے ہمہ گیر ہیں کہ بعد کے شعراء کا اثر قبول کرنا لازمی تھا۔ ترقی پسندوں نے صرف ان موضوعات پر نظمیں لکھیں جن میں سیاسی، سماجی اور اجتماعی مسائل کو حال اور مستقبل میں دیکھا گیا ہو۔ سماجی نظام اور سرمایہ دارانہ نظام کو ہدف تنقید بنا کر نظم میں پیش کرنا ہی ان کا مقصد تھا۔ دراصل ترقی پسند تحریک ایک ایسے مساوات کی قائل تھی جہاں دولت کی تقسیم صحیح معنی میں ہو کیونکہ وہ دکھی انسانیت کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھے۔ وہ ایک ایسے انقلاب کے خواہاں تھے، جہاں صرف نعرہ بازی نہ ہو بلکہ عملی اقدام ہوں۔ وہ اپنے بنیادی خیالات اشتراکیت کے نظریے سے پیش کرتے ہیں۔ اس دور کی نظموں میں رومان کے ساتھ زندگی کے دیگر موضوعات کو بھی بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ ڈاکٹر عتیق اللہ ترقی پسند نظم کے متعلق لکھتے ہیں

> ''اردو میں ترقی پسند شعراء نے تخلیقی سطح پر اس اشتراکی نظریے کو اپنی فکر کا محور بنایا جو انسانی دلچسپیوں اور مشاغل کے وسیع تر کرّے پر محیط ہے۔ ترقی پسند نظریہ، ادب میں اصلاً اس فکر کی تخلیقی و جمالیاتی توسیع ہے جو سماجی اور اقتصادی سطح پر ٹھوس سائنسی مظہر کا حامل ہے۔''[۲]

اقبال کے بعد ترقی پسند شعراء میں جوش وہ نمائندہ شاعر ہیں جن کی رگ و پے میں انقلاب دوڑتا ہے۔ انہوں نے صحیح معنی میں اقبال کا اثر قبول کیا ہے۔ لیکن اقبال کی فکر اور خیالات اعلیٰ و ارفع ہیں جبکہ جوش کے ہاں تیزی، تندی کے علاوہ آگ پانی کا کھیل ہے۔ اقبال کی نظموں میں اور ان کی فکر میں ایک مربوط نظام ملتا ہے۔ ترقی پسند شعراء کے ہاں نظام کا فقدان ہے۔ البتہ مناظر قدرت

۱۔ فکر اقبال، ص ۵۹

۲۔ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر، ص ۴۱۸

کے مختلف موضوعات پر عمدہ نظمیں لکھی ہیں- ان موضوعات میں چاند، ستارے، چرند، پرند، پہاڑ، دریا، مرغزار، صبح، شام نہایت عمدہ نظمیں ملتی ہیں- جدید اردو شاعری میں عشقیہ شاعری کو بھی اہمیت رہی ہے- عشقیہ شاعری میں جو مقام جوش نے حاصل کیا، وہ کسی اور شاعر کو نہ مل سکا- جدید اردو شاعری میں جنسیات کے موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا لیکن اقبال وہ واحد شاعر ہیں جو شاہراہ رومان سے گریز کرتے رہے- بیسویں صدی میں جنسیات کی مختلف تصویریں نظموں کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں- پہلے جنس کا معیار کچھ اور تھا اور اب اس کے معیار میں شائستگی اور ایک وقار پایا جاتا ہے کیونکہ آج کا شاعر ایک تعلیم یافتہ اور تہذیب یافتہ فرد ہے- جدید اردو شاعری میں جنسیات کے موضوع پر ڈاکٹر عبادت بریلوی رقم طراز ہیں:

''جدید اردو شاعری میں جنسیات کی مختلف کیفیات کے بیان سے جو عریانی پیدا ہوئی ہے، اس کو ہمیں ہر شاعر کے ذہنی پس منظر میں دیکھنا چاہئے ورنہ اس کا سمجھ میں آنا مشکل ہے- ہمارا جدید شاعر اب باشعور ہے، اس پر مختلف علوم کے دروازے کھل چکے ہیں اور اس چیز نے اس کی جذباتیت کو ختم کرکے اس کے محسوسات کو عقلیت سے ہم آغوش کردیا ہے- وہ اب ہر چیز کو حقیقت کی روشنی میں دیکھنے کا عادی ہے- اس کا عشق اب ایک صحت مند انسان کا عشق ہے-''[۱]

اقبال نے ہمیں عشق کا جو فلسفہ دیا ہے، دراصل وہ عشق کی معراج ہے- ان کی نظموں میں جنسی لذت نہیں بلکہ عشق کی کیفیات کو عشق میں رہ کر حل کیا ہے، راشد اور میرا جی کی شاعری میں جو جنسی کیفیات ہمیں ملتی ہیں، وہ ایک زندہ حقیقت ہے، ان موضوعات سے اور کیفیات سے انکار نہیں کیا جاسکتا- ہیئت کی تبدیلی اور موضوع میں ترقی پسندوں کا زیادہ حصہ ہے- مجاز کی نظم ''نغمۂ ٹیگور'' (ترجمہ از گارڈنر) اس نظم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ٹیپ کا شعر تو ردیف میں ہے مگر ابتداء کے چار شعر بغیر ردیف میں ہیں- اس لئے یہ نظم ہیئت کے تجربوں میں اہمیت رکھتی ہے- مجاز کی زیادہ تر نظمیں پابند ہیئت میں ہیں- صحیح معنی میں ہیئت کے تجربے ۱۹۴۷ء کے بعد سے ہونا شروع ہوئے-

نئی ہیئتوں کے سلسلے میں مخدوم محی الدین کی نظم کو بھی رکھا گیا ہے، انہوں نے بحور کی آزادی کو اپنا مسلک بنایا اور کامیاب رہے- فیض کی نظموں میں تغزل پایا جاتا ہے، انہوں نے آزاد نظمیں لکھی ہیں جسے ایک عام رجحان کہا جاسکتا ہے- سردار جعفری نے بھی آزاد نظمیں کہی ہیں- ''نئی دنیا کو سلام'' آزاد نظم میں ہے- کیفی اعظمی نے بھی آزاد نظموں میں اپنے خیالات کی ترسیل کی ہے- ہیئت کے مستحکم تجربے ن- م- راشد کی ''ماوراء'' سے ''لا انسان'' سے شروع ہوتے ہیں- راشد کے سانیٹ اس درجہ مشہور ہوئے کہ انہوں نے اس ہیئت کو صنف کا درجہ دے دیا- دراصل سانیٹ انگریزی شاعری کے اصناف میں شامل ہے اور اس کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ اردو میں بگڑا شاعر مرثیہ گو کہلاتا ہے اسی طرح انگریزی شعراء میں بگڑا شاعر سانیٹ نگار کہلاتا تھا-

اردو میں سانیٹ بہت کم لکھے گئے- اختر شیرانی نے سانیٹ ہیئت کو استعمال کرکے آنے والے شعراء کے لئے رہنمائی کا کام کیا- ہیئت کے تجربوں میں اختر الایمان، منیب الرحمٰن نے جو ترقی اور اضافہ کیا ہے، ہیئت کے متعلق کمال احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''ہیئت کا تعلق ظاہر روپ سے ہے، لیکن ان دونوں باتوں کا فیصلہ لفظوں کی ان کی ترتیب اور ڈھانچے کی سطح پر نہیں، خیال کی سطح پر کیا جاسکتا ہے-''[۲]

۱- جدید شاعری، ص ۲۵۴

۲- ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر، ص ۴۷۴

آزاد اور معریٰ نظم:

بلینک ورس کے لغوی معنی بے قافیہ نظم کے ہیں- مغربی شاعری کا دار و مدار اسی طرز پر ہے- اس کی با قاعدہ ترویج سولہویں صدی عیسوی کے درمیانی حصہ سے تعلق رکھتی ہے- انگریزی شاعری، جو کہ بے قافیہ ہوتی تھی، اس لئے اس کا نام بلینک ورس رکھا گیا-

وقت اور حالات کے تحت بلینک ورس میں بھی ترمیم و اضافہ ناگزیر سمجھا گیا- اس میں ہیئت کے اعتبار سے بھی تبدیلی ضروری سمجھی گئی- اس طرح آگے چل کر بلینک ورس کو بحر کی قید میں لا کر یہ واضح کیا کہ اسی بحر میں سانیٹ کا اضافہ کیا- یہ وہ بحر ہے جو ڈرامائی اور رزمیہ شاعری کے لئے مشہور ہے- بلینک ورس میں جو بھی نظم ملے گی، اس میں بندوں کی تقسیم نہیں ملے گی- شاعران معنوں میں آزاد ہوتا ہے کہ وہ اپنے خیالات کا تسلسل کے ساتھ اظہار خیال کرے، اس بحر کو انگریزی میں ''آیمبک پنٹیا میٹر'' کہتے ہیں- اس بحر کے متعلق حنیف کیفی کا تاثر ملاحظہ کیجئے:

> ''انگریزی بلینک ورس کے لئے جس طرز کو اختیار کیا گیا، وہ بذات خود بڑی رواں اور پر شوکت بحر ہے- یہ بحر نظم کو تسلسل بیان اور شکوہ شاعرانہ عطا کرتی ہے- ساتھ ہی ساتھ آیمبک بحر کی یہ خوبی ہے کہ وہ ہر قسم کے جذبات کے اظہار پر قدرت رکھتی ہے اور اسی لئے یہ انگریزی کی معیاری اور مقبول ترین بحر ہے-''[۱]

اس بحر میں جو ڈرامائی آہنگ پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بول چال کے انداز اور مکالمے سے پتہ چلتا ہے کہ عروض میں رہتے ہوئے بھی عروضی تبدیلی بہ آسانی کی جا سکتی ہے- بلینک ورس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مصرعے بدلتے رہتے ہیں، کہیں طویل مصرعہ تو کہیں مختصر، یہی وجہ ہے کہ شاعر کو اپنا خیال ادا کرنے میں دشواری نہیں ہوتی - شاعری میں یہی وہ نیچرل انداز ہے، جسے آپس میں گفتگو کرنا کہتے ہیں-

بلینک ورس کے متعلق یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ آزاد ہوتے ہوئے بھی آزاد نہیں بلکہ ہیئت اور تکنیک کے لحاظ سے بھی اور بحروں کے قواعد کا بھی پاس ضروری سمجھا جاتا ہے- چند بحروں کو ملاحظہ کیجئے، بحر رمل، بحر رجز، بحر ہزج، بحر متقارب، بحر متدارک وغیرہ- ان بحروں میں زیادہ تر آہنگ پر زور دیا جاتا ہے- اس طرز کی نظموں میں اوزان کا بھی خیال رکھا جاتا ہے- ایسا بھی نہیں کہ نظم بے وزن تکمیل پذیر ہو رہی ہے- بحر کا تعلق ارکان زحافات سے ہے- اس لئے اس میں تغیر و تبدل کا ہونا یا آنا لازمی امر ہے- ارکان کا آزادانہ استعمال ہی بلینک ورس نظم کی تقویت کا باعث بنتا ہے- اس میں چھوٹے بڑے مصرعے معیوب نہیں سمجھے جاتے بلکہ یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ ہم اپنی بات اور خیال کو کہاں تک سپرد قلم یا نظم کر سکے ہیں- اس لئے شعراء نے قافیہ کو غیر ضروری سمجھا- بلینک ورس کی تعریف میں اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ شاعر نظم کہتے ہوئے بھی آزاد نہیں رہتا بلکہ اسے اصول اور قواعد کا پابند ہونا پڑتا ہے، یوں تو بلینک ورس میں شاعر آزاد فضا میں رہ کر آزاد نظم تخلیق کرتا ہے لیکن یہاں یہ امر نہایت ضروری ہے کہ وہ عروض ہو یا اس کی پابندیاں، پابند نظم کے ڈھب کو اختیار کئے بغیر آزاد نظم کو آزاد نظم کا پیکر یا اس کا تصور نہیں دے سکتا- بلینک ورس خالصتاً مغربی طرز کی وہ شاعری ہے جو مشرق کو تحفتاً ملی ہے-

---

۱- اردو میں نظم معریٰ اور آزاد نظم، ص ۱۳۴

آزادنظم کے بارے میں اطلحہٰ رضوی برق لکھتے ہیں:

''اردو شاعری میں آزادنظم ایک انوکھی صنف بن کر داخل ہوئی اس لئے عام طور پر وہ مقبولیت حاصل نہ کر سکی جس کی یہ مستحق ہے۔ آزادنظم پر غیر موزوں ہونے کا اعتراض بھی کیا گیا اور یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض آزادنظم لکھنے والوں نے زبردست عروضی غلطیاں کیں اور موزونیت کو محض موسیقی تک محدود کر دیا حالانکہ سو فی صدی آزاد نظمیں اردو کی کسی نہ کسی مروجہ بحر میں ہی لکھی گئی ہیں۔ مصرعوں کے چھوٹے بڑے ہونے کے باوجود ان کی بحر نہیں بدلتی، ہاں! مصرعوں میں ارکان کی کمی بیشی نے زحافات کو جگہ دی اور کبھی کبھی آدھے رکن کے استعمال نے ترنم اور احساس توازن پر بھی اثر ڈالا۔ لیکن بنیادی بحر اپنی جگہ قائم رہی۔ اردو شاعری میں دوسری اصناف کی بہ نسبت آزادنظم ایک نئی صنف ضرور ہے لیکن یہ کبھی نہیں کہا جا سکتا کہ اردو کی تمام تر اصناف سخن بیک وقت رائج ہوتی ہوں گی۔ ممکن ہے کسی ایک صنف کے مقبول ہونے میں ایک مدت لگی ہو۔ آزادنظم بھی ایک نئے اسلوب، ایک نئی طرز اور نئے خیالات کا جدید ذریعۂ اظہار بن کر زندہ رہ سکتی ہے۔'' [1]

آزادنظم کی کامیابی کا سہرا میراجی کے سر ہے۔ ابہام اور اشاریت کی وجہ سے میراجی نے آزادنظم کو مجروح کیا۔ فنی اعتبار سے تو انہوں نے آزادنظم میں خاصہ مواد فراہم کیا مگر خیالات کے پیچیدہ ہونے کا جہاں تک تعلق ہے، وہ اس کو حل نہ کر سکے۔

معریٰ نظموں کی ابتداء حالی، شرر اور نظم طباطبائی نے کی۔ نظم معریٰ میں ردیف وقافیہ کی قید کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا لیکن ہر مصرعہ ایک ہی وزن پر ہوتا ہے۔ فرانسیسی اور انگریزی ادب میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

اعجاز فاروقی جدید آزادنظم کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''ہمارے ملک میں انگریزوں کے سیاسی تسلط کے ساتھ ساتھ مغربی فلسفۂ سائنس اور تحقیق نے بھی لوگوں کے ذہنوں پر اثر انداز ہونا شروع کیا اور اس سارے عمل میں مسلمہ سماجی اقدار پر بھی کاری ضرب لگی۔ برسوں کے ادب آداب، رسم و رواج اور وہم وخیال اپنی جڑوں سے اکھڑ گئے۔ لوگ تہذیب کے جس جزیرے پر مطمئن اور پرسکون بیٹھے تھے، وہ یکایک سمندر میں غرق ہو گیا اور زندگی کی وحدت کو قائم رکھنے کے لئے انہیں نئے وسیلوں کی تلاش ہوئی۔ مغرب کے سیاسی، اقتصادی اور فلسفیانہ اثرات کے تحت لوگوں میں جو ذہنی ہیجان برپا ہو گیا۔ اس نے نہ صرف نئے سماجی مسائل پیدا کر دیئے بلکہ نفسیاتی طور پر لوگوں کی اجتماعی یک رنگی کو بھی ختم کر دیا۔ ان نئے حالات میں شعر کا رومانی تخیل زندگی کی وحدت پر کاری ضرب لگا رہا تھا۔ لوگوں کے لئے مظاہر سے نبرد آزما ہونا ضروری تھا اور فرار قنوطیت کا رجحان خودکشی کے

۱۔ شاعر۔ فروری، ص ۲۰

مترادف تھا۔ اس عمل میں انسان لمبی اور گہری سوچ میں مبتلا ہو گئے۔ قافیہ اور ردیف کا
التزام اس گہری سوچ کے تسلسل کو توڑتا نظر آتا تھا۔'' [۱]

اگر ہم آزاد نظم اور معریٰ نظم کا بالاستیعاب مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ معریٰ نظم کی ابتداء اسماعیل میرٹھی نے کی۔ اس میں انہوں نے موضوعات کی تبدیلی میں نہایت اچھی کوششیں کیں، جو ایک کامیاب تجربہ تھا۔ ہیئت اور اسلوب کو بھی نئے سانچوں میں ڈھال کر پیش کیا لیکن عظمت اللہ خاں نے اس صنف میں مزید کامیاب تجربے کر کے اسے اوج ثریا پہ پہنچا دیا۔ زمانہ جس تیزی سے کروٹ لے رہا تھا اسے شعراء محسوس کر رہے تھے۔ سماجی زندگی کا تغیر اور مغربی اثرات اس طرح اردو میں آزاد نظم اور معریٰ نظم کے ارتقاء میں میرا جی، ن۔م۔ راشد، ڈاکٹر تصدق حسین خالد، دین محمد تاثیر اور فیض احمد فیض نے ہیئت، شعری مواد، اسلوب اور موضوعات میں گراں قدر اضافہ کیا۔

اردو منظوم تراجم:

آزاد نظم میں جو ہیئت کے تجربے ہوئے ان میں قافیہ اور ردیف کا التزام نہیں رکھا گیا وہ اس لئے کہ مغربی شعراء میں اس طرز پر کہنے والے خاص طور پر بلکہ خصوصیت کے ساتھ ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں شیکسپیئر، ٹینی سن اور ایمرسن بہت زیادہ مشہور ہیں۔ ان شعراء کے تراجم اردو میں نظم طباطبائی، عبدالحلیم شرر اور دیگر شعراء نے کئے ہیں۔ نظم طباطبائی نے کئی نظموں کے ترجمے کئے جو بڑے کامیاب اور ہیئت و اسلوب کے اعتبار سے اعلیٰ نمونے کے حامل ہیں مثلاً ''اوڈ آن اسپرنگ'' کا ترجمہ ''زمزمۂ فصل بہار'' کے عنوان سے کیا ہے۔ انہوں نے ترجموں میں دو باتوں کا خیال رکھا ہے۔ ایک تو خالص ہندوستانی زبان اور دوسرے عرب کے اوزان۔ یہ نظم مسدس کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ انہوں نے Blank Verse کے بھی کئی ترجمے کئے ہیں، جو نہایت عمدہ اور جاندار ہیں۔ بلینک ورس کی ابتداء، فرانسیسی، جرمنی، ہسپانوی، اطالوی اور انگریزی شاعری سے ہوئی۔ ان ممالک میں اس صنف کو بے پناہ فروغ ہوا۔ اٹلی میں غیر مقفیٰ شاعری کی ابتداء ۱۵۱۴ء میں ہوئی اس کے علاوہ کلاسیکی طرز پر ۱۵۱۵ء میں اطالوی شاعری میں اس کے خدوخال نظر آتے ہیں۔ انگریزی ادب میں اس کی ابتداء ۱۵۵۷ء میں ہوئی۔ انگریزی شاعر سرّے وہ پہلا شاعر ہے جس نے قافیہ کو بے جا قرار دیتے ہوئے آزاد شاعری کا آغاز کیا۔

نظم طباطبائی کی نظم ''گورغریباں''، گرّے کی نظم ''ایلجی'' کا منظوم ترجمہ ہے۔ یہ نظم ''دلگداز'' جولائی ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نظم نگاری میں اسٹینزا کا آغاز بھی اسی نظم سے ہوتا ہے۔ ان کی ایک اور نظم ''ہندوستان کی سیفو میڈم سروجنی'' جو ایک نئے مزاج پر ہے۔ ان کے علاوہ سجاد حیدر یلدرم کی نظم ''انتہائے یاس'' بہترین منظوم ترجمہ ہے۔ گو کہ شرر نے بھی بغیر قافیہ کے نظم کہی ہے۔ ان کا ایک ڈرامہ ''نظم غیر مقفیٰ'' کے عنوان سے دلگداز میں شائع ہوا۔

''بانگ درا'' میں اقبال کی وہ نظمیں جو انگریزی شعراء سے ترجمہ کی گئیں مندرجہ ذیل ہیں ''ہمدردی'' ولیم کوپر، ''آفتاب'' گاتیری، ''پیام صبح'' لانگ فیلو، ''عشق اور محبت'' ٹینی سن اور ''رخصت اے بزم جہاں'' ایمرسن۔

اقبال نے نہایت عمدہ ترجمے کئے ہیں، ان کی نظموں میں مغربی اثرات اور نئے اسلوب و تکنیک سے شاعری میں جو تغیر آیا، وہ انقلاب سے کم نہیں۔ یہ صرف اور صرف اقبال کی دین ہے کہ انہوں نے شاعری میں نظم کو وہ کمال بخشا کہ ان کے اثرات دیگر

۱۔ اوراق۔ جولائی، ص ۶۶

شعراء نے بھی قبول کیے- ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی رسالہ ''مخزن'' کے ذریعے منظوم ترجموں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مخزن کے ذریعہ منظوم ترجموں کے اس رجحان نے شعراء کی طبعزاد نظموں کو بھی ہیئت و اسلوب کے اعتبار سے متاثر کیا اور جدید طرز کی نظمیں اوریجنل طور پر بھی لکھی جانے لگیں- حسرت موہانی اگر چہ بعد میں نظم نگاری سے کنارہ کش ہو گئے لیکن ان کی نظم ''ربط سلمیٰ'' اپنے اندر اب بھی ایک تازگی رکھتی ہے- یہ نظم مئی ۱۹۵۱ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی- اسی طرح ظفر علی خاں، غلام بھیک نیرنگ، خوشی محمد خاں ناظر، پنڈت کیفی اور سرور جہاں آبادی نے نئے انداز کی نظمیں لکھنی شروع کیں اور نادر کاکوروی نے منظوم ترجموں کے علاوہ ''دھرتی ماتا'' (مخزن) اکتوبر ۱۹۰۴ء ''کہاں میں جا کر رہوں'' مخزن ۱۹۰۹ء اور ''بوڑھے دنیا پرست کی موت'' مخزن ۱۹۰۹ء جیسی خوبصورت اور موثر نظمیں لکھیں-'' [۱]

اگر ہم شاعری کے اس بدلے ہوئے رجحان کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ شعراء نے منظوم تراجم کے ساتھ ساتھ طبعزاد نظموں میں مبالغہ و ابہام سے گریز کیا ہے اور سادگی کو اپناتے ہوئے فطری شاعری کو اپنایا- اس کے علاوہ نظموں میں اخلاقیات، واقعہ نگاری اور منظر نگاری نظم کا خاصہ بن گئی- نئے اسالیب اور نئی علامتوں کے پیش نظر ان موضوعات پر نظمیں لکھیں جن کا تعلق براہ راست انسان سے ہے- غرض اس دور میں جو مغربی ادب اور خیالات کو اردو نظم میں تراجم کی شکل میں نہایت عمدہ طریقہ سے پیش کرنا ہی نظم کے دامن کا وسیع ہونے کا اعتراف ہے-

دراصل آزاد نظم کا فارم اور تکنیک انگریزی ادب سے اردو ادب میں داخل ہوا ہے- اس آزاد نظم کو بلینک ورس بھی کہتے ہیں- پابند نظم میں شعر واضح مفہوم ادا کرتا ہے جبکہ آزاد نظم میں صرف مصرعہ اس کا متحمل ہوتا ہے- ہیئت کے تجربوں میں رسالہ ''دلگداز'' نے بڑی حوصلہ افزائی کی- شرر نے اپنے رسالے میں انگریزی نظموں کے طرز پر طبعزاد نظمیں لکھنا شروع کیں- ان شعراء کے لئے زمین ہموار ہو چکی تھی- رسالہ ''دلگداز' میں انگریزی سے اردو منظوم ترجمے شائع ہونے لگے- ان شعراء میں نظم طباطبائی، شوق قدوائی، نادر کاکوروی اور ظفر علی خاں نے منظوم ڈرامے لکھے اور شاعری کے دامن کو نظمیہ شاعری سے مالا مال کر دیا- زیادہ تر شعراء نے انگریزی شعراء کی نظموں کے ترجمے کیے جو نہایت کامیاب تجربے کہلاتے ہیں- ان میں اقبال کے معاصرین اور بعد کے شعراء نے گراں بہا اضافہ کیا- اقبال کے اسلوب اور تکنیک سے نظم میں ایک انقلاب آ چکا تھا- گو کہ اقبال نے پابند نظم میں جو نئے سانچے دیئے وہ سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں- رسالہ ''دلگداز'' کے بعد ''مخزن'' نے اس کام کو آگے بڑھایا مثلاً غلام بھیک نیرنگ کی نظمیں جو ترجمہ کہلاتی ہیں، وہ یہ ہیں ''انجام محبت''، ''مقصد الفت''، ''جان شیریں''، ''عالم پیری'' اور ''یاد ایام'' وغیرہ- نادر کاکوروی کی نظمیں ''مرحومہ کی یاد میں''، ''گزرے زمانے کی یاد'، ظفر علی خاں کی نظمیں 'وفا' اور 'ندی کا راگ'، تلوک چند محروم ''نغمات'' اور ''موت کا موسم''، سرور جہاں آبادی کی نظمیں 'سال گزشتہ'، ''میرا ساغر آسمان ہے''، ''موسم گرما کا آخری گلا'' ان کے علاوہ دیگر شعراء نے انگریزی نظموں کے تراجم نہایت عمدہ اور کامیاب کیے- ان منظوم تراجم سے اندازہ ہوتا ہے کہ مخزن کے ذریعے ہیئت و اسلوب کے نئے زاویے سامنے آئے- ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نئی نظم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''شرر کے ''دلگداز'' سے سر عبدالقادر کے ''مخزن'' کے بعد جدید نظم کو فروغ

۱- نگار- جدید شاعری نمبر، ص ۱۸۳

دینے اور اسے نئے عناصر سے ہم آہنگ کرنے کی شعوری کوشش اور باقاعدہ ایک تحریک چلانے کی ذمہ داری مولانا تاجور کے سر ہے۔''[۱]

عبدالحلیم شرر:

اردو شاعری میں ہیئت کے نئے تجربوں میں جو اولین درجہ رکھتے ہیں، ان میں محمد حسین آزاد، آزاد نظم کے موجد بتائے جاتے ہیں لیکن ان کے تجربے زیادہ کامیاب نہیں ہو سکے البتہ اسماعیل میرٹھی نے جو نظمیں لکھیں ان کو ضرور کامیابی حاصل ہوئی۔ ان دو بزرگ ہستیوں کا مطمع نظر موضوعات کو وسعت دینا تھا۔ ہیئت کے تجربوں میں زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ لیکن شرر نے اس روایت کو آگے بڑھانے میں انتھک محنت اور جانفشانی کا ثبوت دیا۔ یہ شرر ہی تھے جن کی کوششوں سے معریٰ نظم میں وسعت نظر آتی ہے۔ ''دلگداز'' کے ذریعہ اس ہیئت کو روشناس کرانے کا سہرا شرر ہی کے سر ہے۔

جون ۱۹۰۰ء کے ''دلگداز'' میں فتح اندلس اس کی ہیروئن فلورنڈا پہلا سین تحریر کیا۔ اسی طرح یہ سلسلہ دلگداز کی زینت بنتا رہا۔ شرر نے چھ سین پر اس ڈرامے کو ختم کیا۔ ہیئت اور تکنیک کے تجربے اور بدلتے ہوئے رجحان کے تحت نظم نگاری میں نئے موضوعات کو داخل شعر کیا۔ مغربی اثرات کے زیر اثر نئی قسم کی نظم سامنے آئی جسے آزاد یا معریٰ نظم کہتے ہیں۔ انگریزی نظموں میں ڈرامائی تشکیل اور رزمیہ واقعات نظم کیے ہیں۔ اس ہیئت کو اختیار کرتے ہوئے شرر نے اسے ڈرامے کے لئے مخصوص کیا۔

شرر کے ڈراموں میں ''مظلوم ورجینا''، ''اسیری بابل'' نہایت اہم ڈرامے ہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ دیگر شعراء پر یہ اثرات کیسے مرتب ہوئے اور اس کے کیا محرکات تھے، اس کی خاص وجہ ہے اور وہ یہ کہ شرر نے نظم معریٰ پر یکے بعد دیگرے کئی مضامین لکھے۔ اس کی افادیت اور قافیہ کی حدود میں رہتے ہوئے شاعری کو ناپسند کیا، آزاد نظم کو عملی طور پر اختیار کر کے ایسے نمونے پیش کئے جس سے دوسرے شعراء نے اس نئی نظم میں طبع آزمائی شروع کر دی۔ شرر نے معریٰ نظم کو ایک تحریک کے ذریعہ آگے بڑھایا۔ وقتاً فوقتاً اس کی تجدید میں مضامین لکھتے رہے۔ دلگداز میں شرر کے خیالات ملاحظہ ہوں:

> ''اُردو نظم میں جس قدر سختی کی گئی ہے اسی قدر انگریزی میں سہولت سے کام لیا گیا ہے۔ اردو شاعری میں صدہا قیدیں اور ہزار ہا قسم کی پابندیاں ہیں اور ترقی کرتی جاتی ہیں، بخلاف اس کے انگریزی میں بہت کم قیدوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ باوجود اس ترقی کے اب تک انگریزی میں قافیہ کی ضرورت نہیں اور اردو میں جب تک قافیہ کی پابندی نہ ہو شعر ہی نہیں ہو سکتا۔''[۲]

شرر کے منظوم تراجم اس بات کے شاہد ہیں کہ انہوں نے ''دلگداز'' میں اسے متعارف کرا کے نئے شعراء میں جدت کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی منظوم تراجم اور شرر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''شرر کی دلچسپیاں اصل میں ناول نویسی اور تاریخ میں زیادہ تھیں۔ شاعری کو انہوں نے کبھی بنیادی اہمیت نہ دی۔ اس لئے ان منظوم ڈراموں کے علاوہ انہوں نے

۱۔ نگار۔ جدید شاعری نمبر، ص ۱۸۵

۲۔ دلگداز، ص ۵

کچھ اور نہیں لکھا لیکن ان ڈراموں کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ ان سے غیر مقفیٰ اور آزاد نظم کا راستہ ہموار ہوا اور ان کے رسالے ''دلگداز'' کی بدولت براہ راست انگریزی سے نظموں کے ترجمے ہونے لگے- ان ترجموں سے انگریزی شاعری کا اسلوب اور پیرایۂ اظہار اردو میں منتقل ہوا، جس کا اثر اس زمانے کی طبعزاد نظموں پر بھی پڑنے لگا اور پابند نظموں میں بھی تازگی اور جدت کے آثار ملنے لگے-نظم طباطبائی کے ترجموں نے انگریزی نظموں کے منظوم ترجموں کی ایک تحریک چلا دی- چنانچہ ضامن کنتوری نے بہت بڑی تعداد میں انگریزی نظموں کے ترجمے کیے- جن کا ایک مجموعہ ''ارمغان فرنگ'' کے نام سے ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا-'' [۱]

''دلگداز'' کے بعد تراجم کا سلسلہ مخزن میں جاری رہا- شعراء میں شوؔق قدوائی کی نظم ''قاسم وزہرہ''، نہایت کامیاب ترجمہ تھا- نادؔر کاکوروی نے بھی منظوم تراجم کیے ہیں- قیصر بھوپالی کا منظوم ڈرامہ ''کرشمۂ عشق'' جو بہترین منظوم ترجمہ تھا- مخزن ہی میں اقبال کی نظم ''ہمالہ'' کے ساتھ ظفر علی خاں کی نظم ''ندی کا راگ'' جو کہ ایک خوبصورت منظوم ترجمہ ہے-''بانگ درا'' میں اقبال کے منظوم تراجم ہمیں ملتے ہیں مثلاً لانگ فیلو، ایمرسن، ولیم کوپر، ٹینی سن، اقبال نے نہایت کامیاب منظوم ترجمے کئے ہیں- خاص طور پر وہ نظمیں جو بچوں کے لئے کہی ہیں-

اردو کی جدید نظم نگاری میں وہ شعراء جو اقبال کے منظوم ترجموں سے متاثر ہوئے- ان میں نظم طباطبائی، وحید الدین سلیم، شوؔق قدوائی نے جدید نظم نگاری کے فروغ میں بہترین ترجمے پیش کئے- یہ اقبال کی فکر کا وہ ثمر ہے جو انہوں نے اپنے منظوم ترجمے کے طور پر پیش کیا ہے مثلاً ''آفتاب'' (ترجمہ گاتیری) ؎

اے آفتاب! روح دروان جہاں ہے تو شیراز بند دفتر کون و مکاں ہے تو
باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا
قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے
ہر شئے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے

(آفتاب) بانگ درا

ایک اور نظم ''ہمدردی'' جو کہ ولیم کوپر کی نظم سے ماخوذ ہے، ملاحظہ کیجئے ؎

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی پہنچوں کس طرح آشیاں تک
ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا

(ہمدردی) بانگ درا

پروفیسر جابر علی سید نے اقبال کے ترکیب بند کے بارے میں لکھا ہے:

''اقبال نے ترکیب بند کو اس طرح بلند اور زندہ کر دیا ہے کہ اس کے بعد کسی شاعر نے اتنی کامیابی کے ساتھ اسے استعمال کرنے کی ہمت نہیں کی- اگر ہم انگریزی

۱- نگار- جدید شاعری نمبر، ص ۱۷۶

کے اسٹینز ا کی ہیئت اور تکنیک کو کسی قدر آزادی اور وسعت دے دیں تو اقبال کی بعض
ڈرامائی نظمیں اسٹینز ا ٹھہریں گی۔'' [۱]

لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ قدیم شعراء کلاسیکی طرز اور تقلید پر ہی اپنے وقت کو صرف کرتے رہے۔ روایت سے ہٹ کر سوچنا بھی گناہ کبیرہ سمجھا جاتا تھا۔ حالی و آزاد جیسے جرأت مندوں نے جدت کے نئے نئے زاویے تراشے۔ اسماعیل میرٹھی نے بھی ان کوششوں کو سراہا۔ اس عالمی ادب کے تناظر میں نئے شعراء کو فکری و شعری مواد حاصل ہوا۔ انہوں نے اپنے رہبروں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے نظم میں ہیئت اور تکنیک کے جو تجربے کئے ہیں، جو بہت ہی کامیاب اور عمدہ بلکہ ایسی نظمیں تخلیق کی ہیں، جس سے نئی صنف سخن میں چار چاند لگ گئے۔ شرر مغربی طرز سے اس قدر متاثر تھے وہ چاہتے تھے کہ تمام انگریزی ادب کو اردو میں منتقل کر دوں اور اردو کو نئے رجحانات اور نئی علامتیں دے جائیں تاکہ دوسرے شعراء فیضیاب ہو سکیں۔ انہوں نے حتی المقدور کاوشات سے جہاں تک ممکن ہوا اردو ادب میں خاص کر جدید اردو نظم میں معریٰ نظم اور آزاد نظم کو متعارف کرایا۔ علی حیدر نظم طباطبائی کی بلینک ورس میں جو رباعیات ہیں، ان کو شرر نے دلگداز میں صرف اس نظریہ کے ساتھ شائع کیا کہ اسے ہمارے استاد نے پسند فرمایا ہے مثلاً ؎

پر کھینچ لیا میرا گریباں یہ کہہ کر
کر، شوق سخن نے کہ نہ وہ اب خاموش
داد اس کی نہیں جو کوئی دینے والا
تو چل کے سنا عزیز میرزا خاں کو
اس طرز میں قصد خامہ فرسائی کا
مجھ کو بھی تھا، لیکن یہی آتا تھا خیال
سب لوگ کہیں گے بے تکے ہیں یہ شعر
ہر شخص کہے گا بے مزہ ہے یہ بیاں

اقبال نے ان نظموں میں خاص طور پر بچوں کے لئے دلچسپی کا سامان رکھا ہے۔ بچے ان نظموں کو شوق و ذوق سے پڑھتے ہیں۔ نظموں کی پہلی اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں فطرت کی عکاسی خطابیہ طرز اور مکالماتی اسلوب کو اپنایا ہے۔ اس کے علاوہ تراکیب لفظی، تشبیہات و استعارات سے نظم کے دامن کو وسیع کر دیا، جس میں فکری اور فطری میلان کا رجحان زیادہ نظر آتا ہے، اسی وجہ سے بعد کے آنے والے شعراء کو کثرت الفاظ کے ساتھ موضوعات کا خاصا مواد حاصل ہوا۔ منظوم تراجم جو کہ آزاد نظم کی طرز پر ہیں، اقبال کے اثرات کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اگر ہم اقبال کی نظم ''ہمالہ'' کا تجزیاتی مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال قدرت کی صناعی کے اعتراف کے ساتھ اس کا ذکر کئے بغیر نہیں رہتے۔ مثال کے طور پر اقبال نے ''ہمالہ'' پہاڑ کو جو عظمت عطا کی ہے دنیا کے دیگر پہاڑوں کا ذکر بھی ضروری سمجھتے ہوئے نظموں میں اجاگر کیا ہے مثلاً ''کوہ طور''، ''الوند''، ''کوہ اخم'' پہاڑوں کے قرب و جوار میں جب لالہ و گل نظر آتے ہیں۔ پہاڑوں کی خوبصورتی کو نظموں میں پیش کرتے ہیں مثلاً ؎

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن

۱۔ اقبال کا فنی ارتقاء، ص ۲۱

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن

اقبال کے ہاں منظر کشی بھی اعلیٰ پیمانے پر ہوئی ہے۔''ہمالہ'' کے پہلو سے بہتی ہوئی ندی کا نقشہ کھینچتے ہیں ؎

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی
اچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

اقبال کے یہ ہیں وہ فکری اور فطری عوامل جن سے نظموں میں دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔لفظی پیکر اور منظر کشی کو دیگر شعراء میں دیکھا جاسکتا ہے۔اقبال کی ابتدائی نظموں میں یعنی پہلے دور کی شاعری میں وطنیت کی علامات کو دیکھا جاسکتا ہے''ترانۂ ہندی''، ''ہمالہ''، ''نیا شوالہ'' میں جو علامات برتی گئی ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نے قوم و مذہب سے بے نیاز ہو کر ایسے گیت الاپے ہیں جن میں محبت، پیار اور خلوص کی فضا ملتی ہے۔مثال کے طور پر ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' میں وطنیت کا اظہار نہایت قومی جذبے سے ظاہر ہوا ہے۔۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء قیام یورپ میں شاعری کے رجحان اور نظریہ میں تبدیلی آنا شروع ہوئی، فکر میں خاصہ فرق آیا اور اپنی فکر کو ملت اسلامیہ کے لئے وقف کر دیا۔اقبال نے اپنی علامتوں کے ذریعہ نئے رجحان کو اجاگر کیا مثلاً مرد مومن، شمع، پروانہ، شاہین، جگنو، قلندر، لالہ، انسان کامل، یہ وہ علامتیں ہیں جو شاعری میں پہلے بھی مستعمل تھیں لیکن محدود معنی میں مگر اقبال نے ان علامتوں کو نئے معنی اور نئی فکر سے وسعت دے کر گراں قدر اضافہ کیا ہے۔اقبال کے ہاں ''لالہ'' کا استعمال کثرت سے ہوا۔انہوں نے ''لالہ'' کو نیا مفہوم دے کر یہ بات ثابت کی ہے کہ لالہ سوز عشق کی کیفیت میں ڈوبا رہتا ہے، جیسے ایک مومن کا دل، اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''لالہ اپنے اندر سوز عشق رکھتا ہے۔اقبال نے عشق اور جمال کی یہ دونوں قدریں بندۂ مومن سے منسوب کی ہیں۔جس طرح لالہ اپنے سینے پر سوز عشق کا داغ رکھتا ہے، اسی طرح بندۂ مومن کے دل پر بھی خالق حقیقی کی محبت کا داغ ہے۔جس طرح لالہ اپنے رنگ کی مناسبت سے سرخوش و پر جوش معلوم ہوتا ہے، اسی طرح بندۂ مومن کی ذات میں بھی ایک جوش ہے۔اقبال لالہ کو ہنگامہ خیزی اور بیداری کی علامت بنا کر پیش کرتے ہیں۔''[۱]

دیگر علامتوں میں بھی اقبال نے انسان کے اندر خوبیاں تلاش کی ہیں جن سے ان علامتوں کا اظہار ہوا ہے، شاہین اور مرد قلندر میں جو مماثلت بتائی ہے، کچھ یوں ہے خوددار و غیور ہے، آشیانہ نہیں بناتا ہے، رزق کے لئے پرواز سے پستی کی طرف نہیں آتا، کسی دوسرے کا کیا ہوا شکار نہیں کھاتا، مردار نہیں کھاتا، ایک بندۂ مومن کی بھی یہی صفات ہیں، اسی لئے شاہین اور بندۂ مومن اقبال کی فکر کو نئے زاویے سے پیش کرتا ہے۔

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی......۱۹۱۷ء-۱۸۴۴ء:

اسماعیل میرٹھی نے انگریزی نظموں کے ترجمے بڑے جاندار کئے ہیں، جو بہت پسند کئے گئے۔ان نظموں کے عنوانات

۱۔ جدید اردو شاعری میں علامت نگاری، ص ۱۱۶

''ایک قانع مفلس''، ''حب وطن'' اور ''انسان کی خام خیالی'' یہ ایسی نظمیں ہیں جو ترجمہ کم طبع زاد زیادہ معلوم ہوتی ہیں- حالی اور آزادطرزِ ادا اور اسلوب کے معاملے میں تصنع اور تکلف کے قائل نہیں تھے، اسی طرح اسماعیل میرٹھی بھی اصلیت پر زور دیتے تھے- نظیر، حالی، آزاد نے عمارت کا ڈھانچہ کھڑا کر دیا تھا- عمارت کو تعمیر کرنے میں اسماعیل میرٹھی اور اقبال کا بڑا ہاتھ ہے- ان دونوں نے جدت، طرزِ ادا، ہیئت، تکنیک، اسلوب کے ذریعہ نئی جہتیں دریافت کر کے شاعری کو ایک نئے آہنگ سے روشناس کرایا- اسماعیل میرٹھی کی نظموں میں محاسن کے ساتھ بیان اور خیال میں یکسانیت ہے- ان کے عنوانات اور موضوعات عوام میں سے ہیں- چند موضوعات ملاحظہ ہوں ''پن چکی''، ''ہماری گائے''، ''گرمی کا موسم''، ''اسلم کی بلی''، ان نظموں میں منظر نگاری کمال درجے کی نظر آتی ہے- بچوں پر جو نظمیں کہی ہیں، وہ زیادہ تر مثنوی بحر میں ہیں- کلام میں سب سے زیادہ جو توجہ طلب بات ہے وہ سلاست اور سادگی، روانی اور زورِ بیان- ان کی شاعری مشاہدے کی شاعری ہے- حقیقت نگاری اور نیچرل شاعری میں ید طولیٰ رکھتے تھے- ان کی نظموں کو درسی کتب میں بھی شامل کیا گیا ہے- ان کی ایک نظم ''قلعہ اکبرآباد'' اس نظم میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مسلمان کل کیا تھے اور آج ہم کیا ہیں- اس نظم میں عروج و زوال کی داستان بھی رقم ہے- اقبال کی نظم ''بلادِ اسلامیہ'' جو تاریخی اعتبار سے تلمیحات کے اعتبار سے بھی ''قلعۂ اکبرآباد'' سے مماثلت رکھتی ہے- اقبال کی نظم کا ایک بند ملاحظہ کیجئے ؎

سرزمیں دلی کی مسجودِ دلِ غم دیدہ ہے
ذرے ذرے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے
پاک اس اجڑے گلستاں کی نہ ہو کیوں کر زمیں
خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سرزمیں
سوتے ہیں اس خاک میں خیر الامم کے تاجدار
نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار
دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیِ محفل کی یاد
جل چکا حاصل مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد

(بلادِ اسلامیہ)

خانقاہ عظمت اسلام تلمیح ہے حضرت محبوب الٰہی، حضرت نظام الدین اولیاؒ، اقبال کی پوری نظم تاریخی اور تلمیحی اعتبار سے بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہے- اقبال کے اثرات ''قلعۂ اکبرآباد'' میں دیکھئے ؎

یا رب! یہ کسی مشعلِ کشتہ کا دھواں ہے — یا گلشنِ برباد کی یہ فصلِ خزاں ہے
یا برہمیِ بزم کی فریاد و فغاں ہے — یا قافلۂ رفتہ کا پس خیمہ رواں ہے
ہاں دورِ گزشتہ کی مہابت کا نشاں ہے — بانیِ عمارت کا جلال اس سے عیاں ہے

اڑتا تھا یہاں پرچمِ جم جاہیِ اکبر
بجتا تھا یہاں کوسِ شہنشاہیِ اکبر

اکبر سا کبھی مخزنِ تدبیر یہاں تھا — یا طنطنۂ دورِ جہاں گیر یہاں تھا
یا شاہجہاں مرجعِ توقیر یہاں تھا — یا مجمعِ ذی مرتبہ مشاہیر یہاں تھا

بہتا تھا اسی کاخ میں دولت کا سمندر
تھے جشن ملوکانہ اسی قصر کے اندر

(قلعہ اکبر آباد)

اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں، یہ تینوں مغل بادشاہ تھے- ان کے علاوہ وہ مشاہیر جو شعر و ادب اور فنون لطیفہ میں مہارت رکھنے والے تمام اہل ہنران دربار سے وابستہ تھے اور ان کی بڑی قدر و منزلت کی جاتی تھی- اسماعیل میرٹھی کی نظم ''ایک قانع مفلس'' پر اقبال کی نظم ''سلطانی'' جو کہ ضرب کلیم میں ہے، چند شعر اقبال کے دیکھئے ؎

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روح قرآنی
خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی
یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار اسی مقام سے آدم ہے ظل سبحانی

(سلطانی)

اب اسماعیل میرٹھی کی نظم ملاحظہ کیجئے ؎

سو ہزار ایکڑ ہے کلن کی زمیں ملک میری ایک بھی ایکڑ نہیں
ہے محل اس کا نہایت شاندار اور ہمارا جھونپڑا ہے تنگ و تار
ان گنت ہے اس کی نقدی اور مال ایک پائی کے لئے میں پائمال
اس کا رتبہ ہے بڑا عزت بڑی میرے سر پر خاک ذلت کی پڑی
ہے مصیبت مال و دولت میں بڑی موت کا دھڑکا ہے اس کو ہر گھڑی
لطف قدرت کا نہیں اس کو نصیب یہ بہار بے خزاں بھی ہے عجیب

(ایک قانع مفلس)

''ایک قانع مفلس''، ۱۸۶۷ء میں انگریزی پوئٹری سے ترجمہ کی گئی، اس نظم میں امیر و غریب کے رہن سہن، امیروں کے تفکرات اور غریبوں کا سکون، امیر کو ہر وقت زندگی اور موت کا دھڑکا لگا رہتا ہے- مجموعی طور پر اس نظم کا تاثر یہ ہے کہ غریب ایک آزاد منش زندگی گزارتا ہے جبکہ امیر آدمی کو ہزار ہا فکریں لاحق ہوتی ہیں- امیر آدمی بے صبرا اور عجلت پسند ہوتا ہے جبکہ غریب آدمی قناعت پسند ہوتا ہے- اقبال نے متعدد انگریزی نظمیں ترجمہ کی ہیں، اسی طرح اسماعیل میرٹھی نے بھی انگریزی نظموں کے ترجمے کئے ہیں-

اسماعیل کی نظم ''حب وطن'' پر اقبال کی نظم ایک ''پرندہ اور جگنو'' کے اثرات ملاحظہ کیجئے ؎

سر شام ایک مرغ نغمہ پیرا کسی ٹہنی پہ بیٹھا گا رہا تھا
چمکتی چیز اک دیکھی زمیں پر اڑا طائر اسے جگنو سمجھ کر
کہا جگنو نے او مرغ نوا ریز نہ کر بے کس پہ منقار ہوس تیز
تجھے جس نے چہک، گل کو مہک دی اسی اللہ نے مجھ کو چمک دی

(ایک پرندہ اور جگنو)

اسماعیل کی نظم حب وطن ملاحظہ کیجئے ؎

دل میں اک چاشنی محبت کی جملہ جاندار کو خدا نے دی

قلب انسان ہی پہ کیا ہے مدار کہ ہر اک دل میں ہے اسی کا شرار
ایک اسپین کی جواں طوطی جو کہ بچپن سے تھی اسیر ہوئی
اور وہ ملک و میوہ ہائے وطن آسمان وطن ہوائے وطن
کیا ہی سرور چچہا کے ہوئی
آخر آخر پھڑک پھڑک کے موئی

(حب وطن)

اس نظم میں خیالات کی وسعت اور ہمہ جہتی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کی نظموں کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں- ان کی شاعری میں آزاد اور حالی کا اثر بھی نمایاں ہے- سادگی وسلاست کا اہتمام ان کی ہر نظم میں ملتا ہے، خواہ وہ ترجمہ کی ہوئی نظم ہو یا طبع زاد، نیچرل شاعری میں نہایت عمدہ نظمیں ملتی ہیں- اسماعیل میرٹھی کے دل میں پوری انسانیت کا درد ہے، اس کے علاوہ ہر جاندار کی تڑپ کا بھی احساس رکھتے ہیں- قومی و وطنی مسائل کو تشبیہات واشارات اور واضح تلمیحات سے واضح کرتے ہیں- ان کی نظمیں بچوں میں اور بڑوں میں یکساں مقبول ہیں-

جدید اردو نظم نگاری میں ایک اہم نام ساقی فاروقی کا بھی ہے- شمس الرحمٰن فاروقی ان کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''جدید ادب کے منظر پر ساقی فاروقی کا ورود ایک تحیر انگیز اور خوشگوار حادثے کی طرح ہوا تھا- آج سے کوئی بیس سال پہلے جب اردو شاعری نئی راہیں تلاش کر رہی تھی اور ہر شخص کو یہ گمان تھا کہ منزل کا نشان اسی کے پاس ہے، ساقی فاروقی ایک ایسے شاعر کی حیثیت سے سامنے آئے جو فطری اور جبلی طور پر نیا تھا-''[۱]

ساقی فاروقی کی نظموں میں اس عہد کی عکاسی کے ساتھ فطرت نگاری کی دلکش تصاویر بھی ہیں- ان کی نظم ''سیمیا'' پر اقبال کے فطری مناظر کے نقوش نظر آتے ہیں ؎

برف سلاسل میں
ایک شرر کی بے تابی ہے
شیشے کی شریانیں چیخ رہی ہیں
پردیسی دھڑکن کی
دھمک سنائی دیتی ہے
راز گلاب کے
مڑے ہوئے کانٹے سے
اوس کے شل آنسو کی لاش ٹنگی ہے
جیسے تمنا کی ناراض کرن
اپنی چھنی سے کاٹ رہی ہے

(سیمیا)

۱- ماہنامہ اسلوب- جولائی، ص ۱۷۹

دوسری نظم ملاحظہ ہو ؂

رات سمندر میں
وہ سرخ جزیرہ ہلکورے لیتا ہے
جس کے نغمے اور نوحے
میرے اندر بجتے ہیں
اول اول کے دکھ سکھ
آخر آخر تک زندہ رہتے ہیں

(سوگ نگر کے لوگ)

ان نظموں کے آہنگ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ساقی فاروقی نے اقبال کی سوچ اور طرز نگارش کو اپناتے ہوئے جو ہنر مندیاں دکھائیں ہیں، اسے فنکارانہ شاہکار ہی کہا جاسکتا ہے۔ جس طرح اقبال نے قدیم خیالات کو نئے سانچے عطا کئے، قدیم تلمیحات کو نئے پیرائے میں ادا کیا، اسی طرح ساقی فاروقی نے آزاد نظم میں نئے رجحان کا سراغ لگایا ہے۔ ساقی فاروقی تلاش و جستجو کا شاعر ہے۔ انسانی زندگی کی رمق کے ساتھ انسانی زندگی کے حقائق کو بھی نظموں میں ظاہر کیا ہے۔ ان کی ایک نظم ''بہن کی موت'' پر اقبال کی نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں، نظم ملاحظہ ہو ؂

امی یہ کیا پاگل پن ہے
اس کمرے مین
اس کمرے میں
سائے کی طرح
کیوں پھرتی ہو
یہ پھولوں والا سبز فراک
اب یاد کی قبر میں دفنا دو
وہ سرخ پھول تو بکھر گیا
وہ مرگ نین تو چلے گئے

(بہن کی موت)

آزاد نظموں میں بہت سی تو خاصی طویل ہیں۔ یہ اقبال کی طویل نظموں کا اثر تھا جس میں ساقی نامہ، شکوہ، جواب شکوہ، والدہ مرحومہ کی یاد میں، خضر راہ وغیرہ نظمیں طویل اظہاریے میں آتی ہیں۔ اگر ہم فردوسی اور نظام گنجوی اور مولانا روم کی مثنویاں دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال نے ان اکابرین سے پورا پورا اثر قبول کیا ہے، ان کے علاوہ ڈانٹے کا ''طربیۂ ایزدی''، گوئٹے کا ''فاؤسٹ'' اور ملٹن کی ''فردوس گم گشتہ'' ان تمام شعراء کے اثرات کو اقبال کی نظموں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اقبال کے فن اور ان کی مثنوی نگاری، جو طویل نظموں پر محیط ہے، کا تجزیہ کرتے ہوئے اسلم انصاری لکھتے ہیں:

''اقبال کے فن کی ایک جہت ان کی مثنوی نگاری بھی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نے نہ صرف یہ کہ بیانیہ شاعری کی، اس عظیم الشان روایت سے رشتہ منقطع

نہیں کیا بلکہ اسے اپنے فن کا ایک اہم حصہ بھی بنایا- حکیم سنائی، مولانا روم اور محمود شبستری کی مثنویاں ہمیشہ ان کے روبرو رہیں، نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے فردوسی اور نظامی کے فن سے کتنا اثر قبول کیا لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ ان کی وسعت نظر فارسی مثنوی نگاری کی پوری روایت پر محیط تھی-'' [۱]

اقبال کے فن اور ان کی نظموں کے آہنگ کو اس عہد کے شعراء کی نظموں میں بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے مثلاً کشور ناہید نے بلاگادمستر ودا کی نظموں کا اردو آزاد ترجمہ کیا ہے- کشور ناہید نے بھی آزاد منظوم تراجم میں گراں قدر اضافہ کیا ہے- ایران کی مشہور شاعرہ فروغ فرخ زاد کی شاعری کو اردو نظم میں ترجمے کے ساتھ پیش کیا ہے- کشور نے اس کے علاوہ اڈیورالن، الیگزینڈر گروف، بلاگادمتر ودا، پوروان سٹیفاتوف، پیلیو پینوف، لیانا وسکالورا، لیوڈمل سٹونیون، منظوم آزاد تراجم سے اردو نظم کے دامن کو وسیع تر کر دیا- ان نظموں میں ارتقائی عمل کو دیکھا جا سکتا ہے- اقبال بنیادی طور پر ارتقاء کا قائل ہے- اقبال کی نظموں میں مادی اور روحانی ارتقاء کا پتا چلتا ہے، اسی طرح ان شعراء کے ہاں بھی قرآنی آیات، تلمیحات، تشبیہات اور نئے نئے لفظی پیکر سے نئی تراکیب لفظی کا اظہار ملتا ہے- اردو نظم نگاری میں یقیناً یہ اثرات اقبال کے فکر و فن اور ہمہ جہت سوچ نے نظم کو ارفع مقام عطا کیا-

محمد ثناء اللہ ثانی ڈار، میراجی......۱۹۴۹-۱۹۱۲ء:

لاہور میں ۲۵ مئی ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے- شاعری میں ساحری کے تخلص سے پہچانے جاتے تھے- بنگالی لڑکی میرا سین سے عشق ہوا، اسی مناسبت سے میراجی تخلص رکھا-

شاعری کی دنیا میں میراجی کی شخصیت نمایاں اور منفرد نظر آتی ہے- ان کی اس شخصیت کو بنانے میں میلارمے، لارنس، بودلیئر، ایڈگر ایلن، ہائینے اور چنڈی داس کا ہاتھ ہے- گلے میں مالا، لمبی مونچھیں، شیروانی کہنیوں تک پھٹی ہوئی تھیں، فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے-

میراجی نے اپنی نظموں میں جس جنسی جذبہ کو ابھارا ہے وہ انسان کی جبلت ہے- انہوں نے اس احساس کو اپنے مضامین میں بھی پیش کیا ہے- میراجی کی بغاوت شعری اعتبار سے دیکھی جائے تو خاصی کامیاب رہی- انہوں نے عامی اور فنکار کے درمیان جو فرق تھا، اسے مٹا دیا- اس فرق کو مٹانے میں انہیں دور دراز کا سفر بھی کرنا پڑا کیونکہ یہ مواد مشرق میں نہیں مغرب میں ملتا ہے- یہی وہ اسلوب ہے جسے میراجی نے اپنایا اور شاعری میں ہیئت اور تکنیک، موضوعات اور مضامین کو نئے زاویے سے برتا- اس کے علاوہ سنسکرت اور ہندی ادب سے کسب فیض کیا- میراجی کے مجموعہ ہائے کلام یہ ہیں:

۱- میراجی کی نظمیں
۲- گیت ہی گیت
۳- اس نظم میں
۴- مشرق و مغرب کے نغمے
۵- کلیات میراجی، مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی

۱- اقبال عہد آفریں، ص ۳۰

میراجی کی شاعری میں اشاریت اور علامت پسندی جس طور پر نمایاں ہوئی ہے، معاصر شعراء کے ہاں یہ معاملات کم ہی نظر آتے ہیں- میراجی کو اشاریت اور علامت نگاری کا امام کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا - رسالہ ''نگار'' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''اشاریت کے صحیح معنوں میں رہنما میراجی ہیں- ابتدائی نظموں کو چھوڑ کر میرا جی کی کوئی نظم ایسی نہیں جس میں اشاریت نہ ہو- وہ کوئی بات اس وقت تک سمجھتے ہوئے معلوم نہیں ہوتے جب تک وہ اسے کسی اشاریت میں نہ دیکھ لیں، اسی لئے ان کی نظموں کا بیشتر حصہ عام قاری کے لئے ناقابل فہم ہے-'' [۱]

میراجی فرائیڈ کی نفسیات تحلیل سے ہی نہیں ملارمے اور بودلیر کی جنسیات سے بھی متاثر تھے- دراصل ہندوستان میں دیشو بھگتی تحریک زوروں پر تھی، میراجی کی نظموں پر اس تحریک کے نمایاں اثرات دکھائی دیتے ہیں مثلاً کرشن اور رادھا کا عشق اور دوسرے واقعات سے متاثر ہو کر جنسیات پر بیبا کانہ قلم اٹھایا اور جنس کے جذبے کو ابھارا، جو فطری جبلت پر ہے- جنسیات پر میراجی کا اپنا کہنا یہ ہے:

''جنسی فعل اور اس کے متعلقات کو میں قدرت کی بڑی نعمت سمجھتا ہوں اور جنس کے گرد جو آلودگی تہذیب وتمدن نے جمع کر رکھی ہے، وہ مجھے ناگوار گزرتی ہے اس لئے ردعمل کے طور پر میں دنیا کی ہر بات کو جنس کے اس تصور کے آئینے میں دیکھتا ہوں جو فطرت کے عین مطابق ہے اور جو میرا آدرش ہے-'' [۲]

میراجی کی شاعری کی خصوصیات انہی خطوط اور اسی روشنی میں تلاش کی جا سکتی ہیں- نظموں میں ایک کیفیت پائی جاتی ہے- سادہ الفاظ سے جذبے کو ابھارنے کے عمل کو تیز کرنا ہی ان کی شاعری کی خصوصیت ہے- ان کی شاعری میں مصنوعی طرز نہیں بلکہ فطرت نگاری اور لطیف احساس جو ذہنوں میں کروٹ لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے، میراجی نے علامتوں کے ذریعہ جدید اردو شاعری میں ایک نئی روایت کی بنیاد رکھی- میراجی کی علامتوں کے بارے میں تبسم کاشمیری کا کہنا ہے کہ:

''میراجی کی علامتوں کو سمجھنے کے لئے ایک تو ہمیں شعر فہمی کا معیار بدلنا ہوگا- ہمیں ان تحریکوں کو پرکھنا ہوگا جن سے وہ متاثر ہوئے یعنی فرانسیسی شاعری کی علامت نگاری کی تحریک فرائیڈ کے لاشعور اور جنس کے تصورات اور برصغیر کی دیومالا، فرانس کی جس فکری اور فنی روایت سے انہوں اپنی ذات کی شناخت کی اس روایت میں وہ میلارمے اور بودلیر سے خاصے متاثر ہوئے- میراجی کے ہاں آزاد تلازم اسی تحریک کا نتیجہ ہیں-'' [۳]

جنس اور جسم کا جذبہ، علائم واستعارے اور نفسیاتی جذبہ جسے ہم داخلی حسیت کا نام دیتے ہیں، یہ جذبہ راشد کے ہاں اور بھی واضح طور پر سامنے آیا ہے- ''ماوراء'' کی نظمیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں- اس کے برعکس میراجی کے ہاں خیال، الفاظ اور

۱- نگار- اکتوبر، ص ۵۵

۲- میراجی ایک مطالعہ، ص ۳۳

۳- جدید اردو شاعری میں علامت نگاری، ص ۱۷۳

موسیقی کلام میں پائی جاتی ہے۔ رسالہ نقوش میں لکھتے ہیں:

''تازہ نظمیں چننے میں خیال کی طرف میری توجہ زیادہ رہتی تھی کیونکہ خیال ہی میری نظر میں بنیادی شئے ہے۔ اس میں اگر کسی کو دو قدم آگے بڑھانے کی صلاحیت نہیں تو اظہار کی کوشش بے مصرف اور بے کار ہے۔'' [1]

میراجی نے جس قسم کی شاعری کو فروغ دیا، وہ شعری تجربہ تو ہو سکتا ہے، شاعری کا آہنگ نہیں ہو سکتا۔ میراجی اور ان کے رفقاء نے شاعری کی ہیئت کو یکسر بدل دیا۔ ''میراجی کی نظمیں'' کا دیباچہ بھی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ انہوں نے مغربی طرز کو اپناتے ہوئے جدید اردو نظم کا آغاز کیا۔ مظہر ممتاز، میراجی کی نظموں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میراجی نے خود مجھ سے حیدرآباد میں کہا تھا کہ وہ گیتوں اور نظموں میں نہ ہندو اور بدھ مذہب کا پرچار کرتے ہیں نہ اسلام کا، ان کی گفتگو سے میں نے ان کے ایمان کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا وہ کچھ بھگت کبیر اور ابن تیمیہ کے درمیانی راستے کا نظر آتا تھا۔'' [2]

اقبال نے ''ضرب کلیم'' میں مغربی عورت اور تہذیب پر نہایت عمدہ نظمیں لکھی ہیں مثلاً پردہ''، ''آزادیِ نسواں''، ''عورت کی حفاظت''، ''عورت اور تعلیم''، ''عورت''۔ اقبال نے ان مختلف عنوانات سے عورت کا جو معیار قائم کیا ہے، وہ نہایت واضح پہلو ہیں۔ میراجی نے اقبال کے اثرات قبول کرتے ہوئے اپنی نظموں میں اس کا اظہار کیا ہے مثلاً اقبال کی نظم ''آزادیِ نسواں'' کے دو شعر ملاحظہ کیجئے ؎

کیا فائدہ، کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں، معذور ہیں، مردان خرد مند

(آزادیِ نسواں) ضرب کلیم

میراجی کی نظم ''ترغیب'' ملاحظہ کیجئے ؎

رسیلے جرائم کی خوشبو
مرے ذہن میں آ رہی ہے
رسیلے جرائم کی خوشبو
مجھے حدِ ادراک سے دور لے جا رہی ہے
جوانی کا خوں ہے
بہاریں ہیں موسم زمیں پر
پسند آج مجھ کو جنوں ہے

۱۔ نقوش۔ جولائی، ص ۳۰۸

۲۔ ہم قلم۔ جنوری، ص ۴۵

نگاہوں میں نہ ہے میرے نشے کی الجھن
کہ چھایا ہے ترغیب کا جال ہر اک حسین پر
رسیلے جرائم کی خوشبو مجھے آج للچا رہی ہے

(ترغیب) [1]

ان دونوں نظموں کے رنگ و آہنگ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورت مغرب کی ہو یا مشرق کی آزادی کسی طور پر مناسب نہیں۔ اگر عورت کے خدوخال واضح ہوں گے تو پھر میراجی نے ترغیب میں جو مصوری کی ہے، وہ ایک زندہ حقیقت ہے، یہی وہ تہذیب ہے جسے اقبال نے اپنی نظموں میں عورت کو پاکیزہ اور پاکیزگی کا درس دیا ہے۔

میراجی نے اپنی نظم ''اونچا مکان'' میں تہذیبی عوامل پیش کیے ہیں۔ اقبال کی نظم ''سیاست افرنگ'' کے نقوش دیکھیے ؎

تری حریف ہے یا رب سیاست افرنگ
مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

(سیاست افرنگ) ضرب کلیم

اقبال نے مغربی تہذیب کو سیاست افرنگ سے تعبیر کیا ہے۔ میراجی نے اقبال سے جو تاثر اخذ کیا ہے، وہ موجودہ دور کی بدلتی ہوئی تہذیبی اقدار ہیں، جسے ہم مادیت کا دور کہتے ہیں۔ میراجی کی نظم ملاحظہ کیجیے ؎

اے تمدن کے نقیب
تیری صورت ہے مہیب
ذہن انسانی کا طوفان کھڑا ہے گویا
ڈھل کے لہروں میں کئی گیت سنائی مجھے دیتے ہیں مگر
ان میں اک جوش ہے بیدار کا، فریاد کا اک عکس دراز
اور الفاظ میں افسانے ہیں بے خوابی کے
کیا کوئی روح حزیں
ترے سینے میں بھی بیتاب ہے تہذیب کے رخشندہ نگیں

(اونچا مکان)

میراجی کی شاعری میں محویت اور سپردگی کی جو کیفیت ہمیں ملتی ہے، اسے تصور اور خیال کی آماجگاہ کہا جاتا ہے۔ نظم ''مجنوں'' میں میراجی نے حیات کے مختلف گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے۔ جس طرح اقبال نے اپنی نظم ''عشق اور موت'' جو کہ ترکیب بند میں ہے، اپنے خیالات کی ترسیل کی ہے، دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

سہانی نمود جہاں کی گھڑی تھی تبسم فشاں زندگی کی کلی تھی
کہیں مہر کو تاج زر مل رہا تھا عطا چاند کو چاندنی ہو رہی تھی

(عشق اور موت) بانگ درا

۱۔ کلیات میراجی، ص ۳۷۴

میراجی کی نظم ''مجنوں'' ملاحظہ کیجئے ۔

عمر گزر گئی تمام

راہ طلب میں عشق کو مل گئی شہرت دوام

حاصل کار کچھ نہیں

منزل آخری ملی

ریگ رواں کے سیل میں بہتا ہوا پہنچ گیا

فلسفۂ حیات کی ایک عجیب مثال ہے

جذبہ دل کی چاشنی

عشق والم کی بندگی

(مجنوں)

اقبال اور میراجی میں یہی وہ واضح فرق ہے جہاں سے اردو شاعری کی مختلف جہتیں وجود میں آتی ہیں۔ جدید اردو نظم میں میراجی نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ نظم میں تمام عقیدے واضح ہونا چاہئیں تا کہ قاری پر ایک تاثر قائم ہو۔ جنسی خیالات جو نوجوانوں میں جو جذبات کی صورت سر اٹھاتے ہیں، ان کو میراجی نے نظم میں بیان کیا ہے، ملاحظہ کیجئے ۔

آج رات

میرا دل

چاہتا ہے تو بھی میرے پاس ہو

اور سوئیں ساتھ ساتھ

تیرے پیراہن مجھے

یاد آتے ہیں بہت

آسماں بھی صاف ہے

اور ستارے اور چاند

بےخود و سرمست ہیں

(سرگوشیاں)

اس نظم کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ میراجی نے نوجوانوں کی اس جذباتیت کا اظہار کیا ہے جو ایک مخصوص عمر میں سہانے خواب دیکھنے میں اپنے شب و روز گزار دیتے ہیں۔ دلی کیفیات کی نہایت عمدہ ترجمانی کی ہے۔ میراجی نے اقبال سے جو کچھ لیا ہے اس میں تشبیہات و استعارات، علامتیں اور تراکیب لفظی ہیئت کے اعتبار سے نظمیں مختلف ہیں۔ میراجی کے موضوعات بھی اقبال سے مختلف ہیں۔ بہر کیف اقبال کے صوتیاتی نظام سے میراجی خود کو نہ بچا سکے۔

ڈاکٹر تصدیق حسین خالد......۱۹۷۱ء-۱۹۰۱ء:

خالد کے ہاں ہیئت کے تجربے اور مغربی نظم کا اثر شاعری میں نمایاں ہے- ان کا زیادہ تر وقت مغربی ممالک میں گزرا اور پھر ان کے مطالعے میں مغربی شعراء، جن میں انگریزی اور فرانسیسی تھے، ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے- آزاد نظم کا ذخیرہ انہی دو زبانوں میں نظر آتا ہے- انہوں نے ایک ہی نظم میں مختلف بحروں سے کام لیا ہے- خالد نے پابند نظم کو ایک آسان نظم قرار دیتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ اس میں قافیہ اور ردیف کی وجہ سے نظم کہنا آسان ہو جاتا ہے جبکہ آزاد نظم میں خاصی مشکلات ہیں- ان کی شاعری پر اقبال کے افکار کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں- اس کا اعتراف خالد نے اپنے الفاظ میں بھی کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''آزاد شعر اختیار کرنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو پرانی تشبیہات، استعارات اور تراکیب سے یکسر آزاد کر دیا- گو اب بھی کبھی کبھی غالب اور اقبال کے اسلوب بیان کا اثر باقی ہے-''[۱]

خالد نے آزاد شاعری کا آغاز لگ بھگ ۱۹۲۵ء سے کر دیا تھا- سالنامہ ''نیرنگ خیال'' میں چودھری غلام احمد پرویز نے ''خالد کی شاعری'' عنوان کے تحت ایک مضمون تحریر کیا- ہیئت اور تکنیک پر خالد نے ''کچھ اپنے متعلق'' میں اپنے نظریہ کی وضاحت کر دی ہے- اس کے علاوہ ڈاکٹر سید عبداللہ اور احمد ندیم قاسمی نے بھی تفصیلی جائزے لے کر اس جدید صنف پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے- پروفیسر علی محمد خاں، خالد کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''بہر حال خالد نے اردو شاعری کو نہ صرف نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کیا بلکہ جذبات و احساسات کی نئی نئی راہیں بھی دکھائیں- خالد نظریے کا شاعر نہیں بلکہ تاثیر کا شاعر ہے- جس کے نقش براہ راست یا ردعمل کے طور پر میرا جی، ن-م- راشد، فیض اور دوسرے شعراء کے ہاں ملتے ہیں اور جہاں تک لفظی پیکر تراشی اور رنگ و صوت کا تعلق ہے، ان کی آواز آج بھی نمایاں ہے- خالد جذبے، خلوص اور صداقت کا شاعر ہے- جو اس نے محسوس کیا اس کا برملا اظہار کیا ہے-''[۲]

۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۵ء تک کا زمانہ فنون لطیفہ میں اجتہادی دور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے- اسی دور میں علامہ اقبال اپنے بھرپور آب و تاب کے ساتھ شاعری کی دنیا میں چھائے ہوئے تھے- ایسے میں کسی اور کا قد کیسے بلند ہو سکتا تھا اس لئے مکاتب فکر نے شعری آہنگ کو بہ اعتبار ہیئت تبدیل کیا اور اس تبدیلی سے نمایاں تجربے وجود پذیر ہوئے- ان میں ایک آزاد نظم بھی ہے- خالد کے ہاں جدیدیت، تکنیک، ابہام اور تازہ فکری اسلوب سے نظم میں ایک نئے آہنگ کا باب کھلا، جسے جدید اردو نظم کہا جاتا ہے- نظموں میں جذبات کی عکاسی کے ساتھ ہندوستانی تہذیب اور جدید رجحانات کا پایا جانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ نظم میں وسعت اور فکری میلانات کا پھیلاؤ ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ آزاد نظم اپنا ایک آہنگ بنانے میں کامیاب ہوگئی- خالد کی نظموں میں اقبال کا اسلوب اور آہنگ کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں- خالد کی نظم ''تارے سے'' پر اقبال کی نظم ''ستارہ'' کے اثرات ملاحظہ کیجئے-

قمر کا خوف کہ ہے خطرۂ سحر تجھ کو
مآل حسن کی کیا مل گئی خبر تجھ کو

۱- سرود نو، ص ۲۶

۲- صحیفہ- جنوری، مارچ، ص ۲۹

متاعِ نور کے لٹ جانے کا ہے ڈر تجھ کو
ہے کیا ہراسِ فنا صورتِ شرر تجھ کو
غضب ہے پھر تری ننھی سی جان ڈرتی ہے
تمام رات تری کانپتے گزرتی ہے

(ستارہ) بانگ درا

خالد کی نظم ہیئت کے نئے تجربے کے ساتھ ''تارے سے'' ملاحظہ کیجئے ؎

رات اندھیری
تیرہ و تار
ہر دے دہلانے والی
بادل کالے کالے، اوج فضا میں ٹھہرے ہوئے
دیوں نے جیسے ڈیرے ہوں ڈالے
تاریکی سی تاریکی
ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھے
ایک ستارہ کانپتے کانپتے ابھرا

(تارے سے) [1]

خالد کی نظموں میں فطرت نگاری اور مغربی اثرات دو کے امتزاج سے جو نیا آہنگ وجود میں آیا ہے، یہی وہ اسلوب ہے جو خالد نے اقبال سے اخذ کیا ہے- خالد محبتوں کا امین ہے اور وطن کی یاد اس کا سرمایہ ہے- تنہائی کے کرب سے بیزار نہیں بلکہ تنہائی سے پیار کرنے والا شاعر ہے- خالد کی نظموں کے چند عنوانات جو جدید نظم نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں ''کس قدر تنہا ہے تو''، ''پیام''، ''یاد وطن''، ''ایک کتبہ''، ''ایک اشتہار''، ''محبت''، ''نئی دنیا'' وغیرہ-

خالد کی نظم ''انتخاب'' پر اقبال کی نظم ''ہمالہ'' کے اثرات ملاحظہ ہوں ؎

مجھے پہاڑوں سے ایک بے تاب انس تھا
عشق تھا مجھے ان کی عظمتوں سے
جہان طفلی میں میری معصوم حسرتیں ان کو دیکھتی تھیں
شباب مستی میں میری سرشار الفتیں ان سے کھیلتی تھیں
وہ چھیڑنا ان کی رفعتوں کو!
مری، مسوری، فراز شملہ
بلندیاں گاڈرڈ کی
انتر لکان کے دلربا نظارے
فضائے گلمرگ کی بہاریں

۱- سرود نو، ص ۱۳۲

وہ نیم شب آفتاب کے برف کی حیاؤں سے شوخ اشارے
وہ ناروے کی جمیل راتیں!

(انتخاب)

خالد کی یہ نظم نیچرل شاعری پر ہے، اس میں تصویر کشی کے ساتھ مناظر فطرت، تشبیہات وعلامات، سماجی اور تہذیبی اقدار سب ہی کچھ اس نظم میں نظر آتا ہے۔ اسلوب کے ساتھ خالد نے اقبال سے فکری میلانات سے بھی فیض اٹھایا ہے۔ جس طرح اقبال نے ''ہمالہ'' میں تصویر کشی کی ہے اسی طرح خالد نے اپنی نظم میں مصوری کے جوہر دکھائے ہیں۔

خالد کی نظموں میں آہنگ واسلوب کا جو تنوع نظر آتا ہے، اس بات سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کا ذہن نئی راہیں تلاش کرنے میں سرگرداں ہے۔ ان کی نظموں کی تکنیک پر مغربی فکر کے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں، اس سے ان کی شاعری میں علامتیں واضح اور رنگین نظر آتی ہیں۔ خالد کی شاعری میں رومان کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔ ان کی ایک نظم ''نئی دنیا'' اس میں جمالیاتی رنگ اپنے شباب پر نظر آتا ہے جبکہ اقبال نے اپنے آہنگ میں ''نوائے غم'' نظم کہہ کر جمالیات کی اچھی مثال قائم کی ہے ؎

زندگانی ہے مری مثل رباب خاموش
جس کی ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش

(نوائے غم)

خالد کی نظم ''نئی دنیا'' میں ہیئت اور تکنیک بدلی ہوئی ہے لیکن فکر اور اسلوب اقبال کا ہے ؎

غرابت کے انوکھے پانیوں کی تہہ میں جاتا ہوں
نئی دنیا
نئے منظر
نئی رعنائیاں
میری تمناؤں کے محور بن چکے ہیں
چھوڑ دو مجھ کو
تجھے سب کچھ میسر ہے
ترے ادنیٰ اشارے پر
زمانے بھر کی آسائش ترے قدموں پہ حاضر ہے

(نئی دنیا) [1]

روایت کا ایک طویل سلسلہ جو تصدق حسین خالد پر آکر ختم ہوا، انہی سے روایت کا دوسرا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ ان کی شعوری کوشش تھی کہ انہوں نے غزل سے گریز کیا اور نظم میں جدت اور نئی جہتیں، علامتیں جو نامانوس سی تھیں، اپنی فکر اور جذبے سے بلند مقام عطا کیا۔ یوں تو خالد کا مجموعہ راشد اور میراجی کے بعد اشاعت کے لمس سے آشنا ہوا، پھر بھی آزاد شاعری کا بانی تصدق حسین ہی کو کہا جاتا ہے۔

۱۔ سرودنو، ص ۱۷۸

یوسف ظفر......۱۹۷۲ء-۱۹۱۴ء:

''زندان'' اور ''زہر خند'' کی نظمیں اس بات کا اظہار کر رہی ہیں کہ شاعر نے اپنے ذاتی غموں کو اس انداز سے پیش کیا ہے۔ وہ درد و غم ہر فرد اپنا درد و غم سمجھتا ہے۔ یہ ہمہ جہتی اور پختگی جسے تازہ حوصلہ کہہ سکتے ہیں۔ یوسف ظفر نے وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ حلقۂ ارباب ذوق میں شامل ہو کر جدید نظم کو فروغ دیا۔ گو کہ انہیں پابند نظم پر بھی قدرت تھی لیکن اظہار خیال کے لئے انہوں نے میرا جی سے کسب فیض کیا۔ ''صدا بصحرا'' کی نظمیں میرا جی ہی کی تقلید میں لکھی گئی ہیں۔ یوسف ظفر تاریکی کا نہیں روشنی کا شاعر ہے۔ اس کی نظموں میں ''چٹان اور آگ''، ''شعلے''، ''لاوا''، ''چراغاں''، ''فروزاں'' جیسی علامتیں ملتی ہیں، اس سے ان کی فکر کا دھارا وطن عزیز سے محبت اور انسانوں سے محبت فطری تقاضے بن کر ابھرے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یوسف ظفر کے باطن میں ایک آگ دہک رہی ہے اور وہ اس آگ کے شعلوں میں خس و خاشاک کو جلا کر راکھ کر دینا چاہتے ہیں جو فرنگی لباس میں جلوہ گر ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا یوسف ظفر کی نظموں کے متعلق لکھتے ہیں:

> '''یوسف ظفر کی نظموں میں حرکت اور حرارت کے عناصر مختلف مظاہر میں متشکل ہو کر اور مختلف ذہنی کیفیات کا لبادہ اوڑھ کر برآمد ہوئے ہیں۔ پہلے ''حرارت'' کے عنصر کو لیجئے، یوسف ظفر کے ہاں حرارت ایک وسیع تر کیفیت ہے جس میں آنچ، نور، تمازت اور رنگ سب کچھ شامل ہے۔ چاند، سورج، تارے، آگ اور آگ کے شعلوں سے اس کی نظمیں لبریز ہیں۔ روشنی اس کے ہاں زادِ راہ بھی ہے اور منزل مقصود بھی اور وہ ایک اندرونی ابال اور تموج کے تحت پروانہ وار اس کی طرف اڑا چلا جاتا ہے۔''[۱]

اپنے وطن میں انگریز حکمراں کو کسی طور پر برداشت نہیں کرتے۔ نفرت کا یہ اظہار اپنے دل کی سلگتے ہوئے عمیق غاروں میں جھانک کر ایسے الفاظ تراشتا ہے جس میں آگ ہی آگ اور شعلے ہی شعلے نظر آتے ہیں۔ نظم ''جنگ'' میں یہ تاثر کتنا جاندار ہے۔ اقبال کی نظم ''مشرق'' کے اثرات کس انداز سے مرتسم ہوئے ہیں۔ ''مشرق'' کے دو شعر ملاحظہ کیجئے، یہ نظم اقبال کی ضرب کلیم میں ہے۔

مری نوا سے گریبان لالہ چاک ہوا
نسیم صبح چمن کی تلاش میں ہے ابھی
مری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن
زمانہ دار و رسن کی تلاش میں ہے ابھی

(مشرق) ضرب کلیم

یوسف ظفر کی نظم ''جنگ'' ملاحظہ کیجئے۔

مشرق لاوے سے ابھرا کھولتے تانبے کا تاش
جیسے باغی کا تخیل یا سوا نیزے پہ لاش
لاش صدیوں کے ستم کی آگ میں جلتی ہوئی

۱۔ نظم جدید کی کروٹیں، ص ۱۴۲

گرم رو، گرداب گوں، گستاخ روحوں کا جلوس
جن کی آنکھوں میں چراغاں جن کے چہرے آبنوس
جن کی فطرت میں بغاوت جن کی باتیں آہنی

اس نظم کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یوسف ظفر نے اقبال کے فکری آہنگ سے استفادہ کیا ہے کیونکہ اقبال نے مشرقیت پر اور اس کی تہذیب پر اتنا کچھ لکھا ہے کہ جدید شعراء نے تراکیب لفظی، اسلوب اور فکری زاویے سے ہیئت کے نئے تجربوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے نظم کے دامن کو وسیع تر کر دیا۔ اس کے علاوہ یوسف ظفر نے کائنات کے حسن کو خارجی ماحول سے ایسے استعارے اور تشبیہات تراشے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر کی آنکھ حسن کی تلاش میں ہے۔ منظر نگاری اور فطرت نگاری کی کیفیت کو وہ نظموں میں پر کیف انداز میں پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ نظم ''معیار حسن'' پر اقبال کی نظم ''حقیقت حسن'' کے اثرات ملاحظہ ہوں ؎

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا ۔۔۔ جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا ۔۔۔ شب دراز عدم کا فسانہ ہے دنیا
کہیں قریب تھا، یہ گفتگو قمر نے سنی ۔۔۔ فلک پہ عام ہوئی اختر سحر نے سنی
چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا ۔۔۔ شباب سیر کو آیا تھا، سوگوار گیا

(حقیقت حسن) بانگ درا

تحیرات کا گلخن، نمو کا گورستان
یہ کائنات، یہ لیل و نہار یہ افلاک
یہاں کے سارے سفید و سیاہ و سرخ و کبود
معابد اور تراشے ہوئے بتوں کے خدا
مری نگاہ نے بخشی ہے زندگی ان کو
مری نگاہ نہیں ہے تو ان میں خاک نہیں

(معیار حسن)

یوسف ظفر نے حالات سے سمجھوتا نہیں کیا بلکہ نبرد آزما رہے ہیں۔ شکست اور فتح کے اس دور اہے پر وہ اکیلے ہی وقت کی آہنی کلائی موڑنے میں مصروف ہیں۔ غم روزگار اور غم دوراں سے تمام عمر بر سر پیکار رہے۔ ان کی نظمیں اس بات کی بھی غماز ہیں کہ انہوں نے تاریکی میں رہ کر دنیا کو روشن کر دیا۔ ان کے اس عمل سے آنے والوں کے لئے فکر کے نئے افق روشن اور تابناک ہو گئے۔ ان کی یہ آرزو ان کی اپنی نظم ''ارمان'' میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ اقبال کی نظم ''حیات ابدی'' کے نقش ملاحظہ کیجیے ؎

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

(حیات ابدی) ضرب کلیم

یوسف ظفر کی نظم ''ارمان'' ملاحظہ کیجئے ؎

مرے خدا، مرے دل کا ارماں نہ سرد سکوں کی روشنی ہے
نہ گرم جسموں کی چاندنی ہے
نہ میں کسی مسند معلّی کا خانقاہی
کہ جس سے حاصل ہو کجکلاہی
مرے لئے جیسے تری دنیا میں کچھ نہیں ہے
بس ایک یہ چاندنی ہے جس کی ادائے بیگانہ بھا گئی ہے
جو میرے دل پر، میری نظر پر، مری تمنا پہ چھا گئی ہے
مرے خدا، تو ہر ایک دل کی پکار سنتا ہے میری سن لے
مرے بھی دامن کو اپنی اس چاندنی سے بھر دے
یہ چاندنی لازوال کر دے

(ارمان)

''زندان'' اور ''زہر خند'' میں جو علامتیں نظام فن کے تحت استعمال ہوئی ہیں ان کا مطالعہ ناگزیر ہے مثلاً چند نظموں کے عنوان یہ ہیں ''زنجیر''، ''ٹوٹا ہوا تارا''، ''تھکا ہارا انسان''، ''گردش''، ''طوفان''، ''قوس''، ''محراب''، ان نظموں میں ایک اضطراب سا ملتا ہے، جو شاعر کو نئی سے نئی جستجو کی طرف لے جانا چاہتی ہے، ایک انجانا سا احساس ہے جو بے چین کئے ہوئے ہے- یہی کسک ان کی شاعری کا خاصا ہے- ڈاکٹر انور سدید ان کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''حلقۂ ارباب ذوق کی شاعری میں یوسف ظفر کی عطا یہ ہے کہ انہوں نے خام مواد تو زندگی سے حاصل کیا اور اسے داخل کی ہلکی آنچ پر پکا کر تخلیق شعر کا فریضہ ادا کیا- چنانچہ وہ صرف خارج کو ہی متحرک نہیں کرتے بلکہ داخل کی سلگتی ہوئی آنچ بھی قاری کے دل میں اتار دیتے ہیں-'' [۱]

یوسف ظفر کی نظمیں جو عصری گونج کا وہ آئینہ ہے جس میں جذباتی ردعمل کے ساتھ خود اعتمادی کا ایسا جوہر نظر آتا ہے، ان کے ہر مجموعہ کی صدا الگ ہے اسی لئے ان کی شاعری کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے خود کو وقت کے زنداں میں گرفتار نہیں ہونے دیا بلکہ وقت کو گرفتار کر لیا- تینوں مجموعوں کے آہنگ سے پتا چلتا ہے کہ یوسف ظفر کا دل رنج والم سے پر ہے- کچھ ایسے سانحات رونما ہوئے جس میں موت اور قبر کا ذکر کثرت سے ہے- اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی نظموں پر افکار و خیالات کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں مثلاً ''ملاقاتیں''، ''آنسو''، ''مستقبل''، ''ولولے''، ''میرے نغمے''، ''سوز و ساز''، ''سفر''، ''جمود''، ''انصاف''، ''زندگی''، ''سہارا''، ''تکمیل'' وغیرہ کی نظموں میں اقبال کا اسلوب اور رزمیہ شاعری کے نقوش نظر آتے ہیں، جس طرح اقبال نے شاعری کی پرانی اور روایتی علامتوں کو نئے معنی عطا کیے ہیں اسی طرح یوسف ظفر نے لفظی پیکر تراشے ہیں مثلاً مسند معلّی، کجکلاہی، تحیرات کا گلفن، نمو کا گورستان، ''سفید و سیاہ سرخ و کبود'' میں واؤ عطف استعمال کیا ہے- یہ خالص اقبال کا انداز ہے- ''مری نگاہ نے بخشی ہے زندگی ان کو'' اقبال کے آہنگ سے کس قدر مماثلت رکھتا ہے، یہ مصرعہ ''مرا عشق مری نظر بخش دے'' یہ ہیں وہ اثرات جو یوسف ظفر کی نظموں میں دیکھے جاسکتے ہیں-

---

۱- اردو ادب کی تحریکیں، ص ۵۹۱

مختار صدیقی ۱۹۷۲ء-۱۹۱۹ء:

مختار صدیقی بھی حلقۂ ارباب ذوق ہی کے ایک رکن ہیں- انہوں نے تحریک کو آگے بڑھانے میں جو خدمات انجام دیں، وہ اظہر من شمس ہیں- ان کی فکر کا دائرہ غزلوں اور نظموں پر محیط ہے- غزل میں متصوفانہ اور جمالیاتی رنگ پایا جاتا ہے- دراصل یہ روایت کے امین بھی ہیں اور جدید آہنگ کے متلاشی بھی، یہ تلاش انہیں لاہور کے ان ادباء کی طرف کھینچ لائی جس کی انہیں جستجو تھی- سیماب اکبرآبادی کے تلامذہ میں سے ہیں-

مختار صدیقی نے اپنے عہد کے اس تضاد کو اتنے قریب سے دیکھا اور اسے محسوس کیا- انہوں نے ابتداء غزل سے کی لیکن جلد ہی حلقۂ ارباب ذوق میں شامل ہو کر ایسے نظریے کی داغ بیل ڈالی جوان سے مخصوص ہے- مغرب میں سانیٹ، بلینک ورس، فری ورس کا رواج تھا- ان ہیئتوں سے متاثر ہو کر مختار نے آزاد شاعری میں بہت کچھ کیا لیکن ان کا طبعی میلان پابند غزلوں اور نظموں میں زیادہ واضح ہوا ہے کیونکہ ان کے فنی ارتقاء کا تعلق اور ابتدائی شاعری سیماب اکبرآبادی کی مرہون منت ہے- مختار صدیقی نے اپنی نظموں میں رومانوی علامتوں کو اجاگر کیا ہے- ان کی شاعری میں داخلی رموز اور خارجی اثرات دونوں کا حسین امتزاج نظر آتا ہے- عہد نو میں ہنگامی صورت حال، مختلف تحریکیں، معاشرتی وسماجی مسائل غرض دنیا کا ہر خطہ تخریب کی زد میں تھا- ان تمام واقعات و حالات کو محسوس کرتے ہوئے شاعر نے موت، تنہائی، خوف جیسی فضا کو شاعری میں بطور علامت پیش کیا- نظموں میں حرماں نصیبی، مایوسی اور قنوطیت کے آثار نمایاں ہیں- مختار صدیقی کی نظم ''حرف اول'' کے مطالعہ سے ان کی رسائی فکر ونگاہ کا اندازہ ہو جاتا ہے- یہ نظم ''فنون'' میں شائع ہوئی- اقبال کی نظم ''پنجاب کے دہقان سے'' کے نقوش واضح نظر آتے ہیں۔

بتا کیا تری زندگی کا ہے راز
ہزاروں برس سے ہے تو خاک باز
اسی خاک میں دب گئی تیری آگ
سحر کی اذاں ہوگئی، اب تو جاگ
زمیں میں ہے گو خاکیوں کی برات
نہیں اس اندھیرے میں آب حیات

(پنجاب کے دہقان سے) بال جبریل

مختار صدیقی کی نظم ''حرف اول'' ملاحظہ کیجئے ۔

خون سے سینچی ہوئی خاک پہ اب، حد نظر تک ہیں، نئے کھیت
نئی فصل، نئی ہریالی
ٹینکوں اور فوجوں سے روندی ہوئی مٹی پہ، تباہی کا کوئی گھاؤ
یہ تخریب کی ہلچل کی کہیں بدحالی، ہر طرف ہیں نئی محنت کی نئی بیل بہاریں
نئی شادابی سے وارفتہ ہو جاتی ہے ڈالی ڈالی
امن کا وقفہ، یہاں خواب کی پرچھائیں نہیں
ٹینکوں اور توپوں کی خاموشی، چھلاوہ بھی نہیں، مورچو کا یہ سکوں

بھی کوئی دیباچہ، آرام نہیں
یہ ہرے کھیت، نئی بیل بہاریں تو نئے عزم، نئے کام کی تمثال ہیں
اس امن کے وقفے کی یہ تاریخ ہیں، یہ حال ہیں جن سے کوئی ماضی نہیں ہوتا خالی
(حرف اول) [۱]

مختار صدیقی نے ارباب ذوق کے نقطہ ہائے نگاہ کو اپنی نگارشات میں سمو کر پیش کرنے کا جو ہنر اختیار کیا ہے اس سے ان کی غزلیں اور نظمیں اس معیار کو پہنچ گئی ہیں جہاں اساتذۂ فن کا نام لیا جاتا ہے۔ ''منزل شب'' اور ''سی حرفی'' میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ ان کے ہاں ابہام سے گریز، غنائیت کو اولیت دی گئی ہے۔ راشد اور میراجی کی طرح انہوں نے علامتوں کا سہارا نہیں لیا بلکہ ایسی جدت اختراع کی ہے جسے ہم تجربہ بھی کہتے ہیں اور روایت کا امین بھی۔ مختار صدیقی کی نظموں میں لہجہ کی نرمی، لفظوں میں مٹھاس، سلاست اور رزور بیان ہر نظم سے ظاہر ہے۔ ان کی نظم ''رات کی بات'' پر اقبال کی نظم ''شبنم اور ستارے'' کی کیفیات پائی جاتی ہیں ۔

اک رات یہ کہنے لگے شبنم سے ستارے ہر صبح نئے تجھ کو میسر ہیں نظارے
کیا جانیے، تو کتنے جہاں دیکھ چکی ہے جو بن کے مٹے ان کے نشاں دیکھ چکی ہے
زہرہ نے سنی ہے یہ خبر ایک ملک سے انسانوں کی بستی ہے بہت دور فلک سے
(شبنم اور ستارے) بانگ درا

مختار صدیقی کی نظم ''رات کی بات'' ملاحظہ کیجئے، اس نظم پر اقبال کے تغزل کا اثر ہے ۔

چوڑیاں بجتی ہیں چھاگل کی صدا آتی ہے
فرط بیتابی سے اٹھ اٹھ کے نظر بیٹھ گئی
تھام کر آس ہر آہٹ پہ جگر بیٹھ گئی
میرا غم خانہ عبارت رہا تاریکی سے
موج مہتاب کہاں خاک بسر بیٹھ گئی
شبنم آلود ہو جاتا ہے شب کا داماں
تارے چمکے ہیں کہ اب گرد سفر بیٹھ گئی
بھیگتی رات نہا کر مرے اشک خوں میں
جانے کو اٹھی ہی تھی اٹھ کے مگر بیٹھ گئی
(رات کی بات) [۲]

نظم میں تغزل رچا ہوا ہے۔ نظموں میں بلا کی تاثیر، منظر کشی اور دلآویزی اس منتہائے کمال کو پہنچی ہوئی ہے ان کے معاصر بھی حیران اور ششدر تھے۔ حلقۂ ارباب ذوق تحریک کو تقویت دینے میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ فن و ادب کے بارے میں مختار

۱۔ فنون۔فروری، مارچ،ص ۱۳

۲۔ منزل شب،ص ۱۹

صدیقی نے اپنی کتاب ''منزل شب'' کے دیباچہ میں اظہار کیا ہے:

''فن وادب کے بارے میں آج کل ہر فنکار سے ایک نظریے ایک مقصد یا ایک لائحہ عمل کی ضرور توقع کی جاتی ہے- یہ زمانہ وضاحت اور تشریح کا ہے، رمزوایما کا نہیں- کنایات اب ذرا اس لئے بھی خطرناک ہوگئے ہیں کہ (وضاحتوں کے رسیا زمانے میں) ان کی گوناگوں تعبیریں اور تاویلیں کی جاتی ہیں- اب ہر چیز سخن ہے جو بات ماورائے سخن کبھی سمجھی اور مانی جاتی تھیں اب مشتبہ قرار پائی ہے-''[۱]

فن وادب کی روشنی میں جو آدرش ہمیں ملتا ہے وہ ارباب ذوق کا خاصہ ہے- مختار صدیقی کی نظموں کے عنوانات سے بھی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے منظر کشی کے ساتھ روحانی تسکین کا سامان بھی مہیا کیا ہے مثلاً ''برزخ''، ''بازیافتہ''، ''ہرجائی''، ''دردِ شرمندۂ درماں نہ سہی''، ''برف باری کی ایک رات''، ''اے اسیران قفس''-

مختار صدیقی کی نظم ''بازیافتہ'' ملاحظہ کیجئے ؎

اچھا خاصا سبک سا نقشہ
چہرہ پیلا، لباس سادہ
ماحول سے جیسے تھک چکی ہو
تنہا تنہا بلا ارادہ

آنکھیں جو کبھی رسیلی ہوں گی   اب ان کی اداسیوں کی تہہ میں
کیا کیا نہ تھے جانگسل فسانے   ہم آپ تو بے سنے ہی سہمیں
(بازیافتہ)[۲]

برصغیر کے ہنگامہ خیز مناظر کو کس طریقہ سے نظم کیا ہے کہ تصویریں آنکھوں میں گھوم جاتی ہیں- نظم ''لہریں'' اس کا ثبوت ہے ؎

اب دل و دیدہ بیابان ہیں، یہ ساحل بھی
موج آشفتہ کی سرکوبی و شیون سے نزار
کیسے دمساز بنے، میری سبک ساری کا
اور میں- جس کو لگن رہتی تھی اس ساحل کی
سوچا ہوں میری منزل کے یہی ہیں آثار
تنگی، غم خوردہ چٹانیں، یہ رواں ریگ، یہ بیگار کنار
(لہریں)[۳]

۱- منزل شب، ص ۱۳
۲- منزل شب، ص ۴۶
۳- منزل شب، ص ۳۱

قیوم نظر......۱۹۹۷ء-۱۹۱۴ء:

جدید اردو نظم میں جتنا پھیلاؤ اور ترقی کے نئے امکانات حلقۂ ارباب ذوق کے تحت وجود میں آئے، کسی اور تحریک میں جدید رجحانات اس وسیع تناظر میں نظر نہیں آتے۔ حلقہ کے بیشتر شعراء نے غزل ہی سے ابتداء کی جبکہ ترقی پسندوں کے ہاں غزل معتوب قرار دے دی گئی تھی۔ یہ شعراء نظم کو پروان چڑھانے میں مصروف تھے۔ میراجی کی شمولیت سے حلقۂ ارباب ذوق کے فکری و فنی رجحانات کو تقویت ملنا ہی ان کی کامیابی کی روشن دلیل ہے۔ ان حضرات نے نظم کو ایک نیا آہنگ دیا۔ ہیئت کے نئے تجربوں پر گزشتہ صفحات پر بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل قیوم نظر کی نظم نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''قیوم نظر نے اس افسردہ دلی کو اور ہوا دی۔ مایوسی اور موت دنیا کا حل، قیوم نظر کے یہاں اس طرح تو نہیں جس طرح فانی کے یہاں ملتا ہے بلکہ ان کی یہ مایوسی، بے بسی اور عدم حصول امید کے بجائے میں پلٹ جائے اور نیچے گرنے سے ترتیب پاتی ہے۔ انہیں فرد کی حیثیت اور اس کی شخصیت کا طلسم ٹوٹتا نظر آتا ہے اور تنہائی ایک مبہم اور نامانوس و ناشناسا منزل کی طرف انسان کو لاکر اسے ہمیشہ کے لئے گم کر دیتی ہے۔''[1]

قیوم نظر نے حزن اور یاسیت کے نغمے الاپے اور اپنے قلبی واردات کو نظموں کے قالب میں ڈھال کر نظم کو نیا روپ دیا۔ اس میں تراکیب استعارے وہی روایتی باتیں لیکن فکر کو جدید آئینے میں صیقل کر کے پیش کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ میراجی نے داخلیت کو جس طور پر برتا اور اسے متعارف کرایا اس سے دیگر شعراء بھی متاثر ہوئے۔

قیوم نظر کی شاعری میں افسردہ دلی، غم ناکی اور ماحول کی ناسازگاری پائی جاتی ہے۔ ''قندیل'' اور ''سویدا'' کی نظموں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے عصری کرب اور غم و آلام کو اپنی نظموں میں موضوع سخن بنایا ہے، نظموں کے متعلق ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''ان نظموں میں افسردہ دلی اور غم کی ایک برقی رو دوڑتی چلی گئی ہے جو اس بات پر دال ہے کہ شاعر اپنے ماحول، زندگی اور کائنات سے احساسی اور جذباتی طور پر منسلک ہے اور اس نے زمانے کے وار کو اپنے دل کی ڈھال پر روکا ہے۔ زمانے، ماحول اور زندگی کے ان چرکوں میں سے کچھ تو ایسے ہیں جن کا تعلق شاعر کی شخصی زندگی سے ہے اور کچھ ایسے ہیں جو وقت کی ناسازگاری کی پیداوار ہیں۔''[2]

قیوم نظر نے اپنی ذات کے اندر سے ان دکھوں کو تلاش کیا ہے جو سماجیات کا حصہ ہیں۔ حلقۂ ارباب ذوق کے زیر اثر رہ کر ایک ایسی فکر اور ہیئت کو اپنایا جس میں بہ آسانی خیال کا اظہار ہو سکے۔ ان کی شاعری جمالیاتی پیکر بھی تراشتی ہے اور خارجی ماحول کی عکاسی بھی کرتی ہے۔ شعراء میں جو تحریک اور تحرک خارجی ماحول اور داخلی کیفیات کے تصادم سے وجود پذیر ہوا۔ اس سے شاعری میں ایک نیا پن آ گیا اور یہی نیا پن جدید اردو نظم کا پیرہن کہلایا۔ محمد حسن عسکری نے قیوم نظر کی مندرجہ ذیل نظم کو اپنے انتخاب میں رکھا

۱۔ نقوش۔ جولائی، ص ۳۱۸

۲۔ نظم جدید کی کروٹیں، ص ۱۶۶

ہے، ملاحظہ کیجئے ؎

خاموش ہوا بھیڑوں کا گلہ چلتے چلتے ممیا کر
جا پہنچا شاید باڑے میں بو سی رستے میں پھیلا کر
چپ چاپ کھڑا ہے دور ادھر وہ جنگل کالی چیلوں کا
آواز نہیں آتی اب جھیل کی جانب سے مرغابی کی
سنسان فضا بے جان ہوا میں لرزاں روح خموشی کی
یوں لائی دوش پہ لاش سی کیا رنگیں دن کی بربادی کی
یہ شام، یہ گہری شام، یہ ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تاریکی

(خلش تاثیر) [۱]

موت، تنہائی اور خوف جیسی علامتوں کو وضع کرنا ہی اس بات کا اظہار ہے کہ انسان اب تنہائی کا طلبگار ہے کیونکہ غموں کی دھوپ اتنی تیز ہے، افسردگی ہے کہ چین سے بیٹھنے بھی نہیں دیتی- ان کی نظموں میں انسان کے داخلی غموں کا اظہار ہوا ہے- جس طرح اقبال نے اپنی نظم ''قبر'' میں علامتوں سے کام لیا ہے مثلاً بندۂ محکوم''، ''پردۂ ناموس چاک''، ''اسرافیل'' کو تلمیح باندھا ہے، دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

آہ، ظالم! تو جہاں میں بندۂ محکوم تھا
میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاک میری سوزناک
تیری میت سے مری تاریکیاں تاریک تر
تیری میت سے زمیں کا پردۂ ناموس چاک

قیوم نظر کے مجموعۂ کلام ''سویدا'' کی نظموں میں ایک محرومی اور مایوسی کی فضا نظر آتی ہے- اس کے سامنے ماضی کے مہیب غار ہیں جو تاریکی کی وجہ سے بے رونق ہی نہیں وحشت زدہ بھی نظر آتے ہیں- گزری باتیں اور گئے وقت کو کس شدت سے یاد کر کے دل کے تہہ خانوں میں اس امید کو تلاش کرتے ہیں، جو خارجی ماحول سے پراگندہ نظر آ رہی ہے- ''برسات کی رات'' ملاحظہ کیجئے ؎

اب بندھ گیا تار آنسوؤں کا
روتی ہے عجیب سادگی سے
پرہول، مہیب دلکشی ہے
غمناک ہوئے ہیں خار و خاشاک
دل جا ہوا کلی کلی کا
بڑھنے لگا درد زندگی کا

(برسات کی رات)

قیوم نظر نے اپنے واقعات و حالات کو پیش نظر رکھ کر اپنی تھکن کو داخلی اضمحلال سے تعبیر کرتے ہوئے محبت اور فطرت کو اس

۱- قلب و نظر کے سلسلے، ص ۵۶۲

امتزاج سے پیش کیا جس سے جمالیاتی اقدار اور فطرت پرستی کا نیا انداز سامنے آیا ؎

دیوداروں کے ترش رو پتے
جھڑ کے پیوند خاک ہو بھی چکے
جھیل کی لٹ چکی ہے شادابی
کب سے میداں میں پہنچی مرغابی
چیختی ہے ہوا گزرتی ہوئی
کوہساروں کے پار اترتی ہوئی
میں ہوں اور اک بسیط تنہائی

(انجام) [۱]

قیوم نظر کی یہ نظم دیکھئے، اس میں کرب و احساس کا ملا جلا رجحان پایا جاتا ہے ؎

کون اس جھونکے کو سمجھائے
صحن چمن سے جو اٹھا ہے
سوکھے پیڑ کو چھیڑ رہا ہے

(واپسی)

قیوم نظر کی شاعری کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جائے کہ ان کی یاسیت اور محرومی فانی بدایونی سے کسی بھی طور کم درجہ کی نہیں۔ ان کی نظموں میں درد و غم، مصائب و آلام، کرب جاں کا احساس جو داخلی کیفیات کا آئینہ دار ہے جبکہ خارجیت میں سماجی مسائل اور انسانی ہمدردی میں سرشار ہو کر جو نظمیں لکھیں ہیں ان سے پتا چلتا ہے۔ انہیں انسان سے ہمدردی بھی ہے اور اپنے وطن سے محبت بھی۔ ویسے بھی ان کی فکر اور ہیئت کے تجربے یہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے نظم کو ایک نیا آہنگ ہی نہیں دیا بلکہ ایسی وسعت عطا کی جو جذبہ اور احساس کی ترجمانی کرتے ہیں۔ قیوم نظر حلقۂ ارباب ذوق کے بانیوں میں اہم نام ہے۔ انہوں نے میرا جی کی ادارت میں نکلنے والا رسالہ ''ادبی دنیا''، جس نے ''ادبی دنیا'' کو متاثر کیا۔

قیوم نظر کی شاعری میں جو یاس کے بادل منڈلا رہے ہیں وہ دلی اور داخلی کیفیات کا آئینہ دار ہے۔ اگر قیوم نظر کو فانی کے بعد یاسیت کا دوسرا شاعر تسلیم کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ نظم ''نیا دور'' میں اقبال کی نظم ''مردان خدا'' کا آہنگ ملاحظہ کیجئے ؎

وہی ہے بندۂ حر جس کی ضرب ہے کاری
نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیاری
ازل سے فطرت احرار میں ہیں دوش بدوش
قلندری و قبا پوشی و کلہ داری

(مردان خدا) ضرب کلیم

قیوم نظر کی نظم ''نیا دور'' میں اثرات ملاحظہ کیجئے ؎

نشان فتح و ظفر ہے نئے نظام کی بات

۱- قلب و نظر کے سلسلے، ص ۵۷۹

دلیل ہوش و خرد سے ہے اب انصرام کی بات
ہر ایک بات ہماری ہے آج کام کی بات

(نیادور) [1]

اقبال نے عربی الفاظ استعمال کیے ہیں اسی طرح قیوم نظر نے ''انصرام'' اور بہت سے عربی الفاظ استعمال کیے ہیں۔

ن۔م۔راشد......۱۹۷۵ء۔۱۹۱۰ء:

نام نذر محمد راشد ۹ نومبر ۱۹۱۰ء، گوجرنوالہ میں پیدا ہوئے۔ جدید شاعری کی ابتداء اگر ہم حلقۂ ارباب ذوق میں شامل شعراء سے کریں تو یہ بات اپنی جگہ درست ہوگی کہ میراجی اور راشد ہی نے روایت سے انحراف کرتے ہوئے ایسی شاعری کو فروغ دیا جو اپنی نوعیت کی علیحدہ اور انفرادیت کی حامل تھی۔ ان دونوں نے مغربی ہیئت کو اپنایا اور نئے نئے تجربے کیے۔ فیض بھی اسی دور کے شاعر ہیں لیکن انہوں نے سماجی و معاشرتی زبوں حالی کو مشرقی فکر پر ہی استوار کیا جبکہ راشد اور میراجی کے یہاں جنسی میلانات اور ترغیبات بے روک ٹوک نظر آتے ہیں۔ مغربی اثرات ان شعراء پر اس سرعت سے اثر پذیر ہوئے کہ ملارمے اور بودلیر کی شاعری مشرق کا حصہ بن گئی۔ ''ماوراء'' کی نظمیں اور ان کے موضوعات دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ راشد ایک آزاد ذہن لے کر شاعری کے دبستان میں داخل ہوئے اور بہت جلد شاعری کے افق پر چھا گئے۔ ان کی نظموں میں عشق، وطن پرستی، مباشرت، قوم پرستی وغیرہ جیسے مضامین ملتے ہیں، راشد کے مجموعہ ہائے کلام یہ ہیں:

۱۔ ماوراء ۲۔ ایران میں اجنبی ۳۔ لا۔انسان

راشد کے ہاں تشبیہات واستعارات کا نظام تخلیقی اعتبار سے بہت مستحکم ہے۔ ان کی نظموں میں ایک بھرپور معنویت ملتی ہے۔ ان کی نظموں کے زیادہ تر موضوعات، تاریخی شعور اور انسانی تاریخ سے مملو ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے مشرقی انسان کے کرب کو مغرب کے نشاط آمیز رویوں میں تلاش کیا ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی و سماجی پس منظر بھی شاعری کا حصہ ہے۔ ان کی ایک نظم ''زنجیر'' پر اقبال کی نظم ''گلہ'' کے اثرات تشبیہات واستعارات کے آئینے میں دیکھیے ؎

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک بیچارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تو مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے، یورپ سے نہیں ہے

(گلہ) ضرب کلیم

راشد کی نظم ملاحظہ کیجیے ؎

گوشۂ زنجیر میں
اک نئی جنبش ہویدا چلی
ہر جگہ پھر سینۂ نخچیر میں
اک نیا ارمان نئی امید پیدا ہو چلی
جملۂ سیمیں سے تو بھی پیلۂ ریشم نکل

۱۔ قلب ونظر کے سلسلے، ص ۶۱۹

شکر ہے دنبالہ زنجیر میں
اک نئی جنبش نئی لرزش ہویدا چلی

(زنجیر) [1]

اس جدید نظم میں تشبیہات واستعاراتی نظام اقبال کی دین ہے کیونکہ اقبال کی شعوری رو اس قدر تیز ہے کہ اسے ہم تخلیقی اور اجتہادی رویہ سے تعبیر کرتے ہیں- اسی طرح راشد کی نظموں میں صوتی، صوری اور معنوی حسن خاصہ جاذبیت لئے ہوئے ہے- ان کے ہاں غیر مانوس الفاظ اور بے کیفی اور خشکی کا احساس تک نہیں ہوتا- ڈاکٹر وزیر آغا راشد کی شاعری پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جدید اردو نظم میں راشد کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے اور اگر لحظہ بھر کے لئے راشد کی نظم کو اردو ادب سے خارج کر دیا جائے تو جدید اردو نظم مفلس اور بے آبرو نظر آنے لگے- حقیقت یہ ہے کہ راشد کے رخصت ہونے سے ایک پورا عہد مر گیا ہے اور اردو زبان اور ادب کو ایک ایسا زبردست نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی ممکن نہیں-'' [2]

راشد کے ہاں معاشرتی اور سیاسی غور وفکر کے آئینے میں خارجی تاثرات کا وہ پرتو ہے جس سے شاعر غافل نہیں بلکہ حسیت کا حصہ ہے- ان کی بہت سی ایسی نظمیں ہیں جس میں یہ جذبہ اجاگر ہوا ہے مثلاً دیوار ظلم، اجنبی عورت، انتقام، دست ستم گر، مشرق پر مغرب کا ظلم، ایسی بہت سی نظمیں ہیں جنہیں پڑھ کر ہم راشد کے ذہن تک بہ آسانی پہنچ سکتے ہیں- راشد جذبات کا شاعر نہیں اس کے ہاں جمالیاتی قدریں بڑی خوبصورت ہیں وہ خود رومانوی فضا میں محو ہو کر نظم تخلیق کرتا ہے- محبت اس کا آدرش ہے- اگر ہم راشد کا ذہنی ارتقاء نظموں میں تلاش کریں تو ان میں چند نظمیں تو ایسی ہیں جن پر اشراقیت اور عجمیت کی چھاپ نظر آتی ہے- ان کی ایسی شاعری کو غنائی شاعری کہا گیا ہے-

راشد کی رسائی فکر ونگاہ اور تکنیک کی روایت پر چلنے والوں پر تنقید بھی ان نقوش کو واضح کرتی ہے کہ وہ ایک ایسے اجتہاد کے قائل ہیں جو بدلتی ہوئی قدروں کا ساتھ دے سکے اسی لئے راشد کے یہاں فن میں پختگی، منفرد اسلوب بیان اور گھمبیر علامات کا تانا بانا ان کی مندرجہ ذیل نظموں میں نظر آتا ہے:

''جرأت پرواز''، ''داشتہ''، ''نمرود کی خدائی''، ''سایہ''، ''سبا ویران''، ''حیلہ ساز''، ''وادی پنہاں''، ''یہ دروازہ کیسے کھلا'' وغیرہ- ان نظموں میں راشد کا ذہنی ارتقاء، فکر اور خیال عروج پر نظر آتا ہے- راشد کی نظم ''دریچے کے قریب'' میں اقبال کا فلسفۂ خودی کو بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے- یہ نظم ایک ایسی تصویر ہے جس میں خدوخال اور رومانوی فضا کا بھرپور تاثر ملتا ہے -

دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
بے پناہ سیل کے مانند رواں
جیسے جنات بیابانوں میں
مشعلیں لے کر سر شام نکل آتے ہیں
ان میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ایک دلہن سی بنی بیٹھی ہے

۱- ماوراء، ص ۱۱۰

۲- ن-م-راشد ایک مطالعہ، ص ۱۸۵

ٹمٹماتی ہوئی ننھی سی خودی کی قندیل
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے ان میں سے کوئی شعلۂ جوالہ بنے
ان میں مفلس بھی ہیں بیمار بھی ہیں
زیر افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں
ایک بوڑھا سا تھکا ماندہ سا رہوار ہوں میں

(دریچے کے قریب) [1]

اسلوب و آہنگ کے اعتبار سے اقبال کے افکار و خیالات سے بہت قریب ہیں- ہیئت اور تکنیک کے بدلتے ہوئے اس رجحان کو قبول عام حاصل نہ ہوسکا- راشد نے تضحیک کے پہلو تلاش کر کے مذہب پر بھی وار کئے ہیں- تصوف اور روایت کے باغی تو تھے ہی خدا کو بھی ادب و آداب سے خارج کر دیا- یہ شعر ملاحظہ کیجئے ؎

کون جانے کہ وہ شیطان نہ تھا بے بسی میرے خداوند کی تھی

ایک شعر اور دیکھئے ؎

تجھے معلوم ہے مشرق کا خدا کوئی نہیں اور اگر ہے تو سرا پردۂ نسیان میں ہے

''ایران میں اجنبی'' کے دیباچے میں اپنی نظموں کے متعلق سیر حاصل روشنی ڈالتے ہوئے-ن-م-راشد لکھتے ہیں:

''''ایران میں اجنبی'' کی شاعری میں اس اجتماعی ذمہ داری کا احساس ملتا ہے جو وقتی نہیں ایک لحاظ سے منفرد بھی ہے یعنی کسی بنے بنائے اصول کے تابع نہیں- ان نظموں میں شبیہہ سازی کی وہ عیاشی بھی کم ہے جس سے اردو کی جدید شاعری بھری نظر آتی ہے- ان نظموں میں اشیاء کو مرئی کرنے کی کوشش زیادہ کی گئی ہے، ان کی تصویریں بنانے کی کم- ان نظموں میں وہ اپنی ہی ذات سے گفتگو بھی نہیں جو پرانے شاعروں کا مشغلہ تھی-'' [2]

مغرب کی نئی اختراعیں اور نئے اسلوب سے متاثر ہوکر راشد نے اردو شاعری کی روایت سے بغاوت کر کے ایک ایسے اسلوب کی بنیاد رکھی جو انجان کیفیت کی حامل تو نہیں تھی پھر راشد نے اس میں خاصی وسعت پیدا کر دی- سب سے اہم خصوصیت ان کی شاعری کی یہ ہے کہ انہوں نے عصری تقاضوں اور اپنے سماج سے آنکھ نہیں چرائی بلکہ معاشرتی زبوں حالی کو اپنی نظم میں پیش کر کے عہد کی ترجمانی کی ہے- راشد کی نظم ''سباویراں'' جو تلمیح اشارات کی حامل ہے، یہ طرز خاص انہوں نے اقبال سے لیا ہے ؎

گیاہ و سبزہ و گل سے جہاں خالی
ہوائیں تشنۂ باراں
طیور اس دشت کے منقار زیر پر
تو سرمہ در گلو انساں

۱- ماوراء، ص۹۶

۲- ایران میں اجنبی، ص۴

سلیماں سربزانو اور سباویراں

(سباویراں)

اس نظم میں تلمیح اشارات ملاحظہ کیجئے، طیور، جو کہ ہدہد کی طرف اشارہ ہے، سلیماں، حضرت سلیمانؑ اور سبا کو ملک سبا کی تلمیح کہتے ہیں، ایسی بے شمار تلمیحات اقبال کے کلام میں موجود ہیں- یہ ہیں وہ اثرات جو راشد کی نظموں میں جابجا نظر آتے ہیں-

ڈاکٹر محمد دین تاثیر......۱۹۵۰ء-۱۹۰۶ء:

جدید شاعری میں تاثیر کا نام اہمیت کا حامل ہے- مغربی شاعری سے متاثر ہو کر ہیئت کے نئے تجربوں میں ان کا بھی حصہ ہے- انہیں پابند نظم اور آزاد نظم دونوں میں یکساں قدرت حاصل تھی- شاعری میں آزاد نظم کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۰ء سے ہوا- ان کی نظموں میں سرمایہ داری کے خلاف احتجاج بھی ہے اور دہقان کی مجبوریوں اور اس پر جور وظلم کا احساس بھی جھلکتا دکھائی دیتا ہے- نظموں میں اقبال کی فکر، اسلوب اور تخیل کا بڑا دخل ہے- ڈاکٹر عبادت بریلوی ان کے خیالات اور شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اقبال کی طرح تاثیر کی امیدیں بھی دہقان اور مزدور کے ساتھ وابستہ ہیں- انہیں بھی ساری دنیا میں کسانوں اور مزدوروں کے دور کا آغاز نظر آتا ہے کیونکہ نظام اقدار کی تبدیلی ان کے بغیر ممکن نہیں اسی لئے ان کی نگاہیں یہ دیکھتی ہیں کہ زندگی اور انسانیت کا مستقبل انہیں محنت کشوں کے ہاتھ میں ہے-''دہقان کا مستقبل'' تاثیر کی ایک اعلیٰ درجے کی نظم ہے-'' [۱]

تاثیر کی نظم ''دہقان کا مستقبل'' میں اقبال کی نظم ''خضر راہ'' میں ''سرمایہ ومحنت'' کے اثرات واضح نظر آتے ہیں، ملاحظہ کیجئے ؎

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے　　خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر　　شاخ آہو پر رہی صدیوں تک تیری برات

(خضر راہ) بانگ درا

اقبال نے اس نظم میں مغربی سامراجیت، دولت کی تقسیم، غریبوں کی آہ وبکا، مزدوروں کا استحصال، سرمایہ دارانہ نظام، جس میں مکر، فریب کے سوا کچھ نہیں ؎

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

تاثیر کی نظم ''دہقان کا مستقبل'' ملاحظہ کیجئے، ہیئت کے اعتبار سے پابند نظم ہے ؎

مگر روئے زمیں سے خستہ تن ہے قلب دہقاں کا
کہ ہے آماجگاہ صدیوں سے ظلم و جور انساں کا
یہ ایسا کھیت ہے تلوار کا ہل جس میں چلتا ہے
لہو کے مینہ میں برچھی بن کے ہر خوشہ نکلتا ہے

۱- جدید شاعری، ص ۴۲۴

یہ بنجر کھیت غیر آباد دل، خاموش دہقاں کا
طلب رکھتا ہے خوشوں کی تمنائی ہے باراں کا
یہی آزاد کروائیں گے آقاؤں سے بندوں کو
یہ پاؤں روند لیں گے سرکشوں کو سر بلندوں کو
یہ ہل ہموار کر دیں گے بلندی اور پستی کو
یہ مستعمر بدل ڈالیں گے ویرانی میں بستی کو

(دہقان کا مستقبل)

تشبیہات واستعارات کا استعمال اور علامتوں سے کلام میں جان ڈالنا، انہی سے مخصوص ہے- ان کے ہاں پیکر تراشی اور تصویر کشی کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں- سید عابد علی عابد تاثیر کی نظم ''ید بیضا'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''تاثیر کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس نے ایک ایسی عدیم النظیر نظم لکھ دی ہے جو ارباب نظر کے لئے مشعل راہ کا کام دے گی- اردو زبان میں اتنی عمیق اور جامع نظم آج تک نہیں لکھی گئی- فنکار کی عظمت وشوکت ان کے دل ودماغ میں موجود تھی چنانچہ اپنے اکتساب کے تمام افکار حسین کو انہوں نے اس نظم میں سمو دیا ہے- اس نظم کی حسین علامتیں، خوبصورت استعارے اور دلنشین کنائے اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ تاثیر اپنے مختلف جمالیاتی علامات کے ذریعے ظاہر کر رہے ہیں- موسیقی، تصویر کشی، سنگتراشی اور دیگر فنون لطیفہ کی علامات وتشبیہات اس نظم میں اس طرح توضیح مطلب کے لئے استعمال کی گئی ہیں کہ ان کی نظیر اردو میں نظر نہیں آتی-''[۱]

اس اقتباس سے تاثیر کی نظم نگاری کے نقوش واضح ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے اپنی نظم میں فطرت نگاری اور دیگر مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے- ان کا رنگ وآہنگ جدا بھی ہے اور منفرد بھی- تاثیر کی نظم ''سائے'' میں مغربی اثر ملاحظہ کیجئے-

ایسی راتیں بھی کئی گزری ہیں
جب تری یاد نہیں آتی ہے
درد سینے میں مچلتا ہے مگر
لب پہ فریاد نہیں آتی ہے
ہر گناہ سامنے آجاتا ہے
جیسے تاریک چٹانوں کی قطار
نہ کوئی حیلۂ تیشہ کاری
نہ مداوائے فرار
ایسی راتیں بھی ہیں گزری مجھ پر
جب تری رہگذر میں سائے

۱- آتشکدہ، ص-م

ہر جگہ چار طرف، تھے چھائے
تو نہ تھی، تیری طرح کے سائے
سائے ہی سائے تھے، لرزاں لرزاں

(سائے) [۱]

تاثیر نے یوں تو کئی نظموں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ ان کی نظموں کی خاص بات یہ ہے کہ طبعزاد معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی نظموں میں بھرپور جمالیاتی تاثر ملتا ہے۔ نظموں میں چاشنی اور رچاؤ نظر آتا ہے۔ مزاج کے اعتبار سے تاثیر نہایت شوخ اور بذلہ سنج واقع ہوئے تھے۔ ان کی نظم ''مگر ایک دل'' میں یہ تاثر ملاحظہ کیجئے، اس نظم میں اقبال کے اوائل کلام کا اثر پایا جاتا ہے ؎

یہ رنگ ہے کہ گل شرما گیا ہے نہیں شبنم پسینہ آ گیا ہے
نگاہیں ہیں کہ بجلی ہے کہ سیماب فلک بھی دیکھ کر چکرا گیا ہے
یہ ابھرا آ رہا ہے تیرا جوبن کہ طغیانی پہ دریا آ گیا ہے
بہار بے خزاں ہے تو سراپا
مگر اک دل ترا مرجھا گیا ہے

(مگر ایک دل) [۲]

تاثیر نے اپنی نظموں میں علامتوں اور تمثیلوں سے بھی کام لیا ہے مثلاً چند نظموں کے عنوان ملاحظہ کیجئے ''اگلے وقتوں کے شاعران کرام''، ''رس بھرے ہونٹ''، ''کارزار''، ''بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم''، ''سنہری دیا'' وغیرہ۔

تاثیر کی نظم ''دوراہا'' میں انسانی زندگی کی مختلف تصویریں کھینچی ہیں، جس میں سرمایہ دارانہ نظام، غربت، افلاس، ان سب کی کیفیات کو نظم میں پیش کر کے معاشرتی اور سماجی تصویروں کی نقاب کشائی کی ہے۔ نظم ملاحظہ کیجئے ؎

ریل گاڑی پہ یہ گھمسان، الٰہی توبہ!
نہ مروت، نہ تکلف، نہ تبسم نہ ادا
یونہی اک غیر شعوری سی خشونت کا خروش
بے ارادہ ہے تو کیا غیر شعوری ہے تو کیا
یہ نئے دور کے احساس غلامی کا ظہور
انتقامانہ تحکم کی نمود
خانہ جنگی ہی سہی
اس میں اک اظہار بغاوت بھی تو ہے
یونہی یونہی سہی
اک شائبہ داد شجاعت بھی تو ہے

۱- آتشکدہ، ص ۶۴

۲- آتشکدہ، ص ۳۹

یہ جو بندوں کے ہیں آقا مگر آقا کے غلام
باوفا ہوں تو ہوں بے دام نہیں!

(دوراہا) [۱]

شاعری میں آزاد نظم کو برتنے میں جو کمال تصدق حسین خالد، میرا جی اور ن-م-راشد نے دکھایا ہے، لیکن اس کے باوجود دین محمد تاثیر نے آزاد نظم میں فکر وخیال کی آمیزش سے نئے موضوعات سمو کر ہیئت و تکنیک میں گرانقدر اضافہ کیا- اقبال کی طرح انہوں نے بھی انگریزی نظموں کے ترجمے کر کے مغربی شاعری سے استفادہ کیا- تاثیر کی شاعری میں اقبال کی شاعری اور فکر کے روشن پہلو نظر آتے ہیں- اقبال کی فطری اور وطنی شاعری کے اثرات تاثیر کی شاعری میں واضح طور پر نمایاں ہوئے ہیں- اس کے علاوہ اقبال کے منظوم تراجم سے بھی استفادہ کرتے ہوئے تاثیر نے متعدد نظموں کے ترجمے کئے ہیں-

اختر الایمان:

اختر الایمان نظم اور نظم جدید کا وہ نمائندہ شاعر ہے جس نے شعری پیکر تراشنے میں نیا اسلوب وضع کیا اور وہ اسلوب انہی سے مخصوص ہے- نظم میں نئی جہتیں اور نئی فکر طرز نگارش کی آئینہ دار ہیں- ان کی نظموں میں تغزل نہیں بلکہ ڈرامائی اور محاکاتی انداز رقص کرتا نظر آتا ہے- احمد ہمدانی ان کی نظمیہ شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اختر الایمان پہلے شاعر ہیں جنہوں نے تغزل سے اپنا دامن بچائے رکھا اور اردو شاعری کو نظمیہ شاعری کی تازہ ترجہت سے روشناس کرایا-'' [۲]

اختر الایمان نے پابند اور آزاد دونوں میں طبع آزمائی کی ہے اور نہایت عمدہ نظمیں کہی ہیں- یہاں چند نظم آزاد کے نمونے، جس میں اقبال کی فکر تلاش کی گئی ہے، اختر الایمان کی نظم ''نہ مرنے والا آدمی'' ملاحظہ کیجئے:-

یہ مٹی بوئے خوں آتی ہے جس کے لالۂ وگل سے
یہی میری زمیں ہے میرا مولد میرا مدفن ہے
میں وہ قابیل ہوں جو لاش کاندھے پر لئے پھرتا ہے بھائی کی
ثمود و عاد کا وہ فرد ہوں جس پر فلک نے سنگ باری کی
میں وہ تاریخ کا پہلا ورق ہوں دست برد و جہد عالم سے
اچانک بچ گیا، سب کچھ رقم ہے ایک صفحے پر
میں لاشوں پر چلا ہوں خون کے دریا سے گزرا ہوں
مرا ورثہ ہے آنسو، بے کسی کی موت، بالا دست کا نشتر
میں نوحہ خواں ہوں آبائی مزاروں کا مجاور ہوں

۱- آتشکدہ، ص ۹۲

۲- نئی شاعری کے ستون، ص ۶۴

بہاروں کو کفن دیتا ہے جو وہ گور کن ہوں میں

(نہ مرنے والا آدمی)

اختر الایمان نے اپنی نظم ''نہ مرنے والا آدمی'' میں تلمیحات کا کثرت سے استعمال کیا ہے مثلاً لالۂ وگل، قابیل، ثمود و عاد۔
لالۂ گل...... سرخ رنگ کا پھول، قابیل...... حضرت آدمؑ کے پہلے صاحبزادے کا نام، ثمود و عاد...... پیغمبروں کے نام، جیسے اقبال نے تلمیحات باندھی ہیں مثلاً ؎

کچھ اس میں جوش عاشق حسن قدیم ہے
چھوٹا سا طور تو، یہ ذرا سا کلیم ہے

اقبال

اس شعر میں طور...... مشہور پہاڑ، جہاں حضرت موسیٰؑ اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوا کرتے تھے، کلیم...... حضرت موسیٰؑ کی مناسبت سے آیا ہے۔ اقبال کا یہ شعر دیکھئے جس میں منصور کی تلمیح باندھی ہے ؎

کیا نوائے اناالحق کو آتشیں جس نے
تری رگوں میں وہی خوں ہے، قم باذن اللہ

اقبال

منصور کو ہوا لب گویا پیام موت
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

اقبال

منصور کا ''نعرۂ اناالحق''، جس پر علماء نے کفر کا فتویٰ صادر کیا اور انہیں سُولی پر چڑھا دیا۔
اب اختر الایمان کی نظم کا یہ مصرعہ پڑھیے، جس میں اقبال کی فکر نمایاں نظر آتی ہے ؎

میں نوحہ خواں ہوں آبائی مزاروں کا مجاور ہوں

(منصور کا نعرۂ اناالحق)

اختر کی یہ نظم بہترین نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔
اختر الایمان کی نظم ''عذاب'' پر اقبال کی نظم ''جان وتن'' کے اثرات ملاحظہ کیجئے ؎

عقل مدت سے ہے اس پیچاک میں الجھی ہوئی
روح کس جوہر سے خاک تیرہ کس جوہر سے ہے
میری مشکل؟ مستی و شور و سرور و درد و داغ
تیری مشکل؟ مے سے ہے ساغر کہ مے ساغر سے ہے
ارتباط حرف و معنی؟ اختلاط جان و تن؟
جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے

(جان وتن) ضرب کلیم

اختر الایمان نے نئے اسلوب میں وہی بات دہرائی ہے، ملاحظہ کیجئے ؎

یہ جسم میرا نہیں ہے، تمام عمر مجھے
یہی خلش رہی، اور جسم ہے اگر میرا
تو روح میری نہیں، قید کر دیا ہے اسے
کسی اک ایسے بدن میں جو ہے قفس اس کا
یہ سال اور مہینے یہ دن گئے لمحات
اک ایسے کرب میں گزرے جو بے ثمر نکلا
مگر یہ میرا مقدر ہے اپنے آپ کو میں
عذاب جاں سہی، اس سے چھڑا نہیں سکتا

(عذاب)

اختر الایمان نے روح کے فلسفے کو کس احسن طریقے سے سمجھایا ہے- ان کی اس نظم میں فنا و بقاء کے اصول بھی ہیں اور جسم و روح کا ارتباط بھی- اقبال کے ہاں کچھ اس طریقہ سے آیا ہے ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

اقبال

عبدالرحمٰن اس شعر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یعنی دنیائے فانی میں بقاء کسی شئے کو نصیب نہیں اور اگر اس عالم کون و فساد میں کوئی چیز بالاستقلال باقی ہے تو وہ تغیر و انقلاب ہے- اقبال نے نہایت حسین و جمیل پیرائے میں ثابت کیا ہے کہ اگر بقاء کسی چیز کو حاصل ہے تو وہ خود قانون فنا ہے-'' [1]

احمد ظفر:

احمد ظفر نے اپنی نظموں میں مختلف تصویریں اجاگر کی ہیں، ان میں فطرت نگاری کے ساتھ وقت کو ''موسم'' کی علامت بنا کر پیش کیا ہے- نظم ''لخت لخت موسم'' میں اقبال کی نظم ''ہمالہ'' کے نقوش دیکھے جاسکتے ہیں- ڈاکٹر عبدالمغنی ''ہمالہ'' کی تصویر کشی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نظم کا ارتقائے خیال مسلسل ہے اور مختلف بندوں کے درمیان ایک ترتیب ہے، ساتھ ہی ہر بند کے مصرعے اور اشعار ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں- ہیئت کی اس تنظیم کے علاوہ استعارات و علامات اور کنایات و اشارات کا پورا نظام ہے- منتخب الفاظ وتراکیب کی نشست معنی آفریں بھی ہے اور نغمہ

۱- اشارات اقبال، ص۸۳

آفریں بھی، ان فنی کمالات سے کوہ ہمالہ کی ایک دلآویز اور فکر انگیز شاعرانہ وحقیقت پسندانہ تصویر رونما ہوتی ہے۔'' [1]

اس اقتباس کی روشنی میں احمد ظفر کی نظم ''لخت لخت موسم'' کا مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس طرح ''ہمالہ'' کے دامن میں پھولوں اور کلیوں کی تصویر دکھائی ہے اسی طرح احمد ظفر نے اپنی نظم میں مختلف تصویریں کھینچی ہیں، ملاحظہ کیجیے ۔

یہاں
پھر خزاں کے الاؤ میں جلنے لگا
گلستاں
پھول اور پتیاں
حدت مہر سے پھیلتا جا رہا ہے، دھواں
ہر طرف...... تیر موسم کے چلنے لگے
زندگی بن گئی زندگی کا ہدف
وہ لہو جو رگ و پے میں تھا
خاک پر جم گیا
منجمد جسم و جاں

(لخت لخت موسم)

ڈاکٹر وزیر آغا نے اقبال کی فطرت پرستی پر کچھ یوں اظہار خیال کیا ہے:

''مظاہر فطرت کی طرف اقبال کی پیش قدمی نے ان کے احساس جمال ہی کو صیقل نہیں کیا بلکہ ان کے احساس وسعت کی پیدائش اور نکھار میں بھی حصہ لیا ہے۔ دراصل آغاز کار ہی میں اقبال کو فطرت کے ان مظاہر نے خاص طور پر متاثر کیا ہے، جو اپنی عظمت، رفعت، دوری اور پرشور روانی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے مثلاً ان کے ہاں ''ہمالہ'' عظمت و رفعت کا مظہر ہے۔'' [2]

فطرت کی عکاسی کرنے والا شاعر احمد ظفر جب اقبال کے افکار سے استفادہ کرتا ہے تو اس کی فکر میں وہی الفاظ و تراکیب، وہی مناظر فطرت گردش کرنے لگتے ہیں۔ اقبال اور احمد ظفر میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ نظم کی ہیئت کا فرق ہے۔ احمد ظفر نے آزاد نظم میں اپنے خیالات کی ترسیل کی ہے۔ ان کی نظم ''برکھا سے پہلے'' پر اقبال کی نظم ''ابر کہسار'' کا اثر ملاحظہ کیجیے ۔

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا ابر کہسار ہوں گل پاش ہے دامن میرا
کبھی صحرا کبھی گلزار ہے مسکن میرا شہر و ویرانہ مرا، بحر مرا، بن میرا
کسی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھ کو
سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو

(ابر کوہسار) بانگ درا

۱۔ اقبال کا نظام فن، ص ۱۶۳

۲۔ نظم جدید کی کروٹیں، ص ۴۹

احمد ظفر کی نظم ''برکھا سے پہلے'' کا یہ حصہ دیکھئے جس میں اقبال کے افکار و خیالات نظر آئیں گے ۔

پھول گوندھنے والے ہاتھ
دلہنوں کے لئے سانپوں کے سروں کی مالا پرو رہے ہیں
بیر بہوٹیوں جیسے ہونٹ ، نیلے زہر کو
آخری بوسہ دے رہے ہیں
سروں پر جامنی آنچل اوڑھے سندریاں
پریت ریت کو مرتے مرتے گلے لگا رہی ہیں
یہ زرد موسموں کا اجنبی جنگل ہے

(برکھا سے پہلے)

احمد ظفر کی ایک اور نظم ''ثمر بے ثمر'' پر ''گل پژمردہ'' کا فکری آہنگ دیکھئے ۔

کس زباں سے اے گل پژمردہ تجھ کو گل کہوں ‏ ‏ ‏ کس طرح تجھ کو تمنائے دل بلبل کہوں
تھی کبھی موج صبا گہوارۂ جنباں ترا ‏ ‏ ‏ نام تھا صحن گلستاں میں گل خنداں ترا
تیرے احساں کا نسیم صبح کو اقرار تھا
باغ تیرے دم سے گویا طبلۂ عطار تھا

(گل پژمردہ) بانگ درا

احمد ظفر کی نظم آزاد ہیئت میں ہے، لیکن آہنگ اقبال کا ہے، ملاحظہ کیجئے ۔

جو ممکن ہو تو ہم بھی اس شجر کی شاخ کی مانند جھک جائیں
ثمر رنگین ہیں جس کے
ستاروں کی طرح شبنم کے موتی جس کے پتوں پر چمکتے ہیں
عروس شب کا آئینہ فضا میں جو دکھاتا ہے
سحر کی فاختہ جس پر کوئی نغمہ سناتی ہے
مگر کیسا شجر ہے یہ؟
نہ برگ و بار ہیں جس پر
پرندہ ہی نہ کوئی گھونسلہ جس پر بناتا ہے
سیہ بختی فلک کو چھو رہی ہے قد و قامت میں
جسامت میں قوی ہیکل
''شجر دونوں شجر ہیں ایک جیسے کیوں نہیں ہوتے''
ہوا سے پوچھتا ہوں میں!!
ہوا سرگوشیاں کرتے ہوئے مجھ کو بتاتی ہے
کہ انساں، سارے انساں ہیں......مگر

وہ ایک جیسے کیوں نہیں ہوتے؟

(ثمر بے ثمر)

نظم کو نئی علامات واشارات سے مزین کیا ہے۔ استعارات کا وہی نظام اپنایا گیا ہے جو ہمیں اقبال کی نظموں میں نظر آتا ہے۔ جدید نظم نگاری میں اقبال کے اثرات اور ان کے افکار و خیالات کے ساتھ احساسات و کیفیات کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

جمیل ملک:

ان کی نظموں میں عظمت انسانی کے علاوہ دیگر موضوعات پر عمدہ نظمیں ملتی ہیں۔ ان کا ہر موضوع تنوع اور وسعت لئے ہوئے ہے۔ لفظوں میں ایک قہرمانی قوت کارفرما ہے۔ اپنی قوت فکر سے الفاظ کو نیا معنوی لباس عطا کیا ہے۔ نظموں میں ایک گہرا رچاؤ اور زندگی سے مطابقت اور ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ اسلوب و بیان کے لحاظ سے جمیل ملک نے روایات سے رشتہ نہیں توڑا بلکہ تشبیہات و استعارات کی روشنی میں ایک ایسے سفر کی تلاش ہے جسے جدو جہد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ماضی اور مستقبل کے عکس کو بھی نظموں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جمیل ملک کی نظم آزاد'' کالی رات، چمکتا سورج'' کو علامتی انداز میں دیکھئے مثلاً کالی رات کو ماضی سے تعبیر کیا ہے اور چمکتا سورج کو مستقبل کی علامت قرار دیا ہے۔ اقبال نے اسی خیال کو اپنی نظم ''فلسفہ و مذہب'' میں پیش کیا ہے ؎

یہ آفتاب کیا یہ سپہر بریں ہے کیا
سمجھا نہیں تسلسل شام و سحر کو میں
اپنے وطن میں ہوں کہ غریب الدیار ہوں
ڈرتا ہوں دیکھ دیکھ کے اس دشت و در کو میں

(فلسفہ و مذہب) بال جبریل

جمیل ملک کی نظم ''کالی رات چمکتا سورج'' ملاحظہ کیجئے ؎

خواب تمہارے ماضی کی میراث ہوئے
کیوں خوابوں کے پیچھے بھاگتے پھرتے ہو!
ماضی تو ماضی ہوتا ہے
وہ کب لوٹ کے آتا ہے
حال سے تم کیسے آنکھیں دو چار کرو
حال کی راہوں پر چلنا تو انگاروں پر چلنا ہے
اور خود اپنے ہاتھوں سے
انگارے کون چباتا ہے

(کالی رات، چمکتا سورج)

اقبال کی شاعری کے موضوعات کا مطالعہ کریں تو ہمیں ایک آفاقی پھیلاؤ نظر آتا ہے۔ ان کے افکار کی پہنائی جس کی کوئی حد نہیں، اسی طرح جمیل ملک اپنی نظموں میں ان موضوعات کو زیر بحث لاتے ہیں جس میں کائناتی رنگ کے علاوہ انسان دوستی کا

جذبہ بھی نظر آتا ہے- ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اقبال کو آفاقی شاعر کہہ کر خراج تحسین پیش کیا ہے، لکھتے ہیں:

''اس عظیم شاعر کی شاعری، حکمت، پیغام، سیرت وشخصیت کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو بحث میں نہ آیا ہو اور جس کا ہر پہلو روشن نہ ہو گیا ہو-'' [1]

جمیل ملک کی نظموں کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں، جن پر اقبال کی فکر وفلسفہ کا گہرا اثر ہے، ''امر''، ''معصومیت''، ''پرکھ''، ''مشرق'' - ان عنوانات سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ جمیل ملک نے اقبال سے بہت کچھ لیا ہے- نظم ''مشرق'' پر اقبال کی نظم ''رام'' کے فکری اثرات ملاحظہ ہوں ؎

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند — سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رام ہند
یہ ہندیوں کے فکر فلک رس کا ہے ثمر — رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بام ہند

(رام) بانگ درا

جمیل ملک کی نظم ''مشرق'' ملاحظہ کیجیے ؎

پہاڑوں پہ یلغار کرتے ہوئے کالے بادل
درختوں سے دست وگریباں
کھلی وادیوں میں چھما چھم برستی ہوئی موسلا دھار بارش
گرج، رعد، طوفاں
مگر اب
نہ بادل نہ طوفاں
نہ شور قیامت
ہری وادیاں ڈھل گئی ہیں

(مشرق)

جمیل ملک کی نظم ''معصومیت'' ملاحظہ کیجیے ؎

کھلونے کھلونوں سے جب کھیلتے ہیں
تو ماں باپ کے دل انوکھی مسرت سے مل کر دھڑکتے ہیں
یوں لہلاتے ہیں
جیسے بھرے گھر میں رقصاں شگوفوں کی خوشبو سے ہر سو بہار آ گئی ہو
کھلی نیلی چھت پر
خدا اس طرح زیر لب مسکراتا ہے
جیسے کھلونوں کا یہ کھیل اس نے رچایا ہو
جیسے خدائی میں اس سے بڑی اور کوئی مسرت نہ ہو
جیسے انسان ویزداں کے دل

۱- خیابان اقبال، ص ۱۹۷

اس حسیں، جاوداں آرزو نے بہم کر دیے ہوں
کہ ان کے یہ نازک، سونے کھلونے ہمیشہ چہکتے رہیں، کھلکھلاتے رہیں
زندگی کے یہ خوش رنگ، شفاف چشمے سدا رقص کرتے رہیں، گیت گاتے رہیں

(معصومیت)

جمیل ملک نے کھلونوں کو انسان سے تشبیہہ دے کر اس دنیا کا نقشہ کھینچا ہے۔ انسان و یزداں کہہ کر یہ ثابت کیا ہے کہ انسان کی تخلیق ہی سے اس دنیا کو سجایا جاسکتا ہے۔ جب انسان سے دنیا آباد ہوگئی تو خیر وشر کا بازار گرم ہوا، تو اس پر خدا زیرلب مسکرا رہا ہے۔

''سرگزشت آدم'' میں اقبال نے یہی کچھ نقشہ کھینچا ہے کیونکہ انسان کی منچلی طبیعت جنت میں کیسے رہ سکتی تھی، اس مضطرب روح کو دنیا میں قرار آ سکتا تھا۔ دنیا میں آ کر انسان مختلف قبیلوں میں تقسیم ہوگیا۔ جو رنگ برنگ گل بوٹے کہلائے، جمیل ملک نے جو استعارے اور تشبیہات استعمال کی ہیں ان پر اقبال کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

احسان دانش:

احسان کی نظموں میں انقلابی وسماجی فکر بھی ہے اور مناظر فطرت پر بہترین نظمیں بھی۔ یہ ایک سچے محبِ وطن اور اپنی قوم سے بے پناہ محبت کرنے والے تھے۔ ان کی شاعری کے زیادہ تر موضوعات انسانی اقدار سے ہی اخذ شدہ ہیں۔ بیانیہ شاعری اور مرقع نگاری میں وہ منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ عمیق، مطالعہ وسیع، تجربات وحوادث اور تخیل کی پرواز ان عوامل کی آئینہ دار ہیں۔ احسان کے کلام میں شائستگی، سوز وگداز اور لہجے کی ملائمت، بیچارگی، اندوہ اور حسرت ہر شعر سے ٹپکتی ہے۔ شاعری میں نغمگی کے رچاؤ کے ساتھ نوحے کا دردست کر آ گیا ہے جو دلوں پر اثر کرتا ہے۔ مناظر فطرت کے حوالے سے کھیتوں، دریاؤں، صبح و شام کے منظر دلکش انداز میں پیش کئے ہیں۔ الفاظ وتراکیب پر قدرت رکھتے ہیں۔ روانی وسلاست بھی شاعری کا خاصہ ہے۔ وطن پرستی کے جذبے سے سرشار ہو کر جو نظمیں کہی ہیں ان میں اقبال کا سا انداز اور پرتو نظر آتا ہے۔ احسان کی نظم ''خیال وطن'' پر اقبال کی نظم ''تصویر درد'' کے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ اقبال کی نظم کا موضوع حب وطن ہے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی ''تصویر درد'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''خاص کر شاعر چونکہ وطن دوست ہونے کے ساتھ ساتھ دین پسند بھی ہے لہذا اس کا موقف ہے کہ وہ دونوں کے درمیان عصر حاضر کے دوسرے بہتیرے دانشوروں برخلاف کوئی تضاد محسوس نہیں کرتا۔ اسی بصیرت کی دین وہ اعتماد ہے جس کی بناء پر اقبال اپنے وطنی اور دینی دونوں بھائیوں کی کم عقلی و بے عملی پر تنقید بھی کرتے ہیں اور انہیں فکر وعمل کی تلقین بھی کرتے ہیں۔'' [1]

۱۔ اقبال کا نظام فن، ص ۲۰۵

اقبال کی نظم ''تصویر درد'' طویل نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

اڑا لی قمریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری

(تصویر درد) بانگ درا

احسان دانش کی نظم ''خیال وطن'' ملاحظہ کیجیے ؎

یہ ہوائے مشک پرور یہ بہار آئی ہوئی
میرا یہ عالم طبیعت غم سے گھبرائی ہوئی
اشکباری کی طرف مائل ہوا جاتا ہے دل
درد سا اٹھتا ہے سینے میں بھرا جاتا ہے دل
غم کی تاریکی میں ہے تنویر مہتاب وطن
دیکھتا ہوں عین بیداری میں اک خواب وطن
گھلتی جاتی ہے فضاؤں میں سیاہی کیا کروں
روح پر رقت سی طاری ہے الٰہی کیا کروں
مضمحل رستے وطن کے آرزو کرتے نہ ہوں
آ کے آبادی میں میری جستجو کرتے نہ ہوں
کاش اس قابل کرے مجھ کو وہ رب ذوالجلال
کھنچ سکے ایسی مرے خامہ سے تصویر خیال

(خیال وطن) [1]

احسان کی ایک اور نظم ''سخن پارہ'' پر اقبال کی نظم ''شمع'' کا واضح اثر ملاحظہ کیجیے ؎

غروب مہر گردوں پر شفق، چپ چاپ ویرانہ
زبان شام پر ہے دن کی ناسازی کا افسانہ
رواں ہے اس طرح مزدور گھر کی سمت جنگل سے
کھنچا جاتا ہے جیسے شمع کے جلووں میں پروانہ
تہی آنکھیں، تہی سینہ، تہی کیسہ، تہی دامن
سلگتا آتش شب رنگ سے راحت کا کاشانہ
پھٹے کرتے کی ہلتی دھجیاں ٹھنڈی ہواؤں میں
زبان حال سے کہتی ہوئیں عسرت کا افسانہ
تصور بال بچوں کا، تفکر اپنی روزی کا
قدم دھندلی سی بٹیا پر، تخیل میں الم خانہ
پھٹی دستار کا ہر تار ہے عنوان مجبوری
برہنہ پاؤں کا ہر نقش ہے نکبت کا افسانہ

(سخن پارہ) [2]

احسان دانش کی نظم ''کسان'' پر اقبال کی نظم ''خضر راہ'' میں ''سرمایۂ محنت'' بند کے اثرات ملاحظہ ہوں ؎

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

(خضر راہ) بانگ درا

احسان دانش کی نظم ''کسان'' ملاحظہ کیجیے ؎

فضا ویران ہے گرمی کی شدت ہے زمانے میں
مگر مصروف ہیں بیچارے دہقاں ہل چلانے میں

۱- نفیر فطرت، ص ۲۱۴

۲- چراغاں، ص ۴۰

یہ انساں مچھلیاں ابھری ہوئی ہیں جن کے شانوں پر
ہے مہر آدمیت ان کی زریں داستانوں پر
یہی دہقاں چلاتے ہیں جو ہل بنجر زمینوں میں
چراغ آرزوؤں سے دل ہیں روشن ان کے سینوں میں
یہ وہ انساں ہیں دامان مشقت میں جو پلتے ہیں
جہاں سوتا ہے اور یہ آبیاری کو نکلتے ہیں
ابھی ہوتا نہیں کچھ ''ہو حق'' پارساؤں میں
جدا بچوں سے ہو جاتے ہیں یہ تاروں کی چھاؤں میں
یہاں آتی ہیں لے کر قسمتیں کاسہ گدائی کا
جہاں محتاج ہے ان کے پسینے کی کمائی کا
انہیں کے بازوؤں سے ہیں بہاریں گلستانوں کی
انہیں کے دم سے ہے تعلیم جاری نوجوانوں کی

انہیں فاقوں سے گھبرائے ہوؤں میں پارسائی ہے
انہیں ڈوبے ہوؤں کے دم سے زندہ ناخدائی ہے

(کسان)[۱]

احسان دانش کی حسیت اس انتہا کو پہنچی ہوئی ہے جہاں غریب کے دکھ درد کا احساس اور ان مصائب و آلام کا ذکر نظموں میں ہوا ہے- اس کا اظہار سبک روی اور دردمندول کے ساتھ کیا ہے- احسان کی شاعری عوامی شاعری ہے- اقبال نے عالمگیر انسان کی بات کر کے موضوع کو وسیع کر دیا- احسان دانش نے اقبال سے انسانیت کا درد لے کر نظموں کا موضوع بنا دیا- بہترین اور کامیاب نظمیں کہی ہیں، جو آج بھی ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں-

مجید امجد:

جدید شاعری میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں- ان کی نظموں میں درمیانی طبقہ کی ترجمانی کی گئی ہے- زندگی کے مختلف پہلوؤں اور حالات پر فکر کرنا ان کا خاصہ ہے-نظموں میں تہذیبی عوامل،، سماجی عدم مساوات اور بے انصافی کو اجاگر کیا ہے- نئے نئے موضوعات کو نظموں میں سمیٹا ہے جو جدیدیت کا آئینہ دار ہیں- ان کی نظموں میں اقبال کے آہنگ کا سراغ ملتا ہے-نظموں میں غزل کی چاشنی اور خطیبانہ انداز اقبال سے اخذ کیا ہے- ڈاکٹر محمد حسن مجید امجد کی نظم نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''عام طور پر وہی خیالات اور جذبات نظم کیے گئے جو غزل کا موضوع بنتے آئے تھے- جنہوں نے اس سے آگے قدم بڑھایا انہوں نے بھی غزل کی اصطلاحوں اور اس کی زبان سے مدد لی- خود اقبال نے بھی اس طریقے کو اختیار کیا- ایلیٹ کی اصطلاح میں ہمارے ہاں شاعری کی ''دو آوازیں'' ہی ابھری تھیں- ایک خود کلامی کی آواز جس میں شاعر کا تخاطب اپنی ذات سے ہوتا ہے اور دوسری خطیبانہ آواز جس میں اس کا براہ راست تخاطب دوسروں سے ہوتا ہے لیکن شاعری کی ایک تیسری آواز بھی ہے جس میں شاعر زندگی کے نمائندہ مظاہر کو ڈرامائی یا افسانوی معنویت کے ساتھ پیش کرتا ہے اس کے لئے واقعات کا تانا بانا بنتا ہے، کردار تراشتا ہے، منظر کشی کرتا ہے اور علامتیں

۱- نفیر فطرت، ص ۸۶

اور استعارے ڈھونڈ کر لاتا ہے۔'' [۱]

اس پیراگراف کی روشنی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مجید امجد کی نظموں پر اقبال کی خطابیہ نظموں کا اثر ہے مثلاً اقبال کی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' ڈرامائی طرز پر ہے۔ اس کے علاوہ ''بانگ درا'' کی متعدد نظمیں، جو ابتداء میں لکھی گئی ہیں، ان میں ڈرامائی انداز ملتا ہے۔

مجید امجد کی نظم ''جلوس جہاں'' پر اقبال کا خطابیہ انداز ملاحظہ کیجئے ۔

میں پیدل تھا، میرے قریب آ کے اس نے، بہ پاس ادب، اپنے تانگے کو روکا،
اچانک جو بجریلی پٹڑی پہ سم کھڑکھڑائے، سڑک پر سے پہیوں کی آہٹ پھسل کر جو ٹھہری،
تو میں نے سنا، ایک خاکستری، نرم، لہجے میں، مجھ سے کوئی کہہ رہا تھا،
چلیں گے،، کہیں، آپ؟ بازار منڈی، اسٹیشن، کچہری؟،
پلٹ کر جو دیکھا، تو تانگے میں کوئی سواری نہیں تھی، فقط اک فرشتہ، پھٹے کپڑے پہنے،
عنان دو عالم کو تھامے ہوئے تھا!
یہ لطف کریمانہ خوش دلاں بھی، یہ پر غیظ خوئے سگاں بھی،
مرے ساتھ، رو میں ہیں۔ لوگوں کے جتنے رویے، یہ سب کچھ، یہ سارے قضیے،
غرض مندیاں، ہی غرض مندیاں ہیں...... یہی کچھ ہے اس رہگزر پر متاع سواراں
میں پیدل ہوں، مجھ کو جلوس جہاں سے انہی ٹھوکروں کی روایت ملی ہے

(جلوس جہاں)

مجید امجد کی نظم ''موجودگی'' میں اقبال کی تراکیب لفظی کے ساتھ محاکات سے بھی کام لیا ہے، نظم ملاحظہ کیجئے ۔

پھر آج دل میں کوئی موج غم مچلتی ہے
شب خیال میں قندیل عود جلتی ہے
پھر اک ادائے حجاب
رسوم دہر کی زنجیر اتار آئی ہے
بہار آئی ہے
رسوم دہر کی اس سنگدل فصیل کے پار
گداز سینوں کی مخمور دھڑکنوں کے دیار
محبتوں کے سراب
کہ جن کو تیر کے آتی ہے پائلوں کی جھنک
مرے دکھے دل تک

(موجودگی)

تراکیب لفظی ملاحظہ کیجئے، شب خیال میں قندیل عود، رسوم دہر کی زنجیر، مخمور دھڑکنوں کے دیار، محبتوں کے سراب۔

۱۔ شناسا چہرے، ص ۱۰۹

ضیاء جالندھری:

اردو نظم کا یہ دور جدیدیت کا دور کہلاتا ہے- وہ اس لئے کہ ہیئت اور تکنیک نے نظم کا چولہ ہی بدل ڈالا- آزاد نظم میں قلبی واردات کے ساتھ جذبہ و احساس کا شعور بھی ملتا ہے- ضیاء جالندھری نے اقبال سے مناظر فطرت پر منظر کشی اخذ کی ہے مثلاً ''سورج'' نظم پر اقبال کی نظم ''نوید صبح'' کی منظر کشی ملاحظہ کیجئے ؂

آتی ہے مشرق سے جب ہنگامہ در دامن سحر   منزل ہستی سے کر جاتی ہے خاموشی سفر
محفل قدرت کا آخر ٹوٹ جاتا ہے سکوت   دیتی ہے ہر چیز اپنی زندگانی کا ثبوت
چہچہاتے ہیں پرندے پا کے پیغام حیات   باندھتے ہیں پھول بھی گلشن میں احرام حیات

مسلم خوابیدہ اٹھ! ہنگامہ آراء تو بھی ہو
وہ چمک اٹھا افق گرم تقاضا تو بھی ہو

(نوید صبح) بانگ درا

اب ضیاء جالندھری کی نظم ''سورج'' ملاحظہ کیجئے ؂

شانوں پہ سفید لٹیں بکھرائے
اک پھٹی پرانی شال بدن سے لپٹائے
سانسوں کی بھاپ سے ٹھٹھری پوریں تاپ تاپ کے
آنکھوں کے حلقے سکیڑے
ملگجے دودھیا دھاگوں سے
روئی کی اجلی رضائی میں
ٹھہر ٹھہر کے ٹکندے ڈالتا جاتا ہے
کبھی کبھی رک کر
اک خواب سا دیکھنے لگتا ہے
ننھی ننھی کلیاں
شبنم کے شلوکے پہنے
شاخوں کی رگوں، مٹی کی تہوں سے نکل آتی ہیں

(سورج)

ضیاء جالندھری کی نظم میں اقبال کی سی تلمیحات اور تشبیہات و استعارات کا نظام ملاحظہ کیجئے ''ایک مجسمہ'' میں حضرت موسیٰ کی طرف اشارہ کیا ہے- ضیاء جالندھری نے ذکر طور و کلیم اور بنی اسرائیل کے واقعات کو قلمبند کیا ہے- اقبال کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؂

کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثل کلیم
اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی

(اقبال)

ضیاء جالندھری کی نظم ''ایک مجسمہ'' پر اقبال کی تلمیحات ملاحظہ کیجیے ۔

لوحِ احکام ہوئی ایک ہی جھٹکے میں دولخت
دیکھا جاتا نہ تھا پیغمبر سینا کا جلال
لب سفید، آنکھیں تپاں، رخ سے عیاں صدمۂ سخت
اور ان آنکھوں سے ابلتا ہوا اک قہر عظیم
شعلہ در شعلہ رواں سوئے بنی اسرائیل
تم وہ بخت کہ ٹھکراتے ہو عرفاں کی سبیل
بے اثر تم پہ ہر اک معجزہ و حرف و دلیل
کہ اس انسان کی گمراہی وہی ہے کہ جو تھی
لاکھ سقراط اسے راستہ دکھلاتے رہیں
اس کی قسمت میں وہی تیرہ شبی ہے کہ جو تھی
لاکھ موسیٰ یہاں خورشید بکف آتے رہیں

(ایک مجسمہ)

تراکیب لفظی اور تلمیحات ملاحظہ کیجیے، پیغمبر سینا، بنی اسرائیل، عرفاں کی سبیل، معجزہ و حرف و دلیل، سقراط...... مشہور فلسفی، حصرت موسیٰؑ ...... یہ وہ اثرات ہیں جو اقبال سے جدید شاعری میں منتقل ہوئے۔

آفتاب اقبال شمیم:

جدید اردو نظم کے ارتقاء میں آزاد نظم نے جو حصہ لیا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال نے حالی کے بعد ہندوستان کی سماجی اور معاشی حالت کو شدت سے محسوس کیا۔ اقبال نے مختلف موضوعات کے پیش نظر ایسی جاندار اور کامیاب نظمیں لکھیں جس میں زندگی اور معاشرت، تصوف اور مذہب، ملا اور مکتب جہاں بھی کمزوریاں نظر آئیں بغرض اصلاح نظمیں لکھیں۔ ان نظموں کے بعد کے شعراء پر جو اثرات مرتب ہوئے، ان نظموں میں اقبال کی ہمہ جہت فکر اور فلسفہ کا بڑا دخل ہے۔ دور اول میں اقبال کی جو نظمیں ''مخزن'' میں ترجمے کی شکل میں شائع ہوئیں ان نظموں کے اثرات بھی شعراء نے قبول کیے ہیں۔

''مخزن'' میں منظوم ترجموں سے بھی ہیئت اور اسلوب کے نئے رجحان سامنے آئے۔ عہد حاضر کے جدید شعراء میں آفتاب شمیم ایک معتبر نام ہے۔ ان کی نظموں میں تصوف اور سیاسی و سماجی شعور کی بازگشت دکھائی دیتی ہے۔ یہ طرز ادا انہوں نے اقبال سے اخذ کیا ہے۔ ان کی نظم ''سنگ بے حیا'' پر اقبال کی نظم ''صدائے درد'' کے اثرات سیاسی و سماجی تناظر میں دیکھے جا سکتے ہیں،

نظم ملاحظہ کیجئے ؎

قید خانے کی دیوار پر انگلیوں کے نشاں
ناخنوں کی خراشیں
سزا یافتہ مجرموں کی شب و روز سر پھوڑنے کی صدا
تیس برسوں سے رکی ہوئی سانس
سینے میں سولی کی مانند لٹکی ہوئی
اور آنکھوں سے جلتے ہوئے دائرے سے نکلنے کی
ممنوعہ سڑکوں پہ پھرنے کی خواہش کا
تاوان...... ہر سوچ کی بے مرادی
بگولے کی زنجیر کو خار و خس توڑ سکتے نہیں
نینوا کے اندھیرے کنویں، دل کے پاتال میں
کوئی برسوں سے گرتی ہوئی چیخ
ہاروت و ماروت کو چھو کے لوٹی نہیں

(سنگ بے حیا)

اس جدید رنگ میں بھی شاعر نے اقبال کی فکر اور تلمیحات کو پیش نظر رکھا مثلاً نئی تراکیب، سینے میں سولی، بگولے کی زنجیر، جلتے ہوئے دائرے، نینوا کے اندھیرے کنویں، ہاروت و ماروت، اقبال نے ان فرشتوں کو اپنی نظم میں بطور تلمیح استعمال کیا ہے۔ ہاروت و ماروت یہ وہ فرشتے ہیں جو قدرت کی طرف سے معتوب کئے گئے، سزا کے طور پر قیامت تک دیوار چاٹتے رہیں گے، ان کا جرم زہرہ پر عاشق ہونا تحریر کیا گیا ہے۔

آفتاب اقبال شمیم کی ایک اور نظم ''نیلی گرد کا زمزم'' ملاحظہ کیجئے، اس نظم میں علامتی اور استعاراتی نظام اقبال سے متاثر ہونے کی دلیل ہے ؎

میں تخیل کے تشدد کا شکار
دیکھتا ہوں آسماں سے سایہ سایہ چیتھڑے گرتے ہوئے
سن رہا ہوں
پھڑ پھڑاتی دھوپ کی پیلی صدا
درد کی بوڑھی چڑیلیں
آنکھ کے صحرا میں اپنی ریتلی آواز میں سب کو پکاریں
آؤ آؤ
میں اکیلا اپنے سناٹے میں گرد و پیش کے آشوب میں کھویا ہوا
چل رہا ہوں
راستے کے سنگریزے آنکھ سے چنتے ہوئے

تا کہ پتھرائی ہوئی صرصر کی سڑکیں، رفتہ رفتہ میرے پاؤں چاٹ لیں
چل رہا ہوں
جانے کس جانب مجھے جانا ہے، کیوں جانا ہے
شاید فاصلوں کی انتہا افتادگی ہے

(نیلی گرد کا زمزم)

نظم میں احساس فکر وفن آب وتاب سے نظر آ رہا ہے، نئی تراکیب اور استعارات ملاحظہ ہوں، تخیل کے تشدد کا شکار، پھڑ پھڑاتی دھوپ، درد کی بوڑھی چڑیلیں، آنکھ کے صحرا، صرصر کی سڑکیں، ان تراکیب اور استعارات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال نے شاعری کو جو نیا رخ عطا کیا تھا بعد کے شعراء نے اسے بہت آگے تک کامیابی کے ساتھ پہنچا دیا ہے۔ آفتاب اقبال شمیم جدید شاعری کا ایک اہم ستون ہیں۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری:

جدید اردو شاعری میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کی شہرت کا دارومدار گیتوں اور نظموں پر ہے۔ حفیظ جالندھری براہ راست اقبال سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی نظموں میں اقبال کی فکر، فلسفہ اور تصوف کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔ اقبال اور چکبست کی قومی اور وطنی شاعری نے حفیظ کو خاصہ متاثر کیا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ منظوم تاریخ اسلام ہے جو ''شاہنامۂ اسلام'' کے نام سے ہے۔ حفیظ کے دیگر مجموعے جن کے پڑھ لینے سے ہم بخوبی افکار وخیالات تک پہنچ سکتے ہیں۔ ''نغمۂ زار''، ''تلخابۂ شیریں''۔ حفیظ دراصل مذہب، قوم اور وطن کی بات کرتے ہیں۔ ان کی ایک نظم ''اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے'' اتنی مشہور ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ ایک اور نظم ''فرصت کی تمنا میں'' اقبال کی نظم ''انسان'' ہیئت اور اسلوب کے لحاظ سے ملاحظہ کیجئے ؎

قدرت کا عجب یہ ستم ہے
انسان کو راز جو بنایا — راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بیتاب ہے ذوق آگہی کا — کھلتا نہیں بھید زندگی کا
حیرت آغاز و انتہا ہے
آئینے کے گھر میں اور کیا ہے

(انسان) بانگ درا

حفیظ کی نظم ملاحظہ کیجئے ؎

یوں وقت گزرتا ہے — فرصت کی تمنا میں
جس طرح کوئی پتا
بہتا ہوا دریا میں
ساحل کے قریب آ کر
چاہے کہ ٹھہر جاؤں

اور سیر ذرا کر لوں اس عکس مشجر کی
جو دامن دریا پر زیبائش دریا ہے
یا باد کا وہ جھونکا
جو وقف روانی ہے

(فرصت کی تمنا میں)

اقبال کے بعد زبان میں جو وسعت پیدا ہوئی ہے اس کا اندازہ عہد حاضر کے شعراء کی نظموں سے لگایا جاسکتا ہے کیونکہ زبان ایک ارتقائی عمل ہے- اگر یہ جامد ہو جائے تو پھر زبان ناقص ہو کر رہ جاتی ہے- ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری زبان کے ارتقاء کے بارے میں لکھتے ہیں:

''زبان ارتقاء کی پابند ہے- الفاظ بے جان نہیں بلکہ زندہ ہیں گو منطق کے قواعد لاتبدیل ہیں لیکن تصورات بمرور وقت تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور چونکہ تصور کے زبان سے ادا کرنے کا نام ہی لفظ ہے- الفاظ بھی تغیر کا تقاضا رکھتے ہیں- اگر یہ تجدید عہد بہ عہد نہ ہوتی رہے تو زبان کہنہ اور پارینہ ہو جائے زبان کی تجدید مذہبی یا تمدنی اصلاح سے آسان نہیں جس طرح رواج پر غالب آنا مشکل ہے، محاورے کا مٹانا بھی مشکل ہے، بہت سے ادیب اس نکتے سے غافل ہیں-'' [1]

اس اقتباس کی روشنی میں اقبال کے کلام کو پرکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے زبان کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا- پروفیسر سید عابد علی عابد اقبال کے صنائع لفظی و معنوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اقبال کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے صنائع لفظی و معنوی سے اس طرح کام لیا ہے کہ پڑھنے والے کی توجہ مطالب و مفہوم کی طرف رہتی ہے- اقبال کے کلام میں کم و بیش تمام صنائع معنوی بڑی ہنرمندی اور چابکدستی سے استعمال ہوئی ہیں لیکن تضاد، حشو ملیح، مراعات النظیر، حسن تعلیل، ایہام، تضاد اور ایہام تناسب سے انہوں نے زیادہ کام لیا ہے کہ ان کی مدد سے معانی کی تمام دلالتیں روشن ہو جاتی ہیں-'' [2]

حفیظ جالندھری نے زبان کا استعمال اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ اقبال کے بعد اگر کوئی شاعر جس نے اردو، فارسی، عربی، ہندی کثرت سے استعمال کئے ہیں تو وہ حفیظ جالندھری ہیں- حفیظ اور اقبال میں ایک خاص مماثلت ذہنی بھی ہے- کیونکہ اقبال مذہبی فکر رکھتے تھے، دوسرے انہیں وطن سے بے پناہ محبت تھی اور مسلمان قوم کی بدحالی پر پریشان اور فکر مند رہتے تھے- ان تمام افکار کو آگے بڑھاتے ہوئے حفیظ نے ''شاہنامہ اسلام'' لکھ کر اسلاف کی تاریخ دہرائی ہے-

اقبال کی نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' جو کہ ترکیب بند میں ہے، اسی طرح حفیظ نے مختصر سی نظم ''والدہ کی موت'' عنوان سے کہی ہے، ملاحظہ کیجئے ~

اے کہ جینا تھا تجھے بھی ناگوار اے کہ تو مدت سے تھی زار و نزار

۱- محاسن کلام غالب، ص ۱۰

۲- شعر اقبال، ص ۵۶۸

مل گئی مٹی میں تو پایان کار بن گیا ہے آج تیرا بھی مزار
فکر تھی تجھ کو بہت اولاد کی
راہ لی آخر عدم آباد کی
موجہائے اشک میں بہتی رہی رفتگاں کی یاد میں رہتی رہی
دائمی ماتم کے دکھ سہتی رہی جلد مر جاؤں گی یہ کہتی رہی
آج فرصت ہوگئی ہر کام سے
سو، لحد میں سو، بڑے آرام سے

(والدہ کی موت)

اقبال نے اپنے استادمحترم ''آرنلڈ کی یاد میں'' نظم کیا لکھی ہے، درد وکیف اور جذبات امڈ کر آ گئے ہیں- اسی طرح حفیظ نے اپنے استادمحترم حضرت مولانا گرامی کی وفات پر ''غروب آفتاب سخن'' کے عنوان سے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے- اس نظم میں بھی اقبال کے اثرات کو دیکھا جاسکتا ہے ؎

صبح کے ساحل سے جو کشتی چلی تھی نور کی
آخر کار اس نے طے کر لی مسافت دور کی
شکر ہے دریائے ہستی کا کنارا مل گیا
بے سہارا حسرتوں کو اک سہارا مل گیا
اس مسافر کے لئے منزل ہے ساحل شام کا
کٹ گیا لمبا سفر وقت آگیا آرام کا
آرزو نے پاؤں پھیلائے ہیں سونے کے لئے
ولولے بے تاب ہیں آسودہ ہونے کے لئے
اب یہ محشر خواب کے طوفان میں کھو جائے گا
نیند آ جائے گی چپ ہو جائے گا سو جائے گا
شام نے کچھ اس طرح پھیلا دیا ہے دام خواب
موت کی تاریکیوں میں گھر گیا ہے آفتاب
نور کے شعلے کو یہ کالا کفن پہنائیں گے
پھر اٹھا کر پردۂ ظلمات میں لے جائیں گے

(غروب آفتاب سخن)

پروفیسر منظور حسین شورؔ:

شور صاحب نے شاعری کی ابتداء غزل سے کی لیکن علی گڑھ کی فضا اور مشاعروں نے انہیں نظم کی طرف راغب کر دیا-

جاں نثار اختر، مجاز، جوش، اختر الایمان، سردار جعفری اور دیگر شعراء نظم میں اظہار خیال کر رہے تھے- شور صاحب اقبال سے بے حد متاثر تھے- اس بات کا اندازہ ان کی نظمیں اور عنوانات سے لگایا جاسکتا ہے- عالمگیر انسانیت، سماج، انسان، انقلاب، جبر مشیت، تضاد آدم، جمالیات اور فطری مناظر پر بہترین نظمیں اور موضوعات کا گنجینہ فراہم کیا-

شور کی نظموں میں رعنائی خیال، لطافت افکار، طرز ادا کی ندرت، سبک پن، ذہنی افق اور تفکر کی سطح کو دیکھا جاسکتا ہے- سادہ بیانی کی سحر انگیزی نے جو معجزاتی شکل اختیار کی ہے، وہ نظموں میں نمایاں ہے- شور کی نظم ''زہر خند'' پر اقبال کی نظم ''تصویر درد'' کی تراکیب لفظی اور آہنگ ملاحظہ کیجئے ؎

پھوٹ کر جس میں سویرے کی کرن ڈوب گئی
خون ارباب وطن تھا، مجھے معلوم نہ تھا
میرے سورج کا اجالا، میری صبحوں کا فروغ
میرے ماتھے کی شکن تھا، مجھے معلوم نہ تھا
وقت کے ساز میں، آزادی افکار کا گیت
فتنۂ دار و رسن تھا، مجھے معلوم نہ تھا
میں قفس سے بھی جو نکلا تو قفس کے باہر
دام نسریں و سمن تھا، مجھے معلوم نہ تھا
سحر لالہ و نسرین وسمن کا انجام
ظلمت دشت و دمن تھا، مجھے معلوم نہ تھا
میں کہاں، اور کہاں سلسلۂ دار و رسن
میرا قاتل، میرا فن تھا، مجھے معلوم نہ تھا

(زہر خند)

سورج کا اجالا، صبحوں کا فروغ، فتنۂ دار و رسن، دام نسریں و سمن، لالہ و نسریں و سمن، یہ سب تراکیب جو شور نے استعمال کی ہیں، ہمیں اقبال کے فکری آہنگ اور صنائع لفظی کا پتہ دیتے ہیں-

اقبال کی طویل نظمیں، جن میں تصویر درد، شمع و شاعر، خضر راہ، طلوع اسلام، والدہ مرحومہ کی یاد میں، شکوہ، جواب شکوہ، مسجد قرطبہ وغیرہ ہیں، اسی طرح شور کی طویل نظموں کے عنوانات ملاحظہ کیجئے، یہ نظمیں ''صلیب انقلاب'' ان کے مجموعۂ کلام میں ملیں گی مثلاً فتنۂ لوح و قلم، خون آفتاب، فرعون کی سرزمین، شعلۂ شاداب، آشوب حرم، آدمی نامہ، خدا کا آخری فرمان، جبر مشیت، یہ وہ طویل نظمیں ہیں جنہیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شور، اقبال سے کس حد تک متاثر تھے- انسانی اقدار اور سماج کی عکاسی اقبال کے بہترین موضوعات تھے، اسی طرح شور نے اقبال کے اثرات قبول کرتے ہوئے نظم ''دولت کی کبریائی'' میں اقبال کی تقلید کا اظہار کیا ہے، نظم ملاحظہ کیجئے ؎

میرے ناسوروں سے چھلنی سینۂ مصر و عجم ‏ مرہم حج و زیارت، زخم دینار و درم
میرا اعجاز خلاف کھیتوں کا عرض وطول ‏ سیم و زر میرے نبی، لعل و گہر میرے رسول
معبد و ہیکل کی نورانی جبینوں پر خراش ‏ میرے ناخن سے کلیساؤں کے سینوں پر خراش

نخوتیں میری وراثت، عشرتیں میری برات ساغر و مینا کی صبحیں، عارض و گیسو کی رات
میر و سلطان و وزیر و کج کلاہ و تاجدار میرے فتراکوں کے آہو، میرے تیروں کے شکار
عارف و صوفی، میرے گم کردہ منزل راہگیر میری محرابوں میں دل میری ہی طاقتوں میں ضمیر
(دولت کی کبریائی)

اقبال کے ہاں تلمیحات واشارات کا ایک مربوط نظام ملتا ہے، شور نے اسے اپناتے ہوئے نظم کے دامن کو نت نئی تراکیب اور تلمیحات سے وسعت عطا کی ہے- تراکیب اور تلمیحات ملاحظہ کیجئے، مراہم حج وزیارت، سینۂ مصر وعجم، سیم وزر میرے نبی، کلیساؤں کے سینوں پر خراش، معبد وہیکل کی جبینوں پر خراش، میرے فتراکوں کے آہو، عارف وصوفی، طاقتوں میں ضمیر- ان تراکیب سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ شور کی نظموں میں اقبال کی فکری بصیرت بازگشت کرتی نظر آتی ہے-

شور اپنی شاعری کے متعلق ''ذہن وضمیر'' میں انسانی اقدار پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خلاق عالم کی زمین پر ''آزادی'' آدم کی اولاد کا پیدائشی اور بین الاقوامی ورثہ ہے اور انسانی وحدت کے اس مقدس قانون کے تحت، نفس کی تہذیب، اخلاق و مروت، باہمی بھائی چارہ، عدل وانصاف، خیر وخلوص اور ایثار وانسان نوازی نہ کسی خاص قوم کا اجارہ ہے، نہ کسی مخصوص طبقے کی میراث، اس ابدی اور اٹل سچائی کی بنیاد پر انسانیت عظمیٰ کو نہ رنگ ونسل، نہ قومیت ووطنیت یا مذہب وسیاست کی آہنی زنجیروں میں جکڑا جاسکتا ہے، نہ کسی جغرافیائی حدود میں قید کرکے رکھا جاسکتا ہے-''[۱]

شور کا ایک شعر ملاحظہ کیجئے، جو اقبال کی فکر کا آئینہ دار ہے ؎

نیکی کا وطن چین نہ تاتار نہ ہند سیرت کے لئے شرط نہیں رنگ و نسب

اب اقبال کا شعر اسی روشنی میں ملاحظہ کیجئے ؎

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی گھر میرا نہ دلی، نہ صفاہاں نہ سمرقند

شور نے اپنے پیغام میں انسانیت ہی کو اولیت دی ہے، دو شعر ملاحظہ کیجئے ؎

انسانیت کو کر کے حدود وطن میں قید
دیوار چین و سرحد ہندوستان نہ دیکھ
میں شاعر حیات ہوں میرا پیام سن
میری زمیں نہ دیکھ مرا آسماں نہ دیکھ

شور کا شجرۂ شاعری بالواسطہ اور بلاواسطہ اقبال کی نظم نگاری سے ملتا ہے- ان کی نظموں میں احساسات اور جذبات جو انسانی اقدار کے حوالے سے ہیں اور وہ نظمیں جن میں فطرت کی عکاسی اور روح عصر کا درد وکرب خاص وصف کے ساتھ نظر آتا ہے- اس لئے شور کی شاعری کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی نظموں میں تاریخی پس منظر، ادبی رچاؤ اور فن پر گرفت نمایاں ہے- شور حال ہی کا نہیں مستقبل کا بھی شاعر ہے کیونکہ شور کا ہاتھ کائنات کی نبض پر بھی ہے-

---

۱- ذہن وضمیر، ص ۱۰

ادیب سہیل:

ہماری قدیم شاعری میں تغزل یا پھر متصوفانہ رنگ کی بہتات نظر آتی ہے، جسے ہم داخلیت کا اظہار کہتے ہیں لیکن جدید شاعری میں خارجیت اور مشاہدۂ فطرت پر خاص توجہ دی گئی- ادیب سہیل کی نظموں میں جو خاص بات ہمیں ملتی ہے وہ ذات و کائنات کے مختلف رنگوں کو دانش حاضر کی چکاچوند روشنی میں اجاگر کرتے ہیں- ان کی وہ نظمیں خاص طور پر توجہ کی حقدار ہیں جس میں انہوں نے فطرت کی عکاسی کی ہے- اقبال نے نیچرل شاعری میں ایسے نقوش چھوڑے ہیں جن کی تقلید ناگزیر ہے- ادیب سہیل کی نظموں پر اقبال کی فطری شاعری کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں- انہوں نے ہیئت کے اعتبار سے آزاد نظم کا فارم اختیار کیا ہے لیکن فکری زاویے اقبال کی فکر سے ملتے ہیں- ادیب سہیل کی نظم ''ماہ دونیم'' ملاحظہ کیجئے، اس میں انہوں نے ایک ایسے شخص کی حالت زار کا نقشہ کھینچا ہے جس سے پوری قوم کی بدحالی کا نقشہ سامنے آ گیا- نظموں میں جو مصوری ہمیں ملتی ہے، وہ ان کی زندہ تصویریں ہیں ؎

جس ڈگر پر ہو گیا دونیم مہتاب نظر
جس جگہ پر ہو گئی تقسیم شہراۂ عظیم
ہے وہاں
ایک مرد ناتواں اپنا عصا ٹیکے ہوئے
سال خوردہ جسم کی سب سلوٹوں کو آئینہ در آئینہ کھولے ہوئے
یوں صدا بر لب کوئی آئے ..... عصا کو تھام لے
تجربوں کے بوجھ سے جو لرزہ براندام ہے
اس صدا پر ایک سرخیل سفر آیا بھی ہے
اپنے دیرینہ علم بردار ہونے کا اسے دعویٰ بھی ہے
یہ جری بھی ہے، قوی بھی، لائق منصب بھی ہے
اس جری کی چشم بینا میں مگر
پہلی سی بینائی نہیں
اس جری کی فکری میں
دیرینہ گیرائی نہیں
اس جری کے حسن میں
ویسی پذیرائی نہیں

(ماہ دونیم)

مغربی شاعری میں ایسے ہی تجربے ہمیں ملتے ہیں، جس سے اس دور کی عکاسی ہوتی ہے اور دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریاں سامنے آ جاتی ہیں- جب مغرب میں تہذیب اور سماجی انتشار رونما ہو گیا اور وہ تمام اقدار ختم ہو گئیں جو انسانی اقدار کا حوالہ تھیں، پھر سے تہذیب اور سماج کے بارے میں شعراء نے فکر شروع کی اور جدید طرز پر نظمیں لکھنا شروع کیں- ان جدید شعراء میں ادیب سہیل نے وہ مقام تو حاصل کر لیا، لیکن ان کی نظمیں ابہام کی نذر ہو گئیں- ان کی نظموں میں تنہا پسندی اور انسانوں سے دور

بھاگنے کا عمل ملتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ ان کی نظموں میں علامتی پیکر اور منظر کشی اقبال کی نظموں ہی سے آئی۔ اس ہنر کا اعتراف ان کی اپنی نظمیں ہیں۔ ادیب سہیل کی نظم ''یہ زندگی یہ اپسرا'' پر اقبال کی نیچرل شاعری کے اثرات ملاحظہ کیجیے ؎

اس کے من کی کامنا تھی کاش میں لکھتا کبھی
زندگی پر ایک البیلی سی نظم
زندگی ہوتی کوئی چنچل پری
بادلوں کے پنکھ، روپک دامنی
اس کے من کی کامنا کو روپ دینے کے لئے
سوچ کے رتھ پر سوار
لوک اور پرلوک میں اڑتا پھرا اس اپسرا کی کھوج میں
جب اچانک اک ڈگر پر رتھ رکا
میں نے یہ سمجھا مری من چاہی منزل آ گئی
میں نے یہ سمجھا مری من چاہی منزل آ گئی
رتھ کے جھلمل ریشمیں پردے ہٹا کر جب اٹھی میری نظر
میں نے دیکھی آم کے پھینکے ہوئے چھلکوں کے پاس
ایک صورت ملگجی
آم کی چوسی ہوئی گٹھلی نظر آئی مجھے یہ زندگی یہ اپسرا

(یہ زندگی یہ اپسرا)

اس نظم میں جو نئے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں وہ جدید علامتیں ہیں، جو زندگی کا اشارہ ہے۔ اقبال نے اپنی بیشتر نظموں میں انسانی اقدار اور زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ یہی وہ اثرات ہیں جو ادیب سہیل نے اقبال سے قبول کیے ہیں۔

باب ششم

اقبال کی براہ راست تقلید

اقبال دور جدید کا امام ہے- اس کی شاعری اور نظریات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن پھر بھی تشنگی سی محسوس ہوتی ہے- اقبال کی ہمہ جہتی اور ہمہ گیری نے ان کی شخصیت کو اور بلند کر دیا- فکر وفن کے لحاظ سے بھی ان کا مقام متعدد شعراء سے بلند ہے- اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری کا مقصد فکر و عمل اور جہد مسلسل ہر شخص کا شعار بن جائے، کوئی محروم و مجبور نہ رہے- اقبال نے مغربی تہذیب کو بڑے قریب سے دیکھا ہے اس لئے وہ مادیت سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں- دراصل اقبال دل کو مضبوط اور توانا بنانا چاہتے ہیں- جو معاشرتی نظام مغرب میں رائج ہے، وہ اس نظام کی نفی کرتے ہیں کیونکہ اس میں انسانیت کی فلاح کا کوئی راستہ نہیں- اقبال کے یہ دو شعر مغربی تہذیب پر تازیانہ ہیں ؎

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب   کہ روح اس میں مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید   ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

اقبال نے اپنے نظریہ کی بنیاد اس نقطۂ نظر پر رکھی ہے کہ ملت اسلامیہ کی طاقت اور اس کی شناخت کسی وطن سے نہیں بلکہ اللہ کی وحدانیت اور ایسی ملت سے ہے جو پوری کائنات کا احاطہ کرتی ہو- قومیت اور وطنیت سے بالا ہو کر ملت اور اسلام کی سربلندی کے خواہاں رہے- اقبال کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے جس میں انہوں نے ملت کے رجحان کو واضح طور پر پیش کیا ہے ؎

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

''قومیت اور وطنیت جس کا سرچشمہ یورپ کی سرزمین ہے، اقبال کی نظر میں شرک اور بت پرستی سے کم نہیں، انہیں اسلام اور قوم پرستی میں کھلا تضاد نظر آتا ہے اور وہ اس غارتگر دین اور اس کے پیرہن کو مذہب کا کفن بتاتے ہیں- اس معاملے میں اقبال کا ذہن شروع ہی سے صاف تھا کہ اسلام قومیت و وطنیت کا قائل نہیں، میں ان لوگوں سے متفق نہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اقبال پہلے وطنیت کی طرف آئے پھر ملت کی طرف، بلکہ صحیح یہ ہے کہ وہ شروع سے آخر تک وطن پرست ہوتے ہوئے بھی ملت اور اسلام کی آفاقیت کے قائل رہے-''[۱]

اقبال کے فن کی وہ خوبیاں جو تقلید کا سامان مہیا کرتی ہیں، وہ شاعری کی مختلف جہتیں ہیں مثلاً تضمین وتراکیب لفظی، عروضی نظام، تصوف، تلمیحات واشارات، صوتیاتی نظام، لفظ و معنی کا ارتباط، فلسفیانہ شاعری کے ساتھ متصوفانہ رنگ جس میں خودی و بے خودی، عقل و عشق، نظریۂ انسان کامل، سکون و حرکت، ترمیمات اقبال ان تمام امور کو اسلوبیات اقبال میں دیکھا جا سکتا ہے-

---

۱- نقوش اقبال، ص ۲۷۲

اقبال کے ہاں تضامین کا با قاعدہ ایک نظام ملتا ہے- دراصل تضمین کے لغوی معنی کسی دوسرے کے مشہور شعر کو اپنے کلام میں ملانا، قبول کرنا، پناہ میں لینا، ضامن کرنا (فرہنگ عامرہ) ''تصویر درد'' میں تضمین کا استعمال پہلی بار ہوا ہے جبکہ دوسری نظم ''نالۂ فراق'' میں بھی تضمین کی گئی ہے-

اقبال نے تراکیب لفظی سے بھی کام لیا ہے- الفاظ کو نئے ڈھنگ سے ترتیب دینا یعنی فرسودہ اور پارینہ الفاظ جو اپنی قدر و قیمت گنوا چکے تھے- تراکیب کے ذریعے لفظوں کو نیا روپ دینا- ہر بڑا شاعر اپنے افکار و خیالات کی روشنی میں جو الفاظ اس کے سامنے ہوتے ہیں، ان کو تراکیب سازی کے ذریعے نئے مفہوم تلاش کرتا ہے- اسی طرح عروضی نظام میں بھی اقبال نے اختراعیں کی ہیں- دراصل عروض اس علم کو کہتے ہیں جس میں بحروں، ارکان اور زحافات کے قواعد کو ملحوظ رکھا جاتا ہے- اقبال کا صوتیاتی نظام بڑا مستحکم ہے- شاعری میں نغمگی کا پایا جانا ہی اس بات کی علامت ہے کہ لفظوں میں موسیقیت آب و تاب لئے ہوئے ہے- یہی وجہ ہے کہ اقبال کے کلام کو ساز و آواز کے امتزاج سے پڑھتے ہیں اور گائک جھوم جھوک کر گاتے ہیں:

> اقبال کا کمال جس نے ان کے صوتیاتی آہنگ کو اردو شعریات کا عجوبہ بنا دیا ہے، دراصل یہ ہے کہ طویل و غنائی مصوتوں کی زمینی کیفیات اقبال کے ہاں زناٹے دار صفیری و سلسلہ وار مسلسل آوازوں اور طویل و غنائی مصوتوں کا یہ ربط و امتزاج ایک ایسی صوتیاتی سطح پیش کرتا ہے جس کی دوسری نظیر اردو میں نہیں ملتی-'' [1]

اقبال اردو شاعری کا وہ ستون ہے جسے اردو شاعری کی آبرو کہا جا سکتا ہے- رسمی اور نصابی لحاظ سے فلسفہ ان کا مضمون تھا لیکن تصوف انہیں ورثے میں ملا تھا کیونکہ ان کے والد ایک صوفی بزرگ تھے- اقبال کی تربیت میں ان کے والد گرامی اور استاد محترم مولوی میر حسن کا نمایاں حصہ ہے- ان دونوں بزرگوں سے فیضیاب ہو کر اقبال نے اپنی شاعری کی بنیاد اسلامی نقطۂ نگاہ پر استوار کی کیونکہ یہ صرف شاعر ہی نہیں تھے ایک پیامبر بھی تھے-

> ''اقبال کی شاعری کا زیادہ حصہ ایسا ہے جس میں فلسفہ اور دینیات اور احیائے ملت کے تقاضے نے شعر کو شعریت کے زاویۂ نگاہ سے بھی پست نہیں ہونے دیا- اگر اقبال ایک غیر معمولی صاحب کمال شاعر نہ ہوتا تو اس کی نظموں میں فلسفہ خشک ہوتا، وعظ بے اثر ہوتا اور تبلیغ بے نتیجہ ہوتی- یہ اس کا کمال ہے کہ وہ فلسفیانہ اشعار کہتا ہے تو بات خالی فلسفے کے مقابلے میں زیادہ دلنشیں اور یقین آفریں بن جاتی ہے- ملت کے عروج و زوال اور مرض و علاج کو بھی جب وہ اپنی ساحرانہ شاعری کے سانچے میں ڈھالتا ہے تو سننے والوں کے دلوں میں ایک زیر و بم پیدا ہوتا ہے-'' [2]

دراصل اقبال نے اپنی نظموں میں تمام تر توجہ اسلامی نظریات، قرآن و حدیث اور عشق رسولؐ پر مرکوز رکھی- اس کے علاوہ اپنی شاعری میں ملت اسلامیہ کی بیداری اور ہر خطہ کے انسان سے محبت کا اظہار ملتا ہے- اقبال ملت اسلامیہ کو منتشر ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں، انہیں دلی صدمہ اور افسوس ہوتا ہے، اسی لئے اقبال کہتے ہیں ؎

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات   ایشیاء والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

۱- اقبال کا فن، ص ۱۸۳

۲- فکر اقبال، ص ۱۱۷

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاک کا شغر

اقبال اپنی قوم کی زبوں خالی اور شکستہ روی پر آنسو بہاتے ہیں اور یہ افسوس کرتے ہیں کہ جو عشق کی گرمی تھی وہ ناپید کیسے ہوگئی۔ وہ نئے ولولے اور جذبے کے ساتھ دلوں کو گرمانے کی فکر میں محو ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ خدا کی رحمت سے ناامید نہیں۔ وہ قوم کی اس بدحالی کے باوجود بھی امید کی کرن پھوٹتے ہوئے دیکھ رہے تھے:

''اسلام اقبال کے نزدیک زندگی کے اساسی رجحانات کا حامل اور انسانی زندگی کے ارتقائے لامتناہی کا لائحہ عمل ہے اس لئے یہ دین کبھی فرسودہ نہیں ہوسکتا۔ مرورِ ایام اس میں کہنگی پیدا نہیں کرسکتا۔ جس حد تک جس زمانے میں کوئی ملت اس پر کاربند ہوگی اس حد تک وہ قوت اور بصیرت سے بہرہ اندوز ہوگی۔ ملت اسلامیہ صدیوں کے انحطاط سے جادۂ اسلام سے ہٹ گئی ہے لیکن اصول کے مطابق کہ ہر چیز اپنی اصلیت کی طرف عود کرتی ہے، یہ ملت دوبارہ اسلام کی طرف لوٹے گی۔'' [۱]

اقبال کی شاعری میں حال پر تنقید اور اندیشۂ مستقبل کی جو رمق ملتی ہے، یہیں سے پیام اقبال کی ابتداء ہوتی ہے۔ اس امر میں ان کی چند نظمیں پیش کی جاسکتی ہیں مثلاً ''مسجد قرطبہ''، ''شکوہ''، ''جواب شکوہ''، ''جبریل وابلیس''، ''پیرومرید''، ''طلوع اسلام''، ''ساقی نامہ''، ''شمع وشاعر''، ''نالۂ یتیم'' اور ''ابلیس کی مجلس شوریٰ''۔ ان نظموں میں دیگر فلسفیوں سے استفادہ کا جو رجحان نظر آتا ہے وہ محض خیالات کی بنیاد پر ہے۔ اقبال وہ پہلا شاعر ہے جس نے مغربی شعراء اور فلسفیوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے، ان میں شیکسپیئر، افلاطون، ارسطو، کارل مارکس، ہیگل، لینن، نیٹشے، برگساں، گوئٹے، مسولینی، کروچے، ملٹن، شوپنہار۔ ان کے علاوہ مسلمان مفکر، فلسفی اور شعراء سے جو کسب فیض کیا ہے ان میں مولانا جلال الدین رومیؒ، ابن سینا، امام رازیؒ، فرید الدین عطارؒ، شیخ سعدیؒ، مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ، امام غزالیؒ، امام ابن تیمیہؒ وغیرہ سے اقبال نے انسان دوستی کے نظریے کو اپناتے ہوئے زندگی گزارنے کا صحیح راستہ تلاش کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ زندگی اور معاشرتی نظام کی صحیح معنی میں تعمیر وتشکیل ہوسکے۔

''انہوں نے ان فلسفیوں سے وہ خیالات لئے ہیں جو ان کے انسانیت دوستی کے نظریے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ ان خیالات کے امتزاج سے انہوں نے انسان دوستی کے نظریے کی تعمیر وتشکیل کی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی ایک فلسفیانہ خیال بھی ان کے یہاں ایسا نہیں ملتا جو ان کی انسان دوستی کو سہارا نہ دیتا ہو۔ ان کا فلسفہ صرف فلسفہ نہیں ہے، حیات انسانی کا ایک نظام فکر ہے جس میں انسان دوستی کا خیال بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔'' [۲]

اقبال نے اپنے نظریہ شاعری میں اس بات کا اظہار کردیا ہے کہ یہ صرف ایک ذریعہ ہے، مجھ سے ایسی شاعری کی توقع نہ رکھی جائے جس میں محبوب کا تصور، لب ورخسار کی باتیں اور گل وبلبل کے تذکرے ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری میں مقصدیت کو اولیت حاصل ہے، ان کی شاعری مخاطبہ اور پیام کی شاعری ہے۔ شاعری کے بارے میں اقبال کا یہ شعر دیکھئے

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ کہ میں محرم راز درون میخانہ

۱- فکر اقبال، ص ۱۵۷

۲- جدید شاعری، ص ۱۸۴

اقبال زندگی کے سربستہ راز انسان کے سامنے کھولنا چاہتے ہیں اور اپنے پیغام میں راز حیات کو جو اہمیت اور فوقیت دی ہے، یہی ان کا کلیدی پیغام ہے:

''یہ پیغام، راز حیات ہے- انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا راز، جسے انہوں نے برسوں کی دل سوزیوں، جگر کاریوں اور اشک ریزیوں کے بعد سمجھا اور اب وہ دوسروں کو سمجھانے کے لئے بے تاب ہیں لیکن جہاں میں ایک بھی محرم راز نہیں ملتا جس کے سامنے وہ اس حقیقت کا اظہار کر سکیں-'' [1]

اقبال نے اپنی نظموں میں وہ تمام حقائق اور واقعات تجربات کی روشنی میں پیش کر دیے- اقبال کے بعد آنے والے شعراء نے ان نظریات و خیالات کو مشعل راہ بنا کر براہ راست تقلید کی ہے اور اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہ اقبال ہی بیسویں صدی کا وہ عظیم شاعر ہے جس کے افکار و خیالات اور نظریات قابل تقلید ہیں- ان کی فکر و فلسفہ اور بحر خیالات کس قدر عمیق ہیں، اس کا اندازہ ان کی نظموں سے بھی لگایا جاسکتا ہے- کثیر المطالعہ ہونے کے باوجود اقبال کا یہ اعتراف انکسار پر مبنی ہے ؎

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے مرے بحر خیالات کا پانی

قومی و معاشرتی نظمیں:

دو قومی نظریہ کی داغ بیل اسی دن پڑ گئی تھی جب ہندوؤں نے اردو ہندی تنازعہ کھڑا کیا تھا- دوسری طرف مغربی متعصبانہ کارروائیاں، جو مسلمانوں کی بربادی کا آغاز تھا، ان امور کے پیش نظر مسلمان نہ ہندو سے اشتراک کر سکتا تھا اور نہ انگریز سے- یہی وہ حالات تھے جس کی بناء پر آزادی کا نعرہ لگایا گیا- زیادہ تر شعراء نے ملی اور وطنی شاعری کو فروغ دیا- ان نظموں میں ایک کرب اور دل ہلا دینے والے موضوعات پیش کیے- ان نظموں میں جو موضوعات زیر بحث آئے، ان میں قومی، معاشرتی، معاشی، سماجی اور خاص طور پر مذہبی نکات پر نہایت عمدہ نظمیں لکھیں- اقبال نے ''ترانۂ ملی''، ''وطنیت''، ''شکوہ''، ''جواب شکوہ'' لکھ کر قومی و معاشرتی اقدار میں اضافہ کیا- موضوعات کے اس تناظر میں دیگر شعراء کے یہاں بھی موضوعات کثرت سے نظر آتے ہیں- ان موضوعات کو وسیع پیمانے پر اقبال کے بعد علی سردار جعفری، جوشؔ، حفیظؔ، ندیمؔ، فیضؔ، پروفیسر شورؔ، ساحرؔ، مجازؔ ان تمام شعراء نے حقائق کو محسوس کرتے ہوئے اپنی نظموں میں ملی و قومی تشخص کو اجاگر کیا- قومی مسائل، آزادی کا احساس اور وطن کے ترانے جن کو سن کر قوم میں ایک ایسا جذبہ کروٹ لینے لگا جسے بیداری سے تعبیر کیا جاسکتا ہے:

''وطن ہو یا آزادی کوئی چیز صرف اس وقت تک پائیدار اور برقرار رہ سکتی ہے جب تک قوم میں اتحاد و حوصلہ باقی ہے لہذا پاکستانی شعراء نے ایسے نغمے بارہا گنگنائے ہیں جن میں عزم و استقلال کا سبق بار بار دہرایا گیا- ان نغموں کی خصوصیت یہ ہے کہ شعراء نے اسلاف کے کارناموں کو بطور مثال پیش نظر رکھا ہے اور چونکہ وہ مسلمان قوم سے مخاطب ہیں اس لئے قدم قدم پر ان اسلامی اصولوں پر چلنے کی دعوت

۱- اقبال معاصرین کی نظر میں، ص ۲۴۳

دی گئی ہے جس نے ان کے ماضی کو تابندہ کئے رکھا تھا- اس طرح یہ نغمے صرف نظمیں نہیں رہتیں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر تہذیب و اقدار کی نمائندہ بن جاتی ہیں جن میں ملی حسن پوری آب و تاب سے جھلکتا ہے-'' [۱]

قیام پاکستان کے بعد ہماری نظموں میں جو رموز و علائم داخل ہوئے ان میں سب سے توانا اور مستحکم علامت اسلامی نقطۂ نگاہ سے عبارت ہے- نئے رموز و علائم میں محرومی، مایوسی کو پیش نظر رکھا گیا کیونکہ قوم کو جن مسائل کا سامنا تھا ان میں ہجرت، قتل و غارت، فسادات غرض اردو نظم میں ان علائم و رموز کو جگہ دی گئی جس میں انسان اور اس کے مسائل زیر بحث آ سکیں- سماجی احساس کے ساتھ اسلامی نظریۂ حیات کو بھی نظم کا موضوع بنایا- اقبال کی نظمیں اس نقطۂ نگاہ سے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں- انہوں نے اسلامی تعلیمات کو نئے رجحانات کے تحت خودی کا ادراک دیا:

''تکمیل خودی یا خودی کے ارتقاء کا سب سے اہم مرحلہ ہے نیابت الہٰی! یعنی خود کو خودی کی ارتقائی منازل طے کر کے انسان انسان کامل کا مرتبہ حاصل کرے اور دنیا میں اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کرے- اللہ پاک نے انسان کو دنیا میں اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے پیدا کیا ہے لہذا انسان کا فرض ہے کہ اپنی خودی کو مستحکم کرے تاکہ کائنات کو مسخر کر کے نیابت خداوندی یا خلافتِ الٰہیہ کے مقام پر فائز ہو سکے- جب انسان اس منزل پر پہنچ جاتا ہے تو اس کی خودی کی تکمیل ہو جاتی ہے-'' [۲]

قدیم علامتوں سے قصداً گریز برتا گیا- اس کی ایک وجہ تو جلاوطنی کی ہے- اس میں سیاسی رجحان کے علاوہ نئی نئی علامتوں کا ظہور ہوا- ترقی پسندوں کے ہاں علامتوں کے علاوہ نظریہ کام کر رہا تھا جبکہ حلقہ ارباب ذوق نے انسان کی داخلی حیثیتوں کو اجاگر کیا- ان علامتوں میں خاص خاص یہ ہیں مایوسی، خوف، تاریکی، جہالت، تنہائی- ان کے علاوہ نئی علامتیں بھی وضع کیں- ان کے ہاں جمود، آزادی، ذہنی آسودگی اور ذہنی الجھنوں کا تذکرہ بھی ہے- اقبال کے متعلق یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ واحد شاعر ہے جس نے مغربی طرز زندگی کا گہرا مشاہدہ کر کے اس سے متنفر ہونے کے ساتھ مسلمانوں کو بیدار کیا- اقبال نے ایسی نظمیں تخلیق کیں جو سرمایہ بھی ہیں اور اثاثہ بھی- ان کی ایک نظم ''مسجد قرطبہ'' جس میں اسلاف کا ذکر کر کے اقبال آبدیدہ ہو گئے، غرض اقبال کے بعد شعراء کے ہاں روایات کی تشکیل نو کے واضح ثبوت ملتے ہیں- ۱۹۴۷ء کے بعد جو فسادات رونما ہوئے ان سے معاشی و معاشرتی انتشار ظہور پذیر ہوا، کشت و خون کا بازار گرم رہا- ہندوستان کی تقسیم سے بہت سے لوگ اجڑ گئے اور جو بچ گئے ان کے لئے منتقلی ایک بڑا مسئلہ بنی ہوئی تھی- پاکستان تو وجود میں آ گیا لیکن آزادی کی بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑی- سماجی بدحالی کی یہ داستان بہت طویل ہے- جو کرب و غم ادیبوں اور شاعروں نے واقعات کی صورت میں محسوس کیا انہیں نظموں میں من و عن پیش کرنے کی پوری کوشش کی ہے- ان نظموں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالات و واقعات اپنے اندر دل سوز مناظر کے ساتھ انسانی اقدار کو جس طریقے پر مجروح کیا ہے، وہ تاریخ کے صفحات پر تحریر کر دیئے گئے ہیں-

شاعری کے رجحان میں یہ تبدیلی ۱۹۴۷ کے بعد نظموں میں دیکھی جا سکتی ہے- زیادہ تر شعراء نے انسانی حقوق اور آزادی کی قدر و قیمت پر جو نظمیں لکھی، ان سے معاشرتی و معاشی اور سماجی حالات موضوعاتی طور پر سامنے آتے گئے- اس طرح اردو نظم میں

۱- اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، ص ۳۳۶

۲- خیابان اقبال، ص ۳۳

جو وسعت نظر آتی ہے وہ شعراء کی محسوسات تھیں جنہیں فرض سمجھ کر نظموں میں پیش کیا- چند شعراء کا کلام بطور نمونہ اختصار کے ساتھ دیا جاتا ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات اور واقعات نے کیا رنگ اختیار کیا- اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آزادی کے بعد نئے مسائل ظہور پذیر ہوئے، ان میں فرقہ وارانہ فسادات اہمیت کے حامل ہیں- ان فسادات سے جو کشت وخون کی ہولی کھیلی گئی وہ ایک کربناک اور دل سوز واقعات کی صورت میں نظموں میں شعراء نے اجاگر کیا ہے اس کے علاوہ افلاس اور مایوسی نے انسان کو محروم اور ناامید کردیا تھا- ان تمام واقعات کو نئے افکار کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے-

جدید رجحانات کو بھی نظموں میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی کیونکہ اقبال ایک روایت پرست تھے- پرانے سانچوں میں نئے افکار کو جدید رجحانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے وقت اور حالات کے تحت شاعری میں ان عوامل کو بنیاد بنا کر پیغام کی صورت میں ظاہر کیا لیکن اقبال کے بعد شعراء نے سیاسی، اخلاقی، معاشی و معاشرتی اور اسلامی نقطہ ہائے نگاہ پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کیا- اس طرح جدیدیت کو عقلیت پسندی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کیونکہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے جس تیزی سے ترقی کی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کی فکر کے زاویے مسلسل تغیر میں ہیں- ۱۹۴۷ء کے بعد جو نئے رجحانات ہماری نظموں میں نظر آتے ہیں، وہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کا ردعمل ہے کیونکہ اقبال کی فکری وسعت اور مشرق ومغرب کے عمیق مطالعہ نے نظموں کے رجحان کو بدلنے میں خاصی مدد دی- ہندوستان اور پاکستان کے شعراء نے رموز وعلائم کو پیش نظر رکھتے ہوئے اقبال کی مکمل تقلید کرتے ہوئے بیسویں صدی کے حالات وواقعات اور سیاسی تغیر کو اپنی نظموں میں اجاگر ہی نہیں کیا بلکہ جدیدیت کی مہر ثبت کردی- جدیدیت وہ آئینہ ہے جس میں تاریخی تصور کو نظموں میں دیکھا جاسکتا ہے-

حامد اللہ افسر میرٹھی:

''پیام روح'' افسر میرٹھی کا مجموعہ کلام ہے- وطن پرستی اور قوم پرستی پر ان کی نظمیں نہایت اہم ہیں- وطن سے والہانہ محبت اور خلوص اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ انہیں مسلمانوں کے مستقبل کی فکر شدت سے ہے- نظموں میں مترنم لہجہ شعری آہنگ اور درد واثر پایا جاتا ہے- انہوں نے نئی نئی بحروں میں طبع آزمائی کی ہے اور نئی نئی جہتیں تلاش کی ہیں- قومی و معاشرتی فکر میں اقبال سے متاثر ہونا لازمی تھا- ان کی ایک نظم ''دنیا میں جنت میرا وطن ہے'' پر اقبال کی نظم ''وطنیت'' کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں- اقبال کی نظم کا یہ بند ملاحظہ کیجئے ؎

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

وطن کے رجحان پر افسر میرٹھی کی نظم ملاحظہ کیجئے ؎

چشتی نے بخشا
دل کو سہارا
ہمدرد ایسا

کس کو ملا ہے
دنیا میں جنت میرا وطن ہے
پربت جو اک یہاں ہے
ہمدوش آسماں ہے
کیسا عجب سماں ہے
ایسی زمیں کہاں ہے
کیا شکر ہو الٰہی! سب کچھ عطا ہے
میرے وطن کو تو نے جنت بنا دیا ہے

(دنیا میں جنت میرا وطن ہے)

سید غلام بھیک نیرنگ:

ان کا زیادہ تر وقت قومی وسیاسی، ملکی وملی خدمات میں گزرا ہے۔قومی ومعاشرتی نظموں میں حب الوطنی کا جذبہ دیکھا جاسکتا ہے ؎

تجھے اے بلبل رنگیں نوا سوجھی ہے گانے کی
مگر مجھ کو پڑی ہے فکر تیرے آشیانے کی
یہ تیرے آڑے سیدھے چار تنکے شاخ گلبن پر
کبھی سے بجلیاں ہیں فکر میں ان کے جلانے کی
کبھی سوچا بھی ہے تجھ کو کہ اب رنگ چمن کیا ہے
کبھی سوچا بھی ہے تو نے ہوا کیا ہے زمانے کی
یہ گلچیں، باغباں، صیاد، یہ تیرے کرم فرما
لئے بیٹھے ہیں دل میں حسرتیں تیرے مٹانے کی
سنبھالے اپنے پر پرزے گر سب ہم صفیروں نے
ہر اک نے فکر کی ہے اپنے اپنے آشیانے کی
مگر اک تو ہی غافل ہے مآل کار گلشن سے
ترے حصے میں آئیں غفلتیں سارے زمانے کی
نہ پھولوں کے وہ تیور ہیں نہ غنچوں کی وہ چتون ہے
خدا جانے کدھر کو اب کشش ہے آب و دانے کی
نئے پودے، نئے بوٹے، نئے گلبن، نئے تختے
نئی شرطیں بنیں گی اب چمن میں آنے جانے کی

(آہنگ عمل)[1]

ان کی اس نظم سے دلی کیفیات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔قوم کے لئے دردمند دل رکھنے کے ساتھ ان کے ہمدرد بھی ہیں۔قوم وملت کے لئے خود کو ہمہ وقت مصروف کار رکھتے تھے:

> ''میر نیرنگ قوم اور ملت سے جو خلوص اور ہمدردی رکھتے تھے اور خود کو جس طرح انہوں نے ملک وملت کے لئے وقف کر دیا تھا اس کا اظہار ان کی شاعری کے ایک بڑے حصے سے بھی ہوتا ہے۔ان کی نظموں کا زیادہ حصہ قومی اور اصلاحی موضوعات پر مشتمل ہے۔''[2]

۱- کلام نیرنگ، ص ۱۴۶

۲- کلام نیرنگ، ص ۴۳

نیرنگ کی نظم ''حالت قوم'' ملاحظہ کیجئے، اس میں انہوں نے معاشرتی زبوں حالی کا نقشہ حالات و واقعات کی روشنی میں کھینچا ہے، ایسی منظر کشی کی ہے کہ واقعات نظر کے سامنے گھوم جاتے ہیں ؂

دل بھر آیا قوم کی حالت پریشاں دیکھ کر ۔۔۔ رو پڑے ہم اپنی بربادی کے ساماں دیکھ کر
یاد آتی ہے خزاں میں عشرت ایام کی ۔۔۔ حال بلبل غیر ہے رنگ گلستاں دیکھ کر
اب کہاں وہ دن؟ کہ جب خیرہ تھی چشم آفتاب ۔۔۔ شوکت اسلامیاں کے ساز وساماں دیکھ کر
صولت اہل عرب کی دھوم تھی آفاق میں ۔۔۔ کانپ جاتے تھے انہیں سام و نریماں دیکھ کر
ایسی رفعت رکھتے تھے بغداد کے شاہی کوشک ۔۔۔ سر جھکاتا تھا جنہیں گردون گرداں دیکھ کر
قوم کا گلزار ایسا تازہ و شاداب تھا ۔۔۔ پھیکا پڑ جاتا تھا جس کو رنگ بستاں دیکھ کر
دفتر عبرت ہیں یہ لاہور و دہلی کے کھنڈر ۔۔۔ سیکھ کچھ اے دل! یہ اوراق پریشاں دیکھ کر
قوم کا غم جاں گزا ہے جس قدر روئیں سو کم ۔۔۔ ہاں! مگر اپنی بساط اے چشم گریاں دیکھ کر

(حالت قوم) [۱]

نظم ''نوائے انقلاب'' نیرنگ کے دل کی آواز ہے۔ یہی وہ طرز خاص ہے جسے اقبال کے اثرات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے اس میں قومی وسیاسی احساس کا اظہار ہے ؂

چل رہی ہے باغ عالم میں صبائے انقلاب ۔۔۔ آ رہی ہے پتے پتے سے صدائے انقلاب
انقلاب آئین ہستی ہے نہیں اس سے مفر ۔۔۔ چلتی رہتی ہے ہمیشہ آسیائے انقلاب
زیر و بم سے ہے مرکب زندگی کا زمزمہ ۔۔۔ زیست کہتے ہیں جسے ہے اک نوائے انقلاب
ذرے ذرے سے ہے آہنگ تغیر موجزن ۔۔۔ ساز ہستی سے نکلتی ہے صدائے انقلاب
ایک حالت پر نہیں ہے کار گاہ ہست و بود ۔۔۔ یعنی ہر ساعت نرالی ہے ادائے انقلاب
جب تلک ہستی ہے گردش سے بھی چھٹکارا نہیں ۔۔۔ انتہائے زندگی ہے انتہائے انقلاب
زندگی کا راز ہے سعی مسلسل میں نہاں ۔۔۔ اہل ہمت کو نہیں ممکن دبائے انقلاب

(نوائے انقلاب) [۲]

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم:

اقبال کی تقلید میں ایک اہم نام غلام مصطفےٰ تبسم کا لیا جاتا ہے۔ ان کی نظموں میں قومی و معاشرتی بازگشت کے علاوہ جذبۂ حریت، آزادی کی لہر، طاغوتی طاقتوں سے بیزاری اور وطن سے محبت کا جذبہ نظموں میں دیکھا جا سکتا ہے ؂

ہم پرچم آزادی لہرائے ہوئے آئے
طوفان کی لہروں کو شرمائے ہوئے آئے

۱- کلام نیرنگ، ص ۱۱۳

۲- کلام نیرنگ، ص ۱۵۲

سنگین چٹانوں سے ٹکرائے ہوئے آئے
وہ دیکھنا دشمن پر پھر خوف سا طاری ہے اب جیت ہماری ہے
ہر سمت بڑھی فوجیں ہر سمت قدم اٹھے
وہ بیٹھ گئے دشمن میدان میں ہم اٹھے
وہ ظلم نے دم توڑا وہ جوروستم اٹھے
اب جیت ہماری ہے، اب جیت ہماری ہے
(پرچم آزادی) [۱]

تبسم کی نظم ''سراغ منزل'' میں منزل کی جستجو اور کشت وخون کا منظر قومی ومعاشرتی آئینے میں دیکھئے ؎

ایک کھوئی ہوئی منزل پہ پہنچنے کے لئے ہم کئی راہگزاروں سے گزر آئے
خارزاروں سے بیابانوں سے ویرانوں سے موت کے خوف سے سہمے ہوئے میدانوں سے
کرب و آلام کے طوفانوں سے ٹکراتے ہوئے زندہ لاشوں کے مزاروں سے گزر کر آئے
ایسا موہوم ہوا ہستی انساں کا ثبات اس قدر گرم ہوا معرکۂ مرگ و حیات
(سراغ منزل) [۲]

جوش ملیح آبادی:

جوش کی شاعری کی کئی جہتیں ہیں اور ان کا دائرہ نہایت وسیع ہے لیکن ہم موضوع کی مناسبت سے ان نظموں کو زیر بحث لائیں گے جن کا تعلق قومی ومعاشرتی فکر سے ہے۔یوں تو جوش نے اقبال کے اثرات سے انکار کیا ہے لیکن وہ اقبال کے اثرات سے خود کو بچا نہ سکے ان کی اپنی نظمیں اس بات کی آئینہ دار ہیں۔نظم ''صدائے بیداری'' میں اس عکس کو دیکھ سکتے ہیں ؎

یہ مانا، سرزمین ہند پر نکبت برستی ہے زبانوں پر حدیث اوج ہے فکروں میں پستی ہے
یہ مانا، آج ہم میدان وحشت میں رجز خواں ہیں عدو بھی سر پہ ہے آپس میں بھی دست وگریباں ہیں
مگر راتوں کو جب فکر وطن میں سر کو جھکاتا ہوں فضائے سرد میں دھیمی سی اک آواز پاتا ہوں
یہ آواز اس لطافت سے مرے کانوں میں آتی ہے صبا جس طرح زیر شاخ سنبل گنگناتی ہے
فضا میں جس طرح روح الامیں کی بال جنبانی برستا ہو کہیں کچھ دور جیسے خواب میں پانی
جگاتی ہے سحر جس ناز سے نغموں کو دریا میں ہوا کی سنسناہٹ جس طرح گنجان صحرا میں
حقیقت کیا بتاؤں اس صدائے روح افزا کی نہاں ہیں جس کے اندر کاوشیں امروز و فردا کی
یہ مشرق محو ہے صبح تجلی زار ہونے میں
یہ روح ایشیاء مصروف ہے بیدار ہونے میں
(صدائے بیداری)

۱- انجمن، ص ۲۱۵

۲- انجمن، ص ۲۱۰

جوشؔ نے نظم ''ماتم آزادی'' میں ہندوستان کی تاریخ قلمبند کی ہے اور یہ نظم آزادی ۱۹۴۷ء میں کہی تھی- حالات وواقعات کو کس خوبی سے ادا کیا ہے- اس نظم کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک دستاویز ہے جو وقت کے ماتھے پر رقم ہے ؎

اے ہمنشیں! فسانۂ ہندوستاں نہ پوچھ   روداد جام بخشی پیر فغاں نہ پوچھ
بربط سے کیوں بلند ہوئی ہے فغاں نہ پوچھ   کیوں باغ پر محیط ہے ابر خزاں نہ پوچھ
کیا کیا نہ گل کھلے روش فیض عام سے
کانٹے پڑے زبان میں پھولوں کے نام سے

(ماتم آزادی)

ابوالاثر حفیظ جالندھری:

وطن سے محبت کے علاوہ مذہبی اساس کا پہلو زیادہ روشن ہے- ان کی نظموں میں یہ اثر اقبال کی تقلید سے آیا- نظم ''شہیدوں کی عید'' میں اس نقطۂ نظر کی ترجمانی واضح نظر آتی ہے ؎

فرض پورا کرچکے، فرصت ملی ہر کام سے   مقبروں میں سو رہے ہیں آج کیا آرام سے
صبح کی صورت اٹھے تھے رات کے آغوش سے   ہوگیا زندہ عمل کا جوش ان کے جوش سے
ان کا اٹھنا تھا کہ تقدیر اخوت جاگ اٹھی   خواب غفلت میں پڑی تھی آدمیت جاگ اٹھی
ان سروں پر سایہ افگن تھا علم اسلام کا   ان لبوں پر ورد تھا اللہ کے پیغام کا
آیۂ رحمت تھے یہ سارے زمانے کے لئے   آئے تھے اجڑی ہوئی دنیا بسانے کے لئے
ہوگئیں آباد ان کے نام سے آبادیاں   رشک جنت بن گئیں ان کے لہو سے وادیاں
پیکر ہستی میں جب روح محبت بھر چکے   آئے تھے جس کام کو وہ کام پورا کرچکے
قبلہ رو ہو کر مصلوں پر نمازی سوگئے   فتح کر کے جنگ کو مردان غازی سوگئے
رات ان کی ہے روز عیش کی تمہید ہے
ان شہیدوں کے لئے صبح قیامت عید ہے

(شہیدوں کی عید) [۱]

حفیظ کے کلام میں اثر آفرینی اور شگفتگی نظر آتی ہے- الفاظ سادہ اور آسان استعمال کرتے ہیں- حب الوطنی پر ان کی نظمیں نہایت اہمیت کی حامل ہیں- خاص و عام میں یہ نظمیں یکساں مقبول ہیں- قومی و معاشرتی نظموں میں اقبال کے اثرات اسلامی فکر کے آئینے میں دیکھے جاسکتے ہیں- وطن سے محبت کا یہ انداز ملاحظہ کیجئے ؎

رشک عدن ہے باغ وطن بھی   گل بھی ہیں موجود گل پیرہن بھی
نازک بدن بھی غنچہ دہن بھی   لیلیٰ روش بھی شیریں سخن بھی

۱- ماہنامہ افکار- حفیظ نمبر، ص ۳۷۰

اس کے بھی اک بار کر لے نظارے
اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے
(اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے)

اختر شیرانی:

یہ وادی رومان کے شاعر ہیں لیکن فطرت نگاری اور حب الوطنی پر ان کی نظموں نے جو جادو جگایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ وطن کی محبت میں جو نظمیں لکھی ہیں ان میں اقبال کی فکر کو دیکھا جا سکتا ہے۔ سیاسی ماحول کے پیش نظر انہوں نے بھی اقبال کی طرح اہل وطن کے دلوں کو اپنی نظموں سے بیدار کیا۔ آزادی کی جنگ میں بحیثیت شاعر شریک ہوئے۔ قوم کو ایسے نغمے دیئے جو آج بھی یادگار ہیں۔ اقبال کے خطیبانہ اسلوب کو اختر شیرانی کی نظموں میں ملاحظہ کیجئے ؎

دشمن ہے قریب اور خطرے میں ہے ماہ لقائے آزادی
دل میرا نثار آزادی، جاں میری فدائے آزادی
اٹھ جلد کہ غاصب چھین نہ لیں ہاتھوں سے نوائے آزادی
وہ ہلہلۂ یلغار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا
ناموس وطن کو غیروں کے پنجے سے بچانے جاتے ہیں
مدت سے ہیں پیاسی تلوار پیاس ان کی بجھانے جاتے ہیں
دشمن کی تڑپتی لاشوں کا کھیل ان کو دکھانے جاتے ہیں
لا برق فنا آثار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا
(ساقی اٹھ تلوار اٹھا)

اختر شیرانی کی نظم ''نوید'' اور اقبال کی نظم ''پیام صبح'' رنگ و آہنگ کے اعتبار سے مماثلت رکھتی ہیں ؎

سیاہی شب غم، منہ چھپانے والی ہے ۔۔۔ بہار صبح طرب لہلہانے والی ہے
نسیم مژدۂ راحت سنانے والی ہے ۔۔۔ نہ رو نہ رو کہ خوشی مسکرانے والی ہے
غم و الم کے سمندر، سمٹنے والے ہیں ۔۔۔ ہراس و یاس کے طوفان مٹنے والے ہیں
سحر امید کی جلوہ دکھانے والی ہے ۔۔۔ نہ رو نہ رو کہ خوشی مسکرانے والی ہے
(نوید)[1]

۱- شہرود، ص ۵۳

مصطفٰے زیدی:

ان کی نظموں میں سیاسی وسماجی شعور کے ساتھ عصری آگہی کے نقوش بھی نظر آتے ہیں۔نظموں میں زیادہ تر جوش اور اقبال کے اثرات پائے جاتے ہیں۔"ساعت جہد" میں اقبال کے تیور ملاحظہ کیجیے ؎

دیکھنا اہل جنوں ساعت جہد آ پہنچی   اب کوئی نقش بہ دیوار نہ ہونے پائے
اب کے کھل جائیں خزانے نفس سوزاں کے   اب کے محرومی اظہار نہ ہونے پائے
یہ جو غدار ہے اپنی ہی صف اول میں   غیر کے ہات کی تلوار نہ ہونے پائے
یہ نئی نسل اس انداز سے نکلے سر رزم   کہ مورخ کی گنہگار نہ ہونے پائے

(ساعت جہد) [۱]

ایک اور نظم "ماہ وسال" ملاحظہ کیجیے ؎

اسی روش پہ ہے قائم مزاج دیدہ و دل
لہو میں اب بھی تڑپتی ہیں بجلیاں کہ نہیں
زمیں پہ اب بھی اترتا ہے آسماں کہ نہیں؟
کسی کی جیب و گریباں کی آزمائش میں
کبھی خود اپنی قبا کا خیال آتا ہے
ذرا سا وسوسۂ ماہ و سال آتا ہے؟

(ماہ وسال) [۲]

فراق گورکھپوری:

فراق غزل اور نظم دونوں میں یکساں کمال رکھتے ہیں۔نظموں میں اقبال کی فطری شاعری سے متاثر ہیں۔موضوعات بھی وہی اختیار کیے ہیں جو اقبال کا خاصہ ہیں۔چند شعر نمونے کے طور پر ملاحظہ کیجیے ؎

یہ مہر و ماہ بھی اڑتے ہوئے شرارے ہیں
کہ عرش تک ہے محبت کے پیچ و تاب کی آنچ
کوہ و صحرا میں بھی یہ درماندگی
یہ بھی ہیں شاید ترے غم دوستدار
کچھ بھی عیاں نہاں نہ تھا کوئی زماں و مکاں نہ تھا
دیر تھی اک نگاہ کی پھر یہ جہاں جہاں نہ تھا

۱۔ کلیات مصطفٰے زیدی،ص ۲۶

۲۔ کلیات مصطفٰے زیدی،ص ۱۷

فراق کی نظمیں جس دور میں لکھی گئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انقلابی دور تھا۔ اس مناسبت سے فراق کی تخلیقات پر اقبال کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں ؎

فضا کی اوٹ میں مردوں کی گنگناہٹ ہے
یہ رات موت کی بے رنگ مسکراہٹ ہے
دھواں دھواں سے مناظر تمام نم دیدہ
خنک دھندلکے کی آنکھیں بھی نیم خوابیدہ

مندرجہ بالا نظم میں انسانیت اور عصری آگہی کا جو شعور ہمیں ملتا ہے یہ بھی فراق کا اعتراف ہے کہ انہوں نے نظموں میں فطری مناظر کے ساتھ معاشرتی تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھا۔ اس طرح اقبال کی مکمل تقلید کرتے ہوئے فراق نے نظموں میں خاصہ اضافہ کیا ہے۔

فیض احمد فیض:

ان کے ہاں تقلید بھی ہے اور تخلیق بھی لیکن نظموں میں مغربی اثرات کے علاوہ برصغیر کے حالات بھی پیش نظر رہے اور ایک خاص نظریے کے تحت نظموں میں تصورِ انسان و کائنات کو موضوع بنا کر قومی و معاشرتی تقاضوں کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اقبال کی نظموں سے کسب فیض کرتے ہوئے اشتراکیت کے نظریے کو فروغ دیا ؎

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن نہ تھی تری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے عتاب جرم سخن سے پہلے

اقبال دنیائے شاعری پر اس طرح چھائے ہوئے ہیں کہ انہوں نے اپنے بعد کے شعراء کو جس انداز سے متوجہ کیا ہے، وہ اقبال کی ہمہ گیر شخصیت اور اثرات کا ثبوت ہیں۔ فیض کی نظمیں یوں بھی زندہ رہنے والی ہیں کیونکہ ان نظموں میں غم عشق، غم دوراں کی حکایتیں منظوم پیرایہ میں ادا کی گئی ہیں۔

احمد ندیم قاسمی:

ان کے تمام مجموعہ ہائے کلام اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ انہوں نے اقبال کو ایک رہنما اور رہبر کے طور پر تسلیم کیا ہے اور ان کی صحبتوں سے فیضیاب ہوئے ہیں۔ ندیم کے مجموعے ''جلال و جمال'' اور ''دشت وفا'' کی نظمیں اس بات کی آئینہ دار ہیں کہ انہوں نے اقبال سے رنگ و آہنگ کے علاوہ انسانیت کا رجحان اخذ کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے ؎

تقدیر پر روتے ہوئے دہقاں کو خبر کیا
مٹی کبھی نم ہو نہ سکی آنکھ کے نم سے

سیم و زر آدمی کے چاکر تھے
آدمی سیم و زر کے کام آیا

ظلمت شب نے کیا دن کا تصور ممکن
یہ اندھیرا تو اجالے کا سہارا نکلا

اس کا ستم بھی عدل سے خالی نہیں ندیم
دل لے کے شاعری کا سلیقہ دیا مجھے

زندگی بھر آگ پھانکی ہے ندیم
اک دیا دل کا جلانے کے لئے

یہاں چند شعراء کے منتخب اشعار دیئے جاتے ہیں، ان نظموں میں اقبال کی براہ راست تقلید ملاحظہ کیجئے —

کلیاں چٹکیں غنچے مہکے
رنگ برنگے پنچھی چہکے
اپنی اپنی باتیں کہہ کے
کون بتائے کہاں گئے ہیں
بوڑھا برگد سوچ رہا ہے

میراجی، سیپ (بقاء)

شگوفہ ہائے زندگی کے برگ تھے کھلے ہوئے
مگر وہ حسن بوئے گل فسردہ ہو کے چل دیا
بکھر کے پتیاں گریں گل و گیاہ مل کے
خزاں کے ہاتھ نے انہیں مسل دیا مسل دیا
وہ بوئے گل کا شرگیں خمار بھی نہ تھا کہیں
اور اس کرن کا آخری شرار بھی نہ تھا کہیں

میراجی، سیپ (امید)

یہ لطف کریمانہ خوش دلاں بھی، یہ پرغیظ خوئے سگاں بھی،
مرے ساتھ، رو میں ہیں، لوگوں کو جتنے روپے، یہ سب کچھ، یہ سارے قصے،
غرض مندیاں ہی غرض مندیاں ہیں، یہی کچھ ہے اس رہگذر پر متاع سواراں
میں پیدل ہوں، مجھ کو جلوس جہاں سے اپنی ٹھوکروں کی روایت ملی ہے

مجید امجد، سیپ (جلوس جہاں)

تو کہ ہے شناور تشنہ لب
جو وقار و حرمت داستاں
وہی حرف مہمل و بے زباں
تری تشنگی نہ بجھا سکا
کوئی جام جم، کوئی بادیہ

ادا جعفری، سیپ (کوئی آئینہ)

اڑ رہی ہیں از زمیں تا آسماں دامن لیلائے شب کی دھجیاں
وقت کے ماتھے پہ ہے صدیوں کی دھول مل رہا ہے چاند چہرے پر بھبول
بجھ رہے ہیں غم و ماہ و کہکشاں ہوچکا گل ہر چراغ آسماں
اب کسی چہرے پہ عیاری نہیں اب کوئی آئینہ زنگاری نہیں

پروفیسر شور، فنون (افسون خواب)

یہ سب کچھ ٹھیک ہے پر اس سے جی گھبرا بھی جاتا ہے
اگر موسم نہ بدلے آدمی اکتا بھی جاتا ہے
کبھی یونہی سہی میں اور کو اپنا بنا لیتا
تمہارے دل کو ٹھکراتا، تمہاری بد دعا لیتا
کبھی میں بھی یہ سنتا تم بڑے ہی بے مروت ہو
کبھی میں یہ بھی کہتا تم تو سر تا پا حماقت ہو

خلیل الرحمٰن اعظمی، ادبی دنیا (بدلتے موسم)

عقل کی انتہا جہاں، عشق کی ابتدا وہاں
مکتب دل کا مبتدی، عقل و خرد کا منتہی
عشق تمام زندگی! عشق تمام سرخوشی!
عشق تمام بے خودی! عشق تمام آگہی

اثر صہبائی، ادبی دنیا (کیف و سرور)

عشق ہے اپنی شریعت میں ہر آئین سے پاک
عقل ہے سر پہ لئے سینکڑوں الزام ابھی
عشق کے فیض سے الہام بداماں ہوں اسیر
عقل کم حوصلہ ہے منکر الہام بھی

علامہ سرپرکابری، مہر نیم روز (عشق و عقل)

ذات سے باہر شور قیامت
ذات کے اندر خاموشی
زیست عبارت ہنگاموں سے
موت کے معنی روپوشی

جمیل ملک، سیپ، (پرکھ)

تنہائی جنگل ہے جس میں سناٹا ہے
سناٹے میں جانے کتنے ناگ چھپے ہیں
سناٹے میں جانے کیسی آگ چھپی ہے
ناگ مری آنکھوں کے شعلے
آگ مرے سینے کا الاؤ
تنہائی کا جنگل جس میں
وحشت ایک درندہ جس نے
میرے جسم کو نوچ لیا ہے

احمد ظفر، سیپ، (ایک شام)

جس ڈگر پر ہوگیا دو نیم مہتاب نظر
جس جگہ پر ہوگئی تقسیم شہراہ عظیم
ہے وہاں
ایک مرد نا تواں اپنا عصا ٹیکے ہوئے
سال خوردہ جسم کی سب سلوٹوں کو آئینہ دار آئینہ کھولے ہوئے

ادیب سہیل، سیپ (ماہ دو نیم)

سمندر ہوں، مری گہرائیوں میں
نجانے کتنی یادوں کے خزانے
نجانے کتنے قصے اور فسانے
اگر ڈھونڈے تو پا سکتا ہے کوئی
مجھے پڑھ کر سنا سکتا ہے کوئی

اطہر نفیس، سیپ (تعارف)

ہر سمت خلائے بیکراں ہے تاحد نظر دھواں ہے
ظلمات کا ایک دائرہ ہے جو مثل سکوت گونجتا ہے
جھگڑا ہی نہیں ہے کفر و دیں کا ''ہے'' پر بھی گمان ہے ''نہیں'' کا
کچھ ہے تو وہی ہے، جو نہیں ہے اور وہ جو نہیں ہے،، ہر کہیں ہے

احمد ندیم قاسمی، فنون (کُن کے قریب کا ایک لمحہ)

مٹی ایک ایسی کسوٹی ہے جو ہر انساں کو
اس کی قیمت کی بلندی کا پتہ دیتی ہے
مٹی ایک ایسی ردا ہے کہ جو ہر لمحے میں
سینکڑوں جسموں کو دامن میں چھپا لیتی ہے

امجد اسلام امجد، فنون (مٹی)

ٹھہرائے ہوائے مراجعت کہ نئے گلوں کا ظہور ہے
جو بجھے پڑے ہیں، شرر بنا کہ زمیں کی صبح غرور ہے
کہ سحر میں بوئے نجات ہے

مبارک حیدر، فنون (۱۹۶۵ء کی ایک نظم)

لہو لہان مرے شہر میرے یار شہید
مگر یہ کیا کہ مری آنکھ ڈبڈبائی نہیں
نظر کے زخم جگر تک پہنچ نہیں پائے
کہ مجھ کو منزل اظہار تک رسائی نہیں
میں کیا کہوں کہ پشاور سے چاٹگام تلک
مرے دیار نہیں تھے کہ میرے بھائی نہیں

احمد فراز، فنون (میں کیوں اداس نہیں)

ان گنت حسرتوں میں ایک امید
جیسے عصر کہن کی لاشوں پر
تھرتھرائی ہو تابش خورشید

ظہر کاشمیری، نقوش (پھر وہی بات)

خون چوسا جان لی اب جسم بھی کھاتے ہو تم
اے سیاسی کرگسو کیوں ظلم فرماتے ہو تم
ایشیاء کے غم میں کیوں دبلے ہوئے جاتے ہو تم
اب بلا سے کچھ بھی ہو تم نے تو گھر کو بھر لیا، کام اپنا کر لیا
لوٹ پر بنیاد ہے جن کی وہ رشتے توڑ دو، ایشیاء کو چھوڑ دو

عرش ملسیانی (ایشیاء کو چھوڑ دو)

میں کب تک اپنے ہی دکھ کے گیت اپنے خول میں رہ کے گنگناؤں؟
جمود ہے اک جہاں پہ طاری، میں کیوں نہ ایسے میں باہر آؤں؟
غرض کے بندوں نے زندگانی کو ایک مرگھٹ بنا دیا ہے
اسنکھ لوگوں کو کیچوؤں کا ذلیل جیون عطا کیا ہے

تاجور سامری (رات مر رہی ہے)

تم کہو گے دن تو میں بھی دن کہوں گا،
ہو بلا سے رات آدھی
میں کہوں گا رات
تم سورج چمکتا ہو تو اس کو چاند سمجھو گے
تمہاری آنکھ میں آنسو نظر آئیں گے جب
میں تعزیت کے ریشمی رومال سے پونچھوں گا ان کو

مظفر حنفی (کچھمن ریکھا)

اقبال نے مسلمانوں کو بیدار کرنے میں اپنی پوری قوت صرف کر دی تھی لیکن اقبال کے بعد جن شعراء نے معاشرتی احساس کو نظموں میں پیش کیا ہے وہ اقبال کی کامل تقلید کا پرتو ہے۔تقسیم ہند کے بعد جو نظمیں تخلیق ہوئیں ان میں قومی، مذہبی رجحان کا پایا جانا ضروری امر تھا لہذا چند شعروں پر اکتفا کرتے ہوئے یہ تجزیہ کرنا ہے کہ اقبال کے اثرات قبول کرنا ناگزیر تھا۔نمونے کے طور پر ایک ایک شعر ملاحظہ کیجئے ؂

قاصدا قیمت گلگشت بہاراں کیا ہے ان دنوں رسم و رہ شہر نگاراں کیا ہے

فیض

وہ دیا جلانا گناہ ہے جو فریب رنگ ضیائیں دے
کوئی ایسا حرف رقم کروں مری لوح مجھ کو دعائیں دے

محشر بدایونی

سپاہ شام کے نیزے پہ آفتاب کا سر
کس اہتمام سے پروردگار شب نکلا

افتخار عارف

خوش رہیں تیرے دیکھنے والے
ورنہ کس نے خدا کو دیکھا ہے

ذہین شاہ تاجی

ناگہاں نور میں نہلا گئے دشت و دمن
فکر اقبال کا مہتاب ہوا جلوہ فگن
ہو گئے بزم تماشا کے دریچے روشن

سید عابد علی عابد

اقبال نے ''ساقی نامہ'' میں اپنے دور کی عکاسی کی ہے اور خودی کا ادراک بھی دیا ہے، اسی طرح عابد علی عابد نے اقبال سے متاثر ہو کر ''ساقی نامہ'' تحریر کیا ہے، نمونے کے طور پر ایک شعر ملاحظہ کیجئے ؎

خرد ہے زمانے میں دامن کشاں اٹھا ساقیا ساغر گلفشاں

سید عابد علی عابد

صہبا اختر خالصتاً نظم کا شاعر ہے۔ ان کی نظموں کا زیر و بم، غور و فکر اور وطن پرستی پر اقبال کے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ آزادی پر ایک بند ملاحظہ کیجئے ؎

قدر آزادی کرو، ورنہ رفیقان بہار
گر یہ آزادی کسی سے روٹھ جائے ایک بار
کرنا پڑتا ہے اسے پھر صدیوں اس کا انتظار
صبح آزادی کا سورج، جسم و جاں کا قرض ہے
اس کی کرنوں کی حفاظت، اب تمہارا فرض ہے

صہبا اختر [1]

صہبا نے اپنے مجموعہ میں اقبال کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''طویل نظموں کی عظمت کا سب سے زیادہ وقیع ثبوت علامہ اقبال کی ان شہرۂ آفاق نظموں میں ملتا ہے جو ہماری شاعری کی دنیا میں ''آسمان سخن'' کا درجہ رکھتی ہیں اور شاید اقبال کی شاعری اتنی محیط اور بسیط اس لئے محسوس ہوتی ہے کہ وہ نظم کی شاعری ہے اور اس علم و فضل کی شاعری ہے جو اقبال کے کسب کمال کا جوہر ہے۔'' [2]

۱- اختر صہبا، سرکشیدہ، ص ۱۳۸

۲- اختر صہبا، سمندر، ص ۱۱

صہبا نے تلمیحات کا نظام اور معاشرتی قدریں اور انسانی وقار پر اقبال کے زیر اثر نہایت عمدہ نظمیں لکھی ہیں، دو بند ملاحظہ کیجیے ۔

زلزلوں میں کہاں، نغمگی کا ظہور
آج داؤدؑ ہے اور رنج زبور
آج تخت سلیمانؑ ہے ظلمت نشیں
آج ہر صومعہ، نور ہیکل سے دور
سامری کا خدا ہے، خدائے یہود
اور ''سونے کا بچھڑا'' دلوں کا سرور
گو ہے قارون، مدفون خاک سیاہ
پھر بھی زندہ ہے قارونیت کا غرور

عہد نو کے بھی فرعون و شداد ہیں
فرق کچھ بھی نہیں، نام کا فرق ہے
مسلک ظلم و بیداد بھی مشترک
ایک ہی شجرۂ آتش و برق ہے
ایک سی تیغ دونوں کے ہاتھوں میں ہے
ایک سے خوں کے دریا میں جو غرق ہے
ان کی تلوار کی ہر چمک خون ہے
ہر گرج خون ہے ہر دھمک خون ہے

ایک نوحہ ایک آواز [1]

احمد فراز:

بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن انہوں نے نظموں میں بھی ایک نئی روح پھونکی ہے۔ نئے موضوعات کی روشنی میں جدید آہنگ کو اپناتے ہوئے قتل وخون کے مناظر، معاشرتی زبوں حالی اور ماحول کی بھرپور عکاسی ان کی نظموں کی شناخت بن گئی۔ ہیئت واسلوب اور فکری اپج کے اعتبار سے بھی فراز نے اقبال کے اثرات قبول کئے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے ۔

کج کلاہوں سے کہہ دو کہ اے بے خبرو
طوق گردن سے نہیں طرہ دستار جدا
کوئے جاناں میں خاصہ تھا طرحدار فراز
لیکن اس شخص کی سج دھج تھی سردار جدا

۱۔ اختر صہبا، سمندر، ص ۲۸۲

اس عہد ظلم میں میں بھی شریک ہوں جیسے
مرا سکوت مجھے سخت مجرمانہ لگا

رات کو آخر بدلنا تو ہے دوستو، اس قیامت کو ٹلنا تو ہے دوستو
اس طرف ہم کو چلنا تو ہے دوستو، جس طرف فصل دار و رسن جائے گی

(احمد فراز)

پاک و ہند کے چند شعراء کے اشعار نہایت اختصار کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں- یہ اشعار خالصتاً اقبال کے اثرات کا اظہار ہیں اور ساتھ ہی اعتراف بھی- ان اشعار میں قومی و معاشرتی قدروں کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی قلم اٹھایا گیا ہے یعنی اقبال کے اثرات دیگر شعراء کی نظموں میں بکھرے نظر آتے ہیں- انہیں سمیٹ کر یکجا کر دیا گیا ہے- اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال ہی وہ عہد آفریں شاعر ہے جس کا شاعری کا تاج آج بھی جھلملا رہا ہے-

بچوں کے لئے خصوصی نظمیں:

اقبال نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کہ بچوں کی ذہنی تربیت اس طرز پر کی جائے کہ جس سے ان کے اخلاق و کردار اعلیٰ اوصاف کے حامل ہوں- انہیں ان واقعات اور حکایات کے ذریعے دلچسپی کا سامان فراہم کیا جائے تاکہ بچوں میں شوق و عمل کا جذبہ پیدا ہو سکے- اس کے علاوہ بچوں میں محنت اور جفاکشی کا رجحان پایا جائے- اقبال نے اصلاحی، اخلاقی اور ذہنی تعمیر پر بھرپور توجہ دی- اقبال کے ہاں تشبیہات و استعارات کا ایک مکمل نظام ملتا ہے جو فنی اصطلاح کے لحاظ سے بڑا جاندار ہے مثلاً محاورات وضرب المثل، تلمیحات، تراکیب لفظی اور قدرت بیان کی خوبی اپنی جگہ مسلم ہے اس لئے ان کی نظمیں دل پر اثر کرتی ہیں- خواہ وہ عمر کسی بھی حصے میں ہو لطف اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتا- بچوں کے لئے اقبال نے جو نظمیں لکھی ہیں ان میں ''بچے کی دعا''، ''ایک مکڑا اور مکھی''، ''ایک پہاڑ اور گلہری'' اور ''پرندے کی فریاد'' یہ وہ نظمیں ہیں جو سبق آموز بھی ہیں اور اخلاق و کردار کے بہتر بنانے میں بھی کارآمد ہیں- اقبال کی نظم ''بچے کی دعا'' پر یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''''بچے کی دعا'' اردو میں بچوں کے لئے لکھی گئی مقبول ترین نظموں میں سے ایک ہے- اس کی مقبولیت کا راز اس تاثیر میں پوشیدہ ہے جو وقت اور عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ ہلکا ہونے کے بجائے اور گہرا ہوتا جاتا ہے- اگرچہ انتخاب الفاظ، انداز بیان اور تشبیہات و تمثیلات کے اعتبار سے یہ نظم دوسری نظموں کے مقابلے میں کسی قدر مشکل ہے لیکن الفاظ کا حسن ترتیب، بیان کی شگفتگی اور مصرعوں کی ہم آہنگی اس قدر موثر اور دلنشین ہے کہ بعض نامانوس عناصر کی موجودگی کے باوجود ہر مصرعہ ذہن پر ایک نقش مرتسم کرتا جاتا ہے-'' [۱]

۱- اردو میں بچوں کا ادب، ص ۱۹۰

حفیظ جالندھری:

حفیظ نے اقبال کی براہ راست تقلید کرتے ہوئے جو نظمیں بچوں کے لئے لکھی ہیں وہ اتنی دلکش اور پر اثر ہیں کہ بچے پڑھنے کے دوران ہی یاد کر لیتے ہیں۔ ان کی نظموں میں ترنم اور نغمگی کا جو رچاؤ نظر آتا ہے اس میں سادگی اور سلاست کا بڑا دخل ہے۔ حفیظ کی نظموں کے موضوعات جو بچوں کے لئے منتخب کئے ہیں مثلاً ''مانو بلی کا سبق''، ''کسان لڑکا''، ''بول میرے مرغے''، ''چڑیا بلی''، ''ننھے منے بچے''، ''استاد آ گئے''، ''مچھلیوں کے ماسٹر جی'' اور ''خدا سب کچھ دیکھتا ہے''۔ حفیظ جالندھری بچوں کے رسالے کے مدیر بھی رہے جن میں ''نونہال'' اور ''پھول'' نمایاں ہیں۔ پنڈت ہری چند اختر حفیظ کی نظموں پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس طرح اگر ان نظموں کو دیکھیں جو حفیظ نے بچوں کے لئے لکھی ہیں تو شاعری کی اس صف میں بھی حفیظ مخترع نظر آئے گا خصوصاً جو نظمیں صغیر السن بچوں کے لئے ہیں، ان میں تو شاعر نے کمال اختراع کا حیرت انگیز ثبوت دیا ہے۔'' [۱]

حفیظ جب بچوں میں گھل مل جاتے ہیں تو بچے بن جاتے ہیں اور انہیں یہ احساس نہیں ہونے دیتے بلکہ باتوں باتوں میں کام کی باتیں کر جاتے ہیں۔ کھیل ہی کھیل میں ایک نظم ''کبڈی''، جس میں بچوں کی دلچسپی کا سامان موجود ہے ؎

ادھر آؤ جی ٹولیاں دو بنالیں   لکیر ایک کھینچیں، نشاں اک لگا لیں
چلے ایک لڑکا نشاں سے نکل کر   مقابل کی ٹولی پہ جھپٹے سنبھل کر
زباں سے یہ کہتا ہوا چل کبڈی
چلا چل کبڈی چلا چل کبڈی

(کبڈی)

نظم ''مانو بلی'' میں سے دو بند ملاحظہ کیجئے ؎

اچھا اب پنجوں کو سمیٹ یہ ہے پنسل اور سلیٹ
جو کچھ لکھوں دیکھتی جا میں نے کیا لکھا ہے بتا
اک دو تین۔ ہوئے چھ بس چار ملا کر بن گئے دس
دس اور دس ہوتے ہیں بیس بیس اور بیس ہوئے چالیس
بیس ہوں اور تو بن گئے ساٹھ اب ان میں سے نکالے آٹھ
اچھا مانو! تو بتلا
رہتا اب باقی کیا

(مانو بلی کا سبق)

بچے حفیظ کی نظموں کو پڑھ کر انہیں اپنا دوست اور ہمنوا سمجھتے ہیں۔ ان کی ایک اور نظم ''سونے والو جاگو'' ملاحظہ کیجئے ؎

جاگو سونے والو جاگو وقت کے کھونے والو جاگو
جاگے عبادت کرنے والے سجدوں میں سر دھرنے والے

۱۔ افکار۔ حفیظ نمبر، ص ۴۹۲

باغ میں چڑیاں بول رہی ہیں کلیاں آنکھیں کھول رہی ہیں
پھول خوشی سے جھوم رہے ہیں پتوں کا منہ چوم رہے ہیں
کوے کالے کالے جاگے سب کو جگانے والے جاگے
منہ دھو دھا کر ناشتہ کھاؤ
بستہ لے کر مدرسے جاؤ

(سونے والو جاگو)

ان کی نظموں میں خوشی اور مسرت کا جو رجحان پایا جاتا ہے، وہ بچوں کی نفسیات کا ادراک ہے کیونکہ بچوں کے دل و دماغ کو پیش نظر رکھ کر ایسا ادب تخلیق کرنا جس سے بچوں میں خود اعتمادی اور ذہنی استعداد میں اضافہ ہوتا ہو- اقبال کی نظموں میں بلند آہنگی پائی جاتی ہے جبکہ حفیظ کی نظموں میں بزلہ سنجی، شگفتگی اور سادگی پائی جاتی ہے-

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم:

بچوں کی شاعری میں ایک انفرادی حیثیت رکھتے ہیں- ان کی مشہور نظم ''ٹوٹ بٹوٹ کی لاری'' ہے- ان کی نظموں میں اقبال کی وہ نظمیں جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں، فکری عوامل کو دیکھا جا سکتا ہے- انفرادیت کی پہلی وجہ یہ ہے کہ تبسم بچوں کی نفسیات سے واقف ہیں کیونکہ بچے پرندوں، جانوروں اور محیر العقول باتوں میں دلچسپی لیتے ہیں، اسی وجہ سے انہوں نے نظموں میں بچوں کے ذہن اور ان کے شوق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسی نظمیں تخلیق کی ہیں جو زندہ جاوید کا درجہ رکھتی ہیں مثلاً ''ٹوٹ بٹوٹ'' ہی کو لے لیجئے، اس نظم سے شہرت دوام حاصل کر کے بچوں اور بڑوں میں مقبول اور محترم ہو گئے- اقبال کے صوتیاتی نظام کا اثر تبسم کی نظموں میں دیکھا جا سکتا ہے- نظم ملاحظہ کیجئے:-

ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ
باپ تھا اس کا میر سلوٹ
پیتا تھا وہ سوڈا واٹر
کھاتا تھا بادام اخروٹ
ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ
ممسن لٹو نام تھا اس کا
گھومتے رہنا کام تھا اس کا
صبح کو ہوتا کلکتے میں
شام کو ہوتا چڑیا کوٹ
ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ

(ٹوٹ بٹوٹ)

شفیع الدین نیر:

ان کی شاعری بچوں کے لئے مخصوص ہے۔''بچوں کا تحفہ'' جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔نظموں کی خصوصیت میں صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ جامع ،دلکش،سادہ زبان،معلومات کا ذخیرہ اور اخلاقی تعلیم سے بچوں کے ذہن کو اعلیٰ شعور دینا۔ان کی نظم ''ریل'' جو پہیلی میں ہے،ملاحظہ کیجئے ؎

میں کیا ہوں یہ بتلاؤ تم پھر گھی اور شکر کھاؤ تم
میں چھک چھک چھک کرتی ہوں میں بھک بھک بھک کرتی ہوں
ناگن کی طرح لہراتی ہوں اتراتی ہوں بل کھاتی ہوں
جو دیو مجھے کھاتا ہے وہ آگ اور پانی کھاتا ہے
یہ خوں خاں کرتا رہتا ہے
یہ شوں شاں کرتا رہتا ہے

(ریل)

ڈاکٹر اسدار یب ان کی نظموں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''انہوں نے اردو میں بچوں کے لئے نئی طرز کی ایسی نظمیں لکھیں جن میں مئیسوری تعلیم کا اثر غالب ہے اس لئے ان کے گیتوں اور نظموں کو گایا بھی جاسکتا ہے اور اشاروں کی مدد سے ادا بھی کیا جاسکتا ہے۔''[1]

نیر کی نظم ''بندر کی کہانی'' ملاحظہ کیجئے کیونکہ بچے جانوروں سے بے پناہ خوش ہوتے ہیں ؎

یہ بندر کی کہانی ہے بھی پرانی ہے
وہ بندر تھا بڑا موٹا مگر عادت کا تھا کھوٹا
کوئی بچہ اگر آتا کوئی پھل ہاتھ میں لاتا
جھپٹ کر چھین لیتا وہ اسے واپس نہ کرتا وہ

(بندر کی کہانی)

وہ نظمیں جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے پیش کی جاتی ہیں جس کے پڑھنے سے بچوں کے ادب اور شاعری کا اندازہ ہو سکے ؎

ہم نے بکری کے بچوں کو کمروں میں نچانا چھوڑ دیا
ناراض نہ ہو امی ہم نے ہر شوق پرانا چھوڑ دیا
پنجروں میں بند جو رہتی تھیں سب پھر سے اڑادیں وہ چڑیاں
مرغوں میں صلح کراتے ہیں مرغوں کو لڑانا چھوڑ دیا

مہدی علی خاں (بچوں کی توبہ)

۱- بچوں کا ادب تاریخ وتنقید،ص ۱۷۹

جنگل میں کچھ پرندوں نے اونچے درخت پر
مل جل کے شاندار کیا ایک مشاعرہ
بیٹھے تھے سب کلام سنانے کے موڈ میں
چوں چوں کا شور تھا تو کہیں ٹائیں ٹائیں کا

محشر بدایونی (جنگل میں مشاعرہ)

دیکھو تارے اب مت گرنا اچھا نہیں چھجوں پر پھرنا
اب کے گیا گر جنگلا چھوٹ تو تم جاؤ گے بالکل ٹوٹ

شان الحق حقی (ٹوٹا تارا)

ایک تھا کتا ایک تھی بلی بلی تھی وہ بڑی چبلی
نہ تھا کتا کم چالاک سیدھی دم تھی بھیگی ناک
بلی نے دو چوہے پکڑے کتے نے دو چوزے پکڑے
کتے کے تھے لمبے کان بلی سب کی خالہ جان

شمس الرحمٰن فاروقی (کتا بلی، دلی دور)

اماں جب نکلے گا چاند چپکے چپکے آئے گا
میں جو پکڑنا چاہوں گا بادل میں چھپ جائے گا

اندر جیت شرما (چاند)

اور نہ مانو بڑوں کا کہنا کیچڑ ہی میں لیٹے رہنا
ہم نے منع کیا تھا منے مت کھیلو فٹ بال
کیسا چھل گیا سارا گال

مظفر حنفی (فٹ بال)

تیل بنا اک دیا جلے جو کہ سب کو راہ دکھائے
شام پڑے تو گل ہو جائے صبح کو پھر جل جائے

قتیل شفائی (سورج)

ایک ننھا سا ساتھی ایسا ہاتھ پکڑ کر ساتھ ہی جائے
بولے جیسے دل کی دھڑکن پل پل کا احساس دلائے

خاطر غزنوی (ہاتھ کی گھڑی)

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بچوں کا ادب اقبال کی وہ مجتہدانہ کوشش تھی۔ جس کے سائے میں رہ کر دیگر شعراء نے بھرپور تاثر قبول کیا اور بچوں کے ادب کا ایسا گلدستہ ترتیب دیا جس میں درسی کتب، افسانوی ادب، کہانیاں، داستانیں، شاعری، مختلف النوع افکار سے اقبال کے بعد بچوں کے ادب میں جو اضافہ ہوا ہے۔ وہ گراں قدر بھی ہے اور بچوں کے لئے افادیت کا سامان بھی ہے۔ بچوں کی ذہنی نشو و نما کے لئے بچوں کا ادب تخلیق کرنا نہایت ضروری ہے۔ تاہم اس ضمن میں خاصہ مواد بچوں کے لئے ادبا اور شعراء نے فراہم کر دیا ہے۔

طویل نظمیں:

اقبال کی طویل نظموں کے پس منظر میں سیاسی، تہذیبی اور صہیونی اثرات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اقبال کی طویل نظمیں مندرجہ ذیل ہیں ''شکوہ''، ''جواب شکوہ''، ''شمع وشاعر''، ''والدہ مرحومہ کی یاد میں''، ''خضر راہ''، ''طلوع اسلام''، ''ذوق وشوق''، ''مسجد قرطبہ''، ''ساقی نامہ''۔ رفیع الدین ہاشمی ان نظموں کے بارے میں رقمطراز ہیں:

> ''علامہ اقبال نے زیر مطالعہ طویل نظمیں ۱۹۱۱ء، ۱۹۳۵ء تک کے عرصے میں مختلف اوقات میں لکھیں۔ نظموں کی تفہیم اور بہتر مطالعہ کے لئے سب سے پہلے یہ کام کرنا ضروری ہے کہ ان کا پس منظر کیا ہے اور یہ نظمیں لکھتے ہوئے شاعر کی نظر کن حالات و عوامل اور اثرات پر تھی۔ اس سلسلے میں ہمیں عالم اسلام کے مختصر تاریخ خصوصاً بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی کے سیاسی، تاریخی اور تہذیبی پس منظر پر ایک نظر ڈالنا ہوگی۔'' [۱]

طویل نظموں میں اقبال کی فکری بلند پروازی، حسن فطرت کی تعریف، وطن پرستی اور نظریات، اس کے علاوہ نظریۂ حیات کی ترسیل ملتی ہے۔ اقبال کی نظم ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' میں ڈیڑھ سال کا وقفہ ہے۔ ان نظموں میں تخیل کی پرواز، پیکر تراشی اور خطابیہ انداز نہایت دلکش اور موثر انداز میں ادا ہوا ہے۔ نظموں میں بے تکلفانہ طرز اور اضطرابی کیفیت کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ دراصل یہ بے چینی ملت اسلامیہ کے زوال کا سبب تھی۔ ان حالات کے پیش نظر اقبال نے جدید علوم سے استفادہ کیا اور اس روشنی میں اپنی قوم کو اسلاف کے کارنامے یاد دلائے۔ زندہ قوموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ ظاہر میں تو وہ ترقی کر رہے ہیں لیکن ان کے دل ایمان سے خالی ہیں لیکن ملت اسلامیہ کو مخاطب کر کے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اسلام وہ واحد مذہب ہے جو طاقت اور ترقی کا سرچشمہ ہے۔ دراصل اقبال معاشرتی قدروں کو اخلاق کی کسوٹی پر پرکھتا ہے، ڈاکٹر یوسف حسین کا یہ کہنا اپنی جگہ درست ہے کہ:

> ''اقبال اپنے تخلیقی پیکروں کی تخلیق سے صرف اپنے دل کو ہجوم جذبات سے ہلکا نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ وہ تمدنی قدروں کو بھی تقویت پہنچانا چاہتا ہے۔ جس تمدنی گروہ سے اس کا تعلق ہے اس کی روایتوں اور اخلاقی ذمہ داریوں کو وہ شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ اس کے آرٹ میں شخصی اور داخلی عنصر کے علاوہ اجتماعی پہلو بھی موجود ہے۔ وہ محض تفنن طبع کے لئے شعر نہیں کہتا بلکہ اپنے مقاصد کے لئے ایک وسیلہ تلاش کرتا ہے۔ اس کے یہ مقاصد اس قدر بلند ہیں کہ ان کی بدولت خود اس کا آرٹ سربلند ہو گیا۔'' [۲]

اقبال نے اپنے آرٹ کو پیش کرنے کے لئے جن نظموں میں اظہار خیال کیا ہے۔ اسے طویل پیرایہ ہی میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ یہ اقبال ہی تھے کہ انہوں نے آنے والے شعراء کے لئے طویل نظم کا فارم دیا۔ اقبال کے بعد طویل نظم میں کئی نام آتے ہیں جنہوں نے اس کو خوب نبھایا ہے، ان میں جوش سرفہرست ہیں۔

۱۔ اقبال کی طویل نظمیں، ص ۱۳

۲۔ روح اقبال، ص ۳۴

جوش ملیح آبادی:

بیسویں صدی میں اقبال کے بعد دوسرا بڑا نام شاعری کی دنیا میں جوش کا لیا جاتا ہے۔ جوش کے مزاج کو دھنک رنگ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔ ایک طرف وہ اپنی نظموں میں حسن پرستی، بادہ پرستی اور رومان پرستی کا ذکر کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ انقلاب کی باتیں کرتے ہیں ع

''میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب''

جوش کے متعدد مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ ''روح ادب'' ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا، اس کے بعد یکے بعد دیگرے مجموعے شائع ہوتے رہے جن میں ''حرف و حکایت''، ''شعلہ و شبنم''، ''فکر و نشاط''، ''آیات و نغمات''، ''رامش و رنگ''، ''نجوم و جواہر''، ''عرش و فرش''، ''سنبل و سلاسل''، ''نقش و نگار''، ''سموم و صبا'' وغیرہ میں جوش نے اپنی طویل نظموں میں رومانی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ پھر قومی آزادی میں شامل ہو کر انقلابی نظمیں لکھیں، فطری مناظر کی دلکش منظر کشی کی۔ جوش نے خمریات میں بھی اضافہ کیا ہے۔ ''انقلاب'' پر بحث کرتے ہوئے علی سردار جعفری کے خیالات ملاحظہ کیجئے:

> ''انقلاب کا لفظ سیاسی اور سماجی تبدیلی کے خول میں سب سے پہلے اقبال نے استعمال کیا اور سیاسی انقلاب کا تصور بھی اردو شاعری کو اقبال ہی نے عطا کیا۔ سرمایہ دار، مزدور، زمیندار اور کسان، آقا، غلام، حاکم و محکوم کی باہمی کشاکش کے موضوعات پر سب سے پہلے اقبال نے نظمیں کہیں لیکن اس کے بعد بھی ''شاعر انقلاب'' کے خطاب کا حقدار جوش کو سمجھا گیا۔'' [۱]

علی سردار جعفری نے کس قدر مدلل اور جامع تبصرہ پیش کیا ہے۔ ان کے اس اقتباس کی روشنی میں تقلید کا جو رجحان دیگر شعراء میں آیا، اس کے سرخیل اقبال ہی ہیں۔ گو کہ جوش نے کئی جگہ اقبال کی تقلید سے انحراف کیا ہے لیکن ان کی نظموں میں کلیتاً اقبال ہی کا پرتو ہے۔ وہ اقبال کے اثرات سے خود کو بچا نہ سکے۔ بہر کیف یہاں ہم جوش کی طویل نظموں کا ذکر کرتے ہیں جن میں ملی جلی نظمیں ہیں۔

جوش کی چند طویل نظمیں جن میں رومانی، انقلابی اور سیاسی پس منظر کو دیکھا جا سکتا ہے:

۱۔	''وحدت انسانی''، مسدس ہیئت میں ہے	۳۶ بند،	مجموعہ	الہام و افکار
۲۔	''مردوں کی دھوم''، مسدس ہیئت میں ہے	۱۲ بند،	مجموعہ	الہام و افکار
۳۔	''رشوت''، مسدس ہیئت میں ہے	۲۳ بند،	مجموعہ	سموم و صبا
۴۔	''برسی ہوئی آنکھیں''، مسدس ہیئت میں ہے	۳۹ شعر،	مجموعہ	سموم و صبا
۵۔	''شکر پروردگار''،	۱۹ بند،	مجموعہ	سموم و صبا
۶۔	''ماتم آزادی''، مسدس ہیئت میں ہے			
۷۔	''جنگل کی شاہزادی''،			سرود و خروش

ان طویل نظموں میں تنوع اور رنگارنگی کے علاوہ انسانی اقدار کی ترجمانی کی گئی ہے۔ سماجی اور عمرانی معاملات کو جس خوبی

۱۔ ترقی پسند ادب، ص ۱۵۲

سے شاعری کے قالب میں ڈھالا ہے وہ انہی سے مخصوص ہے۔حسن و عشق جوش کے خاص موضوعات ہیں اس لئے وہ رومانی شاعر کی حیثیت سے بھی مشخص ہو چکے ہیں۔''جنگل کی شاہزادی'' اس کی واضح مثال ہے۔''مردوں کی دھوم'' ایک تنقیدی نظم ہے اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ قوم جو بظاہر زندہ ہے ان پر مردنی چھائی ہوئی ہے ؎

جو زندہ ہے مردے کا اٹھاتا ہے وہ لاشا
زندوں کو ہیں، کاندھوں پر اٹھائے ہوئے مردے

نظم ''رشوت'' خاصی طویل ہے، نظم کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ رشوت لینے کے کیا کیا طریقے وضع کئے ہیں۔ جوش نے رشوت کو ناسور سے تعبیر کیا ہے ؎

حال کے سکے کو ماضی کا جو سکہ دیکھ لے
سو روپے کے نوٹ کے منہ پر دونی تھوک دے

''وحدت انسانی'' میں جوش نے انسان کو انسانیت کا درس دیا ہے۔مختلف استعارات، تشبیہات اور مثالوں سے انسان کو افضل ترین مخلوق ظاہر کیا ہے۔نظم کا یہ بند ملاحظہ کیجئے ؎

اے دوست دل میں گرد کدورت نہ چاہیئے
اچھے تو کیا، بروں سے بھی نفرت نہ چاہیئے
کہتا ہے کون، پھول سے رغبت نہ چاہیئے
کانٹے سے بھی مگر تجھے وحشت نہ چاہیئے
کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو مرغزار کا
پالا ہوا ہے وہ بھی نسیم بہار کا

الہام و افکار [۱]

اس نظم کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوش نے انسانی احترام کو فوقیت دی ہے۔ انسانی اقدار کے مطالعے سے یہ نظم نہایت اہم ہے۔یوں بھی اقبال کے بعد نظم کا سب سے بڑا شاعر جوش ہی ہے۔ ان کی نظموں میں شباب بھی ہے اور انقلاب بھی، مناظر فطرت کو بھی اپنی گرفت میں لیا ہے۔ غلامی و آزادی پر بھی بڑی جاندار نظمیں کہی ہیں۔غرض کوئی پہلو ان کی نظموں میں تشنگی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا:

''جوش کی شاعری ایک ایسا ہشت پہلو نگینہ ہے، جس کی تابناکی سے شاعری کے بہت سے گوشے روشن ہوتے ہیں، جوش کا خروش و جلال آزادی کے بعد والے دور میں شاید بہت مقبول نہ ہو مگر ان کی شاعری میں جو دل دھڑکتا ہے اور جو چھکتا بولتا لہو گردش کرتا ہے، وہ زمانے تک سینوں کو گرماتا رہے گا۔'' [۲]

ان کی انقلابی نظموں میں تیزی و تندی کے علاوہ جارحانہ انداز پایا جاتا ہے۔ لہجہ میں تلخی انتہا کو پہنچ جاتی ہے خاص کر سیاسی نظموں میں یہ لہجہ اور کرخت ہو جاتا ہے۔''حرف آخر'' جوش کی طویل نظم مگر نامکمل رہی۔ اس میں انہوں نے عقل پرستی کو اہمیت دی

۱۔ ملیح آبادی۔ جوش، الہام و افکار، مکتبہ ادب جدید، لاہور، ۱۹۶۶ء ص ۳۰۹

۲۔ افکار، جوش نمبر، ص ۵۴۶

ہے۔علی سردار جعفری نے نظم کے چند بند اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں حوالے کے طور پر دیئے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ:

''اس میں علمی سنجیدگی، فلسفیانہ وقار، تشبیہوں اور استعاروں کی رنگینی اور ندرت،
پرشکوہ ترنم اور پرعظمت روانی، معنی آفرینی اور خیال آرائی کے امتزاج کا وہ معجزہ ہے،
جو اردو شاعری اس سے پہلے پیش نہیں کر سکی تھی۔'' [1]

ساغر نظامی:

ہمہ جہت اور نابغۂ روزگار حیثیت سے اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔نظم ونثر دونوں میں خوب سے خوب تر لکھا۔ ان کی کتاب ''بادۂ مشرق'' ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی تو پورے ہندوستان میں دھوم مچ گئی اور ملک گیر شہرت حاصل ہوئی۔ اس کتاب میں جو منظوم کلام ہمیں ملتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ساغر ایک سچے محبِ وطن تھے اور اپنے ملک کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔

دوسرا مجموعہ ''موج و ساحل'' ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں قومی نظمیں، غزلیں اور گیت دلکش انداز میں لکھے گئے ہیں۔
ان کی طویل نظموں میں ''پجارن''، ''بھکارن''، ''شکنتلا'' کالی داس کی ''ابھے گیان شکنتلم'' کا اردو ترجمہ ہے۔

''مشعل آزادی'' ایک طویل نظم ہے۔ یہ ہندوستان کی منظوم تاریخ ہے۔ رزمیہ نظم کی اعلیٰ مثال بھی ہے۔ سماجی و معاشرتی تناظر کو پیش نظر رکھا ہے۔ ساغر نے اپنی نظموں میں انسانیت عظمیٰ کا وقار، بغاوت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اپنی فکر کے تانے بانے بنے ہیں۔ ''شکنتلا'' اور ''انارکلی'' میں وہ ایک شاعر رومان کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئے ہیں۔ جبکہ ''مشعل آزادی'' اور ''نہرو نامہ'' میں وہ شاعر انقلاب کی حیثیت سے اقبال کی تقلید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ''نہرو نامہ'' طویل نظم ہے۔ اس میں مختلف بحریں ملتی ہیں۔ ساغر کا یہ جذباتی شاہکار ہے جو نہرو سے محبت کا آئینہ دار ہے۔ نہرو سے جو عقیدت ساغر کو تھی اس کا اندازہ ذیل کے چند شعروں سے ہو جاتا ہے ؎

زندگی اس کی آئینہ خانہ جس میں عکسوں کی ایک دنیا تھی
ہندو افریشا کا عکس جمال حریت اور نجات کے خد و خال
وہ پیامی بقائے باہم کا جس نے طوفاں کے رخ کو موڑ دیا
جس سے ہر ساز مست و بے خود ہے وہ کہتا ہوا ترانہ تھا

(نہرو نامہ)

''مشعل آزادی'' میں ساغر نے ظلم و استبداد کے خلاف اپنی فکر اور زورِ قلم سے کام لیا ہے ؎

چلے چلو دوستو کہ وحشت نشان ہے یاترا ہماری
ملے ہیں تاج و کلاہ مٹی میں، تخت ٹوٹے ہوئے پڑے ہیں
قدم قدم پر کھنڈر ہیں محلوں کے راستے سرخ ہو رہے ہیں
فضا تصور کی کانپتی ہے مگر ہمارا سفر ہے جاری

(مشعل آزادی)

۱۔ ترقی پسند ادب، ص ۱۶۷

اس نظم میں جذبہ سرفروشی، ظلم وتشدد کے خلاف باغیانہ تحریکوں کا ذکر ہے اس کے علاوہ جنگ آزادی کے شہداء پر نوحہ کناں بھی ہیں- ساغر کی فکری اور تخیل کے بارے میں یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''ساغر کا تخیل نئے دور کی آواز ہے، وہ نئے دور کا پیامبر ہے، وہ ہر جگہ انسان کے شعور، اس کی زندگی، اس کے ارتقاء اور اس کی خلاقانہ قوتوں کا ذکر کرتا ہے، وہ انسان کی عظمت کا معترف ہے، وہ اسے مجبور اور بے بس نہیں سمجھتا، قضا وقدر کا غلام دیکھنا نہیں چاہتا، وہ انسان کو نئے جہان کا خالق اور پروردگار تسلیم کرتا ہے- ساغر کی شاعری میں ایک ترقی یافتہ انسان کے تابندہ خدوخال نظر آتے ہیں-'' [1]

ساغر نظامی نے اپنی طویل نظم ''مشعل آزادی'' میں مختلف عنوانات سے نظم کو سجایا ہے مثلاً ''نیرنگ آزادی''، ''ارژنگ غلامی''، ''رازداں''، ''دریا''، ''شعلہ کا سفر''- ان عنوانات کا اپنا ایک پس منظر ہے-غرض منجملہ حیثیات سے ساغر نظامی کی نظم نگاری میں قوم پرستی اور وطن پرستی کا جو ذکر ہمیں ملتا ہے اس سے دلی کیفیات کا اندازہ ہوجاتا ہے- دراصل ساغر نے نظموں میں تنقید سے کام لیا ہے- ان کی نظموں میں جو طنز کارفرما ہے وہ فرقہ پرستوں اور مفاد پرستوں کے خلاف ہیں- وہ ایک ایسی جمہوریت کے داعی ہیں جو انسان کی فلاح اور آزادی کے لئے ہو- ان کی نظموں میں سب سے زیادہ طاقتور جذبہ انسان دوستی اور حب الوطنی کا ہے- ساغر نظامی طویل نظم نگاری میں اپنی ایک شناخت اور منفرد مقام رکھتے ہیں- ان کے کارناموں کو کسی بھی طور پر بھلایا نہیں جاسکتا-

حفیظ جالندھری:

حفیظ کو ملی شاعر بھی کہا جاتا ہے اور رزمیہ شاعر بھی- اس کے علاوہ نیچرل شاعری میں بھی خاصہ اضافہ کیا ہے- ان کے ہاں اظہار کا منفرد انداز پایا جاتا ہے- نظموں میں سادگی اور بے ساختہ پن کے ساتھ آفاقی احساسات بھی فکر کا اظہار ہے- اس نوع کی نظموں میں ''صبح وشام کہسار''، ''تصویر کشمیر''، ''شام رنگیں''، ''جلوۂ سحر''، ''بنجارہ پربت'' اور ''برسات'' لیکن حفیظ کی طویل نظموں میں ''شہسوار کربلا'' اور ''شاہنامہ اسلام'' کو فوقیت حاصل ہے- ''شاہنامہ اسلام'' میں تقریباً آٹھ ہزار شعر قلمبند کئے ہیں، بند ملاحظہ کیجئے -

تمنا ہے کہ پھر لہو ان کا اک بار گرماؤں دل سنگیں سخن کو آتشیں تیروں سے برماؤں
سناؤں ان کو ایسے ولولہ انگیز افسانے کرے تائید جن کی عقل بھی تاریخ بھی مانے
کیا فردوسی مرحوم نے ایران کو زندہ
خدا توفیق دے تو میں کروں ایمان کو زندہ

(شاہنامہ اسلام)

حفیظ کا ذہن اسلامی تھا اور اسی کے زیر اثر انہوں نے شاہنامہ تخلیق کیا- ہندوستان کی سیاسی وسماجی صورت حال کے پیش نظر حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہوکر قومی نظمیں لکھیں، جو بے حد مقبول ہوئیں- ان کے فن کے بارے میں یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''حفیظ کا فن یہ ہے کہ لفظ دوسرے لفظ پر، مصرع دوسرے مصرع پر اور شعر

۱- ساغر نظامی، فن اور شخصیت، ص ۳۱۷

دوسرے شعر پر اضافہ کرتا ہے جس سے دیدہ و دل کے سامنے پوری تصویر بے نقاب ہوتی جاتی ہے- یہ سب کچھ اس لطافت، سادگی اور دلآویزی کے ساتھ کہ اس میں شاعر کی اپنی ذات اور گرد و پیش کی خصوصیتیں زائل نہیں ہونے پاتیں- منظر کشی کا یہ اسلوب قادر الکلامی اور قوت اختراع کا زبردست ثبوت ہے-''[1]

حفیظ میں یہ تمام خوبیاں اقبال کے توسط سے آئیں کیونکہ وہ اقبال کی شاعری اور ان کی فکر سے بے پناہ متاثر تھے- اقبال کے اثرات قبول کرتے ہوئے اسلامی تاریخ کو منظوم پیرائے میں ادا کرنے کا خیال آیا، جو نہایت مشکل کام تھا لیکن قدرت نے یہ کام حفیظ پر سہل کر دیا اور پایۂ تکمیل پہ پہنچا- یہی وہ طویل نظم ہے جو تا ابد یاد رکھی جائے گی- یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو حفیظ کو حیات دوام سے ہمکنار کرتا ہے-

جعفر طاہر:

طویل نظمیں لکھنا بھی ایک فن ہے- طویل نظم نگاری میں جعفر طاہر نے جو نظمیں لکھیں ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں- ان کے علاوہ ایک منظوم ڈرامہ ''معجزۂ فن'' کے نام سے لکھا ہے- ان کی طویل نظموں میں ''تاریخ''، ''مذہب''، ''فلسفہ و حکمت'' اور ''انسانی نفسیات'' کو تاریخی کردار کی صورت میں پیش کیا ہے- اس کی مثال نظم ''عراق'' ہے- واقعۂ کربلا کی منظر کشی نہایت احتیاط سے کی ہے- یہ ایک تمثیلی نظم ہے اور دلچسپ بھی، اس نظم میں زیادہ تر عراقی بود و باش کو پیش نظر رکھا ہے- جگہ جگہ عربی کے الفاظ استعمال کئے ہیں- اقبال سے بے حد متاثر تھے اس تائید میں یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''جعفر طاہر نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں سے کلچر اور کلچر سے ادب کی نمو ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں بلکہ محسوس کرتے ہیں اور یہی ان کا ادبی کارنامہ ہے- پاکستان کی ثقافتی شناخت کے تخلیقی عمل میں وہ محض ایک تماشائی کی حیثیت سے شریک نہیں ہوتے بلکہ اس سارے عمل کے ساتھ اپنا ایک گہرا ثقافتی رشتہ پیدا کر لیتے ہیں- جب وہ پاکستان کی ثقافتی روح کو اپنی شاعری کا جامہ پہناتے ہیں چنانچہ پاکستان پر انہوں نے Canto لکھا، اس میں یہی تعلق ہمارے اجتماعی شعور میں ایک واضح صورت اختیار کرتا ہے اور جب یہ صورت حال ہے تو پھر جعفر طاہر پاکستانی ملی ادب میں اقبال کے قرب میں جگہ دیئے جانے کا جائز حق رکھتا ہے-''[2]

جعفر طاہر نے ایک منظوم ڈرامہ ''معجزۂ فن'' کے نام سے لکھا جو خاصہ طویل ہے اور ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوا- ''پگمیلیاں'' اس نظم کا مرکزی کردار ہے اور یہ بے مثل بت تراش ہے- اس کا زمانہ قبل مسیح اور مقام ایتھنز ہے- اس منظوم طویل ڈرامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بت تراش ایک پیکر تراشتا ہے اور خود ہی اس پیکر بے مثال پر دل و جان سے فریفتہ ہو جاتا ہے- اس دیوی کے حضور دعائیں کرتا ہے، اس کی چاہت میں صبح و شام کرتا ہے، آخر کار اس مجسمہ میں جان پڑ جاتی ہے- اب سراپا سیمیں بدن پری پیکر پگمیلیاں کی آغوش میں تھا، پھر اس نے باقاعدہ شادی کی- اس مجسمہ کا نام ''گلاٹیا'' تھا-

---

۱- افکار، حفیظ نمبر، ص ۴۹۰

۲- صحیفہ، ص ۵۴

بہر کیف یہ نظم جعفر طاہر کی شاہکار نظموں میں سے ہے۔تقریباً ۴۶ صفحات پر یہ نظم مشتمل ہے۔نظم کے چند شعر ملاحظہ کیجئے، اس نظم میں اقبال کی تقلید اور پرتو صاف نظر آتا ہے ۔

ہر اشک مرا گوہر خوش آب ہنر ہے	جو زخم ہے خورشید جہاں تاب ہنر ہے
کیا چیز ہے اللہ رے پیکر کدۂ خاک	ہر نقش رنگیں دفتر صد باب ہنر ہے
دل شمع طرب بن کے جلا بھی تو ہوا کیا	دل وہ ہے کہ جو مشعل محراب ہنر ہے
اے پیر فغاں بہر کرم کچھ تو ادھر بھی	سنتے ہیں ترے پاس مئے ناب ہنر ہے
وا دار زمانہ بھی کوئی ہو تو غرض کیا	سو جان سے دل خادم ارباب ہنر ہے
ہم خضر سے کم ہیں جو کریں خضر کی باتیں	قدموں کے تلے چشمۂ نایاب ہنر ہے
سینہ ہے کہ آئینہ اسرار جہاں ہے	کیا روشنی داغ جگر تاب ہنر ہے
یہ بات نہیں دیدۂ بیدار کے بس کی	اللہ رے کیا سلسلۂ خواب ہنر ہے
اندازۂ فن کام نہیں بے ہنروں کا	یہ کار ہنر لائق اصحاب ہنر ہے
ناقدر شناسوں سے تو ملتا نہیں طاہر	وہ سوختہ جاں ماہر آداب ہنر ہے

(معجزۂ فن)[1]

یہ ایک تمثیلی نظم ہے۔نظم میں ہر کردار جاندار ہے۔غرض جعفر طاہر نے اقبال کے فکر وفن اور فلسفہ وآہنگ سے مکمل اکتساب کیا ہے۔ ان کی نظموں میں اقبال کی تقلید واضح نظر آتی ہے۔ خاص کر تشبیہات و استعارات اور خطیبانہ انداز اقبال سے مستعار لیا ہے۔جعفر طاہر کی نظموں پر اقبال کی چھاپ گہری ہے:

> ''برصغیر میں اپنی ملی بقاء کا سوال اور اس کے جواز جعفر طاہر کے ذہن میں ابھرتے ہیں تو وہ اقبال کی فکر کو خراج تحسین پیش کرنے کے بعد ہی آگے چلتے ہیں۔''[2]

علی سردار جعفری:

ترقی پسند شعراء میں نمائندہ حیثیت اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔سیاسی وسماجی انتشار پر جو نظمیں انہوں نے لکھی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہمدرد انسان ہیں۔ وہ انسان سے محبت کرتے ہیں اور اشتراکیت کے مبلغ ہیں۔ آزاد اور پابند نظموں میں اپنے خیالات کی ترسیل کی ہے۔ یہ دکھی انسانیت کے علمبردار ہیں، ان کی نظموں کا موضوع ''انسان'' اور ''انقلاب'' ہے۔ ان کے ہاں تشبیہات واستعارات اور علائم میں جو جدت پائی جاتی ہے وہ اقبال کے افکار وخیالات کا ثمر ہیں اور ان کے اپنے مزاج کا خاصا بھی ہے:

> ''ان کی شاعری کا بنیادی مسئلہ طبقاتی تقسیم اور اس سے پیدا ہونے والے مصائب ہیں۔ طبقاتی تقسیم کی کشکش ''سرمایہ دار لڑکیاں'' اور ''مزدور لڑکیاں'' میں

۱- ادبی دنیا، خاص نمبر،ص ۶۱

۲- صحیفہ،ص ۵۵

نمایاں ہوئی ہے- وہ زندگی کی موجودہ قدروں سے مطمئن نہیں ہیں- ان کے خیال میں
یہ قدریں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے ذہنوں کی پیدا کردہ ہیں-''[۱]

انہی خیالات و موضوعات کو آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے اپنی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' میں نظام نو کی جو تشکیل انہوں نے کی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غلامی و محکومی کو بزدلی سمجھتے ہیں- ایک ایسے انقلاب کی بات کرتے ہیں جس میں دولت کی تقسیم، انسانیت کا وقار اور سامراجی طاقتوں کا استعمال نظموں میں موضوع بنا کر اپنے خیالات پیش کئے ہیں- ان کی طویل نظموں میں ''ایشیاء جاگ اٹھا'' اور ''پتھر کی دیوار'' نہایت اہم نظمیں ہیں- ان نظموں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پس منظر میں جس کرب اور بے چینی کو وہ ظاہر کر رہے ہیں، وہ تابناک مستقبل کی روشن دلیل ہے-

''نئی دنیا کو سلام'' نظم میں سماجی و معاشرتی پہلوؤں کو کردار نگاری اور جذبات نگاری سے مزین کیا ہے- اقتباس ملاحظہ کیجئے:

'' ''نئی دنیا کو سلام'' واقعی ایسی نظم ہے جس میں ان کی بہترین تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار ہوا ہے- یہ نظم اپنی کردار نگاری اور جذبات نگاری کے لحاظ سے بھی بہت اہم ہے- سردار کی اس طویل نظم کے علاوہ ''جمہور ایشیاء جاگ اٹھا''، ''ہندوستان''، ''پتھر کی دیوار'' وغیرہ بھی طویل نظمیں ہیں جو کہ اپنے رنگ و آہنگ، موضوعات کی اہمیت اور وسعت کے سبب اردو کی طویل نظموں میں خاص مقام رکھتی ہیں-''[۲]

علی سردار جعفری کی نظموں میں اقبال کے آہنگ کو دیکھا جا سکتا ہے- نظموں میں اقبال کی تقلید مختلف انداز سے نظر آتی ہے مثلاً ہیئت کے تجربے، تکنیک، بحروں میں اختراع اور اسلوب میں اقبال کی وسعت فکر کا دخل ہے- بنیادی طور پر یہ نظم کے شاعر ہیں- ان کی نظموں میں گہرائی و گیرائی کے علاوہ وقت کی آواز، عصری گونج اور مظلوموں کی آہیں اور کراہیں محسوس کی جاتی ہیں- جبر و استبداد کی داستانیں، انسان کی گرتی ہوئی حالت، قومی و تہذیبی اقدار کا ختم ہونا سبھی کچھ نظموں میں نوحہ بن کر ظاہر ہوا ہے اس لئے ان کی طویل نظموں میں دلی جذبات اور ذہنی اپج کو اقبال کے آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے- یہ بات- تیقن سے کہی جا سکتی ہے کہ علی سردار جعفری، اقبال کے مقلدین میں سرفہرست نظر آتے ہیں-

حمایت علی شاعر:

اردو کی طویل نظم نگاری میں جہاں دیگر شعراء کی نظمیں اہمیت کی حامل ہیں وہاں حمایت علی شاعر کی طویل نظم ''حرف حرف روشنی'' کے عنوان سے منصہ شہود پر آئی- اس نظم کے ذیلی عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

''حرف زیاں''، ''حرف حق''، ''حرف وفا'' یہ نظم حمایت علی شاعر نے اپنے بچوں کی معرفت نئی نسل کے نام کی ہے- ان کی نظمیں اس معیار کی ہیں جنہیں ادبی حلقوں میں ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے- اقبال کی تقلید میں جو نظمیں لکھی ہیں ان میں ملی و وطنی جذبہ دیکھا جا سکتا ہے-

---

۱- جدید اردو شاعری میں علامت نگاری، ص ۱۶۵

۲- اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقاء، ص ۲۴۵

اردو میں طویل نظم نگاری آزادی کے بعد بھی آب وتاب سے جاری رہی- اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''آزادی کے حصول کے بعد اردو نظم میں کچھ ایسے رجحانات در آئے جس کا سلسلہ مغرب کی جدید طویل نظموں سے جا ملتا ہے اور طویل نظم صنعتی نظام حیات میں انسان یعنی ''فرد'' کی تنہائی، بے بسی، بے چارگی کے احساسات سے دو چار ہوئی - اس طرز کو جدیدیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے- جدیدیت کے زیر اثر عصر حاضر کی طویل نظم نے اپنے خدوخال مرتب کئے- اس دور کی طویل نظموں میں فرد کی تنہائی، بے بسی، بے چارگی اور صنعتی نظام کی مشینی زندگی کی تصویریں بڑی واضح ہیں-'' [۱]

حمایت علی شاعر کی اس طویل نظم میں بے بسی و بے چارگی کے تانے بانے نظر آتے ہیں- اس نظم میں معاشرتی وسماجی عکس نہایت خوبی سے منعکس ہوا ہے ؎

مرے لہو کے چراغو، مرے جگر پارو	سنو یہ میری نصیحت بھی ہے، وصیت بھی
جبر وقت بھی تاریخ کا تقاضا ہے	اسے بھی مرحلۂ قرض جاں سمجھ لینا
مرے لہو کے چراغو، مرے جگر پارو	میں آج اپنی کہانی سنا رہا ہوں تمہیں
وہ حرف جو سنایا نہیں گیا تم کو	سنو کہ پہلے پہل میں سنا رہا ہوں تمہیں
مرے لہو کے چراغو، مرے جگر پارو	تمہیں زمیں پہ رہنا ہے آسماں کی طرح
یہ ہاتھ چھوڑ نہ دینا اگر زمیں ہے عزیز	کہ ان سے بڑھ کر نہیں کوئی اعتبار کے ہاتھ

(حرف حرف روشنی) [۲]

اس نظم میں وہ سب کچھ موجود ہے جو موجودہ نسل کی ضرورت ہے- نظم میں تہذیبی اقدار کے ساتھ وطن سے محبت کا جذبہ بھی موجزن ہے- ۱۰۵ اشعار پر یہ نظم محیط ہے-

وہ شعراء جو طویل نظم نگاری میں اعتبار رکھتے ہیں ان میں جوش ملیح آبادی، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، جاں نثار اختر، اختر الایمان، کیفی اعظمی، احمد ندیم قاسمی، منظور حسین شور، ساحر لدھیانوی یہ وہ شعراء تھے جو آزادی سے پہلے طویل نظم میں خاصا اضافہ کر چکے تھے- پھر آزادی کے بعد جن شعراء نے طویل نظم کو آگے بڑھایا، ان میں ڈاکٹر وزیر آغا، مجید امجد، قیوم نظر، یوسف ظفر، مختار صدیقی، انجم رومانی، سلام مچھلی شہری، ضیاء جالندھری، منیب الرحمٰن، منیر نیازی، شاذ تمکنت، ادیب سہیل، عرش صدیقی، جیلانی کامران، حرمت الاکرام، بلراج کومل، جعفر طاہر، عبدالعزیز خالد، جمیل ملک، عارف عبدالمتین، احمد فراز، احمد ندیم قاسمی، شہزاد احمد، ان کے علاوہ اور بھی بہت سے نام ہیں جو طویل نظم کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں- دیئے گئے ناموں کی فہرست میں مزید اضافہ ہوسکتا ہے- اختصار کی بناء پر چند نام دیئے گئے ہیں- ان شعراء نے طویل نظم میں جو آبیاری کی ہے، اسے اقبال کے وسیع تناظر میں اثرات کو قبول کرنے اور تقلید کرنے میں جو فخر وامتیاز کا اعتراف ہمیں ملتا ہے، یہی اقبال کی عظمت اور ان کی شاعری کا اعتراف ہے-

---

۱- اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقاء، ص ۳۱۰

۲- ماہنامہ اسلوب، تخلیقی ادب، ص ۴۴

اصلاحی نظمیں:

اقبال نے جس عہد میں آنکھ کھولی تھی وہ انگریزوں کا عہد تھا، مسلمان اور دیگر قومیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے- معاشرتی اور اخلاقی حالت دگرگوں تھی- ان حالات کے پیش نظر اقبال کو دو اہم کام کرنا تھے ایک تو قوم میں آزادی کا جذبہ پیدا کرنا اور دوسرے قوم کے اخلاق و کردار کو درست کرنا تھا- قوم میں حریت کا جذبہ اور احساس مفقود ہو چکا تھا اس لئے انہوں نے مذہب اور سیاست کی راہیں متعین کیں- انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ انسان ایک ایسی طاقت ہے جسے سمجھنے کی ضرورت ہے- انسان ابھی اپنی قوت سے آگاہ نہیں، اگر انسان اپنی قوت کو بروئے کار لائے تو غلامی کی زنجیریں ٹوٹ سکتی ہیں ؎

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اقبال نے اپنے عہد کا بغور مطالعہ کیا تھا اور اپنی قوم کی اصلاح کے لئے خود کو وقف کر دیا- اس بیداری کے عمل میں انہوں نے ایک ایسا صور پھونکا کہ قوم خواب غفلت سے یکدم بیدار ہوگئی، قلب کو وہ تازہ روح عطا کی کہ انہیں اپنی منزل قریب نظر آنے لگی ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

اقبال جمود کا نہیں جہد مسلسل کا قائل ہے- عصری تقاضے اور مسائل پر غور و فکر کر کے ایک لائحہ عمل تیار کیا اور انسان کی عظمت انسان پر واضح کی- انہوں نے اپنے پیغام میں بیداری کے ساتھ زبان کو بھی نیا لہجہ اور نیا آہنگ دیا- قوم کے سامنے شاعری کا نیا طرز رکھا- اقبال کے ہاں انسانیت کا جذبہ بڑا توانا ہے- خاص کر مسلمانوں کو اسلامی اصولوں پر چلتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں- چوتھے خطبے میں اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

> ''انسان کو خیر اعلیٰ کی طلب ہے، اس کے حصول کی آرزو، اس لئے کہ خیر ہے تو فضائل اخلاق بھی ہیں اور مسرت و سعادت بھی- وہ دونوں پر حاوی ہے لیکن فضائل اخلاق اور مسرت و سعادت علیٰ ہذا فرض اور خواہش غیر متجانس تصورات ہیں لہذا یہ چند روزہ زندگی جس کا تعلق اس عالم محسوسات سے ہے- اس کے حصول کے لئے کافی نہیں اور اس لئے ہم مجبور ہیں کہ بقائے دوام کو ایک مسلح کے طور پر قبول کر لیں- یونہی ہم انسان ایسا کر سکتے ہیں کہ فضائل اخلاق اور مسرت و سعادت کے متبائن تصورات کو رفتہ رفتہ ایک وحدت میں سمو دیں-'' [1]

اقبال نے مسلمانوں کا کھویا ہوا مقام یاد دلایا اور وہ شعور عطا کیا جس سے مسلمانوں میں آزادی کا جذبہ کروٹ لینے لگا- اصلاحی نظموں سے سوئی ہوئی قوم میں بیداری کی لہر دوڑ گئی ؎

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتار طلسم، ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے
سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیام ناز کا
جو نظام دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے

۱- تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۱۷۰

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ   تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

بانگ درا (شمع و شاعر)

مغربی تہذیب کو اقبال بہت قریب سے دیکھ چکے تھے- اس تہذیب کے خطرناک اثرات سے وہ اپنی قوم کو آگاہ کرتے رہے- برصغیر کے مسلمانوں میں جو احساس کمتری پیدا ہو چلا تھا اس کیفیت کو شدت سے محسوس کر کے اپنی نظموں میں مغربی تہذیب کے خدو خال واضح کیئے اپنی قوم میں تقلید کا جو رجحان بڑھتا جا رہا تھا، اسے روکنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی- اقبال نے اپنی نظم ''تہذیب حاضر'' میں انہی باتوں کا ذکر کیا ہے- نوجوانوں کو اس نئی تہذیب پر چلتے ہوئے دیکھتے تو ان کا دل بھر آتا تھا اور افسوس کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے کہ ؎

نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے   یہ رعنائی، یہ بیداری، یہ آزادی، یہ بیباکی
تغیر آگیا ایسا تدبر میں، تخیل میں   ہنسی سمجھی گئی گلشن میں غنچوں کی جگر چاکی
حیات تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا   رقابت، خودکشی، ناشکیبائی، ہوس ناکی
فروغ شمع نو سے بزم مسلم جگمگا اٹھی   مگر کہتی ہے پروانوں سے میری کہنہ ادراکی

بانگ درا (تہذیب حاضر)

مغربی تہذیب نے مسلمانوں میں جو تن آسانی پیدا کر دی تھی- اقبال اس کے مضر اثرات سے متعدد بار کئی نظموں میں مسلمانوں کو باخبر کرتے رہے- مغربی تعلیم پر جو تنقید کی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال مغربی تعلیم کے نظریات سے متفق ہیں اس لئے انہوں نے اس کی وضاحت ''لینن خدا کے حضور میں'' صاف لفظوں میں وضاحت کر دی ہے ؎

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے   حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں رونق میں صفا میں   گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بینکوں کی امارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے   سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت   پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس   کیا کم ہیں فرنگی مدینت کے فتوحات

(لینن خدا کے حضور میں)

اقبال نے ہر اس مقام پر مغربی تہذیب کا پردہ چاک کیا ہے- جہاں جہاں انہوں نے مسلمانوں کو اپنے ظلم اور انتقام کا نشانہ بنایا ہے اس لئے مغربی تہذیب کی برائیوں کو صاف صاف بیان کر دیا- مغربی تقلید سے مسلمانوں کی روح مجروح ہو رہی تھی- اقبال نے مرض کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو اپنے افکار اور مصلحانہ طرز سے روکنے کی پوری کوشش کی- انہوں نے یہ واضح کیا کہ مغربی تہذیب اوپر سے جتنی روشن اور تابناک ہے، اندر سے اتنی ہی تیرہ و تاریک ہے- اسلامی نظام میں انسانوں کے لئے فلاح کا راستہ ہے- اقبال کا کہنا ہے کہ اسلام وہ واحد جماعتی نظام ہے جس میں امن، سلامتی، یکجہتی، اخوت اور اخلاقیات کا درس ملتا ہے:

> ''عالم بشریت کا مقصد اقوام انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجود اجتماعی حیثیتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سدائے نظام اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آ سکتا کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عام بشریت کی

اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی
نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔" [۱]

مسلمان جس تیزی سے پستی کی طرف جا رہے تھے اور انہیں اپنے حال کا کچھ احساس نہ تھا۔ اقبال نے اصلاح کے پہلو کو مدنظر رکھا اور تہذیب حجاز کی یاد دلائی ؎

ہے زیارت گاہ مسلم گو جہاں آباد بھی — اس کرامت کا مگر حق دار ہے بغداد بھی
یہ چمن وہ ہے کہ تھا جس کے لئے سامان ناز — لالۂ صحرا جسے کہتے ہیں تہذیب حجاز
جس کے غنچے تھے چمن ساماں، وہ گلشن ہے یہی
کانپتا تھا جن سے روما، ان کا مدفن ہے یہی

(بلاد اسلامیہ)

اقبال کے نزدیک جسمانی غلامی سے زیادہ خطرناک ذہنی غلامی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ذہنی غلامی انسان کو دیمک کی طرح چاٹتی ہے۔ اقبال قطعی طور پر اپنی قوم سے مایوس نہیں تھے، وہ ان میں زندگی کی رمق دیکھ رہے تھے ؎

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اقبال کو نئی نسل کی فکر سب سے زیادہ تھی کیونکہ جدید تعلیمی نظام نوجوانوں کی گمراہی کی طرف لانے کی ایک کوشش تھی۔ اقبال اس رخ کو نہایت سنجیدگی سے اپنے دائرۂ فکر میں لائے اور نوجوانوں کی بے راہ روی کو شدت سے محسوس کیا:

"اس کی عقل باریک مگر روح تاریک ہے اور اس کے ذہنی ارتقاء کے ساتھ اس کا روحانی زوال بھی اسی حساب سے ہو رہا ہے، وہ نئی نسل کو بہت قریب سے جانتے تھے اس لئے جب بھی اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے یا کوئی بات کہتے ہیں تو وہ واقعہ کی تصویر ہوتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نئی نسل کا پیمانہ خالی اس کی روح پیاسی اور تاریک ہے مگر اس کا چہرہ بہت تازہ، بارونق اور اس کا ظاہر بہت چاق و چوبند ہے۔ اس کی عقل روشن مگر بصیرت اندھی ہے۔ بے یقینی اور یاس و قنوط ان کی زندگی کا حاصل ہے اور محرومی ان کی قسمت ہے۔ یہ نوجوان انسان نہیں انسانوں کی لاش ہیں۔ سخت کوشی اور جفا کشی کے بجائے نرمی اور تن آسانی، لذت طلبی اور عیش کوشی ان کا مسلک بنتی جا رہی ہے۔" [۲]

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر — نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

اقبال کے نزدیک انسان وہ سب سے بڑی طاقت ہے جو تزکیۂ نفس، احکام الٰہی اور اتباع رسولؐ سے یہ قوت حاصل کر سکتی ہے۔ انسان جتنا اپنے عقیدے میں قوی ہوگا اتنا ہی اس کے ارادے میں تقویت پائی جائے گی۔ عمل کی قوت سے قومیں اپنا مقام خود بناتی ہیں۔ غرض اقبال کی اصلاحی نظموں میں بیداری اور توانا جذبے کی جو بازگشت ہمیں ملتی ہے اس میں ان کا خلوص و ہمدردی، قوم

۱۔ مقالات اقبال، ص ۲۲۴

۲۔ نقوش اقبال، ص ۸۶

سے محبت ہر نظم سے عیاں ہے۔ اقبال کے مرد مومن کی خوبی ان اشعار میں دیکھی جا سکتی ہے ؎

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
چیتے کا جگر چاہئے شاہیں کا تجسس
جی سکتے ہیں بے روشنی دانش افرنگ

اقبال کی اصلاحی نظموں سے دوسرے شعراء پر جو اثرات مرتب ہوئے اس سے تقلید کا یہ رجحان دیگر شعراء میں تیزی سے پایا گیا۔ شعراء میں چکبست، غلام بھیک نیرنگ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

چکبست کی نظموں میں حب الوطنی اور معاشرتی غلامی کا جو احساس ہمیں ملتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سیاسی، مذہبی اور ذہنی غلامی کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنی قوم کے ہر فرد کو شاداں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کوشش میں انہوں نے بے شمار نظمیں لکھیں مثلاً ''ہمارا وطن''، ''خاک ہند''، ''آوازۂ قوم'' وغیرہ نظموں میں اصلاحی رنگ کو دیکھا جا سکتا ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپس کے بنیادی جھگڑوں کو دیکھ کر انہیں بے حد افسوس ہوتا تھا۔ ان کے نزدیک اس بات کی اہمیت تھی کہ برصغیر آزاد ہو جائے، وہ آپس کے جھگڑوں کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں ؎

نئے جھگڑے نرالی کاشیں ایجاد کرتے ہیں وطن کی آبرو اہل وطن برباد کرتے ہیں
بلائے جاں ہیں یہ تسبیح اور زنار کے پھندے دل حق بیں کو ہم اس قید سے آزاد کرتے ہیں

قوم کی حالت پر افسوس کرتے ہوئے انہوں نے دونوں قوموں کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اصلاح کی غرض سے نظموں میں اس بات کو اجاگر کیا کہ اپنی توجہ صرف آزادی پر رکھو ؎

قوم کی شیرازہ بندی کا گلہ بے کار ہے طرز ہندی دیکھ کر، رنگ مسلماں دیکھ کر
انتشار قوم سے جاتی رہی تسکین قلب نیند رخصت ہوگئی خواب پریشاں دیکھ کر

چکبست کی تمام شاعری پر اقبال ہی کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ چکبست نے رنگ و آہنگ بھی وہی اختیار کیا ہے جو خالص اقبال کا رنگ ہے۔ چکبست اور اقبال کی شاعری نے مردہ دلوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ انہوں نے وقت کا احساس کرتے ہوئے اصلاحی رنگ کو اپنایا اور اپنی قوم کو بیدار کرنے میں جو کوششیں کی ہیں، اس سے قوم میں ایک نیا شعور آیا ہے۔ ''مرقع عبرت'' کا یہ بند ملاحظہ کیجئے ؎

بالعکس یہاں قوم کی ہمت میں ہے پستی وہ مرد کہاں ہیچ سمجھتے ہیں جو ہستی
یہ جوش فقط جہل و تکبر کی ہے مستی اصلاح کے پردے میں ہے بس نفس پرستی
آثار دلوں میں ہیں کہاں درد پنہاں کے
دکھلائے ہیں جوہر یہ فقط سیف زباں کے

(مرقع عبرت)

میر غلام بھیک نیرنگ:

ان کی تمام زندگی برصغیر کے مسلمانوں کی معاشرتی حالت کو بہتر بنانے میں گزری، نیرنگ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے ہر وقت کوشاں رہتے تھے۔ علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کے فروغ میں بے لوث خدمات پیش کیں۔ اس سلسلے میں آل انڈیا مسلم (محمڈن) ایجوکیشنل تعلیمی لحاظ سے جو ترقی کی راہیں تلاش کر رہے تھے، ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ غرض ان کے خمیر میں قدرت نے ایسا جذبہ رکھ دیا تھا جسے ان کی خدمت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ملک و ملت کی خدمت کو جز و ایمان سمجھتے تھے۔ جس شدت سے قوم کا درد اپنے دل میں محسوس کرتے تھے، ان کی نظمیں اس بات کی آئینہ دار ہیں۔ اقبال کی مکمل تقلید نیرنگ نے کی ہے اس کا ثبوت ان کی شاعری ہے:

> ''میر نیرنگ قوم اور ملت سے جو خلوص اور ہمدردی رکھتے تھے اور خود کو جس طرح انہوں نے ملک اور ملت کے لئے وقف کر دیا تھا، اس کا اظہار ان کی شاعری کے ایک بڑے حصہ سے بھی ہوتا ہے۔ ان کی نظموں کا زیادہ حصہ قومی اور اصلاحی موضوعات پر مشتمل ہے۔ انہوں نے جس طرح خود ساری زندگی جہد و عمل اور خدمت قوم میں گزاری، وہ قوم کو بھی اسی انداز کی زندگی گزارنے کی ترغیب دیتے رہے۔ یہ موضوعات اور قوم سے خطاب کی یہ صورتیں اس زمانے میں تقریباً ہر بڑے شاعر کے کلام میں ملتی ہیں لیکن ایسے بہت کم شاعر گزرے ہیں جن کے کلام کا بڑا حصہ قوم سے خطاب اور اس کی اصلاحی اور بیداری کے خیالات پر مبنی ہو۔'' [1]

نیرنگ نے اصلاحی نظمیں لکھیں تا کہ مسلمان اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کر سکیں، اس سلسلے میں ان کی نظمیں ''درد پنہاں''، ''شرط زندگی'' اور ''حالت قوم'' میں اصلاحی رنگ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے ؎

دل بھر آیا قوم کی حالت پریشاں دیکھ کر ۔۔۔ رو پڑے ہم اپنی بربادی کے ساماں دیکھ کر
صولت اہل عرب کی دھوم تھی آفاق میں ۔۔۔ کانپ جاتے تھے انہیں سام و نریماں دیکھ کر
کاش ہو ایسی یکایک قوم کی حالت درست ۔۔۔ جیسے جاگ اٹھے کوئی خواب پریشاں دیکھ کر
قوم کا غم جاں گزا ہے، جس قدر روئیں سو کم ۔۔۔ ہاں! مگر اپنی بساط اے چشم گریاں دیکھ کر

(حالت قوم)

نیرنگ کی مندرجہ ذیل نظم ''شرط زندگی'' اس میں خاص کر مسلمان قوم کو مخاطب کر کے ان باتوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ نظم خالصتاً اصلاح پر مبنی ہے ؎

تجھ کو اے مسلم ہے اپنے حال کا کچھ بھی پتہ ۔۔۔ کس طرف جانا تھا تجھ کو اور کدھر ہے جا رہا
کون سی دولت کا تو وارث تھا اور وہ کیا ہوئی ۔۔۔ کس نے لوٹا کارواں کو تیرے اور کیا کیا لٹا
آہ اے مسلم! تری غفلت کو کیا کیا روئیے ۔۔۔ کیسی تیری ابتداء تھی! کیا ہے تیری انتہا
شامت اعمال تیری آنکھ کھلتی ہی نہیں ۔۔۔ جب تلک سر سے گزر جائے نہ سیلاب بلا

(شرط زندگی)

۱۔ کلام نیرنگ، ص ۴۳

نظم کا ایک ایک لفظ مسلمانوں کی بیداری کے لئے ہے- ہر شعر میں ایک نیا دور ابھر کر سامنے آیا ہے- نیرنگ نے مسلمانوں کی حالت زار کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے عصری تقاضوں کی ترجمانی ہوتی ہے- قومی، ملی شاعری میں اصلاحی رنگ ان کی پہچان ہے اور اس اصلاحی رنگ میں اقبال کی آفاقیت کو دیکھا جاسکتا ہے- اقبال کے بعد شعراء کی ایک طویل فہرست ہے جنہوں نے اقبال کی مکمل تقلید کی ہے ان میں برصغیر کے نامور شعراء کے نام آتے ہیں-

انقلابی وسیاسی شعور:

سب سے پہلے فکری ارتقاء میں وہ نظمیں آتی ہیں جنہیں روایت کا نام دیا جاتا ہے- انقلاب نے جو اثرات مرتب کئے وہ تاریخ کے صفحات پر سرخ سیاہی سے لکھے گئے ہیں- جیسے ہی وقت نے کروٹ بدلی فکر کا دائرہ بھی وسیع ہوتا چلا گیا- وطن پرستی اور آزادی کو موضوع بنا کر نظم کو نیا لہجہ دیا- اقبال کی اہمیت اس لئے بڑھ جاتی ہے کہ انہوں نے عالم اسلام کو بہ نظر غائر دیکھا جہاں تمام اسلامی ممالک مغربی طاقتوں کے زیر اثر تھے- اقبال نے ایسے میں وہ کاری ضرب لگائی اس تناظر میں جو نظمیں لکھی گئیں دیگر شعراء نے اقبال کی تقلید کرتے ہوئے اس مشن کو آگے بڑھایا-

اقبال کی سیاسی بصیرت ان کی شاعری، خطوط اور تشکیل جدید الٰہیات میں دیکھی جاسکتی ہے- اقبال جب اپنی رسمی تعلیم سے فارغ ہوئے تو انہوں نے عالمی تقابلی جائزے سے اندازہ لگایا کہ تقریباً تمام عالم اسلام میں انگریزوں نے اپنا جال بچھایا ہوا ہے- اگر تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو مسلمانوں کا سیاسی زوال اٹھارہویں صدی سے شروع ہو چکا تھا لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی نے مسلمانوں کو مزید زوال کی طرف دھکیل دیا- مغربی فاتحین نے مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کئے تھے وہ تاریخ کے صفحات پر لکھے جاچکے- سرسید کی تحریک کے بعد دیگر تحریکیں بھی کام کرتی رہیں- اقبال نے جب تمام حالات کا جائزہ لیا تو انہیں دلی صدمہ ہوا، انہیں جس قدر افسوس مسلمانوں کی بدحالی کا تھا وہ بیان سے باہر ہے- ایک زمانہ وہ تھا کہ مسلمان پوری دنیا میں چھائے ہوئے تھے، ان کی حکومتیں اور کارنامے جنہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا- اقبال کے سیاسی افکار اور سیاسی نظموں نے قوم کو بیدار کرنے میں بڑی مدد دی- انہوں نے غلامی کو لعنت قرار دیا- آزادی کی قدر و قیمت واضح کی ''ارمغان حجاز'' میں سے چند شعر جو سیاسی نقطہ ہائے نظر سے کہے گئے ہیں، جس میں آزادی اور محکومیت کو واضح طور پر بیان کیا ہے ؎

آزاد کی رگ سخت ہے مانند رگ سنگ　　محکوم کی رگ نرم ہے مانند رگ تاک
محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید　　آزاد کا دل زندہ پرسوز و طرب ناک
آزاد کی دولت دل روشن، نفس گرم　　محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نم ناک
محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروت　　ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہم دوش　　وہ بندہ افلاک ہے یہ خواجہ افلاک

ہندوؤں اور انگریزوں نے مل کر جو مظالم مسلمانوں پر ڈھائے تھے، ہندو مسلم فسادات اس بات کے آئینہ دار ہیں- اقبال ان حالات کو بغور دیکھ رہے تھے- ایک مفکر کی حیثیت سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ سب کچھ انگریز کے ایماء پر ہو رہا ہے- انسانیت کو پامال ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو وہ مسلمانوں میں اس جذبہ کو ابھارنا چاہتے تھے، جنہیں تاریخ نے امر کر دیا- وہ ذہنوں میں ایسا انقلاب

لانا چاہتے تھے، جس میں اسلامی مملکت کا تخیل کارفرما ہو ۔

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکش انقلاب

اقبال نے آزادی کے لئے ''محبت'' کو تفویض کیا۔ انہوں نے اتحاد و اتفاق پر زور دیا۔ اگر مسلمانوں میں یہ دولت حاصل کرنے کی صلاحیت ہے اور وہ متحد ہو جاتے ہیں تو پھر مسلمانوں کو زیادہ دیر غلام نہیں بنایا جا سکتا ۔

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی اسیر امتیاز ما و تو رہنا
محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے

اقبال جب انگریزوں کی سیاست اور ہندوؤں کی ناپاک چالوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو ان کا حساس دل اپنی قوم کی حالت زار دیکھ کر آزردہ ہو جاتا ہے۔ یہی وہ دور تھا جب مسلمان ہی نہیں بلکہ مشرق ہر لحاظ سے مغرب کی غلامی کا طوق گردن میں ڈالے ہوئے تھا۔ ''اقبال کا پیام آزادی'' کے عنوان سے نوابزادہ لیاقت علی خاں نے جو تقریر کی اس میں سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''جب وہ سیاسیات حاضرہ کی تماشا گاہ پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کو ہر طرف اصحاب تسلط و استبداد کی مکر سامانیوں اور فریب کاریوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ان کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ غلاموں میں کس طرح نشۂ غلامی کو تیز تر کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور غلاموں کے قلب و دماغ کو کس طرح دیوار مجلس میں آسودہ رہنے کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ وہ مرغ زیرک کی دانہ مستی پر تڑپ جاتے ہیں اور اس سیاسیات حاضرہ کے طلسم کو توڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔'' [۱]

اقبال کے سیاسی افکار کی نظمیں ''شکوہ''، ''جواب شکوہ''، ''خضر راہ'' اور ''شمع و شاعر'' ہیں۔ یہ اس زمانے کی نظمیں ہیں جس میں مسلمانوں کو ان کے حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ نظم ''شمع و شاعر'' میں مغرب کی مکاری، فریب اور عیاری کو بے نقاب کیا گیا ہے ۔

دیکھ لو گے سطوت رفتار دریا کا مآل
موج مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی
نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خون گل چیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

(شمع و شاعر)

۱۔ اقبال پر ۱۵ مقالات، ص ۱۴۰

دراصل یہ نظم جس میں علامتوں کے پردے میں بات کہی گئی ہے- ایک تو ملت اسلامیہ کے کربناک واقعات جس میں مسلمانوں کو خاص کر ظلم و انتقام کا نشانہ بنایا اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس نظم میں مسلمانوں کے ادوار بتائے ہیں تاکہ مسلمانوں میں بیداری کا جذبہ پیدا ہو سکے:

> ''اس سلسلے میں دو امور توجہ طلب ہیں- اول یہ کہ روشن مستقبل کی نوید سناتے ہوئے بھی اقبال مغرب سے احتراز کی تلقین ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ اقبال کے نزدیک زوال مسلم کا بہت بڑا (اور دور حاضر میں غالباً سب سے بڑا) سبب ایک طرف مسلمانوں کی تقلید مغرب (سادگی اپنی بھی دیکھ) اور دوسری طرف مغرب کی سیاست (اوروں کی عیاری بھی دیکھ) ہے- اس موقع پر اگر مشرق وسطیٰ کے دردناک حالات کو ذہن میں تازہ کر لیا جائے تو خصوصاً عثمانیہ کا خاتمہ، اسرائیل کا قیام اور سرزمین عرب کی بندربانٹ سے تو اقبال کی تلقین کی اہمیت اور نمایاں ہو جاتی ہے-''[1]

اقبال سیاسی شعور کو بیدار کرنے میں اس بات پر زور دیتے ہیں کہ تمام اسلامی ممالک متحد ہو کر ایک سیاسی نظام کی بنیاد رکھیں، جس میں معاشی اور معاشرتی تحفظ حاصل ہو سکے- اقبال انگریزوں سے دبنے اور ڈرنے کا نہیں، آنکھ ملانے کا سبق دیتے ہیں:

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو
خوف باطل کیا کہ ہے غارت گر باطل بھی تو

کیوں گرفتار طلسم ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تیری پنہاں ہے ترے خون جگر میں
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ

انقلابی اور سیاسی شعور کو ان اشعار میں جس انداز سے سمویا ہے، ان اشعار میں ملت اسلامیہ کی بیداری کے علاوہ شاندار مستقبل کا پیغام بھی ہے-

ادھر ہندوؤں نے مسلمانوں کا جینا حرام کر رکھا تھا اور ادھر یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد سماجی اعتبار سے جو تغیر آیا اس سے سماجی اور سیاسی شعور کو تقویت تو ملی کیونکہ سائنسی ایجادات نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا- یہ سرسید کی ذہانت اور فراست تھی کہ انہوں نے وقت کے بدلتے ہوئے تیور پڑھ لئے تھے انہوں نے مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کیا- ان کا کہنا تھا کہ جدید تعلیم ہی میں ان کا مستقبل مضمر ہے، انقلابی و سیاسی شعور کو زیادہ بہتر سمجھنے کے لئے ''اقبال کے خطوط جناح کے نام'' کا مطالعہ ناگزیر

۱- اقبال کی طویل نظمیں، ص ۶۳

ہے۔علامہ کے ان خطوط میں سیاسی رجحانات کے علاوہ حالات وواقعات کی صحیح تصویر دکھائی دیتی ہے۔
خطوط کی روشنی میں سیاسی شعور کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ نظموں میں جو شعور کو جلا بخشتی ہے، اقبال نے مستقبل کی نوید دیتے ہوئے یہ کہا ع

بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش

اقبال مسلمانوں کو تنبیہہ کرتے ہیں کہ اپنے دلوں کو مردہ ہونے سے بچاؤ، اسے زندہ رکھو کیونکہ تمہیں ایک نیا جہاں آباد کرنا ہے ؎

دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ

ضرب کلیم میں اقبال کا یہ کہنا کتنا درست ہے ؎

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

مغربی تعلیم اور انداز فکر سے ہندوستان میں وطنیت کا پرچار کرتا تھا۔یورپ جانے سے پہلے اقبال نے جو نظمیں لکھیں ان میں ''ترانہ ہندی''، ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت''، ''بلاد اسلامیہ''، ''وطنیت''، ''ترانہ ملی''، ''شمع اور شاعر''، ''طلوع اسلام''۔یہ وہ نظمیں ہیں جس میں موضوعات کے ہمہ گیر پہلو نظر آتے ہیں۔قومی و وطنی خیالات کا ابلاغ انہی نظموں سے ہوا۔یورپ سے واپسی پر اقبال نے محسوس کیا کہ مغرب کا تصور قومیت دراصل مسلمانوں کے خلاف ایک سازش ہے اس لئے انہوں نے اپنے خیالات کے ذریعہ مخالفت کرنا شروع کر دی اور مسلمانوں کو اس کے مہلک اثرات سے آگاہ کیا ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

برصغیر کی تاریخ میں سب سے پہلے شبلی اور حالی نے انقلابی و سیاسی شعور کو اپنی نظموں میں اجاگر کیا لیکن ان دونوں کے میدان مختلف تھے۔پھر بھی حالی نے قوم کا مرثیہ ''مسدس حالی'' لکھ کر قوم کو نئے راستے ہی نہیں دکھائے۔مسلمانوں کے ذہن میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔لیکن ابھی تک مسلمان صحیح معنی میں بیدار نہیں ہوئے تھے کیونکہ اس وقت انہیں دوسرا حالی چاہیے تھا۔وہ اقبال کی صورت میں برصغیر کے اسٹیج پر نمودار ہوا۔اقبال کی یہ سعادت مندی تھی کہ اس نے اپنے پیشروؤں حالی، شبلی، اکبر کے مشن اور سیاسی شعور سے کسب فیض کیا۔ان حضرات نے قوم کے مرض کی تشخیص تو کر لی، علاج نہ کر پائے۔سیاست کروٹ پر کروٹ بدل رہی تھی۔مسلمان چکی کے پاٹوں میں پس رہے تھے۔اقبال نے اپنے اشعار سے اور اپنی فکر سے مسلمانوں کے مرض کا علاج بتایا۔مسلمانوں کی رہنمائی اور دستگیری صرف اور صرف اللہ کے احکام اور اتباع رسول میں ہے:

''وہ اپنے سیاسی افکار میں بت شکن واقع ہوا ہے۔وہ مروجہ خیالات کے طلسم

باطل کو توڑتا ہے اور ان اوہام وخرافات کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیتا ہے جو انسانی اذہان کے مطلع کو مکدر کیئے ہوئے ہیں، خواہ اس کام میں اسے بڑے متقدمین و متاخیرین کے مقابلے میں بھی کیوں نہ کھڑا ہونا پڑے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اقبال تمام افکار و اعمال کو اسلام یا فطرۃ اللہ کے نقطۂ نگاہ اور معیار سے دیکھنا چاہتا ہے اور اس یقین و ایمان کے لئے کہ فطرۃ اللہ عین اسلام ہے۔'' [۱]

ترک موالات اور تحریک خلافت کے بارے میں اقبال کے تاثرات اور فکری میلان مثبت انداز میں نہیں تھے۔ انہوں نے واضح طور پر کہہ دیا تھا۔

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے تو احکام حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

مسلمانوں کو خبردار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

خندہ زن کفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں

چکبست......

وطن پرست شاعر ہونے کی وجہ سے مغربی تہذیب سے بیزاری کا اظہار ملتا ہے۔ ان کی نظموں میں انقلابی و سیاسی شعور بڑا جاندار ہے۔ ان کی شاعری کو جذباتی شاعری کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ انہوں نے ہندوستان کو زیر و زبر ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ سیاسی حالات کو نہایت خوبی سے نظموں میں ادا کیا ہے۔ قوم کی آزادی ان کی اولین ترجیح تھی اس کے لئے انہوں نے بے شمار نظمیں لکھیں، قوم کو ایک نیا شعور عطا کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ ہندو مسلم دونوں قومیں آپس میں اتحاد کی فضا قائم کر کے انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

وہ اپنے وطن میں امیدوں کا چراغ جلتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اہل وطن کو مبارکباد دیتے ہوئے کہ عنقریب آزادی کا سورج طلوع ہونے والا ہے، چکبست نے فضا میں ایسے نغمے بکھیر دیئے جن سے آزادی کی تڑپ میں مزید اضافہ ہوگیا۔ انگریز کے ہاتھ سے اقتدار نکلتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ انگریزوں کی بربادی کو کس خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔ یہی وہ سیاسی شعور ہے جسے چکبست نے اپنی قوم کو دیا۔ قوم کو بیدار کرنے میں ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انگریزوں نے وطن پرستوں پر جو مظالم ڈھائے ہیں ان کا ذکر متعدد بار ہو چکا ہے۔ ان کے یہ مظالم، جبر و استبداد ہی آزادی کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ چکبست نے درج ذیل بند میں آزادی ملنے کا اعلان کر دیا۔

ہے آج کل کی ہوا میں وفا کی بربادی سنے جو کوئی تو سارا چمن ہے فریادی
قفس میں بند ہیں جو آشیاں کے تھے عادی اڑا ہے باغ سے بو ہو کے رنگ آزادی
ہوائے شوق میں غنچے بکس نہیں سکتے
ہمارے پھول بھی چاہیں تو ہنس نہیں سکتے

۱۔ اقبال معاصرین کی نظر میں، ص ۴۴

یہ بند ملاحظہ کیجئے جو سیاسی بیداری کا ترجمان ہے ؂

یہ خاک ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار ہمالیہ سے اٹھے جیسے ابر دریا بار
لہو رگوں میں دکھاتا ہے برق کی رفتار ہوئی ہیں خاک کے پردے میں ہڈیاں بیدار
زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شباب قوم کا ہے اور ہوم رول کا ہے

چکبست ہندو مسلم اتحاد کے بڑے خواہاں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ آپس کے جھگڑے ختم کر کے قوم میں ایک فکر اور یگانگت کا جذبہ بیدار ہو جائے تا کہ ہم مغربی آقاؤں کو سیاسی شکست دے سکیں۔ چکبست ایک شاعر کی حیثیت سے سوچ رہے تھے۔ یہ اتحاد ازل ہی سے ناممکن تھا۔ دونوں کی معاشرت، طرز زندگی، مذہبی رجحانات ایک دوسرے سے جدا تھے اور پھر ہندوؤں کا سلوک بھی مسلمانوں کے ساتھ زیادہ اچھا نہ تھا۔ وہ وقت کی بساط پر مصلحت کی چالیں چل رہے تھے اس لئے مسلمانوں میں اضطرابی کیفیت پائی جاتی تھی۔ بہر کیف ہندو مسلم جھگڑے پر چکبست کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں ؂

مٹے جھگڑا الٰہی کب یہاں ہندو مسلماں کا بنے کب مشترک ہندوستاں ہندو مسلماں کا
غضب ہے ایک گھر کے رہنے والے یوں لڑیں باہم جھگڑنا ہے بہم شور زناں ہندو مسلماں کا

وطن پرستی کے جذبے سے سرشار ہو کر چکبست کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے ؂

اے خاک ہند تیری عظمت کا کیا گماں ہے
دریا فیض قدرت تیرے لئے رواں ہے

وطن کی آزادی کے لئے یوں تو چکبست نے نہایت عمدہ نظمیں لکھیں لیکن ہوم رول کا ذکر اکثر نظموں میں ملتا ہے، یہ شعر ملاحظہ کیجئے ؂

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

انقلابی و سیاسی شعور میں جو کام حالی، شبلی، اکبر، اقبال، چکبست اور جوش نے کیا ہے، ان شعراء نے غلام قوم میں بیداری اور حریت کا جو جذبہ پیدا کیا، ان کی نظموں میں للکار بھی ہے اور اپنے وطن سے محبت کا اظہار بھی۔ ان سب نے اقدار بدلنے کی کوشش کی۔ اقدار بدل جانے سے زندگی کا زاویہ ہائے نگاہ بدل جاتا ہے۔ وطن کی محبت کا یہ تصور ان شعراء سے پہلے نظر نہیں آتا۔ جدید شاعری میں ان تمام موضوعات پر بحث کی گئی ہے جو انسانی زندگی، معاشرتی مسائل، فطری مناظر اور دیگر موضوعات سے شاعری میں وسعت پیدا کی۔

غلام بھیک نیرنگ......

ہندوستان کی سیاست کے پیش نظر نیرنگ نے خود کو قومی خدمات کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ ان دنوں تحریک خلافت کا دور تھا۔ انہوں نے اس میں شمولیت کر کے اسے کامیاب بنانے میں انتھک محنت اور خاصی جدوجہد کی جبکہ ہندوؤں نے شدھی تحریک کا آغاز کیا تا کہ مسلمانوں کو اپنی تہذیب اور ثقافت میں شامل کر سکیں۔ ان کے ان نظریات کی بیخ کنی کے لئے نیرنگ نے علمائے دین

سے رابطے کئے اور انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مسلمانوں کو اپنے مذہب کی پیروی اور اسلام کے تحفظ کا جذبہ پیدا کریں اور مسلمانوں میں اخلاقی اقدار کو فروغ دیں۔ مذہبی و قومی خدمات میں ان کی اولین ترجیح آپس میں اتحاد و اتفاق کی تلقین تھی۔ مسلمانانِ ہند کے لئے معاشی و اقتصادی بہتری کے لئے ان کی خدمات کو سراہا گیا۔ مسلم لیگ میں شامل ہو کر نیرنگ نے قومی و ملی جذبہ ابھارنے کے ساتھ مسلمانوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کی۔ ان کی نظم ''نوائے انقلاب'' اس بات کی آئینہ دار ہے ؎

چل رہی ہے باغِ عالم میں صبائے انقلاب ۔۔۔ آ رہی ہے پتے پتے سے صدائے انقلاب
انقلاب آئینِ ہستی ہے نہیں اس سے مفر ۔۔۔ چلتی رہتی ہے ہمیشہ آسیائے انقلاب
زیر و بم سے ہے مرکب زندگی کا زمزمہ ۔۔۔ زیست کہتے ہیں جسے ہے اک نوائے انقلاب
ذرّے ذرّے سے ہے آہنگ تغیر موجزن ۔۔۔ ساز ہستی سے نکلتی ہے صدائے انقلاب
ایک حالت پر نہیں ہے کار گاہ ہست و بود ۔۔۔ یعنی ہر ساعت نرالی ہے ادائے انقلاب

(نوائے انقلاب)

خاصی طویل نظم ہے، چند اشعار پر اکتفا کیا گیا ہے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ وہ قومی و سیاسی شعور میں کس قدر منہمک تھے۔ ان کی بیشتر نظمیں اسی خیال پر ہیں۔ انہوں نے ہندوستان کی سیاست کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ نیرنگ کی ایک نظم ''آہنگِ عمل'' جس میں انہوں نے وقت کی نزاکت کو محسوس کر کے مسلمانوں کو عمل پیہم کی تلقین کی۔ اس نظم کے اثرات مسلمانوں کے اخلاق پر مرتسم ہوئے ؎

سنبھالے اپنے پر پرزے ترے سب ہم صفیروں نے ۔۔۔ ہر اک نے فکر کی ہے اپنے اپنے آشیانے کی
مگر اک تو ہی غافل ہے مآلِ کارِ گلشن سے ۔۔۔ ترے حصے میں آئیں غفلتیں سارے زمانے کی
نئے پودے، نئے بوٹے، نئے گلبن، نئے تختے ۔۔۔ نئی شرطیں بنیں گی اب چمن میں آنے جانے کی
قفس بھی دام بھی مقراض بھی بالکل نہیں ہوں گے ۔۔۔ نئی ترکیب ہوگی تجھ کو پھندے میں پھنسانے کی
اگر گلشن میں رہنا ہے بدل لے تو بھی ڈھنگ اپنا ۔۔۔ سماعت اب نہیں ہوگی کسی حیلے بہانے کی
سمجھ لے ہم نفس! جو کچھ کہا میں نے اشاروں میں ۔۔۔ سنائی ہے تجھے تیری کہانی استعاروں میں

(آہنگِ عمل)

نظم کا ایک ایک شعر مسلمانوں کو متنبہ کر رہا ہے کہ اب غفلت برتنے کا وقت نہیں۔ دیگر اقوام تجھے نیست و نابود کرنے کی فکر میں ہیں۔ کانگریس کے نظریات، اُن کی اصطلاحات اور ان کی ملمع سازیوں سے مسلمانوں کو باخبر کر رہے ہیں۔ نیرنگ نے ایک مصرعہ میں جو مسلمانوں کو موجودہ حالت بدلنے کی تلقین کی ہے، یہی وہ ان کے دلی جذبات تھے ''اگر گلشن میں رہنا ہے بدل لے تو بھی ڈھنگ اپنا''۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت پر افسردگی کا اظہار کرتے ہوئے کہ اگر اب بھی تم ہشیار نہ ہوئے تو دشمن جال بچھائے بیٹھا ہے، وہ تجھے نئے نئے حربوں اور حیلوں سے خوشامد اور چاپلوسی سے اپنے دام میں لانے کی کوشش کریں گے۔ میں تمہیں پہلے سے باخبر کر رہا ہوں۔ ان نظموں کو پڑھنے کے بعد مسلمانوں کی ذہنی کیفیت اور عادات و اطوار میں تبدیلی آنا شروع ہوئی، جسے انقلابی شعور کا آغاز کہہ سکتے ہیں۔ نظم ''صدائے اسلام'' وقت کی وہ پکار تھی، مسلمانوں نے اس آواز پر لبیک کہا۔ اس نظم میں مسلمانوں کے لئے پیغام بھی ہے اور دعوتِ فکر بھی، چند شعر ملاحظہ کیجئے ؎

گلشنِ عرفاں کو دینے رنگ و بو آیا ہوں میں ۔۔۔ اس چمن میں بن کے آئینِ نمو آیا ہوں میں

درد دل ہی حضرت انساں کے دکھ کی ہے دوا
دل میں بن کر درد دل کی آرزو آیا ہوں میں
ناامیدوں کو سنایا میں نے پیغام امید
ساتھ لے کر مژدۂ لا تقنطو آیا ہوں میں
ظلمت کثرت کی چھائی تھی گھٹا چاروں طرف
مہر وحدت ہوں چمکنے سو بہ سو آیا ہوں میں
تھا یہ بازار جہاں میں اک متاع کسمپرس
گوہر حکمت کی بن کر آبرو آیا ہوں میں
بھائی بھائی نوع انساں کو بنادوں تو سہی
ہاں مٹانے ہستی غیر و عدو آیا ہوں میں
عدل سے الفت ہے مجھ کو مفسدی سے بیر ہے
امن پھیلانے جہاں میں چار سو آیا ہوں میں

(صدائے اسلام)

جوش ملیح آبادی......

اقبال کے بعد جوش وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے انقلابیت کے علاوہ جارحانہ طرز پر زیادہ نظمیں کہی ہیں- انقلابی شاعری کو متعارف کرانے میں اقبال پہلے شاعر ہیں- ان کے ہاں سیاسی انقلاب کا تصور نظموں سے ظاہر ہے- سماجی اور سیاسی شعور میں جب تبدیلی آتی ہے تو اس کا اثر سب سے پہلے شاعری میں منعکس ہوتا ہے- اقبال کی اس دور کی نظمیں اس بات کی آئینہ دار ہیں جس میں انہوں نے انقلابی شاعری کی بنیاد رکھی مثلاً ''طلوع اسلام''، ''خضر راہ''، ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' وغیرہ نظموں میں انقلابی شعور کو دیکھا جاسکتا ہے- جوش کی نظموں میں اقبال کے اثرات نہ ہوں یہ ہو نہیں سکتا- جوش نے اکثر اقبال کے اثرات سے انحراف کا اظہار کیا ہے- یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے- حقیقت یہ ہے کہ سب سے زیادہ جوش نے اثرات قبول کئے ہیں- جہاں تک سرمایہ دارانہ اور سامراجی نظام کا تعلق ہے سب سے پہلے اقبال ہی نے نفرت کا اظہار کیا ہے- اقبال کے تصورات سے اردو شاعری کو جو نیا مزاج ملا، اس میں انسانی ارتقاء کی اہمیت پر زور دیا گیا- اس مثال میں اقبال کی ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کو پیش کیا جاسکتا ہے- جوش کے ہاں انسانی تصور کا رنگ بہت ہلکا ہے- وہ تو آگ، پانی، توپ، تفنگ، تلاطم، تخریب، کشت وخون، یہ وہ علامتیں ہیں جن سے بھڑکانے کا کام لیا گیا- کوئی راستہ یا رہنمائی نہیں ملتی- تحریک آزادی پر ان کی نظمیں اس بات کی غماز ہیں، جن میں جذبات کو زیادہ دخل ہے:

> ''ایسی نظموں کی پرشوکت روانی، ان کے وزن، ان کے الفاظ کی بے محابا ترتیب، ان کے جذبات کی خودسری میں انقلاب کے آہنی قدموں کی چاپ صاف سنائی دیتی ہے- اس طرح کی نظموں نے اردو میں ایک نئے قسم کی متحرک ولولہ خیز اور مجاہدانہ شاعری کی بنیاد ڈالی ہے جس کا اثر ترقی پسند شاعروں کی پوری نسل پر پڑا ہے-'' [1]

جوش دراصل رومانی شاعر ہیں- رومان سے انقلاب کی طرف آنا یہ وقت کا تقاضا ہے- سیاسی واقعات پر جوش کی نظمیں جو حالات اور واقعات کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں، ان میں ''انسانیت کا کورس''، ''نظام نو''، ''شکست زنداں کا خواب''، ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام''، جو سامراجی جنگ کی علامت بن کر سامنے آئی- ''زوال جہابانی'' جیسی نظموں میں طنز وظرافت کے ساتھ نفرت اور حقارت آمیز رویے پر بھی اتر آتے ہیں- نظم ''نظام نو'' اس میں مستقبل قریب میں نوید کا پیغام ہے، جسے آزادی کے

۱- ترقی پسند ادب، ص ۱۵۵

خواب سے تعبیر کیا جاتا ہے ؎

کھیل، ہاں اے نوع انساں، ان سیہ راتوں سے کھیل
آج اگر تو ظلمتوں میں پابجولاں ہے تو کیا
مسکرانے کے لئے بے چین ہے صبح وطن
اور چندے ظلمت شام غریباں ہے تو کیا
کل جواہر سے گراں ہوگی لہو کی بوند بوند
آج اپنا خون پانی سے بھی ارزاں ہے تو کیا
آچکا ہے رونق فردا کا جنبش میں جلوس
آدمی کا خانۂ امروز ویراں ہے تو کیا
آج اگر رسوا یہ مرد نا مسلماں ہے تو کیا

(نظام نو)

سماج کے جتنے تاریک رخ ہیں۔ جوش نے ان پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنی نظموں میں جب غلامی اور افلاس کی بات کرتے ہیں تو انہیں اس بات کی فکر بھی دامن گیر رہتی ہے۔ نئی نسل کے حوالے سے جوش نے ولولہ انگیز نظمیں لکھ کر ان کے دلوں کو تازہ حرارت اور نئی فکر عطا کی ہے۔ ''انسانیت کا کورس'' ؎

بڑھے چلو، بڑھے چلو، رواں دواں بڑھے چلو
بہادرو وہ خم ہوئیں بلندیاں، بڑھے چلو
پئے سلام جھک چکا وہ آسماں، بڑھے چلو
یہ ماہ ہے، وہ مہر ہے، یہ کہکشاں بڑھے چلو
لئے ہوئے زمین کو کشاں کشاں بڑھے چلو
رواں دواں بڑھے چلو، رواں دواں بڑھے چلو

قریب ختم رات ہے رواں دواں سیاہیاں
سفینہ ہائے رنگ و بو کے کھل رہے ہیں بادباں
فلک دھلا دھلا سا ہے، زمیں ہے دھواں دھواں
افق کی نرم سانولی سیاہیوں کے درمیاں
مچل رہی ہیں زرنگار سرخیاں بڑھے چلو
رواں دواں بڑھے چلو، رواں دواں بڑھے چلو

(انسانیت کا کورس)

جوش کے ہاں آزادی کا یہ تصور کس قدر نشاط آور ہے۔ ان نظموں میں قومی شعور کے ساتھ سامراجی دشمنی کا اظہار بھی ہے۔ ان کے ہاں سیاسی شعور کی آنچ دیگر شعراء سے کہیں زیادہ تیز ہے۔ جوش ایک گرم مزاج کے انسان ہیں۔ اسی لئے ان کی شاعری میں جذباتیت اور انقلاب آگ کی بھٹی کی مانند نظر آتا ہے۔ انگریز دشمنی میں یہ جذبہ تندی اور تیزی لئے ہوئے ہے۔ ان کے یہ تیور

''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام''نظم میں دیکھے جاسکتے ہیں ؎

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو
باغ انسانی میں چلتے ہی پہ ہے باد خزاں
آدمیت لے رہی ہے ہچکیوں پر ہچکیاں

آخری بند ملاحظہ کیجئے ؎

خیر، اے سوداگرو اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی
وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں

(ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے)

''شکست زنداں کا خواب''نظم کا بہ نظر غائر مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ جوش کی نظر رومانیت کے علاوہ سیاست اور سماج پر بھی تھی- ان کی باغیانہ نظموں میں جو مقام اس نظم کو ملا ہے، یہی وہ نظم ہے جس سے انگریزوں کے دل دہل گئے- تحریک آزادی میں ایک نئی جان پڑ گئی- جوش نے اس نظم میں خطابیہ طرز اختیار کیا اور وہ بھی تند و تیز لہجہ میں- اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے خطابیہ رنگ اقبال سے اخذ کیا ہے- جوش نے اس نظم میں درحقیقت جوش ولولہ کو اجاگر کیا ہے- یہ وہ نظم ہے جسے پڑھ کر انسان متحرک ہو جاتا ہے ؎

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
کیا ان کو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹی زنجیریں

جوش کی نظموں کا زیادہ تر تاثر اقبال کی نظموں کے آہنگ سے ملتا ہے، مثلاً ان کی نظم ''وطن'' تو اقبال کی نظم ''وطنیت'' اس کے علاوہ ''زنداں کا گیت''، ''ایک شہید وطن کی یاد میں''، ''غدار''، ''مقتل کانپور'' اور اس طرح بیشتر نظمیں آزادی کے رجحان کو ظاہر کرتی ہیں- بہرکیف جوش شاعر فطرت، شاعر رومان کے علاوہ شاعر انقلاب کی حیثیت سے بھی اپنا شعرائے عصر میں ایک مقام رکھتے ہیں- ہندوستان میں جب برطانوی نظام رائج تھا تو انہوں نے جدوجہد آزادی میں شامل ہو کر اپنی نظموں سے سامراجیوں کے تن بدن میں آگ لگا دی:

''جوش کو شاعر انقلاب کہا جاتا ہے، کسی حد تک یہ بات صحیح بھی ہے- انہوں نے ایسے وقت آزادی کے نغمے الاپے اور نعرے بلند کئے جب برطانوی استبداد اس قسم کی باتیں کرنے والے کے لئے عرصۂ حیات تنگ کر دیتا تھا- میں نے ایک سے زیادہ اہم

اور بلند مرتبہ سیاسی رہنماؤں کو یہ اعتراف کرتے سنا ہے کہ وہ پہلی بار جوش کی نظم سن کر یا اس سے متاثر ہو کر سیاست اور قومی آزادی کی لڑائی میں شامل ہوئے۔'' [1]

غرض آزادی کے جذبے سے سرشار ہو کر انقلابیت کو جذباتیت کا لباس پہنا دیتے ہیں۔ اس کو مزاج کا خاصا کہا جائے تو بجا ہوگا۔ جوش منافقت سے دور انسان دوستی کو عزیز رکھتے ہیں۔ جوش نے سامراجی وسماجی نظام سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ غلامی کو کمزوری سمجھتے ہیں۔ آزادی کا پیغام دیتے ہوئے نظم ''غلاموں سے خطاب'' میں مخاطب ہیں، ان کا یہ انداز خالصتاً انقلابی ہے۔ قوم کی بیداری میں جوش کی خدمات کو بھی سراہا جاتا ہے، نظم ملاحظہ کیجئے ؎

اکسائے میرا شعر اگر جذبہ ہائے جنگ پیدا ہو آبگینے کے اندر مزاج سنگ
خرمن میں میرا شعر اگر کج کرے کلاہ خس تند بجلیوں سے لڑانے لگے نگاہ
آہن کے جوہروں سے ٹپکنے لگے شراب پیری کی ہڈیوں میں مچلنے لگے شباب
تجھ کو یقیں نہ آئے گا اے دائمی غلام میں جا کے مقبروں میں سناؤں اگر کلام
خود موت سے حیات کے چشمے ابل پڑیں قبروں سے سر کو پیٹ کے مردے نکل پڑیں
میرے رجز سے لرزہ براندام ہے زمیں افسوس تیرے کان پہ جوں رینگتی نہیں
تو چپ رہا زمین ہلی آسمان ہلا تجھ سے تو کیا خدا سے کروں گا میں یہ گلا

ان بزدلوں کے حکم پہ شیدا کیا ہے کیوں
نامرد قوم میں مجھے پیدا کیا ہے کیوں

(غلاموں سے خطاب)

ان شعروں کا آہنگ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جوش کو بزدلی اور غلامی ناپسند ہیں، اسی وجہ سے وہ اللہ سے اس قوم کی شکایت کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ وہ تو قوم میں ایک اسپرٹ دیکھنا چاہتے ہیں۔ جو آگ جوش کے سینے میں دہک رہی تھی وہ اسی آگ سے سامراجیوں کو جلا کر خاک کر دینا چاہتے ہیں۔ غرض جوش کی نظموں نے قوم کے اندر ایک نیا عزم اور نیا حوصلہ عطا کیا ہے جس میں بیداری کا درس ہے، وطن سے محبت ہے اور مظلوم لوگوں سے انسیت ہے، اس لئے وہ قوم کو بیدار دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ بیداری ہی سے ہم آزادی اور اپنی منزل مقصود حاصل کر سکتے ہیں ؎

بیدار ہے پھر فتنۂ چنگیز جہاں میں اور تو ہے ابھی تک اثر خواب گراں میں
صیاد کمینوں میں ہیں ناوک ہے کماں میں پیشانی دوراں یہ ہیں شب کے آثار

بیدار ہو، بیدار ہو، بیدار ہو بیدار
بیدار ہو بیدار

غرض شعراء نے انقلابی وسیاسی شعور کو اجاگر کرنے میں دو چیزوں کا لحاظ رکھا، ایک تو انگریزوں کے ظلم کی داستان کو نظم کے آہنگ میں پیش کرنا اور دوسرے مسلمان، جو محکوم کی زندگی بسر کر رہے تھے، یعنی غلامی کو لعنت تصور کرنا، البتہ ان نظموں سے اتنا ہوا کہ جو زندگی خزاں سے تعبیر تھی، اس میں بہار کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

۱۔ افکار، جوش نمبر، ص ۵۳۶

اقبال اور جوش کے بعد انقلابی اور سیاسی شعور کو اجاگر کرنے میں ادیب اور شعراء کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس شعور میں اضافہ کرنے والے ترقی پسند شعراء ہیں جنہوں نے مشرق کی بیداری کے لئے سامراجیوں کے خلاف نظمیں لکھیں اور وطن کی محبت میں ڈوب کر وہ ترانے لکھے جن سے ذہنوں میں انقلاب کی لہروں سے ارتعاش پیدا ہو گیا۔ روش صدیقی ''بیداری مشرق'' سے خاص کر نوجوانوں میں جدو جہد کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں ؎

سرخی خون وفا سے زندگی گلریز ہے
غیرت مزدور برق خرمن پرویز ہے
جس کا تیشہ آج شعلہ بار و آتش خیز ہے
ہاں وہی ہے کامران و کامگار و کامیاب
انقلاب! اے ساکنان ارض مشرق انقلاب

(بیداری مشرق)

اسی زمانے میں جوش کی نظم ''نعرۂ شباب'' بہت ہی زیادہ مشہور ہوئی ؎

یہ ستم کیا اے کنیز کفر و ایماں کر دیا — بھائیوں کو گائے اور باجے پہ قرباں کر دیا
کر دیا طول غلامی نے تجھے کو تہ خیال — چھریاں ہیں یہ ترے منہ پر کہ غداری کا جال
پیٹ کے بل، تا سزا پنجاب میں رینگتی تھی تو — تیری اس بے غیرتی پر گرم ہے اب تک لہو
ایک دین نو کہ لکھوں گا کتاب زرفشاں — ثبت ہوگا جس کی زریں جلد پر ہندوستاں
کوثر و گنگا کو اک مرکز پہ لاؤں تو سہی — اک نیا سنگم زمانے میں بناؤں تو سہی
کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ، انقلاب و انقلاب وانقلاب

(نعرۂ شباب)

جوش کی اس نظم کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صرف ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں اور آزادی کی اہمیت اور قدر و قیمت نوجوانوں کو بتانا چاہتے ہیں:

''اقبال اس سلسلے کی سب سے اہم کڑی ہیں۔ ترقی پسند شاعروں نے سماجی صورت حال کی صرف ترجمانی نہیں کی بلکہ اسے بدلنے پر بھی زور دیا۔ ترقی پسند نظم کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس نے سائنٹفک بنیادوں پر ان طاقتوں کی نشاندہی کی جو سماج کو بدلنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ یہ کام اس سے پہلے کے شاعروں نے نہیں کیا تھا۔ تیسرے یہ کہ ترقی پسندوں نے ہماری شاعری کا رشتہ قومی اور عوامی تحریکوں کے علاوہ بین الاقوامی تحریکوں سے جوڑا، ایک نئی انسانی اخوت اور نئی عالمی یکجہتی کا تصور انہوں نے دیا۔ اس کی خوب صورت مثالیں فیض، سردار جعفری، کیفی اور مخدوم کی شاعری میں ملتی ہیں'' [۱]

۱۔ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر، ص ۴۶۶

سیاسی شعور کی بیداری میں مجاز، احمد ندیم قاسمی پروفیسر شور، عزیز حامد مدنی، منیب الرحمٰن، اختر الایمان، ساحر لدھیانوی، عارف عبدالمتین، رفعت سروش، ظہیر کاشمیری، جاں نثار اختر، سردار جعفری کی نظمیں اس عرصہ میں زیادہ فعال رہیں کیونکہ یہ نظریاتی لحاظ سے اقبال اور جوش کی فکر کے شاعر ہیں۔ ان کی مقبول نظمیں یہ ہیں: ''نئی دنیا کو سلام''، ''ایشیاء جاگ اٹھا''، ''اودھ کی خاک حسین'' اور ''پتھر کی دیوار''۔

ساغر نظامی نے بھی اپنی شاعری میں سیاسی شعور کو اجاگر کیا ہے۔ ان کی مشہور نظمیں ''جواہر لعل نہرو''، ''مشعل آزادی''۔ فیض کے ہاں سیاسی شعور کے جو جذبات ابھرے ہیں ''نقش فریادی'' میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

پروفیسر شور کی نظم ''بنام ایشیاء''، افکار و مسائل کے ساتھ عصری گونج کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ مجروح سلطان پوری نے بھی انقلابی شاعری میں حصہ لیا۔ ان کا یہ شعر زباں زد عام ہو گیا ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

(مجروح)

اسی طرح دوسرے شعراء نے بھی سیاسی شعور کو ابھارنے میں غزل اور نظم میں بے پناہ اضافہ کیا، ان شعراء کے جذبات ملاحظہ کیجئے ؎

آج سے کوچہ و بازار میں مرنا ہے روا
ظلم کی چھاؤں میں جب بیٹھ کے جینا ہے حرام

(سردار جعفری)

جو چل سکو تو چلو کہ راہ وفا بہت مختصر ہوتی ہے
مقام ہے اب کوئی نہ منزل، فراز دار و رسن سے پہلے

(فیض)

زمیں جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل
وہ وقت ہے کوئی ذرہ بھی محو خواب نہیں

(فراق)

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

(مجروح)

کوہ غم اور گراں، اور گراں، اور گراں
غمزہ و تیشے کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے

(مخدوم)

توڑ پرانا نظام دائرۂ خاص و عام
بندش قوم و مقام دے یہ جہاں کو پیام

لے کے اخوت کا نام
انقلاب زندہ باد

(آنند نرائن ملا)

قدم قدم بڑھیں گے ہم
محاذ پر لڑیں گے ہم

(مجاز)

جگر خالصتاً غزل کا شاعر ہے، آزادی اور نظام نو کی خوشی سے سرشار ہے ؎

جو محو جشن نظام نو ہیں پکار کر ان سے کہہ رہا ہوں
نچوڑتا ہے لہو غریبوں کا دست سرمایہ دار اب بھی

(جگر)

رات تھی میں تھا اور اک میری سوچ کا جال
پاس سے گزرے تین مسافر دھیمی چال

شکیب جلالی

آدمی روز ازل سے زندہ و پائندہ ہے
آدمی روز ازل سے سرخوش و آزاد ہے
اس پہ لاکھوں بجلیاں برسیں حوادث کی مگر
یہ ہر لحظہ، بہ انداز دگر آباد ہے

ظہیر کاشمیری

تو دشت شام میں کیا ڈھونڈتا ہے اے شاعر
نشان گم شدگاں؟ نقش پائے راہرواں؟

عبدالعزیز خالد

یوں دبے پاؤں گزرتے تھے گریزاں لمحے
ہم کو احساس سفر کا تھا نہ منزل کی خبر

الیاس عشقی

ابھی تو شام ہے، شب کی سحر کا منظر ہے
ابھی شفق کا تلاطم ہر اک نگاہ میں ہے

خاطر غزنوی

نہ حکیموں کا مقدر، نہ رسولوں کا نصیب
نہ کہیں زہر کے پیالے، نہ کہیں دار و صلیب
نہ کوئی سچ کا پجاری، نہ کوئی حق کا نقیب

سرشار صدیقی

ازل سے ناخنہٗ آہو ہے درد مجبوری
یہ اک چراغ ہے سینے میں آرزو کی طرح

یوسف ظفر

مرا وجود، مری روح کو پکارتا ہے
تری طرف بھی چلوں تو ٹھہر ٹھہر جاؤں

احمد ندیم قاسمی

ہوا سرگوشیاں کرتی ہے موسم کے بدلنے کی
چٹختی دوپہر تپتے ہوئے ذروں سے کہتی ہے
حصار آسماں کو توڑ کر بجلی کی تنہائی
فضا میں ابر پاروں سے گلے ملنے کو نکلی ہے
زمین منتظر پر اس کی بوندوں کی یہ شہنائی
خبر دیتی چلی ہے کاروان گل کے چلنے کی

ڈاکٹر حنیف فوق

نرگس کے اداس، زرد پھولو
تم اپنے غموں میں یہ نہ بھولو
جب باد خزاں کے تند جھونکے
چھینیں گے یہ رنگ سب گلوں کے

حسن اکبر کمال

چلو چل کر کسی خالی زمیں پر پھول مہکائیں
کہیں کیاری بنائیں اور کہیں پیڑوں کو لہکائیں
کہیں پانی سے فوارے نکالیں اور کہیں چشمے
کہیں بجلی سے دھرتی پر شفق کے رنگ برسائیں
کہیں مہتاب چمکائیں کہیں شمعوں کو پگھلائیں
بہت زخمی ہے یہ دھرتی کسی اک زخم پر اس کے
مہکتی، جھومتی، فطرت کا دست مہرباں رکھ دیں

زبیر رضوی

مملکت زندہ و بیدار ہے اے ہم وطنو
قوم ایثار سے سرشار ہے اے ہم وطنون
ہم بہادر ہیں مگر ظالم و بے رحم نہیں
دشمنوں کو بھی یہ اقرار ہے اے وطنو

انور شعور

حسن بے نیازی سے
تم نے درد بویا تھا
میرے دل کے صحرا میں
میں نے خونِ حسرت سے
اس کی آبیاری کی
آنسوؤں کی شبنم نے
اس کو تازگی بخشی

رفعت سروش (عیش غم)

ساری دنیا جل رہی ہے نفرتوں کی آگ میں
عشق والے آئیں اب دنیا کی سرداری کریں
فخر سے پہنیں گلے میں تمغۂ آوارگی
اور یوں انسانیت کا جشن بیداری کریں

علی سردار جعفری، سیپ (جشن دلداری)

تیری تخلیق کا یہ سحر ہے بے قید زماں
اہل دل کے لئے زہر اب ہے یہ آگاہی
کہ اس انسان کی گمراہی وہی ہے کہ جو تھی
لاکھ سقراط اسے راستہ دکھلاتے رہیں
اس کی قسمت میں وہی تیرہ شبی ہے کہ جو تھی
لاکھ موسیٰ یہاں خورشید بکف آتے ہیں

ضیاء جالندھری، فنون (ایک مجسمہ)

شمعیں گل ہوگئیں فانوس بھی بے رنگ ہوئے
چند سایوں کے سوا کچھ بھی نہ تھی بزم نشاط
اب مرے پاس فقط چند تصور ہیں کمال
وہ تصور ہیں کہ ہر چند نہیں جن کی بساط

کمال احمد صدیقی (تصور)

سرد ہوا پاگل جھونکا
پھٹے ہوئے دامن میں اپنے
دیس دیس ہے، نگر نگر سے
تازہ سوکھے پتے لائے
گھر گھر بانٹتا جائے

محمود شام (پوسٹ مین)

کہیں پھول کھلے
مرا دل مہکے
کہیں شمع لے
مری آنکھیں روشن ہو جائیں

مشفق خواجہ (نظم)

بہت سے کام ہیں!
بنجر زمین پر گھاس پھیلا دیں
درختوں کو اگا ہیں، ڈالیوں پر پھول مہکائیں
پہاڑوں کو قرینے سے لگائیں
چاند لٹکائیں

ندا فاضلی (فضا خاموش ہے)

فکر و احساس کے دھندلکے میں
وقت کی زندگی سمت آئی
حافظے کے خموش گنبد میں
دفعتاً ایک گونج لہرائی

نریش کمار شاد (یاد)

پیار کے کچے دھاگوں میں اب کون پروئے دل
آیا جھونکا، ٹوٹا دھاگا، بکھر گئی محفل
بچھڑ گئے سب سنگی ساتھی، ڈوب گئی منزل

ڈاکٹر وزیر آغا (پیار)

ڈوبتی شام کا زخمی منظر
سامنے گہرا سبز سمندر
ایسے میں کشتی سے اتر کر
ساحل کی گیلی مٹی پر
تیرا نام مٹایا لکھ کر
نقش مگر باقی ہے دل پر

اشفاق حسین (نقش)

پھر رات گئے میں گھر کو لوٹ رہا ہوں افتادہ حیراں
اک گہری سوچ میں ڈوبا، تنہا تنہا، سر بہ گریباں
پھر دل کی گلیاں گھر کے طاقوں کی صورت ہیں ویراں

جلیل حشمی (زخم دل)

وقت رخصت وہ چپ تھی
بس ہاتھوں میں گلدستہ تھا
جس میں تین ہی پھول تھے لیکن
ہر اک باتیں کرتا تھا
دو اس کی آنکھوں جیسے تھے
ایک میرے دل جیسا تھا

پیرزادہ قاسم (وداع)

جہاں ستم کشوں پہ عرصۂ حیات تنگ ہے
جہاں بشر کا دست کار ساز نیرنگ ہے
جہاں صلہ سوال حق کا جور بے درنگ ہے
ضمیر جس کا منکر بتان نسل و رنگ ہے
جہاں نشید حریت کی لہو ترنگ ہے
وہ دیس میرا دیس ہے وہ جنگ میری جنگ ہے

اختر اقبال کمالی، نیرنگ خیال (میرا دیس)

تیری نظر تھی واقف اسرار کائنات ۔ تیرا ہر ایک قول تھا شرح صفات ذات
پوشیدہ ہر نفس میں تھی برق تجلیات ۔ تیری خودی نے فاش کیا عقدۂ حیات
تو فخر روزگار تھا دانائے راز تھا!
تصویر شوق پیکر سوز و گداز تھا

روشن نگینوی، ادبی دنیا (اقبال کے حضور)

صلاح الدین ندیم، احمد شمیم، بلراج کومل، رضا ہمدانی، رفعت سلطان، اعجاز صدیقی، اندر جیت شرما، احسان دانش، آل احمد سرور، تاجور نجیب آبادی، عرش ملسیانی، مشیر افضل جعفری، قمر ہاشمی، شبنم رومانی، سجاد باقر رضوی، آغا صادق، ڈاکٹر عندلیب شادانی، اختر انصاری، ظہور نظر، شان الحق حقی، محسن احسان، حفیظ تائب، مظفر حنفی، بشیر بدر، آفتاب اقبال شمیم، انور شعور، شہزاد احمد، گوہر ہوشیار پوری، احسن علی خاں، سرمد صہبائی، جلیل حشمی، مسلم شمیم، عبدالحمید عدم، عنوان چشتی، رحمان کیانی، جگن ناتھ آزاد، حکیم یوسف حسین خاں، کمار پاشی، زبیر رضوی، جمیل مظہری، سلیم احمد۔[1]

ان اشعار کی روشنی میں انقلاب زمانہ کو انقلاب ادب ہی نے روشناس کرایا۔ وہ ادب تاریخی حیثیت رکھتا ہے جس میں سیاسی وسماجی حالات اور مسائل پر شعر وادب تخلیق کیا گیا ہو اور ذہنوں میں ایک ارتعاش اور تبدیلی حالات جو آزادی سے تعبیر ہو، اس میں انسانی قدروں کا تحفظ اور قومی تہذیب کو اجاگر کیا گیا ہو۔ ترقی پسند ادب کو انسانی آزادی کا ادب کہا گیا ہے۔ اس شاعری میں جو ارتقائی عمل نظر آتا ہے، اس میں انسان کی بیداری کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ نظموں میں نئی جہتیں اور نئے موضوعات سے سماجی

۱۔ ''منتخب مختصر نظمیں'' عامر ضمیر کا مرتب کردہ مجموعہ ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس انتخاب میں سے چند نظمیں لی گئی ہیں اور چند نظمیں راقم نے رسائل سے منتخب کی ہیں۔

مسائل حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے- ناسپاسی ہوگی اگر ہم ان شعراء کی خدمات کا اعتراف نہ کریں کیونکہ انہوں نے ملک وملت سے محبت کا جو ثبوت فراہم کیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے- جنگ آزادی کے بعد سے عہد حاضر تک شعراء نے انقلابی وسیاسی شعور کو جس طرح اور جس طرز پر پیش کیا ہے، اس سے محکوم اور غلام قوم میں آزادی اور جرأت مندی کی لہر دوڑ گئی- نظموں کی کیفیت کچھ اس طرح سے تھی کہ جو پڑھتا اس میں ایک جوش، ولولہ اور آزادی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہو جاتا- آخر کار شعراء کی مسائی اور خدمات کام آئیں اور ۱۹۴۷ء کو ملک آزاد ہوگیا- آزادی کے بعد جو مسائل پیدا ہوئے، وہ حالات نظموں میں دیکھے جاسکتے ہیں-

متصوفانہ فکر:

برصغیر کی سیاسی تاریخ سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء تک سیاسی وسماجی ابتری کو شعراء نے ''شہرآشوب'' میں نظم کی صورت میں پیش کیا- ہندوستان میں رہنے والوں کی اضطرابی کیفیت کو جس طرح ظاہر کیا ہے، ان کی کچھ وجوہات تھیں- پہلی وجہ تو ملکی نظام میں خلل، قومی تشخص کا مجروح ہونا، معاشی بدحالی، غرض عروج وزوال کی طویل داستان ہے جو ہمیں مختلف شعراء کے ''شہرآشوب'' میں نظر آتی ہے- البتہ ۱۸۵۷ء کے بعد دکنی ادب کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے ان موضوعات کو مرثیہ میں پیش کیا- یاس وناامیدی کی جو فضا پہلے قائم تھی، وہ بعد میں بھی رہی-

اگر تاریخی اعتبار سے ان وجوہات کا جائزہ لیں جس میں مسلمانوں کا تیزی سے زوال پذیر ہونا پایا جاتا ہے تو سب سے پہلے مسلمانوں میں تعیش پرستی، مذہب سے دوری اور انسانی ہمدردی سے گریز- انگریزوں نے مسلمانوں کے حالات اور دیگر اقوام کی زبوں حالی دیکھی تو انہوں نے ملکی سیاست میں دخل دینا شروع کیا، بالآخر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جو کہ ناکام رہی، جسے بغاوت کا نام دیا گیا، مغلیہ سلطنت کا قصہ تمام کردیا- اب انگریز حکمران تھا اور ہندوستانی قوم غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھی- اس معاشرتی انحطاط کے پیش نظر حالؔی نے ''مسدس حالی'' اور شبلی نعمانی نے ''تماشائے عبرت'' جو کہ مسدس میں ہے، لکھ کر قوم کو غیرت دلائی- شبلی کا ''شہرآشوب اسلام'' دراصل انگریزوں کے خلاف ایک قلمی جہاد تھا، جس میں انگریز حکومت اور ان کی پالیسیوں سے نفرت کا اظہار کیا گیا ہے- ان کے بعد اکبرالہ آبادی، اقبال، مولانا محمد علی جوہؔر، مولانا ظفرعلی خاں، مولانا حسرت موہانی، امجد حیدرآبادی، ماہر القادری، مولانا احمد رضا خاں، حفیظ جالندھری وغیرہ نے متصوفانہ فکر اور شاعری کو فروغ دیا:

> ''درحقیقت تصوف ایک مکتب فکر کی حیثیت رکھتا ہے- اسے وجدان، واردات روحانی اور اشراق بھی کہا جاتا ہے- ابن سینا کے نزدیک علم کے تین ذرائع حواس، عقل اور تخیل ہیں- جب یہ تینوں اپنے عروج پر پہنچتے ہیں تو الہام جنم لیتا ہے- ابن سینا کا یہ نکتۂ نظر کس حد تک درست ہے، اس کی بابت تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے البتہ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ جب عقل و وحی کے پرستاروں کے مابین جنگ نے اتنی شدت اختیار کرلی کہ بالآخر دونوں گروہ نڈھال ہوگئے تو علم باطن یا علم اشراق نے جنم لیا اور یوں تصوف ایک مکتب فکر کی حیثیت اختیار کرگیا-''[1]

آٹھ سو سالہ دور میں برصغیر پر کیا گزری، مسلمانوں کے عروج وزوال کی یہ داستان اتنی طویل ہے کہ پڑھنے کے بعد افسوس

۱- اسلامی فکروثقافت، ص ۱۱۶

کئے بغیر نہیں رہ سکتے - ہم اپنے موضوع کے اعتبار سے کہ ''متصوفانہ فکر'' کی طرف لوگوں کا رجحان کیونکر ہوا؟ اس کا بنیادی اور اہم جواب یہ ہے کہ جب کشت وخون کا بازار گرم ہو، ناانصافیاں جب معاشرے میں جڑ پکڑنے لگیں، سیاست، علوم وفنون اور اسلامی اقدار میں بھونچال سا آ گیا ہو، غرض تاریخ میں یہ نشیب وفراز شکست وریخت مختلف کتب میں دیکھی جاسکتی ہیں مثلاً ''تمدن ہند پر اسلامی اثرات''، ''آب کوثر''، ''مضامین سرسید''، ''غدر دہلی''، ''مرزا غالب کے خطوط''، ''دستنبو''، ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' وغیرہ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے- یہاں اختصار کے پیش نظر کہ جب انسان اتنے مسائل اور مصائب سے گزر رہا ہو تو ایسے میں اسے ذہنی و قلبی سکون چاہئے ہوتا ہے اور وہ دین میں ہے، اس لئے لوگوں نے ظاہری عبادات کے ساتھ باطنی اصلاح کے لئے خانقاہوں کا رخ کیا تاکہ روحانی سکون میسر ہو، تصوف کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے:

> ''عملی طور پر تصوف ایسا طریقۂ حیات ہے جس کا مقصود ذات خداوندی سے بلاواسطہ رابطہ پیدا کرنا ہے- اس رابطے کے حصول کے لئے ہر شخص کو چند روحانی تجربات سے گزرنا پڑتا ہے، جنہیں واردات قلب کہتے ہیں- صوفیا کا علم ان کے نفس کی گہرائیوں سے پیدا ہوتا ہے، جسے مشاہدے یا کشف کا نام دیا جاتا ہے-'' [۱]

متصوفانہ فکر کی طرف رجوع ہونے کا مقصد یہی تھا کہ اب باطن کی اصلاح ہونا چاہئے- مسلمان خاص طور پر زمانے کے ہاتھوں اس قدر ذلیل اور رسوا ہو گئے تھے، ان کی اس اصلاح میں صوفیائے کرام نے نمایاں کردار ادا کیا:

> ''صوفی صوف مشتق ہو یا صفا سے، وہ مذہبی اور اخلاقی عالم میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے- وہ ملک وملت سے بے نیاز ہے اور ہر قوم اور مذہب میں پایا جاتا ہے، وہ ایک قسم کا باغی ہے جو رسم وظاہر داری کو جو دلوں کو مردہ کر دیتی ہیں، روا نہیں رکھتا اور اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے- مولوی اور صوفی میں یہ فرق ہے کہ وہ ظاہر کو دیکھتا ہے اور یہ باطن کو، وہ لفظ کو دیکھتا ہے اور یہ معنی کو-'' [۲]

تصوف پر چند بزرگان دین کے اقوال درج کئے جاتے ہیں- ان اقوال کی روشنی میں دیکھنا یہ ہے کہ اقبال کا نظریہ تصوف کیا ہے، تصوف کے بارے میں معروف کرخیؒ فرماتے ہیں:

> ''حقائق کو گرفت میں کرنا، دقائق پر گفتگو کرنا اور خلائق کے پاس جو کچھ ہے اس سے ناامید ہونا تصوف ہے-''

ذوالنون مصریؒ کا کہنا یہ ہے کہ:

> وہ لوگ صوفی ہیں جنہوں نے تمام کائنات میں صرف اللہ تعالیٰ کو پسند کیا-''

جنید بغدادی فرماتے ہیں:

> ''صوفی وہ ہے جس کا دل دنیا سے متنفر ہو اور جو فرمان الٰہی کا ماننے والا ہو-''

تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقیؒ کو بتایا جاتا ہے- انہوں نے محی الدین ابن عربی کی تصنیف ''فصوص الحکم'' کی تعلیمات کو منظوم پیرائے میں ادا کیا ہے-

---

۱- اسلامی فکر وثقافت، ص ۱۱۷

۲- اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۵

علامہ شبلی نعمانی اپنی کتاب شعر العجم جلد پنجم میں حضرت ابوسعید ابوالخیر کے بارے میں لکھتے ہیں، انہوں نے سب سے پہلے صوفیانہ خیالات ادا کئے ہیں، وہ شیخ بوعلی سینا کے معاصر تھے، شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ فارسی شاعری میں تصوف کا سرمایہ کس قدر موجود ہے:

''تصوف اصل میں زبان و قلم کی حدود سے باہر ہے- وہ وجدان ذوق ومشاہدہ کا نام ہے، جو بیان میں نہیں آ سکتا، تاہم جس قدر زبان قلم سے ادا ہوسکتا تھا، ارباب تصوف نے تصنیفات کے ذریعہ سے ادا کیا اور یہ پورا سرمایہ شاعری میں بھی آ گیا- ابتداء میں انہی دو چیزوں یعنی اسی علم و عمل کا نام تصوف تھا لیکن رفتہ رفتہ اس میں اور چیزیں بھی شامل ہوتی گئیں- چنانچہ موجودہ تصوف، فلسفہ اور اخلاق کے مجموعے کا نام ہے-'' [۱]

شبلی نعمانی کے اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قدیم تصوف اور موجودہ تصوف میں وقت کے ساتھ ساتھ دیگر معاملات بھی تصوف میں جگہ پاتے گئے- حضرت داتا گنج بخش علی بن عثمانؒ نے اپنی کتاب ''کشف المحجوب'' تصوف پر سیر حاصل معلومات رقم فرمائی ہیں- اس کتاب کی یہ خوبی ہے کہ اسے ہر دور میں مقبولیت حاصل رہی ہے- اگر اس کتاب کو تصوف کی روح کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا- زیادہ تر اقوال تصوف پر جو صوفیائے کرام نے ارشاد فرمائے ہیں، وہ اس کتاب میں محفوظ ہیں- ان میں سے چند کے اقوال یہاں درج کئے جاتے ہیں تاکہ اس عہد کے صوفیاء کے نظریات و خیالات سے آگہی ہو سکے اور تصوف کا صحیح معنی میں ادراک کر سکیں- ''کشف المحجوب'' کا یہ اقتباس جس میں موجودہ صوفیوں کے بارے میں لکھا ہے:

''موجودہ زمانہ میں اس قسم کے لوگ بکثرت ہیں لہذا جہاں تک ہو سکے ایسوں سے بچنے کی کوشش کرو اور ان کی طرف قطعاً توجہ نہ دو اس لئے کہ ایسے نقلی صوفیوں سے اگر تم نے ہزار ہا سلوک وطریقت حاصل کرنے کی کوشش کی تو ایک لمحہ کے لئے بھی طریقت کا دامن تمہارے ہاتھ نہ آئے گا- یہ راہ محض گدڑی پہننے سے طے نہیں ہوتی بلکہ یہ منزل ریاضت و محنت سے ملتی ہے-'' [۲]

دیکھنا یہ ہے کہ متصوفانہ فکر کا رجحان کیونکر ہوا؟ تقسیم ہند کے بعد پاکستان دنیا کے نقشے پر چمکنے لگا کیونکہ پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے اور اسے اسلام کے نام پر حاصل کیا ہے اس لئے اسلامی اقدار کا ہونا لازمی تھا- اسلام اخلاقیات اور اخوت کا درس دیتا ہے- ہندوستان میں مسلمانوں کے سر پر مایوسی اور محرومی کے بادل چھائے ہوئے تھے- ہندوؤں اور انگریزوں کے مظالم ہر روز بڑھتے جا رہے تھے- ہمارے ادیب اور شعراء نے ان حالات کو نثر اور نظم دونوں میں تحریر کیا ہے- مسلمان قوم جس پر مغربی تہذیب کی گرد اٹی ہوئی تھی، پاکستان بننے کے بعد جھڑنا شروع ہوئی- لوگ اسلامی تعلیمات کی طرف لوٹنا شروع ہوئے- شعراء نے نعتیہ کلام کے ذریعہ اسلامی نقوش اجاگر کئے- اس کے علاوہ اخلاقیات کے موضوعات پر توجہ دی- نعتیہ کلام کی ابتداء صوفیائے کرام کے ہاتھوں ہوئی- اردو زبان کی تشکیل اور فروغ میں صوفیائے کرام کا زیادہ حصہ ہے:

''نعت جسے صوفیانہ یا مذہبی شاعری سے تعبیر کیا جاتا ہے اپنی ابتداء اور فروغ کے

۱- شعر العجم- جلد پنجم، ص ۱۲۰

۲- کشف المحجوب، ص ۷۶

لئے صوفیائے کرام کی مرہون منت ہے۔ ظاہر ہے کہ اردو شاعری کا آغاز مذہبی حیثیت سے ہوا اور مذہبی خیالات ایک عرصہ تک شاعری میں غالب رہے لہذا اردو شاعری کے آغاز ہی سے شعراء نے نعت کی طرف توجہ کی۔'' [۱]

موضوع کے اعتبار سے ہم متصوفانہ فکر کے فروغ کا جائزہ نعتیہ شاعری میں لیں گے۔شعراء نے مدحت سرکارؐ کے علاوہ تصوف کے موضوعات پر بھی نظمیں لکھنا شروع کیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ لوگوں کے اخلاق وعادات اور اطوار میں خاصا فرق محسوس کیا گیا۔ خود آگہی کا احساس ذہنوں میں کروٹ لینے لگا۔ یہی وہ سب سے بڑا انقلاب ہے جس سے مسلمانوں میں پھر سے بیداری کی لہر دوڑ گئی، مذہبی اقدار اپنانے میں فخر کرنے لگے۔ یہ مساعی ہمارے اکابرین کی ہے کہ جس سے گم کردہ قوم اپنے مرکز پر واپس آنا شروع ہوئی:

''یہ صوفیائے کرام ہی کی جرأت کا فیض تھا کہ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی، جو پہلے ہچکچاتے تھے، اس کا استعمال شعر وسخن،، مذہب وتعلیم اور علم وحکمت کے اغراض کے لئے شروع کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان صوفیائے کرام کو اردو کا محسن خیال کرتا ہوں۔ یہ بزرگ اس زبان کے بڑے ادیب اور شاعر نہ تھے یا کم سے کم ان کا مقصد اس زبان کی ترقی نہ تھی، نہ اس کا انہیں کچھ خیال تھا، ان کی غایت ہدایت تھی لیکن اس ضمن میں خود بخود اس زبان کو فروغ ہوتا گیا۔ عہد بہ عہد نئے نئے اضافے اور اصلاحیں ہوتی گئیں۔'' [۲]

ان نئے اضافوں کو دور جدید سے عہد حاضر تک کے شعراء کا صوفیانہ کلام اور نعتیہ کلام پیش کرنے کی سعادت حاصل کریں گے، جس سے ہمارے اردو شعراء وادب میں تاریخی، مذہبی اور اخلاقی مضامین کا گنج ہائے گرانمایہ نظر آتا ہے اس کے علاوہ شعراء نے نعتیہ شاعری میں معاشرتی اور سماجی زبوں حالی کو بھی پیش نظر رکھا۔ اخلاقی مضامین کے بارے میں حالی کی رائے کچھ یوں ہے:

''شاعر جب اخلاقی مضامین بیان کرتا ہے تو اس کو بہ ضرورت اکثر نصیحت و پند کا پیرایہ اختیار کرنا پڑتا ہے اس لئے ہم کو بھی کہیں کہیں ناصح بننا پڑا ہے مگر اصلی ناصح کی نصیحت اور شاعر کے ناصحانہ بیان میں بہت بڑا فرق ہے۔ اصلی ناصح خود برائیوں سے پاک ہو کر اوروں کو ان سے باز رہنے کی تاکید کرتا ہے مگر شاعر چونکہ برائیوں کی ہو بہو تصور کھینچ کر دکھاتا ہے اور گھر کے بھیدی کی طرح چھپے رستموں کے پترے کھولتا ہے۔'' [۳]

نعتیہ شاعری کے علاوہ اس دور کی سیاست بھی زیر غور رہی۔ کچھ سانحات ایسے ظہور پذیر ہوئے اس وجہ سے مسلمانوں کی توجہ شعراء نے اس طرف مرکوز کرتے ہوئے حالات، وواقعات کو نظموں میں پیش کیا۔ ان میں مولانا محمد علی جوہر، حسرت موہانی، اقبال، ظفر علی خاں وغیرہ نے جلیانوالہ باغ کا حادثہ، تقسیم بنگال کی تنسیخ، مسجد کانپور کے شہداء، بلقان اور طرابلس کی جنگ، ان تمام حادثات اور واقعات کو شعری پیرائے میں ادا کیا ہے تاکہ مسلمانوں کی رگ حساس پر ضرب لگے اور خود کو بیداری کی طرف مائل

۱۔ اردو میں نعتیہ شاعری، ص ۱۲۵

۲۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۶۷

۳۔ دیوان حالی، ص ۱۰

کریں۔ان نظموں میں متصوفانہ فکراور اسلامی شعور کو دیکھا جا سکتا ہے۔

اقبال کے ہاں شاعری میں مختلف معیار ملتے ہیں،ان میں سے ایک متصوفانہ فکراور نعتیہ شاعری بھی ہے۔یوں تو اقبال کے اثرات معاصرین اور بعد کے آنے والے شعراء نے قبول کیے ہیں۔تشکیل جدید الٰہیات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نوجوانوں کو صورت فولاد دیکھنا چاہتے ہیں۔اقبال کی شاعری میں جو وسعت اور آفاقیت ہے وہ کسی دوسرے شاعر میں نظر نہیں آتی۔اقبال نے مسلمانوں کے زوال کو ایمانی کمزوری بتایا ہے۔یہی ایک ایسا مرض تھا جس سے پوری ملت اسلامیہ پارہ پارہ اور روبہ زوال ہوگئی تھی۔علامہ اقبال نے اس کا علاج تجویز کیا اور اپنے پیغام میں بارہا اس بات پر زور دیا کہ حضورؐ کی اطاعت اور پیروی میں آ جاؤ۔مسلمان جب اغیار کی تہذیب کو اپنانے لگے،اپنے مذہب سے بے پرواہ ہوگئے،تو اقبال نے ''جواب شکوہ'' میں مسلمانوں کی حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے،ملاحظہ کیجیے ؎

کون ہے تارک آئین رسول مختارؐ؟
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعار اغیار؟
ہوگئی کس کی نگہ طرز سلف سے بیزار؟
قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغام محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں
(جواب شکوہ)

مسلمانوں کو دعوت فکر دیتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ اب بھی وقت ہے اپنی اصلاح کی فکر کرو،ورنہ دنیا سے مسلمان کا نام ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا اس لئے وہ کہتے ہیں کہ عشق رسولؐ اور اتباع رسولؐ میں جو کامیابی ہے،وہ آخرت کی کامیابی ہے ؎

کسی یک جائی سے اب عہد غلامی کر لو
ملت احمدؐ مرسل کو مقامی کر لو

اقبال کے ہاں عشق ایک طاقت بن کر ابھرا ہے،تعلیم دیتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کر دے

کیونکہ اقبال سراپا عشق رسولؐ میں سرشار تھے۔اگر کوئی ان کے سامنے حضورؐ کا نام لے لیتا تو آپ تڑپ جاتے تھے۔سرکارؐ کی مدحت کرتے ہوئے اشکبار ہو جاتے اور پھر یہ ارشاد کرتے ؎

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا!
نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسین، وہی طاہا

ملت اسلامیہ کی بربادی اور زبوں حالی پر اقبال حضورؐ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں ـــ

شیرازہ ہوا ملت مرحوم کا ابتر اب تو ہی بتا تیرا مسلماں کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روح محمدؐ آیات الٰہی کا نگہباں کدھر جائے

اقبال کے کےنزدیک مسلمانوں کی بے بضاعتی اور زبوں حالی کا علاج صرف عشق رسولؐ میں ہے:

''علامہ اقبال کو ذات رسالتمابؐ سے غیر معمولی عشق و محبت تھا - ان کے حکیمانہ
دل و دماغ نے یہ محسوس کرلیا کہ حب نبویؐ کے بغیر سارا علم و عمل حجاب ہی حجاب ہے
کیونکہ انسانیت کی حقیقت تعمیر کے لئے جس فکر و عمل کی ضرورت ہے اس کا مرجع اور
مرکز ذات رسالت مآبؐ ہی ہے-'' [۱]

اقبال نے جو تعلیم و تبلیغ کی ہے اس میں حضور اکرمؐ کی سیرت طیبہ اور مکارم اخلاق کو بڑا دخل ہے- وہ حضور کے اسوۂ حسنہ سے انسانی زندگی کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں کیونکہ حضورؐ قیامت تک کے لئے نمونہ بن کر آئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنی شاعری میں اخلاقی اور روحانی قدروں کا خیال رکھا ہے-

اقبال کا نعتیہ کلام ان خوبیوں کا حامل ہے جس میں نعت رسولؐ کا یہ طریقہ جس میں حکمت آفرینی کی مثالیں عشق و مستی کی صورت میں پائی جاتی ہیں، یہاں تک کہ اقبال کی نعتیہ شاعری کا ذکر تھا، اب ان کی متصوفانہ فکر کو شاعری میں دیکھیں گے کہ اقبال کا نظریۂ تصوف کیا ہے-

دراصل اسلامی تصوف میں جب دیگر فلسفیوں کے نظریات شامل ہوگئے، اس عمل سے تصوف کی روح مجروح ہوئی- موجودہ دور میں تصوف کی ہیئت ہی بدل گئی- خانقاہوں کے صوفی حضرات صحیح معنی میں تصوف کی حقیقی روح سے واقف نہیں- تصوف ایک نظریہ ہے، تعلیم ہے، اس میں اصلاح کے ہزار پہلو ہیں، اس میں توحید و طریقت کے معاملات زیر بحث لائے گئے ہیں- اقبال کے متعلق یہ کہنا کہ وہ تصوف کے خلاف تھے، سراسر وہ لوگ غلطی پر ہیں یا پھر اقبال کے نظریات کا صحیح معنی میں مطالعہ نہیں کیا- وہ تصوف میں غیر اسلامی اجزاء کو برداشت نہیں کرتے، وہ عجمی اثرات سے تصوف کو پاک کرنا چاہتے ہیں اس لئے وہ اپنے نظریۂ تصوف میں عمل پر زور دیتے ہیں ـــ

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری
کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دل گیری

اسلامی ممالک میں جو نظریہ کام کر رہا تھا، تصوف میں توحید یا وحدت الوجود کا مسئلہ تھا- اس نظریے نے غلط طریقے پر عمل کرتے ہوئے قوم میں سستی، کاہلی اور جہد و عمل سے گریز، مسلمان جب اس راہ پر چل نکلے تو قوم میں غفلت، اپنی ہستی کا ادراک نہ کرنا، بے مقصد زندگی بسر کرنا- محی الدین ابن عربی نے اپنی کتاب ''فصوص الحکم'' میں وحدت الوجود پر جو بحث کی ہے، اس کی فضیلت سے انکار نہیں- انہوں نے احسن نقطے واضح کئے ہیں- دراصل اقبال نفی خودی کے خلاف تھے- ان کا نظریہ اثبات خودی میں پوشیدہ ہے- طویل بحث سے گریز کرتے ہوئے اقبال کے وہ اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن سے ان کا تصوف کا نظریہ واضح ہوتا ہے بلکہ ایک تعلیمی اور تبلیغی مشن تھا جسے انہوں نے احسن طریقہ سے ادا کیا گو کہ ان کی مخالفت بہت ہوئی، لیکن ثابت قدم رہے- اقبال موجودہ صوفیاء کی توجہ ان بزرگان دین کی طرف مبذول کراتے ہیں، جن کا ذکر داتا گنج بخش سید علی ہجویریؒ نے اپنی کتاب ''کشف

۱- اقبال شعاع صد رنگ، ص ۲۹۱

المجوب''میں کیا ہے، اقبال کے دوشعر ملاحظہ کیجئے ؎

وہ صوفی کہ تھا خدمت حق میں مرد
محبت میں یکتا جمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

اقبال ایسے صوفیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو آستینوں میں شمس وقمر چھپائے بیٹھے ہیں ؎

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضاء لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

اقبال کے پیام میں خودی پر جو زور ملتا ہے اس میں ذات کا عرفان وآ گہی بھی ہے اور خدا آ گہی کا میلان بھی۔ اقبال جب اپنی قوم پر نظر ڈالتے ہیں تو انہیں یہ غم اور افسوس ہوتا ہے کہ یہ قوم فرسودہ طریقوں پر کیسے گامزن ہوگئی۔ اس قوم کے پاس تو باقاعدہ ایک ضابطۂ حیات ہے، پھر یہ زوال پذیر کیسے ہوئی۔ انہوں نے تصوف کا صحیح ادراک دیا۔ انہوں نے اس خانقاہی نظام کی مخالفت کی اور نام نہاد صوفیوں پر اوران کے طریقوں پر کاری ضرب لگائی۔ اپنی قوم کی حالت کو بہتر بنانے کی فکر میں متصوفانہ فکر کو از سر نو فروغ دیا ؎

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

مندرجہ ذیل اقتباس سے اقبال کا نظریہ تصوف واضح ہوجاتا ہے:

''اقبال دراصل ایک صوفی شاعر تھا اور منفی تصوف کا نہیں بلکہ اثباتی تصوف کا قائل تھا۔ منفی تصوف وہ ہندی عجمی تصوف ہے جو انسان کو اس دنیا سے بے تعلق کر کے صرف روحانیت میں گم کردے۔ اثباتی تصوف، اسلامی تصوف وہ ہے جو انسان کا روحانیت سے اس طرح تعلق باقی رکھے کہ وہ اس دنیا میں زیادہ سے زیادہ انفرادی اور اجتماعی فرائض انجام دے، اس کی سب سے اعلیٰ مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ملتی ہے۔'' [1]

اقبال نے مسلمانوں، خاص کر نوجوانوں کو فکر وعمل کی تعلیم دی، اسی ایک عمل سے ملت کے رخ پر شباب آتا ہے ؎

ندرت فکر و عمل کیا شئے ہے؟ ذوق انقلاب
ندرت فکر و عمل کیا شئے ہے؟ ملت کا شباب
ندرت فکر و عمل سے معجزات زندگی
ندرت فکر و عمل سے سنگ خارہ لعل ناب

(بال جبریل)

۱- اقبال پر ۱۵ مقالات، ص ۱۶۳

ملا اور فقیہہ پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں، جن کے قلب عشق سے محروم ہیں ؎

آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملا نہ فقیہہ
وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خام
قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام

اقبال نے ضرب کلیم کی اس شعر میں دل مردہ کی بات کی ہے، اگر دل مردہ ہے تو پھر یہ دل نہیں، اسے دوبارہ زندہ کر، اسے اپنی خودی سے صیقل کر ؎

دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ

اقبال مرض کی تشخیص بھی کرتے ہیں اور مرض کا علاج بھی کرتے ہیں، ان کے اس مرض کی دوا ''خودی'' ہے ؎

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آب جو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

غرض اقبال نے عرفان خودی اور تعمیر خودی پر سب سے زیادہ زور دیا ہے، یہی ان کی متصوفانہ فکر ہے اور یہی ان کا نصب العین ہے۔

متصوفانہ فکر کو جن شعراء نے اجاگر کیا ہے، ان میں ان کے نعتیہ کلام کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ امجد حیدرآبادی کا کلام بطور نمونہ ملاحظہ کیجئے ؎

دونوں عالم میں کیا حق نے سرفراز مجھے
اپنی رحمت سے دیا خلعت اعزاز مجھے
بس ہے اک تیری نگاہ غلط انداز مجھے
امتی ہوں تیرا تقدیر پہ ہے ناز مجھے[1]

شہنشاہ کونین نکلا جو گھر سے دھواں سوز فرقت کا اٹھا جگر سے
زمیں سے زماں سے شجر سے حجر سے اٹھا شور کعبے کی دیوار و در سے
چلا تو کہاں رب کے گھر کے اجالے
نہ جا چھوڑ کر ہم کو او جانے والے[2]

ہدایت کی شعاعوں سے ضلالت کا مٹا سایا رخ روشن نے غارت کر دیا ظلمت کا سرمایہ
سودا ابروئے خمدار نے کیا رنگ دکھلایا ہوئی شام آفتاب بت پرستی پر زوال آیا

فلسفہ توحید پر امجد کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

اللہ کا ایک وصف رحمٰن بھی ہے بندوں کی اسی سے جان میں جان بھی ہے

رحمٰن محیط ماہ وطین ہے بالکل واللہ مبالغہ نہیں ہے بالکل
کونین میں فیض بخش عالم ہے یہی رحمت کی طلب کا اسم اعظم ہے یہی
مطلق ظاہر ہوا مقید بن کر رحمت نازل ہوئی محمدؐ بن کر
اسلام کا لطف کل نظر آئے گا رحمٰن ہی جب رحیم ہو جائے گا
تخصیص میں لطف ہوگا نعیم کے بعد کوثر کا مزہ آئے گا تسنیم کے بعد
سب کے لئے لا الہ الا اللہ ہے مسلم کو محمدؐ رسول اللہ ہے[1]

امجد حیدرآبادی

مہاراجہ سرکشن پرشاد شاؔد نے ''ہدیہ شاد'' میں جس عقیدت کا اظہار کیا ہے، ان کے اس جذبات سے عشق محمدی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ؎

جن کو کہتے ہیں محمدؐ وہ ہیں اپنے سلطان جس کو کہتے ہیں مدینہ وہ ہے کشور اپنا
احمدؐ کے در پہ اس لئے میں جبہ سا رہا سجدے کے لائق اور کوئی آستاں نہ تھا
اپنی خودی کو کھو کے اسے پایا آپ ہی یہ سیر کی ہے آ کے عدم سے وجود کی
میں فدا تم پہ دل و جان سے ہوں اے میرے نبیؐ مجھ کو بلوا لو مدینے میں شہ مطلبی
یہی کہتا ہوا آؤں گا جو ہوگی طلبی مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

عاشق ہوں مجھے جنت فردوس سے کیا کام ہے سر میں ازل سے مرے سودائے مدینہ

شاؔد کے کلام میں عشق کی تڑپ اور سوز غم فرقت کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ''ہدیہ شاد'' کے نام سے مجموعہ کلام شائع ہوگیا ہے۔ ان کے ہاں اہل بیت سے محبت کا اظہار بھی ملتا ہے، نعتوں میں نیازمندانہ اور عقیدت مندانہ جذبات کی ترجمانی بھی ملتی ہے ؎

سازگار اپنا زمانہ ہوگیا ہند سے طیبہ کو جانا ہوگیا
کفر چھوڑا پی کے مئے توحید کی رنگ شاداب عاشقانہ ہوگیا
بل کھاتے ہو کیا فرط نزاکت سے حسینو
حضرت کے ذرا گیسو کے خم دار کو دیکھو

یہ تمام اشعار ''ہدیہ شاد'' سے ہیں، بحوالہ اردو میں نعتیہ شاعری۔

مولانا ظفر علی خاں کی نعتیہ اور متصوفانہ شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسلام کی عظمت کو مجاہدانہ رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ اقبال کے خیالات زیادہ تر مذہبی تاثر لئے ہوئے ہیں۔ یہی حال ظفر علی خاں کا ہے ''بہارستان'' ان کی نعتوں کا مجموعہ ہے۔ حالی نے ''شکوۂ ہند''، اقبال نے ''شکوہ''، ''جواب شکوہ''، گلے کی صورت میں میں کیا ہے جو کہ ایک فریاد ہے، اسی طرح ظفر علی خاں نے ''اسلامیان ہند کی فریاد'' کے عنوان سے آنحضرتؐ کے حضور میں پیش کرتے ہوئے ہند کی تباہی اور بربادی پر آنسو بہائے ہیں ؎

جاگ اور یثرب کے میٹھی نیند کے ماتے کہ آج
لٹ رہا ہے آنکھوں آنکھوں میں تری امت کا راج

۱۔ ریاض امجد، نذر امجد۔ خرقہ امجد۔ بحوالہ اردو کی نعتیہ شاعری

ہم ہیں ننگ سر اٹھ اے شان عرب آن عجم
اور پہنا دے ہمیں پھر سطوت کبریٰ کا تاج

ملت بیضا کی رونق تیرے دم سے بے قرار
تمکنت اس بانحل کارواں کی تجھ سے ہے
ساری دنیا بن گئی ہنگامہ زار کشت و خون
کچھ اگر امید ہے امن واماں کی تجھ سے ہے

جو ماسوا کی حد سے بھی آگے گزر گیا
اے رہ نورد جادۂ اسریٰ تم ہی تو ہو

ظفر کا مشہور زمانہ شعر جو زبان زد عام ہے ۔

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز جھلکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں

عشق اور سرشاری کی کیفیت ملاحظہ کیجئے ۔

مرا منہ لیا چوم روح الامیں نے
لیا میں نے جس وقت نام محمدؐ

مولانا ظفر علی خاں

حفیظ جالندھری:

یوں تو حفیظ ہمہ جہت شاعر ہیں، ان کی شاعری ہفت پہلو لئے ہوئے ہے۔ ان کا رنگ و آہنگ حالی اور اقبال سے مماثلت رکھتا ہے، اسلامی وقومی جذبات جو حالی اور اقبال کے ہاں ملتے ہیں وہ ہمیں اسلامی تاریخ کی صورت میں حفیظ کے ہاں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ہدیۂ عقیدت کو تصوف کی زبان میں ادا کیا ہے۔ غرض انہوں نے منظوم تاریخ اسلام لکھ کر جس خلوص، محبت اور حضورؐ سے والہانہ عشق وخلوص کا اظہار کیا ہے۔ پڑھنے والے پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، چند اشعار ''شاہنامہ اسلام'' میں سے دیئے جاتے ہیں۔ ''سبب تالیف'' کے عنوان سے حفیظ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں پر ہر طرف مردہ دلی چھائی ہوئی ہے۔ مسلمانوں کی حالت کو دیکھتے ہوئے دل میں تحریک ہوئی کہ خدمت اسلام کس طریق سے کی جائے، عقل اور عشق کے پیکار میں عشق بازی لے گیا، ''شاہنامہ اسلام'' لکھنے کا آغاز کر دیا ۔

تمنا ہے کہ اس دنیا میں کوئی کام کر جاؤں — اگر کچھ ہو سکے تو خدمت اسلام کر جاؤں
مسلمانوں پہ ہے مردہ دلی چھائی ہوئی ہر سو — سکوت مرگ نے چادر ہے پھیلائی ہوئی ہر سو
نظر آتے ہیں اب وہ صف شکن بازو نہ شمشیریں — مقدر کی طرح سوئی پڑی ہیں آج تکبیریں

(سبب تالیف)[1]

۱۔ شاہنامہ اسلام۔ اول، ص ۹

ہند کے مسلمانوں کے لئے پیغام دیتے ہیں ؎

قلم سے زندہ کر سکتا ہے تو ان کارناموں کو — سنا سکتا ہے پھر پیغام آزادی غلاموں کو
عوام الناس میں ہنگامۂ احساس پیدا کر — دلوں کو ازسرنو حسن حریت پہ شیدا کر
مسلمانوں کے دل میں شعلۂ غیرت کو بھڑکا دے — نہیب رعد بن کر کفر کی غیرت کو دھڑکا دے
بتا دے اہل باطل کو حق کا نام زندہ ہے — وہی ایمان قائم ہے وہی اسلام زندہ ہے
اگر اسلام کے فرزند پھر آمادہ ہو جائیں — مٹا دیں تفرقے توحید کے دلدادہ ہو جائیں

(ضمیر کی آواز) [۱]

حفیظ جالندھری نے جس خلوص اور محبت سے حضورؐ کی خدمت میں سلام پیش کیا ہے، یہ سلام آج بچے بچے کی زبان پر ہے ؎

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوب سبحانی — سلام اے فخر موجودات فخر نوع انسانی
سلام اے ظل رحمانی سلام اے نور یزدانی — ترا نقش قدم ہے زندگی کی لوح پیشانی

سلام اے آتشیں زنجیر باطل توڑنے والے
سلام اے خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے

(سلام) [۲]

آفتاب ہدایت کا طلوع مقصد بعثت اس میں حفیظ نے مظلوم دنیا کی دعائیں قلم بند کی ہیں ؎

وہ مقصد جس کی خاطر آپ اس دنیا میں آئے تھے
وہ قرآں جس کو انسانوں کی خاطر آپ لائے تھے
کوئی گوشہ نہ ملتا تھا جہاں مظلوم اماں پائیں
کوئی سنتا نہ تھا ان کی یہ بے چارے کہاں جائیں

(مظلوم دنیا کی دعائیں) [۳]

حفیظ کا عشق رسولؐ، جس میں محبت ہی محبت، عقیدت ہی عقیدت ہے ؎

محمدؐ کی محبت دین حق کی شرط اول ہے — اسی میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے
محمدؐ کی غلامی ہے سند آزاد ہونے کی — خدا کے دامن توحید میں آباد ہونے کی
محمدؐ کی محبت امن ملت شان ملت ہے — محمدؐ کی محبت، روح ملت، جان ملت ہے
محمدؐ کی محبت خون کے رشتوں سے بالا ہے — یہ رشتہ دینوی قانون کے رشتوں سے بالا ہے

(حب رسول) [۴]

۱- شاہنامہ اسلام-اول، ص۱۳

۲- شاہنامہ اسلام-اول، ص۱۷

۳- شاہنامہ اسلام-اول، ص۸۶

۴- شاہنامہ اسلام-اول، ص۵۶

انہوں نے، مدحت رسولؐ میں جس عقیدت سے نذرانہ پیش کیا ہے، اس میں تلقین کی گئی ہے۔ حضورؐ کی محبت ہر اس چیز سے افضل ہے جو تمہیں اپنی جان سے زیادہ عزیز ہو، اگر اس دل میں سرکار دو عالم کی محبت نہیں تو پھر یہ دل بیکار و ناکارہ ہے۔

حفیظ نے وہ دور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ جب چار جانب سے مسلمانوں پر مغربی بجلی قہر بن کر گر رہی تھی۔ اقبال کے بعد اگر کسی شاعر نے مسلمانوں کی حالت، مذہب سے وابستگی نہ ہونا، اسلاف کے کارناموں کو بھلا بیٹھنا، افسوس کہ مسلمانوں کی رگوں میں لہو سرد ہو چکا، انہیں پھر سے گرمانے کی ضرورت ہے، وہ اپنی قومی کی بدتر حالت پر اپنے اندر ایک ایسا عزم پیدا کرتے ہیں جس کا اظہار انہوں نے چند شعروں میں کر دیا ؎

گئی دنیا سے آقائی محمدؐ کے غلاموں کی بھلا بیٹھے ہیں یاد اپنے سلف کے کارناموں کی
ارادہ ہے کہ پھر ان کا لہو اک بار گرماؤں دل سنگیں سخن کے آتشیں تیروں سے برماؤں
سناؤں ان کو ایسے ولولہ انگیز افسانے کرے تائید جن کی عقل بھی تاریخ بھی مانے
کیا فردوسی مرحوم نے ایران کو زندہ خدا توفیق دے تو میں کروں ایمان کو زندہ

مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی رائے ملاحظہ کیجئے جس میں سچائی اور حقیقت کے موتی نظر آتے ہیں:

''''شاہنامہ اسلام'' کا مصنف اور ''سر پھر اصلاح'' کا خالق آپ کے ملک میں اندھیرے گھر کا چراغ ہے۔ اکبر و اقبال دونوں کا سچا جانشین!'' [۱]

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حفیظ نے حقیقتاً اقبال کی براہ راست تقلید کی ہے۔ ان کے موضوعات میں مذہبی لگاؤ، وطن سے محبت اور انسانوں سے محبت کا جو پیغام ملتا ہے، وہ دراصل اقبال کی فکر کا ثمر ہے۔ غرض حفیظ نے ''شاہنامہ اسلام'' لکھ کر وہ منظوم تاریخ مرتب کی ہے جس کے حالات و واقعات سے آنے والی نسلیں سبق اور عبرت حاصل کرتی رہیں گی۔ حفیظ کا یہ کام وقت کی تختی پر لکھا جا چکا ہے، اسے مٹایا نہیں جا سکتا کیونکہ جنوں کی عبارت مٹائے نہیں مٹتی۔

ہندوستان کی حالت زار کو دیکھ کر احمد رضاؒ فاضل بریلوی سرکار دو عالمؐ سے مدد کی التجا کرتے ہیں اور اپنے رب سے مصطفیٰؐ کا واسطہ دیتے ہیں ؎

یا خدا بہر جناب مصطفیٰ امداد کن یا رسول اللہ از بہر خدا امداد کن
نیر نور الہدیٰ بدر الدجیٰ شمس الضحیٰ اے رخت آئینہ ذات خدا امداد کن
اے سرور جاں غمگیں اے پے امت حزیں اے غم تو ضامن شادی ما امداد کن

احمد رضا خاںؒ [۲]

عملی زندگی میں احمد رضا خاںؒ ایک سچے عاشق رسولؐ اور سنت کی پیروی کرنے والے مثالی انسان تھے۔ ان کی نصیحتوں میں حب رسولؐ اور عقیدت ہر لفظ اور ہر شعر سے عیاں ہے، جو ان کی دلی کیفیات کی ترجمانی کرتی ہے ؎

نزول نسخۂ پاکیزۂ کلام مجید
ترے عروج ترے حمد کے بیاں کے لئے

محسن کاکوروی

۱۔ افکار۔ حفیظ نمبر، ص ۵۹۱

۲۔ حدائق بخشش۔ حصہ دوم، ص ۳۹

ہندوستان کی تباہی پر محسن مضطرب اور پریشان ہیں، حضورؐ کے وسیلے سے بیڑا پار کرنے کی دعا کرتے ہیں ؎

موج طوفان بلا ہر سو ہے اور قلب کو اضطراب ہر پہلو ہے
کر دے بہ طفیل مصطفیٰ بیڑا پار اس کشتی کا ناخدا خدایا تو ہے

محسن کاکوروی

تم سے کروں نہ عرض تو کس سے ہو التجا میرا نصیب میرا مقدر تمہیں تو ہو

بہزاد لکھنوی

درحقیقت میری بخشش کی کوئی صورت نہ تھی سچ یہ ہے ماؔہر کہ عشق مصطفیٰ کام آ گیا
اک لمحہ ان کی یاد سے غفلت ہے معصیت آٹھوں پہر تصور جانانہ چاہئے

ماہرالقادری

متصوفانہ فکر میں جن شعراء کا کلام دیا گیا ہے ان کے کلام سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے روحانیت کو موضوع بنا کر عشق حقیقی کے مضامین سے لوگوں میں دین کی محبت کا جذبہ پیدا کیا، دوسرے اس کلام سے باطنی اصلاح کا کام لیا۔تصوف کا مفہوم اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتا جب تک کہ حضور اکرمؐ سے والہانہ محبت اور ان کی مکمل پیروی میں نہ آ جائیں۔اتباع رسولؐ ہی سے ہم دنیاوی مصائب اور آلام سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔آپؐ کے اخلاق اور اوصاف حمیدہ نے یہ ثابت کر دکھایا کہ انسان کو زندگی کیسے گزارنا چاہئے۔مسلمان جب پریشانی کی حالت میں ہوتا ہے، مدد کے لئے دین کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آتا، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ اور حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ قوم کی اصلاح تصوف کے راستے پر چل کر کی جائے۔شعراء نے مسئلہ تصوف پر وحدت الوجود اور ہمہ اوست کے فلسفہ کو اپناتے ہوئے شاعری میں دفتر کے دفتر تیار کر دیئے، لیکن اقبال نے تصوف کے رجحان کو بدلتے ہوئے قوم میں عمل کے رجحان کو فروغ دیا۔انہوں نے عجمی تصوف سے گریز کی تلقین کی ہے اس کے ساتھ ہی نو افلاطونی اثرات پر کڑی تنقید کی ہے۔ان کے نزدیک تصوف کی اصل روح اخلاص فی العمل ہے۔اس سے باطن کی اصلاح بھی ہوتی ہے اور اطمینان قلب بھی حاصل ہوتا ہے۔مسلمانوں کے حالات اور ہندوستان کی سیاسی و معاشرتی حالت مقالہ میں متعدد بار زیر بحث آ چکی ہے اس لئے اعادہ سے بچنے کے لئے زیادہ تر شعروں پر اکتفا کیا گیا ہے تاکہ تصوف کا میلان اجاگر ہو سکے۔نعتیہ شاعری کا تذکرہ اس لئے ضروری تھا کہ اس عمل سے روحانیت کا تعلق ہے۔نعت میں حضورؐ کی سیرت، خصائل و شمائل اور آپؐ کے اخلاق و اطوار کو بطور نمونہ پیش کر کے دین سے محبت اور عشق رسولؐ کا فریضہ ادا کیا ہے تاکہ مسلمان نعتیہ ادب سے ماضی کی روایات تازہ کر سکیں۔تصوف اور نعتیہ ادب سے ایک انقلاب برپا ہو گیا۔شعراء کی یہ مساعی کیا کم ہے کہ بگڑی ہوئی قوم کو راہ راست پر لانے کے لئے جو فکر اور شعور انہوں نے قوم کو دیا، اس کی مثبت نتائج برآمد ہوئے۔

باب ہفتم

اقبال کی مخالفت

اقبال کے اثرات ان کے مخالفین پر اعتراضات کی شکل میں مرتب ہوئے، عام انسان ہو یا خواص جبلت کے تقاضوں سے مبرا نہیں- جبلت انسانی کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ جس سے ملتا ہے یا جس کے بارے میں سنتا ہے یا پڑھتا ہے وہ اس سے ذہنی اثرات قبول کرتا ہے اور کسی کی تعریف میں ہی نہیں، متاثر ہونے کا احساس نہیں ملتا بلکہ مخالفت میں بھی متاثر ہونے کا بین ثبوت موجود رہتا ہے- اسی پہلو سے دیکھیں کہ ہمیں اقبال کے نقطۂ نظر سے اتفاق نہ کرنے والوں کی بھی ایک فہرست ملتی ہے، اسی سلسلے میں چند نام جو اقبال کی مخالفت میں نمایاں رہے، ان میں پیرزادہ مظفر احمد فضلی، خواجہ حسن نظامی، اکبر الٰہ آبادی، مولوی ظفر احمد صدیقی، سیماب اکبرآبادی، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، ص-ا-تبسم، عبدالمالک آروی- مخالفین کی آراء سے یہ اندازہ لگانا ہے کہ مخالفت کا معیار کیا ہے اور یہ مخالفت میں کس حد تک کامیاب یا ناکام ہوئے- موضوع کی مناسبت سے انہی امور پر بحث کی گئی ہے- اقبال کی مخالفت اور اعتراضات میں جو لوگ پیش پیش رہے ہیں، اقبال کی شہرت کو نقصان پہنچانے کے سوا اور کچھ نہیں کیونکہ اعتراضات کی نوعیت سطحی زیادہ ہے، معیاری کم- ''اسرارخودی'' کی اشاعت پر ایک خاص طبقہ اقبال کا مخالف ہو گیا- اس خاص طبقہ نے عوام کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا- اس کے علاوہ عروض و زبان، قواعد اور فنی نکات پر اعتراض اٹھائے گئے- ''اودھ پنچ'' میں اعتراضات کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے- یہ اعتراض کیا تھے، وہ تو اقبال کی تضحیک کے پہلو تلاش کئے جاتے تھے- اقبال نے ان اعتراضات کے جواب ''مخزن'' اکتوبر ۱۹۰۲ء میں تفصیل کے ساتھ دیئے ہیں-

اقبال کے نزدیک ''اسرارخودی'' کا محرک برصغیر کی وہ حالت ناگفتہ بہ تھی جو خاص طور پر مسلمانوں میں غیر اسلامی رسوم کے اسلام میں داخل ہونے کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی- مملکت اسلامیہ نے جہالت، تعصب اور مغربی تقلید کے زیر اثر اپنے مذہبی اقدار کو پس پشت ڈال دیا تھا مثلاً افغانستان اور ترکستان افغانی انگریزوں کی غلامی میں تھے اور ترقی روس کے پنجۂ اثر میں تھا، ایران میں مسلمانوں کی حالت سب سے زیادہ بدتر ہو چکی تھی، ان کے ہاں ملوکیت اور مذہبی پیشوا کے تصور نے مسلمانوں کو نفسیاتی غلام بنایا ہوا تھا- مرثیہ خوانی اور سوز خوانی جیسی شاعری کو پسند کرتے تھے- انگریزوں نے مسلمانوں کی اس حالت کو دیکھتے ہوئے ان کو مزید غلامی میں جکڑ لیا- اسی طرح مصر اور الجیریا پر فرانس نے چڑھائی کر کے قبضے میں کر لیا- مسلمان اپنی حالت سے بے خبر تھے، زیادہ تر مسلم ممالک انگریزوں کے قبضے میں تھے-

مسلمانوں پر ایک ایسا جمود طاری تھا، ایک ایسے سحر میں گرفتار تھے، انہیں نہ کچھ اپنے حال کی خبر تھی اور نہ ملک و ملت کی پرواہ- ایسے میں جمال الدین افغانی نے مسلمان قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی سعی زیادہ کامیاب نہ ہو سکی- اقبال نے جب مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لیا تو ہر طرف مسلمان مظلومیت کا شکار نظر آئے، خاص کر ہندی مسلمان، جن کی حالت دیگر مملکت اسلامیہ کے زیادہ بدتر تھی- اس کی وجہ جنگ آزادی تھی جس میں مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا- انگریزوں کی فتح مسلمانوں کے لئے ایک قہر اور عذاب کی صورت میں ظاہر ہوئی- اس موضوع پر ہم گزشتہ باب میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں لہذا اقبال کی

مخالفت کی وجہ دریافت کرتے ہیں- اقبال نے اپنی قوم کو جب ذلیل وخوار اور پستی میں دیکھا تو ان سے رہا نہ گیا، معاً دل میں خیال آیا کہ اس قوم کو بیدار کرنا چاہئے اس لئے انہوں نے قرآن اور اس کی روح کو موجودہ مسلمانوں کی حالت کے تحت روشنی بہم پہنچائی اور مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی ومعنوی سے کسب فیض کیا، اس مردہ قوم کو جگانے کا بیڑا اٹھا- مثنوی ومعنوی کی فضیلت اپنی جگہ مسلم ہے ؂

''مثنوی و مولوی و معنوی
ہفت قرآں در زبان پہلوی''

اس طرح اقبال نے مثنوی اور قرآن سے روشنی حاصل کی اور اپنی مثنوی ''اسرار خودی'' کی بنیاد رکھی کیونکہ مسلمان روحانی، اخلاقی اور سیاسی اعتبار سے اپنا وقار کھو چکے تھے- اس بات کی تائید علامہ اقبال کے ان اشعار سے ہو جاتی ہے ؂

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیار
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

اقبال نے اپنے اشعار میں مسلمانوں کا جو نقشہ کھینچا ہے، وہ ان کی حیثیت کا آئینہ دار ہے، قوم کی پستی اور ان کی تذلیل کو اپنی شاعری میں موضوع بحث بنایا اور مسلمانوں کو مسلمانوں کی تاریخ، مذہب اور اخلاقیات کے وہ نمونے پیش کئے، جس سے مسلمان سرخرو تھے، آج کا مسلمان رسوا ہی رسوا ہے ؂

آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رسوا تو ہوا

اس رسوائی کے پیش نظر اقبال نے اپنے افکار اور نظریات سے اشعار کے ذریعے قوم کو بیدار کرنے کی جو سعی کی تھی اس میں ''اسرار خودی'' اور ''رموز بے خودی'' اہمیت کی حامل ہیں- انہوں نے مسلمانوں کو عجمی تصوف کے مضر اثرات سے بچانے کی بھرپور کوشش کی- عجمی تصوف غیر اسلامی فکر کا وہ نتیجہ ہے جس سے مسلمانوں میں سعی و جہد عمل میں کوتاہی سے کام لیا جانے لگا اور لوگ ذوق عمل سے دور ہوتے گئے- وہ نظریہ وحدت الوجود کا ہے، اس نظریہ میں نفی خودی کا درس ملتا ہے، یعنی اپنے وجود کو دھوکہ اور فریب نظر سے تعبیر کرتے ہیں- اقبال نے اس نفی کو اثبات میں تلاش کیا-

اقبال نے عمیق مطالعہ کی روشنی میں یہ بات واضح طور پر ظاہر کر دی کہ ویدانتی، نو افلاطونیت اور غیر اسلامی تصوف قرآن کے بالکل برعکس ہے- اقبال غیر اسلامی تحریک کی مخالفت کرتے ہیں، نہ کہ تصوف کے خلاف ہیں:

''میں اگر مخالف ہوں تو صرف ایک گروہ کا جس نے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر بیعت لے کر دانستہ یا نادانستہ ایسے مسائل کی تعلیم دی ہے جو مذہب اسلام سے تعلق نہیں رکھتے- حضرات صوفیہ میں جو گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ پر قائم ہے اور سیرت صدیقی کو اپنے سامنے رکھتا ہے- میں اس گروہ کا خاک پا ہوں اور ان کی محبت کو سعادت دارین کا باعث تصور کرتا ہوں-''[1]

۱- مقالات اقبال، ص ۱۶۱

اقبال نے اس اقتباس کے ذریعے اپنا نقطۂ نظر واضح کر دیا اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ ایسے تمام افکار و نظریات اسلام کی ضد ہیں۔ انہوں نے ''اسرار خودی'' اور ''رموز بے خودی'' لکھ کر مسلمانوں کو اثبات خودی کی تلقین کی اور مسلمانوں میں عشق رسولؐ کا جذبہ پیدا کیا۔ عشق رسولؐ کی افادیت میں اقبال کا نظریہ یہ تھا کہ انسان روحانی طور پر اس قدر طاقتور ہو جاتا ہے جیسے صحابہ کرامؓ کی طرز زندگی۔ وحدت الوجود کے مسئلے پر شری شنکر اچاریہ نے بھی اثبات میں پورا زور صرف کیا ہے۔ یہی وہ ویدانتی نظریہ ہے جو اسلام میں داخل ہوا۔ جگن ناتھ آزاد کا کہنا ہے کہ:

> ''مسئلہ انا کی تحقیق و تدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب و غریب مماثلت ہے اور وہ یہ کہ جس نقطۂ خیال سے شری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی، اسی نقطۂ خیال سے شیخ محی الدین ابن عربی اندلسی نے قرآن کی تفسیر کی جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے۔'' [1]

اقبال نے جب ''اسرار خودی'' میں حافظ شیرازی کے خلاف اشعار لکھے تو چار جانب ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا اور لوگ اقبال کی مخالفت میں کمر بستہ ہو گئے۔ گو کہ اقبال نے حافظ کے اشعار اور خیالات کو ہدف تنقید بنایا تھا، حافظ شیرازی کا تو وہ دل سے احترام کرتے تھے۔ اقبال نے افلاطون کو بھی مثنوی ''اسرار خودی'' میں تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ حامد حسن قادری، اقبال کے نظریات کی تائید میں لکھتے ہیں:

> ''انسان کی زندگی آرزو اور عمل سے مرکب ہے۔ آرزو کی تحدید اور عمل کی تہذیب ہر مذہب کا اور سب سے بڑھ کر مذہب اسلام کا کام ہے اور یہی چیز تصوف ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو حسین ترین شکل میں انسان کے سامنے پیش کرنا اور دل کے لئے مرغوب و محبوب بنانا تصوف کا مقصود و مدعا ہے۔ تصوف کے اعمال و اشغال کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ عبادات اور معاملات انسان کی نظر میں مہیب و خوفناک نہیں رہتے، حسین و محبوب بن جاتے ہیں۔ ان پر عمل کرنا گراں نہیں گزرتا بلکہ جس کو عمل کرنے کا شوق پیدا ہوا جاتا ہے، جی چاہنے لگتا ہے لیکن اس سے انسان کی زندگی کے کسی مرحلے میں کسی شغل، کسی آرزو، کسی مقصد میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ اس کی مثال موجود ہے، شہادت سامنے ہے، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر کون صوفی ہوسکتا ہے، بس ان کا اتباع کرنا اور اسی طرح دنیا میں عمل کرنا اور پیہم عمل کرتے رہنا اسلام بھی ہے اور تصوف بھی۔'' [2]

اقبال مسلمانوں کو صحیح سمت پر لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ چند اشخاص مثنوی کے اشعار پر اقبال سے ناراض ہی نہیں بلکہ بدگمان ہو گئے کہ یہ تو تصوف کے خلاف مسلمانوں کو گمراہ کر رہا ہے، ان میں اکبر الہ آبادی، خواجہ حسن نظامی، پیرزادہ مظفر ان کے علاوہ دیگر مخالفین جنھوں نے اقبال کے عروض، قافیہ اور زبان پر اعتراض اٹھائے ہیں۔

۱۔ اقبال اور اس کا عہد، ص ۵۷

۲۔ اقبال اور مشاہیر، ص ۲۴

پیرزادہ مظفر احمد فضلی......

مثنوی ''اسرار خودی'' کی مخالفت میں پیرزادہ مظفر نے ''راز خودی'' جواب کے طور پر لکھی، دراصل ان کی مثنوی حافظ کی حمایت میں ہے، اقبال کی تنقید افلاطون اور حافظ شیرازی پر تھی۔ ''اسرار خودی و رموز بے خودی'' پر پہلی اشاعت میں اقبال نے دیباچے کے ساتھ جو اشعار لکھے تھے، اسے دوسری اشاعت میں حذف کر دیا گیا۔ ان اشعار سے عوام اور صوفیائے کرام اقبال کے خلاف ہو گئے تھے۔ افلاطون کی تنقید پر عوام نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا لیکن حافظ کی تنقید پر لوگ برہم ہو گئے۔ اقبال نے جس تنقیدی نقطۂ نگاہ سے انہیں ہدف بنایا ہے، وہ مسلمانوں کے لئے مثبت اقدام تھا۔ مثنوی ''اسرار خودی'' میں سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

راہب دیرینہ افلاطوں حکیم　از گروہ گوسفندان قدیم
رخش او در ظلمت معقول گم　در کہستاں وجود افگندہ سم
فکر افلاطوں زیاں را سود گفت　حکمت او بود را نابود گفت
قوم ہا از شکر او مسموم گشت　خفت واز ذوق عمل محروم گشت

وہ اشعار جو حافظ کے لئے لکھے گئے تھے مندرجہ ذیل ہیں ؎

ہوشیار از حافظ صہبا گسار　جامش از زہر اجل سرمایہ دار
رہن ساقی خرقہ پرہیز او　مے علاج ہول رستاخیز او
ملم و ایمان او زنار دار　رخنہ اندر دینش از مژگان یار
مفتی اقلیم او مینا بدوش　محتسب ممنون و پیرو مے فروش
آں فقیہ ملت مے خوارگاں　آں امام امت بے چارگاں
ایں قتیل ہمت مردانۂ　آں زرمز زندگی بیگانۂ
بے نیاز از محفل حافظ گذر
الحذر از گوسفنداں الحذر

پیرزادہ مظفر احمد کے ''راز خودی'' میں سے دو شعر ملاحظہ کیجیے ؎

ہر چہ گفتہ از خودی حاشا غلط　سر بسر از لفظ تا معنی غلط
در حیات کس خودی را دخل نیست　خلق عالم نورس ایں نخل نیست

اسلم جیراج پوری نے طویل بحث کے بعد محسوس کیا کہ پیرزادہ مظفر احمد کے اعتراض اور مخالفت کا جواب لازمی ہو گیا ہے، چند سطور ملاحظہ کیجیے:

> ''پیرزادہ صاحب نے خودی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے خواجہ حافظ کے جوش حمایت میں ڈاکٹر صاحب کے مفہوم مقصود کو سہواً یا قصداً نظر انداز کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تو صاف لکھ دیا ہے کہ ''خودی کو بمعنی غرور میں

نے استعمال نہیں کیا ہے بلکہ اس کا مقصود محض احساس نفس یا تعین ذات ہے۔'' باوجود
اس تصریح کے اس لفظ کے جو معنی انہوں نے خود ڈاکٹر صاحب کے اشعار سے نکالنے
کی کوشش کی ہے، اس میں صریحی طور پر انصاف سے تجاوز کر گئے ہیں۔'' [۱]

پیراگراف سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ پیرزادہ مظفر احمد نے جو تنقیدی نقطے تلاش کئے ہیں، ان میں قطعی دم خم نہیں ہے۔ جس خودی کا تصور مظفر احمد نے پیش کیا ہے، وہ خودی کے تصور سے متصادم نظر آتا ہے۔ انہوں نے ''راز خودی'' لکھ کر از خود جواز فراہم کر دیا ہے کہ وہ ''اسرار خودی'' کے مفہوم سے ناواقف ہونے کا اعلان کر رہے ہیں۔ خودی کو غلط کہنے پر اپنی بے خودی کا راز فاش کر دیا:

''بہر حال بہت سے صوفیوں نے حافظ کے متعلق اقبال کے اشعار کو تصوف کے
خلاف ایک حملہ تصور کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے شعراء اور مصنفین نے اقبال پر نظم اور
نثر میں نہایت شدید اور عامیانہ حملے کئے۔ اس سلسلے میں جو لوگ اقبال پر حملہ آور
ہوئے ان میں خواجہ حسن نظامی اور مظفر احمد فضلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں
ناقدین میں سے کوئی بھی بڑا عالم و فاضل نہیں تھا اور یہ ظاہر ہے کہ وہ اسرار خودی کے
موضوع کو بالکل نہیں سمجھتے تھے، تاہم ان کے حملوں نے عوامی تخیل کو متاثر کیا۔'' [۲]

یہ حقیقت ہے کہ ان کی اس مخالفت سے لوگوں کے ذہن متاثر ہوئے اور یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ اقبال تصوف کے خلاف ہیں کیونکہ خواجہ حسن نظامی اور پیرزادہ مظفر احمد کو لوگ اہل تصوف میں شمار کرتے تھے اور ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ اقبال کو صرف یہ افسوس تھا کہ ''اسرار خودی'' کا باضابطہ مطالعہ نہیں کیا گیا۔ نظریات اور مآخذ پر توجہ نہیں دی گئی۔ گو کہ اقبال نے متعدد خطوط تحریر کئے، اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کی پوری کوشش کی، گو کہ اقبال کی کوشش مسلمانوں کی اصلاح تھی:

''ایک شخص علمی تحقیقات سے مفید اور صحیح خیالات قوم کے سامنے پیش کرتا ہے۔
قوم اس کو جاہل، دشمن اسلام اور کافر بتاتی ہے۔ امام غزالیؒ، ابن رشد اور امام ابن تیمیہ
رحمہم اللہ صحیح راستہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کسی کی کتابیں جلائی جاتی ہیں، کوئی
جلاوطن کیا جاتا ہے، کسی کو قید خانے میں جانا پڑتا ہے۔ عقیدہ وہی صحیح ہے جس کی بنیاد
علم یقینی پر ہو، محض رسمی عقیدہ، عیارستان بازار تحقیق میں کوئی قیمت نہیں رکھتا۔'' [۳]

مسلمانوں کی اصلاح کا واحد ذریعہ صرف اتباع شریعت میں ہے۔ شریعت اور طریقت ہی کے اپنانے میں ظاہر و باطن کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ علم اور عمل سے انسان دنیا و آخرت کو سنوار سکتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ سنت کی اتباع کرے۔

علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست   اصل سنت جز محبت ہیچ نیست
باتو گویم سر اسلام است شرع   شرع آغاز است و انجام است شرع

اقبال نے صحیح طور پر اسلام کی روح کو سمجھانے کی کوشش کی اور یہ واضح کیا ہے کہ اصل تصوف کیا ہے، خانقاہوں اور سجادہ نشینوں کے طور طریقے اسلام سے مناسبت نہیں رکھتے یعنی اس تصوف کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ دیگر اقوام جب مسلمان ہونا

۱۔ اقبال معاصرین کی نظر میں، ص ۳۴۳

۲۔ نقش اقبال، ص ۲۵۰

۳۔ اقبال معاصرین کی نظر میں، ص ۳۴۲

شروع ہوئے تو قدیم فلسفے کو اسلام میں شامل کر لیا- اسلامی تعلیمات اور فلسفہ الگ الگ چیزیں ہیں، اقبال نے انہیں علیحدہ کرنے کی کوشش کی ہے-

مثنوی ''اسرار خودی'' کو جن حضرات نے اپنی آنکھوں سے لگایا اور عقیدت سے سر پر رکھا اور اس بات کا اعتراف کیا کہ جو رموز و نکات مثنوی میں اقبال نے بیان کئے ہیں، وہ اپنی جگہ بالکل درست ہیں- مثنوی کے اعتراف میں چند اشخاص کے نام ملتے ہیں: مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی جوہر، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اور اسلم جیراج پوری- ان حضرات نے کھلے دل سے مثنوی کا خیر مقدم کیا- اقبال کے سچے عاشقوں میں مولانا محمد علی جوہر سرفہرست ہیں- ان کا کہنا ہے کہ ''بحیثیت شاعر، اقبال عصر حاضر میں، ہندی مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کے علمبردار ہیں اور بلاشبہ میں ان کا قدردان بلکہ عاشق ہوں-''

اقبال نے ریاست اسلام کی بنیاد توحید اور حیات عقلی پر رکھی ہے، اس اصول کے پیش نظر مسلمانوں کی کامیابی یقینی ہے:

> ''بطور اساس ریاست اسلام ہی وہ عملی ذریعہ ہے جس سے ہم اس مقصد میں کہ توحید کا یہ اصول ہماری حیات عقلی اور جذباتی میں ایک زندہ عنصر کی حیثیت اختیار کر لے، کامیاب ہو سکتے ہیں- اس اصول کا تقاضا ہے کہ ہم صرف اللہ کی اطاعت کریں نہ کہ ملوک و سلاطین کی- لہٰذا اللہ کی اطاعت فطرت صحیحہ کی اطاعت ہے- اسلام کے نزدیک حیات کی یہ روحانی اساس ایک قائم و دائم وجود ہے، جسے ہم اختلاف اور تغیر میں جلوہ گر دیکھتے ہیں-'' [۱]

''اسرار خودی'' کی بنیاد اقبال نے انہی نظریات کے پیش نظر رکھی- یہ وہ نظریات ہیں جن سے گمراہی سے بچا جا سکتا ہے- اسلام میں دیگر غیر اسلامی نظریات کا داخل ہونا اسلام اور مسلمانوں کے لئے مضر ہی نہیں سم قاتل بھی ہے-

خواجہ حسن نظامی......

مخالفوں کی فہرست میں خواجہ حسن نظامی کا نام سرفہرست ہے- انہوں نے اقبال کی مثنوی ''اسرار خودی'' کی مخالفت میں ''سر اسرار خودی'' کے عنوان سے ۳۰ جون ۱۹۱۶ء کے ''خطیب'' میں مثنوی کو موضوع بحث بناتے ہوئے تفصیلی مضمون رقم کیا ہے، فرماتے ہیں:

> ''میں دیباچے میں اس اصلاح کو اصولاً غلط کہتا ہوں کہ اہل مشرق اور مسلمان یورپ کے فلاسفروں کی پیروی کریں اور اپنے قدیمی عقائد بدل دیں اور یہ اصولی غلطی میرے اختلاف کی بڑی وجہ ہے-'' [۲]

اقبال نے اس تحریر کے جواب میں اپنے دیباچے ہی سے وضاحت کی ہے:

> ''انگریزی قوم کی عملی نکتہ اسی کا احسان تمام دنیا کی قوموں پر ہے کہ اس قوم میں ''حس واقعات'' اور اقوام عالم کی نسبت زیادہ تیز اور ترقی یافتہ ہے- یہی وجہ ہے کہ

۱- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ۲۲۷

۲- مقالات اقبال، ص ۱۷۴

کوئی ''دماغ یافتہ'' فلسفیانہ نظام جو واقعات متعارفہ کی تیز روشنی کا متحمل نہ ہوسکتا ہو،
انگلستان کی سرزمین میں آج تک مقبول نہیں ہوا۔ پس حکمائے انگلستان کی تحریریں
ادبیات عالم میں ایک خاص پایہ رکھتی ہیں اور اس قابل ہیں کہ مشرقی دل ودماغ ان
سے مستفید ہوکر اپنی قدیم فلسفیانہ روایات پر نظرثانی کریں۔'' [۱]

اقبال نے جو وضاحت پیش کی ہے اس سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ وہ مغربی علوم اور ان کی ترقی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں جو قدیم روایات فلسفیانہ طرز اسلام میں داخل ہوگئے تھے، اس پر توجہ کی ضرورت ہے۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ علوم کا سرچشمہ جسے قرآن کہتے ہیں اس سے استفادہ کرکے ہم علوم وفنون کے علاوہ دیگر شعبوں میں بھی ترقی کرسکتے ہیں۔

اقبال کو یہ تو خود بھی اندازہ تھا کہ مثنوی اسرار خودی پر اعتراضات اٹھیں گے اور خوب مخالفت ہوگی۔ اقبال نے اعتراضات کا جواب ''اخبار وکیل'' میں کئی مضامین میں لکھ کر دیا ہے، ایک خط میں اقبال اس کی وضاحت کرتے ہیں، یہ خط سید فصیح اللہ کاظمی کو تحریر کیا ہے، لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک حافظ کی شاعری نے بالخصوص اور عجمی شاعری نے بالعموم
مسلمانوں کی سیرت اور عام زندگی پر نہایت مذموم اثر کیا ہے، اسی واسطے میں نے ان
کے خلاف لکھا ہے۔ مجھے امید تھی کہ لوگ مخالفت کریں گے اور گالیاں دیں گے لیکن
میرا ایمان گوارا نہیں کرتا کہ حق بات نہ کہوں۔ شاعری میرے لئے ذریعۂ معاش نہیں
کہ میں لوگوں کے اعتراضات سے ڈروں، آخر میں انسان ہوں اور مجھ سے غلطی ممکن
کیا یقینی ہے۔ نہ ہمہ دانی کا دعویٰ ہے نہ زباں دانی کا۔'' [۲]

اقبال کی وضاحت کے بعد بھی مخالفت کا سلسلہ چلتا رہا۔ ''اسرار خودی'' کی مخالفت کے علاوہ بھی دیگر حضرات نے اقبال کی زبان، محاورے اور عروض پر اعتراضات کئے ان کے اوائل کلام میں تنقیص کے پہلو اجاگر کئے ہیں۔ تمام معترضین میں خواجہ حسن نظامی اور مظفر پیرزادہ نے تو واضح طور پر مخالفت کی۔ خواجہ حسن نظامی کی مخالفت کا یہ پہلو دیکھئے، اقبال کہتے ہیں ''خواجہ حافظ کے متعلق میں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا ترجمہ خواجہ صاحب کے الفاظ میں یہ ہیں:

''حافظ شرابی سے ہوشیار رہنا، اس کے جام میں موت کا زہر ملا ہوا ہے، آہوں
کے درخت جنگل میں بوتا تھا، اس میں بادشاہوں سے لڑنے کی طاقت نہ تھی۔'' [۳]

اقبال کا کہنا یہ ہے کہ ایسا ہو نہیں سکتا کہ خواجہ صاحب فارسی سے واقف نہ ہوں۔ میرے نزدیک اشعار کے ترجمے میں یا پھر سمجھنے میں سہو ہوا ہے یا اس کے علاوہ خاص وعام کو میرے خلاف اکسانے کی تدبیریں ہیں۔

اقبال کا کہنا ہے کہ خواجہ حسن نظامی نے ''اسرار خودی'' کی نامقبولیت کی پانچ وجوہ ظاہر کی ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ''انہوں نے اس مثنوی میں خودی کی حفاظت پر جو کچھ لکھا ہے، وہ کچھ انوکھا

۱۔ مقالات اقبال، ص ۱۵۸

۲۔ خطوط اقبال، ص ۱۲۸

۳۔ مقالات اقبال، ص ۱۷۳

اور نرالا نہیں ہے بلکہ قرآن شریف کی تعلیم سے بہت ہی کم ہے لہذا میں بمقابلہ قرآن اس کی ضرورت نہیں رکھتا اور جس کی ضرورت نہ ہو اس سے اتفاق کیوں کروں۔''

۲۔''دیباچے میں مسئلہ وحدت الوجود اور صوفیوں کو ملزم قرار دیا گیا ہے کہ ترک خودی کا جذبہ اس مسئلے اور وحدت الوجود کے مقلدین صوفیاء کے سبب قوم میں پیدا ہوا۔''

۳۔''مصنف نے دیباچے میں مسلمانوں کو یہ پیروی حکمائے یورپ اپنے عقائد بدل دینے کی اصلاح دی ہے۔''

۴۔''یہ مثنوی کو خودداری سکھاتی ہے مگر ساتھ ہی اس کے مغربی خودغرضی بھی سکھاتی ہے، جو اسلام کے سراسر خلاف ہے۔''

۵۔''اس مثنوی نے میری خودی کی توہین کی ہے۔'' [1]

خواجہ صاحب کے ان اعتراضات سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا، اگر اختلاف ہی مقصود تھا تو پھر بات دلیل سے ہوتی کیونکہ اہل بینش دعویٰ بے دلیل قبول نہیں کرتے۔ خواجہ صاحب کے ہمراہ اکبرالہ آبادی بھی مخالفوں کی فہرست میں ہیں جس پر اقبال کو نہایت افسوس ہوا۔ اکبرالہ آبادی نے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کو خط میں لکھا:

''سمجھ میں نہیں آتا کہ اقبال تصوف کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے ہیں۔''

(بنام عبدالماجد دریا آبادی)

اکبرالہ آبادی......

اکبرالہ آبادی نے متعدد خطوط عبدالماجد دریا آبادی کو تحریر کئے۔ ان خطوط میں اکبر کی مخالفت اور تنقید واضح نظر آتی ہے۔ اکبر کی مندرجہ ذیل عبارت اس بات کی آئینہ دار ہے:

''اقبال صاحب نے جب سے حافظ شیرازی کو علانیہ برا کہا ہے میری نظر میں کھٹک رہے ہیں۔''

اقبال نے ان تحریروں کی روشنی سے اندازہ لگایا کہ اکبرالہ آبادی، جنہیں وہ احترام کے ساتھ القاب و آداب لکھتے تھی اور مرشد کا مقام دیا ہوا تھا، اقبال سے اس قدر متنفر ہو گئے۔ اکبر کی بدگمانی بدستور رہی۔ ہر چند اقبال نے اپنے خطوط کے ذریعے خاصی وضاحت کے ساتھ اپنے خیالات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے:

''مخدومی آپ مجھے تناقص کا ملزم گردانتے ہیں، یہ بات درست نہیں ہے، مگر میری بدنصیبی یہ ہے کہ آپ نے مثنوی اسرار خودی کو اب تک نہیں پڑھا۔ میں نے گزشتہ خط میں عرض بھی کیا تھا کہ ایک مسلمان پر بدظنی کرنے سے محترز رہنے کے لئے میری خاطر اسے ایک دفعہ پڑھ لیجئے اگر آپ ایسا کرتے تو یہ اعتراض نہ ہوتا۔'' [2]

۱۔ مقالات اقبال، ص ۱۷۶

۲۔ اکبر اور اقبال، ص ۵۷

غرض ''اسرار خودی'' شائع ہونے کے بعد اقبال پر متعدد اعتراض اٹھائے گئے- اقبال کے قدموں کو کہیں بھی لغزش نہ ہوئی، وہ ہر مقام پر ثابت قدم رہے- انہوں نے جس ''خودی'' کی بات کی ہے، اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا- اس خودی میں ایک امید ہے، ولولہ ہے، ایک ایسا جذبہ جس کو پڑھنے کے بعد خون میں حرارت پیدا ہوتی ہے، اس کے باوجود اکبرالہ آبادی، اقبال کی فارسی شاعری پر تنقید کرتے ہیں:

''اقبال صاحب کی پروفیسری فارسی شاعری کے ساتھ مل کر مغرب و مشرق دونوں کے لئے بھیانک ہوگئی ہے- اللہ ان کے بیان کو زیادہ صاف کرے اور ہم پر اپنا فضل کرے اور صبر عطا فرمائے-'' [۱]

علامہ اقبال نے ۱۱ جون ۱۹۱۸ء کے خط میں اکبرالہ آبادی کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عجمی تصوف کا جو لٹریچر ہے، اس سے دل فریبی اور حسن چمک پیدا ہوتا ہے:

''عجمی تصوف سے لٹریچر میں دل فریبی اور حسن چمک پیدا ہوتا ہے مگر ایسا کہ طبائع کو پست کرنے والا ہے- اسلامی تصوف دل میں قوت پیدا کرتا ہے اور اس قوت کا اثر لٹریچر پر ہوتا ہے- میرا تو یہی عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کا لٹریچر تمام ممالک اسلامیہ میں قابل اصلاح ہے-'' [۲]

شعرائے عجم کے بارے میں اقبال ۱۰ جولائی ۱۹۱۶ء کو سراج الدین پال کو مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے- یہ ایک نہایت Subtle طریق تنسیخ کا ہے اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو- شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں، جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفے کی طرف مائل تھے- اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبیعت موجود تھا اور اگر چہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشوونما نہ ہونے دیا- ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید تنسیخ کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شئے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے-'' [۳]

اقبال نے اپنے خطوط میں متعدد جگہ شعرائے عجم پر مدلل بحث کی ہے تاکہ صحیح نقطۂ نظر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ظاہر ہو سکے-

مولوی ظفر احمد صدیقی......

۱۲ دسمبر ۱۹۳۶ء کے خط میں مولوی ظفر احمد صدیقی کو اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں، علامہ اقبال کا پہلا جملہ

۱- نگار- اکبرالہ آبادی نمبر، ص ۱۹۰

۲- اکبر اور اقبال، ص ۴۷

۳- اقبال نامہ- حصہ اول، ص ۳۵

ملاحظہ فرمائیے:

''جناب من معترض...... قرآن کی تعلیم سے بے بہرہ ہے- علیٰ ہذاالقیاس، اسلامی تصوف میں مسئلہ خودی کی تاریخ اور نیز میری تحریروں سے ناواقف محض ہے-''

اسی خط میں ''خودی'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خودی خواہ مسولینی کی ہو، خواہ ہٹلر کی، قانون الٰہی کی پابند ہو جائے تو مسلمان ہو جاتی ہے-''

تیسرے اعتراض کے جواب میں علامہ فرماتے ہیں:

''معترض کا کہنا ہے کہ ''اقبال اس دور ترقی میں جنگ کا حامی ہے'' غلط ہے، میں جنگ کا حامی نہیں ہوں، نہ کوئی مسلمان شریعت کے حدود معینہ کے ہوتے ہوئے اس کا حامی ہوسکتا ہے- قرآن کی تعلیم کی رو سے جہاد یا جنگ کی صرف دو صورتیں ہیں، محافظانہ اور مصلحانہ-'' [1]

یہ تمام اقتباسات مولوی ظفر احمد صدیقی کے نام علامہ نے جو طویل خط لکھا ہے اس میں سے دیئے گئے ہیں- غرض اقبال کو ایک طرف قوم کی حالت پر ترس آتا تھا تو دوسری طرف مخالفوں نے ذہنی طور پر پریشان کیا ہوا تھا لیکن ان تمام حالات و واقعات کی روشنی میں علامہ نے جذباتیت سے کام نہیں لیا بلکہ بڑے حسین پیرائے میں اپنے مخالفین اور معترضین کو بہ حسن خوبی جواب عطا فرمائے-

مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے نام علامہ اقبال کا یہ خط ملاحظہ کیجئے جو ۲۴ جون ۱۹۱۶ء کو تحریر کیا تھا:

''علمائے اسلام ابتداء سے آج تک تصوف وجودیہ کے مخالف ہو رہے ہیں- میں نے کوئی نئی بات نہیں کی- ہندوؤں میں کشن کی گیتا اس کے خلاف ایک زبردست آواز تھی- اسلامی تصوف کا دارومدار گسستن پر ہے- تصوف وجودیہ کا پیوستن یا فنا پر- اگر میں نے گسستن کی حمایت کی ہے تو کوئی بدعت نہیں کی- دنیا مخالفت کرتی ہے تو کرے، اس کی پرواہ نہیں- میں نے اپنی بساط کے مطابق اپنا فرض ادا کر دیا ہے-'' [2]

اخبارات و رسائل میں ''اسرار خودی'' کی اشاعت کے بعد تصوف کی بحث میں متعدد مضامین شائع ہوئے، مخالفت میں خواجہ حسن نظامی بھی پیش پیش تھے- خواجہ حسن نظامی کے زیادہ تر اعتراضات دیباچے پر ہیں، مثنوی پر نہیں- تصوف کی یہ بحث اس وقت کے وکیل امرتسر ۱۵ جنوری ۱۹۱۶ء، ۹ فروری ۱۹۱۶ء، ۲۸ جون ۱۹۱۶ء، ۱۲ دسمبر ۱۹۱۶ء، مقالات اقبال، جسے عبدالواحد معینی نے ترتیب دیا ہے، دیکھے جاسکتے ہیں- اس کے علاوہ دیگر کتب میں بھی متعدد جگہ تصوف کی بحث میں خطوط اور مضامین حوالہ کے طور پر تحریر کئے گئے ہیں- اقبال کا خط خواجہ حسن نظامی کے نام ملاحظہ کیجئے:

''مجھے خوب معلوم ہے کہ آپ کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے عشق ہے- پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ آپ کو ایک حقیقت اسلامی معلوم ہو جائے اور آپ اس سے انکار کریں بلکہ مجھے ابھی

۱- اقبال نامہ- حصہ اول، ص ۲۰۱

۲- روح مکاتیب اقبال، ص ۱۵۰

سے یقین ہے کہ آپ بالآخر میرے ساتھ اتفاق کریں گے۔ میری نسبت بھی آپ کو معلوم ہے میرا فطری اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہے اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی قوی ہو گیا تھا کیونکہ فلسفۂ یورپ بحیثیت مجموعی وحدت الوجود کی طرف رخ کرتا ہے۔ مگر قرآن پر تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اپنی غلطی معلوم ہوئی اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا اور اس مقصد کے لئے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا۔'' [۱]

اسی خط کے دوسرے پیراگراف میں اقبال لکھتے ہیں:

''اب تک جو اعتراضات آپ کی طرف سے ہوئے ہیں، وہ مثنوی کے دیباچے پر ہیں، نہ خود مثنوی پر۔ جب تک مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ مثنوی پر کیا اعتراضات ہیں، اس وقت تک میں کیونکر قلم اٹھا سکتا ہوں۔ مثنوی پر جو اعتراض آپ نے کیا ہے، وہ اسی قدر ہے کہ حافظ کی بے حرمتی کی گئی ہے لیکن جب تک اصولی بحث نہ ہو، یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ میں حافظ کی تنقید میں کہاں تک حق بجانب ہوں۔'' [۲]

اقبال نے اپنے خط کے ذریعے تصوف کے بارے میں اور اپنے طبعی میلان کے بارے میں خواجہ حسن نظامی کو واضح طور پر بلکہ تفصیل کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کر دی۔ اسلامی اور غیر اسلامی نظریات کو تحقیق کے ذریعہ صحیح اسلام کی ترجمانی کر دی۔ رفیع الدین ہاشمی نے اس کی تفصیل ''خطوط اقبال'' کے حاشیے میں دی ہے، ملاحظہ کیجئے:

''''وکیل''، ''خطیب'' اور ''زمیندار'' میں موافقانہ اور مخالفانہ مضامین کا سلسلہ جاری تھا کہ اکبرالہ آبادی نے ثالثی کے فرائض انجام دیتے ہوئے صلح کرا دی اور اقبال کی مخالفت کا طوفان تھم گیا۔'' [۳]

اکبرالہ آبادی نے صلح کے فرائض انجام دیئے اور خط میں تین شعر تحریر کئے۔ اکبر، خواجہ حسن نظامی اور اقبال کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''اقبال کا اختلاف خواجہ صاحب سے بہر حال علمی اختلاف تھا۔ انہیں خواجہ صاحب کی ذات سے کوئی لڑائی نہیں تھی۔ چنانچہ اقبال نے خواجہ صاحب سے ملاقات کی خواہش کی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کو ملنے سے انکار تھا، اس پر اکبر اس طرح بیچ بچاؤ کرتے ہیں ؎

اے خواجہ حسن کرو نہ اقبال کو رد قومی رکنوں کے ہیں نگہباں وہ بھی
تم محو ہو حسن کی تجلی میں اگر ہیں دشمن فتنہ رقیباں وہ بھی

۱۔ خطوط اقبال، ص ۱۱۴

۲۔ خطوط اقبال، ص ۱۱۵

۳۔ خطوط اقبال، ص ۱۱۱

پریوں کے لئے جنوں ہے تم کو اگر دیووں کے لئے بنے سلیماں وہ بھی

''ادھر اکبر نے اقبال کو بھی فہمائش کی تھی:- حسن نظامی سے محبت رکھنا چاہیئے-
اقبال نے جواب دیا:- محبت تو رکھتا ہوں لیکن وہ برے طریقے سے اظہار مخالفت کرتے ہیں-''[1]

مولانا ظفر علی خاں کے ہفت روزہ ''ستارۂ صبح'' میں اقبال کی مثنوی ''اسرار خودی'' کی مخالفت میں نظریہ تصوف کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا، یکے بعد دیگرے مضامین لکھے گئے:

''بعض بدنیتوں نے حسن نظامی کو اقبال کے خلاف بھڑکایا کہ یہ سب علامہ کی شہہ پر ہو رہا ہے مگر میر غلام بھیک نیرنگ نے خواجہ صاحب کو یقین دلایا کہ اس میں اقبال کا ہاتھ نہیں ہے چنانچہ انہوں نے ایک خط لکھ کر اقبال سے معذرت کی- اقبال کی وفات پر خواجہ صاحب نے اپنے پیغام تعزیت میں کہا ''ان کی وفات سے تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایسا نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی''[2]

ان خطوط کی روشنی میں جو بات واضح ہوئی وہ یہ کہ اقبال کے مزاج کی مٹھاس، رواداری، خلوص و محبت سے ان کی شخصیت اجاگر ہوتی ہے- خطوط کے آئینے میں اقبال کی سمجھ بوجھ مدبرانہ ہے بلکہ تحقیق اور دلیل سے بات کرتے تھے- عملی زندگی میں بھی اقبال خوش گفتار اور بذلہ سنجی سے محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے- اقبال کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان کے دل اور دماغ میں کسی کے لئے کوئی کدورت نہ تھی- وہ ہر ایک کو برتر سمجھتے تھے اور خود کو کمتر سمجھتے تھے-

جس قدر اقبال کے نکتہ چینوں میں اضافہ ہوتا گیا، اس سے کہیں زیادہ اقبال کی شہرت میں اضافہ ہوتا چلا گیا- شاعری کی پوری تاریخ میں صرف اقبال ہی واحد شاعر ہیں جو اپنے خاص رنگ اور نئے فکری احساس سے شاعری میں بہ اعتبار مضمون اور صنائع بدائع و تلمیحات اور فلسفہ سے نئی روح پھونک دی- شاعری کو ایک ایسا لب و لہجہ دیا کہ لوگ ان کی شاعری کو پسند کرنے لگے- شعراء نے اقبال کی پیروی اور تقلید کرنا شروع کر دی- اقبال کے خیالات اور افکار ان کی شاعری میں آئینہ کی طرح جھلک رہے ہیں- یوں بھی ان پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن تحقیق کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا، ان کا مقصد اور مشن پورا ہو چکا تھا، وہ جو کچھ کہنا اور کرنا چاہتے تھے، نثر اور نظم میں جامع طور پر ادا کر دیا- اب یہ ہماری نسل اور بعد کے آنے والوں پر منحصر ہے کہ اقبال کے اسلامی نظریات جو قرآن کی تفسیر ہیں، عمل پیرا ہو کر ایک ایسے معاشرے کی تشکیل دی جائے جسے خالصتاً مسلم معاشرہ کہتے ہیں- یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب مسلمان قرآن سے روشنی حاصل کرے- اقبال کا حلفیہ یہ کہنا کہ مثنوی ''اسرار خودی'' اور ''رموز بے خودی'' کا جہاں تک تعلق ہے، اس کا ہر لفظ قرآن کی تعلیم پر ہے ؎

آں کتاب زندہ قرآن حکیم حکمت او لایزال است و قدیم
نوع انساں را پیام آخریں حامل او رحمتہ اللعالمینؐ
علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست اصل سنت جز محبت ہیچ نیست

۱- نگار- اکبر الہ آبادی نمبر، ص ۱۹۱

۲- خطوط اقبال، ص ۱۱۱

جنتے جستند در بیکس القرار تا احلو قومہم دار البوار
(رموز بے خودی) [1]

خان محمد نیاز الدین خاں کے نام خط جو ۱۱ستمبر ۱۹۱۶ء کو تحریر کیا تھا، اقبال اپنے مذہب اور نظریہ کے متعلق رقمطراز ہیں:

''میرا مذہب تو یہ ہے کہ یہ سارے مباحث مذہب کا مفہوم غلط سمجھنے سے پیدا ہوتے ہیں- مذہب کا مقصود عمل ہے نہ (کہ) انسان کے عقلی اور دماغی تقاضوں کو پورا کرنا- اسی واسطے قرآن شریف کہتا ہے وما اوتیتم من العلم الا قلیلا- اگر مذہب کا مقصود عقلی تقاضوں کو پورا کرنا ہو بھی (جیسا کہ ہنود کے رشیوں اور فلسفیوں نے خیال کیا ہے) تو زمانہ حال کی خصوصیات کے اعتبار سے اس کو نظر انداز کرنا چاہئے- اس وقت وہی قوم محفوظ رہے گی جو اپنے عملی روایات پر قائم رہ سکے گی-'' [2]

اقبال نے اپنی نظم اور نثر میں قرآنی آیات سے کام لے کر بھی اسلام کی سربلندی اور صحیح اسلامی طریق کو واضح کیا ہے، یہی ان کا مشن تھا اور یہی ان کا مقصود- اقبال کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا ذہن مشرقی اور دل عربی تھا تو بے جا نہ ہوگا- ان کی قلبی کیفیت کا رخ حجاز کی طرف تھا اور ذہن مسلمانوں کی حالت زار کی طرف، ایک دردمند دل کے ساتھ فکر کرنا اور اس کا حل تلاش کرنا اور پھر قرآنی تعلیمات سے ثابت کرنا، یہ اقبال کا فکری اجتہاد ہی تھا- انہوں نے اسلام کو اسلام کی روشنی میں پیش کیا- مملکت اسلامیہ اقبال کی ممنون احسان ہے- اقبال اپنے شب و روز کے متعلق نیاز الدین کو خط کے ذریعے مطلع کرتے ہیں، یہ خط ۲ مارچ ۱۹۱۷ء کو تحریر کیا تھا:

''میں لاہور کے ہجوم میں رہتا ہوں مگر زندگی تنہائی کی بسر کرتا ہوں- مشاغل ضروری سے فارغ ہوا تو قرآن یا عالم تخیل میں قرون اولیٰ کی سیر، مگر خیال کیجئے جس زمانے کا تخیل اس قدر حسین وجمیل روح افزا ہے، وہ زمانہ خود کیسا ہوگا-'' [3]

یہ تو اقبال کی ذہنی اور قلبی کیفیت تھی، جو خطوط سے بھی ظاہر ہے اور شاعری سے بھی- اقبال کا کلام حقائق و معارف کا ایسا خزانہ ہے جو خرچ کرنے سے کم نہ ہوگا- اس خزانے کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے کلام میں خوشبو سی آتی ہے کیونکہ ان کا کلام عشق ہی عشق ہے، جس کلام کی یہ خصوصیت ہو وہ کلام کبھی زوال پذیر نہیں ہوسکتا- اگر تمام دنیا بھی مخالفت، پر کمر بستہ ہو جائے تو اقبال کی شہرت اور ان کے کلام کو نقصان نہیں پہنچایا جاسکتا- ''اسرار و رموز'' ہی اٹھا کر دیکھ لیجئے- قرآنی آیات سے اپنے شعروں کو مزین کیا ہے- آیئے اقبال کے ان مخالفوں کو تلاش کریں، جن کے چراغ اقبال کی موجودگی میں گل ہونے کو ہیں-

سیماب اکبر آبادی......

سیماب اکبر آبادی کو اقبال کی زبان پر اعتراض ہے، ان کا کہنا ہے کہ اقبال تذکیر و تانیث کا خیال نہیں رکھتے، اعتراض

۱- مثنوی اسرار و رموز، ص ۱۴۰

۲- مکاتیب اقبال، ص ۶

۳- مکاتیب اقبال، ص ۷

میں وہ یہ مصرعہ رکھتے ہیں ع

اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز

سیماب کا اشارہ پرہیز پر ہے کہ اسے مونث کیوں باندھا ہے۔ انہوں نے اقبال کی شاعری میں ایسے الفاظ نکالے ہیں، جو اقبال کی نومشقی کا زمانہ تھا یا پھر بہ لحاظ شاعری عیب تلاش کئے ہیں۔ سیماب جیسے شاعر اقبال کے الفاظ پر عیب نکال کر ''بازاری'' کہیں کچھ مناسب نہیں، بہر کیف مجموعی تاثر سیماب کا کہیں نظر نہیں آیا۔

نواب جعفر علی خاں اثر کا تبصرہ، جو کہ ''بال جبریل'' پر ہے، سیماب کے اعتراضات پر بھی جواباً اپنی رائے کا اظہار کیا ہے:

> ''لکھنوی شعراء اور اقبال کی زبان کی گواہی، یہ کیا کم ہے، بہر حال ان اعتراضات میں سے کوئی اتنا وقیع نہیں، جس کے جواب کی کوشش کی جائے۔ مقصد صرف یہ دکھلانا ہے کہ اب بھی ایسے اشخاص موجود ہیں، جو اعلانیہ نہیں تو چھپے دبے ضرور اقبال کی زبان پر اعتراضات کرتے ہیں، وہ ترکیب غلط ہے۔ اس محاورے کو صحت کے ساتھ نظم نہیں کیا۔ یہ مونث نہیں مذکر ہے۔ یہاں تعقید معنوی پائی جاتی ہے، یہاں شعر معما ہے، آخر ان باتوں کی وجہ کیا ہے؟'' [1]

جعفر علی خاں اثر کا آخری جملہ ''آخر ان باتوں کی وجہ کیا ہے؟'' سب کچھ اسی میں کہہ گئے۔ اقبال کے کلام کی آفاقیت اور مقبولیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ان کی شاعری کا ہر لفظ نقش کالحجر ہے کیونکہ اقبال کے اشعار اور ان کے الفاظ لوگوں کے لوح دل پر نقش ہو چکے ہیں۔ رہی کلام کی بات کہ اقبال کے کلام میں یہ عیب ہے، یہ ایسا لفظ ہے، یہاں محاورے کا استعمال غلط ہے، ان اعتراضات سے کچھ حاصل نہیں کیونکہ اساتذہ کے ہاں بھی ایسے اشعار نکالے جا سکتے ہیں، جن پر سیماب صاحب اپنے اعتراض کی مہر ثبت کی ہے۔ سیماب کو یہ دیکھنا چاہئے تھا کہ اقبال کی شاعری کا رنگ کیا ہے اور وہ کس انداز کی شاعری کر رہے ہیں۔ کسی بھی شاعر کا غلط زاویے سے مطالعہ مضر تو ہو سکتا ہے، سود مند نہیں۔ اگر ہم اقبال کی شاعری کے مثبت پہلو تلاش کریں تو سب سے پہلے اقبال کا فن اور ان کی شاعری زیر بحث آئے گی۔ اقبال کے اثرات اور ان کی فکر اس قدر ہمہ گیر ہے۔ بعد کے شعراء میں اقبال کے اثرات کو دیکھا جا سکتا ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ اثرات قبول کیوں کئے، جب اقبال کا کلام تنقیص لئے ہوئے ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اقبال خلا میں تیر نہیں چلاتا بلکہ وہ دلوں کو مسخر کرتا ہے۔ اس کا پیام عمل ہی عمل ہے۔ اس کا اس شاعری سے کوئی تعلق نہیں جو صرف خیالی کہلاتی ہے۔ اقبال کا پورا کلام مقصدیت لئے ہوئے ہے اس لئے سیماب کے اعتراضات کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی۔ ابھی تک اقبال کا کوئی بھی معترض اقبال کی سی مقبولیت نہ پا سکا جبکہ معترض تو پہلے مشتہر ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ پہاڑ کے سامنے رائی کی نہیں چلتی۔ اقبال کے بعد کے شعراء میں ان کی بازگشت دکھائی دیتی ہے۔ زہرا معین نے احمد علی کے بارے میں لکھا ہے کہ انہیں اقبال سے شکایت ہے، ملاحظہ کیجئے:

> ''احمد علی:
>
> ۱- اقبال کی شاعری خیالی ہے۔
>
> ۲- وہ ایک ناممکن اور بے معنی اسلام ازم کی دعوت دیتی ہے۔
>
> ۳- بیماروں کی طرح سے گریز کرتی ہے اور حقیقت کو بھلانے کی خواہش کرتی ہے۔

۱- عرفان اقبال، ص ۷۰

۴- وہ ہم کو بے عملی کی طرف کھینچتی ہے-

۵- رجعت پسندانہ ہے-'' [1]

ان اعتراضات پر کسی قسم کا تبصرہ لاحاصل ہے کیونکہ معترض کو خود بھی اس بات کا عرفان نہیں ہے کہ وہ جو اعتراضات کر رہا ہے، اس کی ضد کیا ہے- اقبال جس معیار کی شخصیت کے حامل تھے اس معیار کا کوئی بھی معترض سامنے نہیں آیا- مخالفت بھی ایک طرح سے زور مانگتی ہے- اقبال کی مخالفت میں زیادہ تر لوگوں کے دست و پا شل ہوگئے، یہی ان کی ہمہ جہتی اور آفاقیت کی دلیل ہے اس لئے کوئی بھی شاعر ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا- آل احمد سرور نے اقبال کی شاعری کا عالمانہ تجزیہ کیا ہے:

'' ''خضر راہ'' کی اشاعت سے وہ ذہنی آتش فشاں اپنی اصل شان سے نمودار ہوتا ہے جس کا نام اقبال ہے- ''خضر راہ'' بظاہر صرف عالم اسلامی کے انتشار اور جنگ عظیم کے تاثرات پر ایک دکھے ہوئے دل کی پکار ہے- مگر دراصل وہ ایک مفکر شاعر کا عہد نامۂ جدید ہے- اس سے پہلے جنگ کا اثر ہندوستان میں کسی نے اتنا محسوس نہیں کیا تھا اور نہ کسی نے اتنے اعتماد سے ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم چھوڑ کر آفتاب تازہ کا خیر مقدم کیا تھا- سیاسی الجھنیں، اقتصادی مسائل، شہنشاہیت کے خلاف جہاد، غرض وہ سب چیزیں جو ہماری زندگی کا جزو بن گئی ہیں، اقبال کے ''خضر راہ'' کے ذریعے سے ادب بنیں- اس کی مشیت انقلابی ہے-'' [2]

آل احمد سرور نے اقبال کی نظم ''خضر راہ'' کو موضوع بنا کر دراصل اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ صحیح معنی میں اقبال ہی وہ خضر ہے جس نے رہنمائی کا حق ادا کر دیا- اگر اقبال کی فکر انگیز شاعری نہ ہوتی تو آج جوش و ساغر، مجاز و جذبی، فیض و فراز، ندیم و ساحر اپنی شناخت کرانے میں ناکام رہتے، ان شعراء نے اقبال کے اثرات قبول ہی نہیں کئے بلکہ اقبال کو اپنا خضر تسلیم بھی کیا ہے-

جوش ملیح آبادی......

دیگر حضرات نے اقبال کی مخالفت فنی اور نظریاتی لحاظ سے کی جبکہ جوش کی مخالفت کا انداز مختلف ہے- جوش اقبال سے مخالفت ہی نہیں کرتے انہیں اپنا سب سے بڑا حریف اور دشمن بھی سمجھتے ہیں- جوش، اقبال دشمنی میں بہت آگے نکل گئے جیسا کہ اقبال تمام شعراء سے فکری لحاظ سے اوج ثریا پہ پہنچ گئے- جوش حسد اور بغض و عناد میں اپنا مرتبہ و مقام بھی بھول گئے جبکہ جوش ایک مکمل اور سراپا شاعر ہے- اقبال دشمنی میں جوش کے الفاظ جو ''ساقی'' کے جوش نمبر میں تحریر ہیں:

''اردو کے شاعر بے اصول، بے وضع، سفلے، تنگ ظرف اور غدار قوم ہیں- یہ کلیہ قائم کر کے آخری نتیجہ جو نکالا ہے وہ انہیں کے الفاظ میں سن لیجئے اور اس خون کو کھولا دینے والے موقع پر جبکہ ہندوستان کے رہنماؤں کے سروں پر ڈنڈے برس رہے تھے اور ان کو جیل کی کوٹھڑیوں میں ٹھونسا جا رہا تھا، اس وقت ہم شعرائے اردو اپنی غداری کے صلے میں انگریز کی سرکار سے ''خان بہادر'' اور ''سر'' کا خطاب وصول فرما

۱- عرفان اقبال، ص ۸۷

۲- انتخاب جدید، ص ۵

رہے تھے۔'' [۱]

علامہ اقبال نے کسی بھی خطاب کو حاصل کرنے کی کوشش کا اظہار نہیں کیا بلکہ سر شادی لال، اقبال کے لئے ''خان صاحب'' کے خطاب کی سفارش میں مصروف تھے۔ اس کے علاوہ میکلیگن کی ملاقاتیں اقبال سے ہوئیں۔ اس نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو ادبی خدمات کے اعتراف میں ''سر'' کا خطاب دے دیا جائے بلکہ میں اس امر کی بھرپور کوشش کروں گا۔ اقبال نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ ''میں خطابات اور اعزازات کے بکھیڑے میں نہیں پڑنا چاہتا۔'' ان بیانات کی روشنی میں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال نے قطعی طور پر منع کر دیا تھا بلکہ واضح طور پر خطاب لینے سے انکار کر دیا تھا۔

جوش نے اس خطاب کو غلط رنگ دے کر علامہ اقبال کے خلاف محاذ کھڑا کر دیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اقبال نے اپنی قوم کے ساتھ غداری کی ہے اور یہ ''سر'' کا خطاب بھی غداری کے صلے میں ملا ہے۔ ''اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ خودی'' کی تعلیم مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوشش تھی۔ ''بالِ جبریل'' اور ''ضربِ کلیم'' کی شاعری پر ہی کیا موقوف ہے، اقبال کی اول سے آخر تک شاعری میں انقلاب، جذبہ، بیداری، غلامی سے نفرت، قرآن و سنت کی اتباع کی تلقین ملتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اقبال کے بارے میں درست ہی لکھا ہے:

> ''بے شک مسلم خوابیدہ کو خوابِ گراں سے بیدار کرنے اور دل کون و مکاں کے راز مضمر کو فاش کرنے کے اس نمایاں عزم نے اقبال کو نیچر سے کنارہ کش ہونے پر مجبور کیا تاہم اس بات سے انکار مشکل ہے کہ یہ نیچر سے ہم آہنگی تھی جس نے انہیں نور و تاریکی کی کشمکش اور آویزش سے آگاہ کیا اور ان کے انمول جواہر، احساسِ جمال، وسعت اور نظر عمیق کو صیقل کر کے انہیں ایک نئی روش پر گامزن ہونے کی ترغیب دی۔'' [۲]

جوش کے اعتراضات کی روشنی میں نہ تو ٹھوس دلائل ہیں اور نہ گہرائی و گیرائی ہے۔ اقبال مسلمانوں کو تھپکی دے کر سلاتے ہیں یا جھنجھوڑتے ہیں ؎

مسلم خوابیدہ اٹھ! ہنگامہ آراء تو بھی ہو
وہ چمک اٹھا افق گرم تقاضا تو بھی ہو

ان تمام حالات و کیفیات کے باوجود مولانا عبدالمجید سالک نے بھی اقبال کی مخالفت میں نظم کہہ دی، اس کا یہ مصرع ملاحظہ کیجیے ع

''سرکار کی دہلیز پہ سر ہوگئے اقبال''

سالک صاحب اپنے بیان میں فرماتے ہیں:

> ''میں اشعار لکھنے کے بعد اتنا نادم ہوا کہ مجھے عرصہ تک ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد جی کڑا کر کے حاضر ہوا تو ڈاکٹر صاحب کے انداز میں کوئی فرق محسوس نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس قسم کا کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں۔ مولانا ظفر علی خاں کو بھی اسی طرح ندامت کا احساس تھا۔'' [۳]

۱۔ ساقی۔ جوش نمبر، ص ۱۶۷

۲۔ نظم جدید کی کروٹیں، ص ۵۶

۳۔ ساقی۔ جوش نمبر، ص ۱۶۸

جوشخص ادراک رکھتا تھا، اس نے ندامت کے آنسو بہالیئے اور اپنا دل صاف کرلیا اور اقبال کی عظمت تسلیم کرلی لیکن جوش ماننے والے کہاں، وہ تو خودکو یہ کہتے ہیں کہ ع

''میں شاعر آخر الزماں ہوں''

جوش نے اقبال کے حوالے سے پنجابی کی تکرار بھی کچھ زیادہ ہی کی ہے:

''اہل پنجاب اپنے معمولی سے صاحب جوہر ہم صوبہ کا ڈنکا پیٹتے رہتے ہیں۔''

صاحب جوہر کہہ کر الفاظ میں اعتراف بھی ملتا ہے لیکن یہ اعتراف اختلاف کی بنیاد پر ہے کیونکہ جوش کے ہاں اقبال کے لئے نفرت، تعصب، بغض اور اپنے سے کمتر سمجھنا پایا جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جوش از خود بڑے شاعر ہیں، بہت اچھی نظمیں کہتے ہیں، لٹریچر پر بڑی عمیق نظر ہے، ان سب کے باوجود جوش پر باضابطہ اور باقاعدہ کوئی معیاری تحقیقی کام نہیں ہوا جبکہ اقبال پر کام کرنے والے اسکالروں کی تعداد دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے۔ ملک میں مختلف جامعات میں جس تیزی سے اقبال پر کام ہو رہا ہے، اس کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر بھی اقبال کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ میں جوش معدوم نہ ہو جائیں کیونکہ عصبیت ایک گھُن ہے جو اندر ہی اندر انسان کو کھوکھلا کرتی ہے۔

''جوش صاحب کے لئے علامہ اقبال فقط ادبی میدان ہی میں نہیں بلکہ دینی و سیاسی میدان میں بھی ایک حریف غالب تھے۔''[1]

جوش کی ایک نظم ''حب وطن اور مسلمان'' ملاحظہ کیجئے، اس میں اقبال کو ہدف تنقید بنایا ہے ؎

ظرف اور اس حد کا تنگ اے حامی دین مبیں
حیف اے ناآشنائے رحمتہ اللعالمین
سعی کرنا چاہئے پہلے تو گھر کے واسطے
گھر سے فرصت ہو تو پھر نوع بشر کے واسطے
تیرے لب پر ہے عراق و شام و مصر و روم و چین
لیکن اپنے ہی وطن کے نام سے واقف نہیں
کون کہتا ہے زمین و آسماں تیرا نہیں
کل جہاں تیرا مگر ہندوستان تیرا نہیں
مرد حق کو قعر باطل سے ابھرنا چاہئے
کعبۂ حب وطن میں سجدہ کرنا چاہئے
سب سے پہلے مرد بن ہندوستاں کے واسطے
ہند جاگ اٹھے گا پھر سارے جہاں کے واسطے

(حب وطن اور مسلمان) حرف و حکایت

جوش اقبال کو شاعر نہیں مانتے لیکن تتبع اقبال ہی کا کرتے ہیں۔ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو یہ بحث تو آپ کو ساقی نمبر میں مل جائے گی، ہم اپنے موضوع کی طرف لوٹتے ہیں کہ اقبال کے اثرات جوش پر یقیناً مرتب ہوئے ہیں، اس کی پہلی مثال جوش کا اپنا

۱۔ ساقی۔ جوش نمبر، ص ۱۷۰

کلام ہے ؎

اے مرد خدا نفس کو اپنے پہچان انسان یقین ہے اور اللہ گمان
میری بیعت کے واسطے ہاتھ بڑھا پڑھ کلمہ لا الٰہ الا انسان

اقبال کے اثرات جوش کی شاعری میں دیکھے جاسکتے ہیں، اس ثبوت میں مثنوی کو پیش کیا جاسکتا ہے- جوش نے ایک مثنوی ''مناجات'' کے عنوان سے لکھی ہے، اقبال کے ''ساقی نامہ'' کا اثر ملاحظہ کیجئے ؎

یہ پچھلا پہر، یہ طلسمی سماں یہ بجلی کی ضو، یہ اگر کا دھواں
اگر کے دھوئیں میں یہ رقصاں شمیم مسکتی فضا میں چٹکتی نسیم
یہ شیشوں سے چھنتی بصد دلبری سیہ تاب ضو، اگریٔ روشنی
سیاہی کے اندر جھلکتے نجوم جہالت کی چادر میں جیسے علوم
سمٹتی سی ظلمت، ہمکتی سی ضو ملاحت کے اندر صباحت کی رو
عقیدت کے ایواں میں گردن جھکا
خدائے دو عالم پہ ایمان لا

(مناجات) [۱]

ان اشعار کو پڑھنے کے بعد کیسے انکار کیا جاسکتا ہے کہ اقبال کے اثر سے باہر ہے، ''بال جبریل'' کا ''ساقی نامہ'' اس بات کا اظہار ہے، چند شعر ملاحظہ کیجئے ؎

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی
اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
دل طور سینا و فاراں دو نیم تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم
مسلماں ہے توحید میں گرم جوش مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش

(ساقی نامہ) [۲]

ان اشعار سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ جوش نے اقبال سے انداز فکر ہی نہیں بلکہ طرز ادا، ندرت خیال اور ہیئت و تکنیک سے استفادہ کیا ہے- اختصار کے پیش نظر چند اشعار پر اکتفا کیا گیا ہے جبکہ تقابلی جائزے سے بھی یہ بات ثابت کی جاسکتی ہے کہ اقبال کے اثرات بعد کے شعراء ہی نے نہیں بلکہ معاصرین نے بھی قبول کئے ہیں اس لئے جوش صاحب کے انکار کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی-

فراقؔ گورکھپوری......

فراق کے اختلافات کی نوعیت نہایت عجیب وغریب ہے- مذہبی اعتبار سے بھی فراق اور اقبال میں فکری بعد ہے کیونکہ

۱- افکار- جوش نمبر، ص ۴۵۲

۲- بال جبریل- ص ۱۶۶

فراق ایک خاص ہندوانہ فکر رکھتے ہیں- ان کی تنقید، تنقید نہیں، اعتراضات ہیں وہ بھی سطحی- اقبال کی فکر اور نظریات میں انسان اور مسلمان مخاطب ہے- فراق کا کہنا یہ ہے کہ اقبال کے ہاں نہ تو ''معجز نما اکسیر ہے اور نہ تریاق'' ہیں- ڈاکٹر سلیم اختر نے اس بات کا نہایت عمدہ جواب دیا ہے:

> ''فراق صاحب کے مرتبہ کے دانشور سے ایسی سطحی بات کی توقع نہ تھی- علامہ اقبال کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے عروج مغرب میں زوال مغرب کی پیش گوئی کی اور جو انگلستان کی حد تک تو صحیح بھی ثابت ہوگئی ہے- علامہ کا مقصد مغرب کو ممکنہ تباہی سے بچانا نہ تھا کہ تاریخ کے دھارے اور وقت کے تقاضوں سے کسی قوم کو کوئی بھی نہ بچا سکتا- یہ خودکشی ان کی مخصوص معیشت اور طرز زیست کا منطقی نتیجہ تھی- اقبال کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس وقت زوال مغرب کی نوید سنائی جب غلام ہند کی آنکھیں مغرب سے خیرہ ہو چکی تھیں اور اہل ہند کے لئے وہ آقا سے بڑھ کر دیوتا کا روپ دھار چکے تھے-'' [۱]

فراق صاحب شاید بھول گئے کہ اقبال ایک مفکر بھی ہے اور مفکر نباض وقت ہوتا ہے- عصبیت کی عینک سے دیکھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود اپنی بینائی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے- فراق کا یہ کہنا کہ ''نہ کوئی مجمل اشارہ کر سکتے ہیں اور نہ مفصل-'' اس جملہ کو پڑھ کر اور بھی حیرت ہوتی ہے- مغرب زدگی سے بچانے کے لئے اقبال کے ہاں ایک پورا نظام ہے ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی　　یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

اقبال تو فردا کے آئینے میں دیکھ رہے تھے اور پہلے سے اس بات کی اطلاع دے رہے تھے ؎

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبر بد، مرے منہ سے نہ نکل جائے

مغربی تہذیب کے مضر اثرات سے مشرقی اقوام کو بلکہ پورے عالم اسلام کو متعدد بار آگاہ ہی نہیں کیا، اس مرض کا علاج بھی بتایا- ایک طرف اقبال مغربی تہذیب کے زیر اثر ان انسانوں سے مخاطب ہیں کہ اس سے روح مردہ ہوتی ہے، وہ جو اندر کا انسان ہے، جسے ضمیر کہتے ہیں، کسی کام کا نہیں رہتا، ذوق عمل اور جدوجہد سے عاری رہتا ہے- زندگی سے مایوس ہونا ہی اس بات کی علامت ہے کہ انسان خود سے اس قدر بیزار ہو جاتا ہے کہ خود سے نفرت کرنے لگتا ہے- جب انسان کو اس حالت میں اقبال نے دیکھا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ اقبال آنکھیں بند کر لیتے- اب اگر فراق ہوتے تو انہیں مشورہ ہی دیا جا سکتا تھا کہ اقبال کا کلام پھر سے پڑھیئے- ڈاکٹر سلیم اختر نے اعتراضات کے جوابات مدلل ہی نہیں بلکہ جرأت کے ساتھ دیئے ہیں- اگر یہ کہا جائے کہ ڈاکٹر سلیم نے فراق کو فراق کی نظروں میں گرادیا تو بے جا نہ ہوگا- مندرجہ ذیل اقتباس میں فراق کا حد سے تجاوز ہونا ملاحظہ کیجئے جسے سلیم اختر نے اپنی کتاب میں حوالے کے طور پر پیش کیا ہے:

> ''اقبال کا من گھڑت فلسفۂ خودی یا بےخودی جرمن مفکر نطشے سے مستعار ہے نطشے نے جرمن قوم کی دنیا کی تمام دوسری قوموں سے برتری اپنے فلسفۂ فوق البشر میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے- اقبال نے ملت اسلام یا اسلامی آبادی کے سر پر

۱- اقبال اور ہمارے فکری رویے، ص ۳۲

کاغذی تاج رکھ دیا ہے۔'' [1]

اس اقتباس کی روشنی میں فراق صاحب کا بغض وعناد کھل کر سامنے آ گیا۔ ڈاکٹر اقبال نے نکلسن کو جو خط تحریر کیا تھا اس میں تفصیل کے ساتھ وضاحت کر دی تھی، ملاحظہ کیجئے:

''وہ انسان کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا، یہی وجہ ہے کہ اس نے خلط مبحث کر کے میرے انسان کامل اور جرمن مفکر کے فوق الانسان کو ایک ہی چیز فرض کر لیا ہے۔ میں نے آج سے تقریباً بیس سال قبل انسان کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا اور یہ وہ زمانہ ہے جب نہ تو نیٹشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا، نہ اس کی کتابیں میری نظروں سے گزری تھیں۔'' [2]

اقبال کی اس وضاحت کی بعد ناقدین اور معاصرین پر مہر سکوت لگ چکی تھی۔ لیکن فراق نے جس تعصب کے پیش نظر اقبال کو لوگوں کی نظروں میں گرانا چاہا۔ فراق اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بات اگر اسلام کی برتری کی ہے تو یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو تقابلی جائزے کے حوالے سے بھی اور دیگر ادیان کی روشنی میں بھی اسلام کی تعلیم تمام عالم انسان کے لئے ہے، نہ کہ مسلمان کے لئے۔ جب اسلام میں یہ آفاقیت پائی جاتی ہے تو پھر تعصب اور اغراض کی گنجائش باقی نہ رہ جاتی۔ مائیکل ہارٹ نے اپنی کتاب ''سو عظیم آدمی'' میں حضور نبی کریمؐ اور اسلام پر نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ اللہ کے نزدیک اسلام پسندیدہ مذہب ہے، اس لئے فراق کے اعتراضات کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی۔

مجنوں گورکھپوری......

''مطالعۂ اقبال غلط زاویۂ نگاہ سے'' کے عنوان سے محمد عبدالقیوم خاں باقی نے مضمون قلمبند کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مجنوں نے اپنی کتاب کے آغاز میں اقبال کو خراج تحسین اور ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے لیکن ساتھ ہی طویل فہرست اعتراضات کی بھی ہے۔ سب سے پہلے ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اعتراضات کس نوعیت کے ہیں کیونکہ مجنوں کا تعلق ترقی پسند ادب سے ہے۔ وہ اقبال کو کس زاویے سے دیکھتے ہیں:

''۱۔ اقبال میں ماورائیت ہے (جو تصوف کی طرح کا فلسفہ ہے)۔

۲۔ فراریت گریز اور رجعت ہے۔

۳۔ خطرناک ''حجازیت'' کی تبلیغ پائی جاتی ہے۔

محمد عبدالقیوم کا جواب معترض کے لئے:

''مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ معترض نے اقبال کی ماورائیت کو صحیح طور پر نہیں سمجھا۔ اصولاً اقبال کی ماورائیت کی چار صفات قرار دی جاسکتی ہیں۔

۱۔ ایک سفر مسلسل ہے جو دنیائے آب وگل سے منزل کبریا تک چلا گیا ہے۔

۱۔ اقبال اور ہمارے فکری رویے، ص ۳۹

۲۔ اقبال نامہ۔ حصہ اول، ص ۴۵۸

۲- اس سفر کی کئی منزلیں ہیں جن میں کچھ فلسفے کی قوت سے محسوس کی گئی ہیں اور
کچھ شاعری کی مدد سے۔'' [۱]

دراصل مجنوں اشتراکیت کے حامی ہیں اس لئے ان کے رجحان اور تنقید میں وہی چیزیں اجاگر ہوئی ہیں جس کی ترقی پسند متقاضی ہے لیکن اقبال کی راہ قدرے مختلف ہے کیونکہ ان کا ذہن فلسفی ہے اور دل مجازیت میں ڈوبا ہوا ہے اس لئے اعتراض کی گنجائش نہیں رہتی۔

اقبال کے خیالات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے قرآن مجید کا بغور مطالعہ کیا جائے، اقبال کی شاعری کو سمجھنے کا واحد ذریعہ صرف یہی ہے:

''اگر ہم چاہتے ہیں کہ اقبال کے خیالات کو کما حقہ سمجھیں خواہ ہمیں ان سے اختلاف ہو یا اتفاق اسلامی ثقافت کی حقیقی روح جب ہی ہمارے سامنے ہوگی۔ جب ہم قرآن مجید کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کریں کہ بحثیت ایک ثقافتی تحریک کے جیسا کہ اقبال نے لکھا ہے، اسلام کی تعلیمات کیا ہیں۔ یہ ہوگا تو ہم اس بحث میں خود بھی آگے بڑھ سکیں گے۔'' [۲]

نذیر نیازی نے مندرجہ بالا اقتباس میں خوب پتے کی بات کہی ہے کہ پہلے قرآن کا مطالعہ کیا جائے پھر اقبال کے خیالات و افکار کو دیکھا جائے۔ اس عمل سے اسلامی تعلیمات کی صحیح آگاہی ہوسکتی ہے۔ جن حضرات نے اقبال کے افکار سے اختلاف روا رکھا ہے، وہ بھی اقبال کے نظریات کے قائل ہوگئے۔ مخالفت شخصی نہیں علمی ہونا چاہئے تاکہ مباحث کی روشنی میں جو مدلل جوابات آتے ہیں وہی مبحث کا حاصل ہوتے ہیں۔

ص۔ا۔تبسم......

''چراغ راہ'' میں ''اقبال پر ترچھی نظر'' کے عنوان سے جو مقالہ ص۔ا۔تبسم نے تحریر کیا ہے، اس کے عنوان ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ تنقیدی نقطۂ نگاہ سے ہٹ کر اعتراضات اور مخالفت پر بھی اتر آئے۔ پروفیسر فروغ احمد نے جوابی مقالہ تحریر کر کے علمی وسعت میں اضافہ کیا ہے۔ پروفیسر فروغ کا یہ مقالہ محققانہ اور فاضلانہ معیار کا ہے۔ جو تجزیہ کیا گیا ہے وہ یقیناً قابل تعریف ہے۔ تنقید کے لئے انہوں نے دو باتوں کا ذکر کیا ہے، وہ یہ ہیں:

''تنقید کے لئے خلوص شرط ہے، مکمل تنقید یا کامیاب تنقید کے لئے دو باتیں ضروری ہیں، لیاقت اور دیانت۔'' [۳]

اقبال اور نطشے کی بحث میں تبسم اس قدر الجھ گئے کہ کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ اقبال اور نطشے پر متعدد مضامین ضبط تحریر میں آچکے ہیں۔ پروفیسر طاہر تونسوی نے اپنی کتاب ''اقبال اور مشاہیر'' میں اقبال اور نطشے پر انتخاب میں مضمون

۱- نگار۔اقبال نمبر، ص ۹۵

۲- نقوش۔اقبال نمبر (۲)، ص ۱۲۲

۳- تفہیم اقبال، ص ۷۹

رکھا ہے- اس مضمون میں واضح طور پر یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اقبال نطشے سے کب اور کہاں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں- یہ وضاحت تبسم نے اپنے مقالے میں نہیں دی- تبسم نے یہ اعتراض تو کر دیا کہ ''پتھر اور کوئلہ'' سے اقبال نے مواد حاصل کیا ہے لیکن اس مواد سے جو چیز تخلیق ہوئی، اس کو اجاگر کرنے میں بخل سے کام لیا گیا- بد دیانتی اور کسے کہتے ہیں-

پروفیسر فروغ احمد کا یہ حوالہ کس قدر مستند ہے:

''وہ ہمیشہ مستعار چیز کو جلا دے کر ایک نئی اور انوکھی چیز بنالیتا ہے، مثال کے طور پر ''اسرار خودی'' کی حکایت ''الماس و زغال'' کو لے لیجئے، جو نطشے کی تصنیف (''ارشادات زردشت'') کی حکایت نمبر ۲۹ پتھر اور کوئلہ سے ماخوذ ہے مگر چونکہ اقبال نطشے سے بزرگ تر شاعر ہے، اس نے پتھر کو اس طرح کاٹا اور صیقل کیا کہ الماس اس کا اپنا بن گیا-'' [۱]

تبسم نے بڑے عجیب وغریب اعتراضات کئے ہیں، ایک اعتراض یہ بھی ملاحظہ کیجئے:

''اقبال نے حیات کے صرف مثبت پہلو پر زور دیا ہے اور اس کے منفی پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے-'' [۲]

فروغ احمد نے مندرجہ بالا عبارت کا جواب نہایت دلیل کے ساتھ دیا ہے- اقبال کے ہاں باضابطہ ''حیات'' کا مکمل نظام ملتا ہے- لفظ خودی اور بے خودی ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے انسانی اقدار کے بارے میں دیگر شعراء کے مقابلے میں مثبت فکر کو اجاگر کیا ہے- وہ انسان کے بارے میں ہمیشہ فکر مند رہتے تھے- ان کے فلسفۂ خودی کی بنیاد بھی یہی انسان ہے- انسان ان کی شاعری کا مرکزی کردار ہے ؎

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں

اقبال نے جس قدر آدم کا استقبال کیا ہے یا احترام آدمیت ہمیں ان کی شاعری میں نظر آتا ہے، یہ جذبہ کسی اور کے ہاں نہیں- حیات کے نشیب وفراز سے لے کر سیاسی و معاشی، معاشرتی نقطہ ہائے نگاہ سے بھی انسان کو بہتر مقام دلوانے کی انتھک کوششیں نظر آتی ہیں- ڈاکٹر عشرت حسن انور نے اپنے مقالے ''اقبال اور نطشے'' میں جو تقابلی جائزہ پیش کیا ہے، اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اقبال اور نطشے دونوں نے نظریۂ خودی پر بات کی ہے:

''اقبال کس حد تک نطشے کے ہم خیال ہیں اور کہاں تک دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں، اور جس کے آگے دونوں کے لئے ایک دوسرے سے علیحدگی لازم ہو جاتی ہے اور اقبال نطشے کا ساتھ چھوڑ کر ایک بزرگ ہم سفر کے ساتھ، جن کا نام پیر رومی ہے، اپنے مخصوص فلسفے کی آخری منازل طے کرتے ہیں-'' [۳]

نطشے اور اقبال کے فلسفۂ خودی کو سمجھنے میں بھی تبسم سے سہو ہوا ہے-

---

۱- تفہیم اقبال، ص ۸۶

۲- تفہیم اقبال، ص ۸۹

۳- اقبال اور مشاہیر، ص ۱۹۳

نطشے کے خیال میں کائنات کی فطرت ہر جگہ دیکھی جاسکتی ہے، وہ ہر جگہ موجود ہے لیکن اقبال کی خودی میں اثبات ہے اور یہ اثبات شہود کا اشاریہ ہے- اقبال وحدت میں کثرت کا مشاہدہ کرتے ہیں- بقول فروغ احمد کے ''تبسم صاحب، اقبال کو طبقاتی شاعر کہتے ہیں-''

یہ جملہ معترضہ ہے، یہ دراصل اقبال کو محدود کرنے کی سازش ہے- یہ ناممکن ہے کہ اقبال کسی خاص طبقہ کا شاعر ہو، اس کی فکر عالمگیری ہے اور تمام انسان کے لئے پیغام محبت ہے- اقبال نے جس خودی کے ذریعہ انسان کو اعلیٰ مقام کی طرف لانے کے لئے اس روح کو زندہ کر دیا جو مردہ ہو چکی تھی- ایسا شاعر طبقاتی شاعر کیسے ہوسکتا ہے-

عبدالمالک آروی......

''اقبال کی شاعری'' عنوان کے تحت عبدالمالک آروی نے جو مقالہ تحریر کیا ہے اس میں اقبال کی شاعری اور نظریات کی مخالفت کی گئی ہے- ابوطاہر رشید احمد صابر ویلور نے تو اس مقالے کو تسلیم کرنے ہی سے انکار کر دیا:

> ''گویا یہ مقالہ کیا ہے اچھا خاصا بھان متی کا پٹارہ ہے، اول تو اس مقالے کو مقالہ کہنا ہی مقالے کی توہین کرنا ہے-'' [۱]

اقبال کی اسلامی شاعری پر نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''اقبال جب اسلامی شاعری پر اتر آتے ہیں تو بعض اوقات ان کے اندر ایک سخت قسم کا فرقہ ورانہ رجحان پایا جاتا ہے جس کو جہاد فی سبیل اللہ تو کہہ سکتے ہیں، لیکن شعر نہیں کہہ سکتے-'' [۲]

مالک آروی کا یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ اقبال فرقہ ورانہ رجحان کے شاعر ہیں- دراصل بات یہ ہے کہ اقبال اپنے جذبۂ عشق اور کمال جنوں سے فرقہ ورانہ بت کو پاش پاش کر دیتے ہیں ؂

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی

مالک آروی نے بر بنائے اختلاف اقبال کو نشانہ بنایا ہے- صرف اس لئے کہ ان کا ادب میں تو کوئی خاص مقام ہے نہیں، اقبال کی مخالفت کر کے ہی شہرت حاصل کر لیں- مالک آروی کا کہنا ہے کہ اقبال کی شاعری پر شیلے، بائرن، ہیگل، افلاطون، برگساں، نطشے، لانگ فیلو اور ورڈسورتھ، دیگر فلسفی و شاعر کے اثرات منجملہ حیثیت سے اقبال کے کلام میں دیکھے جاسکتے ہیں-

اگر یہ بات مالک آروی کی تسلیم بھی کر لی جائے کہ اقبال نے اثرات قبول کئے ہیں، اس حیثیت سے کسی بھی نقاد یا کسی ادبی اور لٹریری شخصیت کو کوئی اعتراض نہیں- اقبال نے ان اثرات کو قبول کیا ہے، جو اسلام کی روح سے مطابقت رکھتے ہیں اور جہاں ان کے نظریات اسلامی فکر اور نظریہ سے متصادم ہوئے- اقبال نے اسلامی نقطہ ہائے نگاہ کے پیش نظر رکھ کر اپنے خیال کا اظہار قرآن وسنت کی روشنی میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیا- اقبال، برگساں سے متاثر ہے اس کا اعتراف انہوں نے خود بھی کیا ہے- اقبال

۱- نقوش- اقبال نمبر (۲)، ص ۵۴۹

۲- نقوش- اقبال نمبر (۲)، ص ۵۵۴

کہاں تک برگساں سے متاثر ہیں، ڈاکٹر عشرت حسن انور کا مقالہ ''اقبال اور برگساں'' ایک پر مغز مقالہ ہے ڈاکٹر عشرت نے کیا خوب تجزیہ کیا ہے:

> ''اقبال کو جب وجدان ذات میسر ہوا تو وہ برگساں سے بجائے قریب تر ہونے کے دور تر ہو گئے، یہی وجدان ذات جس پر برگساں کے تمام فلسفہ کی بنیاد ہے، جب اقبال کو میسر ہوا تو وہ برگساں کی طرح ''ہمہ اوست'' کا اقرار کرنے کے بجائے اس کا انکار کر بیٹھے۔'' [۱]

نقوش اقبال نمبر میں ''اقبال پر بعض فضلا کی حرف گیری کی حقیقت'' جس میں تفصیلی بحث کی گئی ہے، یہ اقتباسات اسی مقالہ سے لئے گئے ہیں۔ ان کے حوالے درج ذیل ہیں:

۱۔ ڈاکٹر عشرت حسن انور کا مقالہ ''اقبال اور نطشے'' اور ''اقبال اور برگساں''، یہ دونوں مقالے ''اقبال اور مشاہیر'' میں طاہر تونسوی نے ترتیب دیئے ہیں۔ ان مقالوں کے علاوہ دیگر مقالے بھی ہیں جن میں حامد حسن قادری، خلیفہ عبدالحکیم، بشیر احمد ڈار، پروفیسر سلیم اختر وغیرہ کے مقالے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

تمام ناقدین کو اس بات کا اعتراف ہے کہ اقبال جس شہرت کی بلندی پر کھڑے ہیں۔ اگر ایک عالم ان کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جائے تو پھر بھی انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ بنیادی چیز جو اقبال میں پائی جاتی ہے وہ ان کا عجز وانکسار ہے۔ دوسرے علمیت اور تیسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ عشق کیونکہ اقبال خود بھی سراپا عشق تھے۔

چودھری خوشی محمد ناظر نے ''تنقید ہمدرد'' میں اقبال کے خلاف عروض، زبان اور محاورات پر جو اعتراضات اٹھائے ہیں ان کے جواب غلام بھیک نیرنگ نے احسن طریقے سے دے دیئے تھے لیکن اقبال کے اشعار پر جو اعتراضات اٹھائے گئے تھے، ان کا جواب علامہ اقبال نے دلیل اور سند اساتذہ کے اشعار سے دے کر مخالفین کو خاموش کیا۔ علامہ اقبال کو سب سے زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ اعتراض کرنے والے نازیبا اور عامیانہ بلکہ گرے ہوئے الفاظ جس سے ایذا رسانی مقصود ہو استعمال میں لاتے تھے:

> ''اگرچہ ''تنقید ہمدرد'' صاحب نے بالخصوص حضرت ناظر کی نسبت اور بعض بعض جگہ میری نسبت دل آزار الفاظ استعمال کئے ہیں مگر میں باوجود حق اور قدرت کے اس بات سے اعتراض کروں گا کیونکہ فن تنقید کا پہلا اصول یہی ہے کہ اس کا ہر لفظ نفسانیت کے جوش سے مبرا ہو۔ تنقید کی بناء دوستی، محبت اور نیک نیتی پر ہونی چاہئے نہ یہ کہ مضمون تو اپنے خیال میں از راہ دوستی لکھیں اور طرز بیان ایسا اختیار کریں کہ دوستی اور دشمنی میں تمیز نہ ہو سکے۔'' [۲]

تنقید اور اعتراضات میں جب دل آزار الفاظ استعمال کئے جائیں گے تو پھر یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ اقبال کے اشعار میں زبان اور محاورات پر کس نوعیت سے اعتراضات کر سکتے ہو۔ تنقید تخلیق کے پیرائے میں ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ ''ڈاکٹر اقبال کی اردو'' کے عنوان سے محمد محمود زمان خاں نے ایک مضمون لکھا جس میں معمولی معمولی اعتراضات اٹھائے گئے ہیں۔ یہ اعتراضات لکھنؤ

۱۔ اقبال اور مشاہیر، ص ۱۸۷

۲۔ ذکر اقبال، ص ۳۰

کے ایک حکیم ''مرقع لکھنؤ'' میں پہلا اعتراض یہ کرتے ہیں کہ یہ اردو ہے یا فارسی ع

''آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے''

اقبال کا یہ مصرعہ غالب کے لئے کہا گیا ہے ''بانگ درا'' میں یہ نظم بہ عنوان ''نذر غالب'' نظم اردو ہی میں ہے- آرامیدہ قافیہ کی وجہ سے اعتراض اٹھایا گیا کہ یہ فارسی ہے کہ اردو- اقبال نے اساتذہ کے کلام سے متعدد مثالیں دے کر معترض کی تشفی کر دی:

> ''دراصل شاعر وہ ہے جس کا احساس قوی ہو- جس واقعے سے متاثر ہو کر شعر کہے، دوسروں کو بھی مسحور کر دے چنانچہ جس شاعر کا احساس جس قدر قوی اور لطیف ہوگا اسی قدر اس کا کلام شعریت واثر سے لبریز ہوگا- میرے نزدیک اس معیار پر ڈاکٹر اقبال کی ذات ہندوستان کے تمام شعراء سے افضل ہے-'' [1]

اقبال کے خلاف جس قدر بھی منفی انداز کی تحریریں لکھی جائیں، کتنے ہی معائب ظاہر کیے جائیں، اقبال کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آتا جبکہ اقبال پر اتنا کچھ کام ہو چکا ہے مگر محقق ابھی تک اقبال کی دریافت میں مصروف عمل ہیں- پی ایچ ڈی کے مقالوں کے علاوہ وہ مقالے بھی نہایت اہم ہیں جو رسائل میں معتبر ناقدین نے تحریر کئے ہیں- ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ اقبال یورپ میں بھی معروف ہیں- ان پر تحقیقی کام برابر جاری ہے- جگن ناتھ کا یہ کہنا کتنا درست ہے کہ:

> ''فراق گورکھپوری کی طرح کے نقادان اشعار سے جو مفہوم پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ ادبی دیانت پر مبنی نہیں-'' [2]

اقبال کے اسلامی نظریات:

دین اسلام کا پہلا اصول توحید ہے، اللہ رب العزت واحد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اس اصول سے تمام نظریات باطل ہو جاتے ہیں، عبادت صرف اللہ کے لئے ہے اور اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہے- ''قل اطیعو اللہ و اطیعو الرسول'' کہہ کر اللہ تعالیٰ نے وضاحت کر دی- جو شخص اس اصول پر کاربند رہے گا، وہ کبھی گمراہ نہیں ہو سکتا، حضور اکرمؐ نے اپنے قول وفعل سے ثابت کر دیا کہ دین اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو قیامت تک انسانوں کی رہنمائی کرتا رہے گا- اقبال اس اصول اور نظریہ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے دعوت فکر دیتے ہیں کہ اگر دنیا وآخرت میں سرخرو ہونا چاہتے ہو تو پھر حضورؐ کی اتباع لازمی ہے، یہی نجات کا راستہ ہے- ۱۹ جنوری ۱۹۱۶ء کے خط میں خان محمد نیاز الدین کو اقبال غیر اسلامی تعلیم کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

> ''فلسفۂ افلاطون کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے جس کو ایک پیرو Plotinus نے مذہب کی صورت میں پیش کیا- عیسائیت کی ابتدائی صدیوں میں رومی دنیا میں یہ مذہب نہایت مقبول تھا، اس کی آخری حامی ایک عورت تھی Hypatia نام، جس کو عیسائیوں نے ہی مصر میں نہایت بیدردی سے قتل کرا دیا تھا- مسلمانوں میں یہ مذہب

۱- اقبال معاصرین کی نظر میں، ص ۳۲۱

۲- اقبال اور ہمارے فکری رویے، ص ۱۶

حراں کے عیسائیوں کے تراجم کے ذریعہ سے پھیلا اور رفتہ رفتہ مذہب اسلام کا ایک جزو بن گیا- میرے نزدیک یہ تعلیم قطعاً غیر اسلامی ہے اور قرآن کریم کے فلسفے سے اس کا کوئی تعلق نہیں- تصوف کی عمارت اسی یونانی بیہودگی پر تعمیر کی گئی-''[۱]

خلافت راشدہ کے بعد ہی سے مختلف علوم اور فلسفہ کے نظریات اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے تھے- دورِ عباسیہ ان علوم کا نقطۂ آغاز ہے- ہارون رشید نے جو لائبریری قائم کی تھی اس کا نام ''بیت الحکمت'' رکھا تھا- متعدد مترجمین ہمہ وقت مصروف کام رہتے تھے- ان میں ہندو، پارسی، یہودی اور عیسائی فلسفہ کی کتابوں کو عربی میں منتقل کرتے تھے- ہارون کی طرح مامون رشید بھی علم اور علماء کا قدردان تھا- مامون نے ایک شب ارسطو کو خواب میں دیکھا- ارسطو سے ایک سوال پر استفسار کیا کہ ''دنیا میں کیا چیز اچھی ہے؟'' ارسطو نے جواب دیا ''جس کو عقل اچھا کہے-'' مامون کو نصیحت کرتے ہوئے کہ تو حید اور صحبت نیک ہاتھ سے نہ دینا-

سلطنت روم کے اطراف میں فلسفہ کا کہیں نام نہ تھا- ایک راہب نے یونانی کے ایک مکان کا حوالہ دیا کہ جو آج تک مقفل ہے اس کی وجہ یہ بتائی کہ جو کتابیں اس مکان میں مقفل ہیں ان کتابوں سے دین عیسوی کو نقصان اٹھانے پڑیں گے، جتنے بھی حکمران تخت نشین ہوتے گئے وہ اس کمرے کو قفل پر قفل کرتے رہے:

''راہب کی ہدایت پر یہ پر خطر خزانہ کھولا گیا تو بہت سی کتابیں محفوظ ملیں لیکن قیصر کو اب یہ خیال پیدا ہوا کہ مسلمانوں کے ساتھ ایسی فیاضی مذہباً ممنوع تو نہ ہو، ارکان دولت نے متفق اللفظ عرض کیا کہ کچھ مضائقہ نہیں- فلسفہ اگر مسلمانوں میں پھیلا تو ان کے مذہبی جوش کو بھی ٹھنڈا کر کے رہے گا- قیصر نے بھی یہ مناسب سمجھا اور پانچ اونٹ لاد کر خاص فلسفے کی کتابیں مامون کے پاس روانہ کیں، مامون نے تصنیفات ارسطو کے ترجے پر یعقوب ابن کندی کو مامور کیا، جو مختلف زبانوں کے جاننے اور تحقیقات علمی میں عموماً بے نظیر مانا جاتا تھا-''[۲]

یونان اور ایرانی خیالات و نظریات جب مکمل طور پر اسلام میں داخل ہو گئے، جس میں علم کلام اور فلسفہ کی بہتات زیادہ تھی، مسلمانوں نے اس فلسفہ کی روشنی میں علمائے اسلام کو زندیقہ تک کہا- علم کلام اور فلسفہ کی مخالفت علمائے اسلام میں زور پکڑتی گئی- امام احمد حنبل اور امام ابن تیمیہ نے بالاستیعاب ان علوم کا دقت نظر سے مطالعہ کیا اور اسے اسلام کے لئے مضر قرار دیا جبکہ ابن رشد نے فلسفہ کے ارتقاء میں انتھک محنت کی- مغرب میں زیادہ تر ابن رشد کے ترجے جو فلسفہ یونان کہلاتا ہے نظر آتے ہیں:

''ابن رشد ارسطو کی منطق کا شیدائی تھا- اس کے خیال کے مطابق منطق انسان کی سعادت کا ماخذ و مصدر ہے- جس درجہ انسان منطق کا ماہر ہو اسی حد تک اس کی سعادت کا اندازہ کیا جائے گا-''[۳]

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ابن رشد کی تعلیمات عرب فلاسفہ کی تعلیمات جیسی ہیں، لیکن اس کے نظریات میں نو

۱- مکاتیب اقبال، ص ا

۲- المامون، ص ۱۴۱

۳- تاریخ فلاسفۃ الاسلام، ص ۱۳۳

افلاطونیت کا اظہار زیادہ ہے۔ ابن رشد کے مسلک کے بارے میں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ فارابی اور ابن سینا کے مسلک پر تھا:

''ابن رشد کو جو فضیلت حاصل ہے وہ صرف اس وجہ سے نہیں کہ اس نے فلاسفہ کے اقوال کی تفصیلی شرح لکھی، وہ صرف ناقل، شارح اور مقلد نہیں، جیسا کہ بعض مورخین کا خیال ہے، بلکہ وہ ایک جدت پسند اور مخترح فلسفی بھی ہے۔ تفسیر و شرح کے دوران میں اس کی جدت پسند اور اختراع دیگر فلاسفۂ عرب کی طرح تھی کیونکہ ان فلاسفہ نے بھی نہ صرف بغیر زیادتی اور کمی کے ارسطو کی شرح کی بلکہ اس کے مذہب کی تشریح کو اپنے مذاہب کی اشاعت کا ذریعہ قرار دیا۔'' [1]

ابن رشد نے اپنے فلسفے کی بنیاد عقل پر رکھی۔ اس کا کہنا ہے کہ ''قوت عقلیہ اختلاط کے شائبے سے پاک صاف رہے اور اشکال کے امتزاج سے ملوث نہ ہو۔''

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو ارسطو اور افلاطون کی تعلیمات کو مغرب میں اتنا فروغ نہیں ہوا جتنا کہ مسلمانوں نے ان کے نظریات کو معتبر سمجھا۔ ان کے نظریات کی بنیاد مادیات پر تھی، گو کہ ان کے خلاف تحریکیں چلیں۔ اشراقی نظریے کے حامل صوفیاء نے کھل کر مخالفت کی۔ فیثا غورث کے ماننے والوں میں صوفیانہ طرز پایا جاتا تھا کیونکہ ان کے نزدیک ''صوفیانہ واردات و احساسات کا سر چشمہ ہمیشہ انسان کا ذاتی وجدان ہوتا ہے۔''

''فیثا غورث کے حامیان نو خدا کے وہ منتخب اور برگزیدہ بندے تھے، جن کے وجدان پر ہر قابل فہم شئے فوری طور پر منکشف ہو جاتی تھی۔ سریت اور وحدانیت کی اس انوکھی آمیزش کی دینی اساس ''جذیات'' تھی جو خدا کی ماورائیت اور دنیا کے درمیان حائل خلیج کو پاٹنے کی ضرورت پر مبنی تھی۔'' [2]

فیثا غورث کے فلسفے میں زیادہ تر مذہبی نکات زیر بحث آئے ہیں جبکہ نو افلاطونیت نے ایک ایسا نظریہ پیش کیا جو وحدت اور کثرت سے متعلق ہے۔ ان کے نظریہ میں اللہ تعالیٰ کو ''ہست'' کہنا بھی ادب کے خلاف ہے۔ افلاطون کے بعد فلاطینوس نے اپنے نظریہ کو وضاحت سے بیان کیا ہے کہ:

''ذات قدیم کثرت کے بالمقابل وحدت ہے۔ متناہی کے بالمقابل لامتناہی اور لامحدود ہے لیکن ہم ذات قدیم کو اخلاقی صفات سے متصف نہیں کر سکتے کیونکہ یہ تحدید کے مترادف ہوگا۔ ذات پاک، ذات والا صفات نہیں، وہ ذات ہے بغیر قدر کے، بغیر زندگی کے، بغیر فکر کے، بلکہ اس کو ہست کہنا بھی حقیقتاً سوئے ادب ہے۔ وہ ہستی سے ماوراء اور نیکی سے ارفع و اعلیٰ اور بلند و بالا ہے، وہ تفریق سے مبرا ایک متحرک قوت بھی ہے اور بہ حیثیت ایک متحرک قوت وہ ذات واحد اپنے اندر کسی تغیر و تبدل یا حرکت یا تقلیل و تخفیف کے بغیر ایک اور شئے بھی دائماً تخلیق کرتی رہتی ہے۔'' [3]

۱۔ تاریخ فلاسفۃ الاسلام، ص ۱۶۶

۲۔ اسلامی ثقافت اقبال کی نظر میں، ص ۱۳

۳۔ اسلامی ثقافت اقبال کی نظر میں، ص ۱۵

اسی طرح کے بہت سے یونانی نظریات وخیالات مسلمانوں میں معتزلہ کے ذریعہ پہنچے کیونکہ معتزلہ نے اپنے دینی عقائد کی بنیاد یونانی فلسفے پر رکھی تھی- ان کی زیادہ تر تعلیمات کا مآ خذ فیثا غورث کے نظریات ہیں- معتزلہ کے حامل افراد عقل کو فوقیت دیتے ہیں- یونان کے فلسفے میں عقل کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ اس نظریہ سے انسان اور خدا کا ادراک کرنا چاہتے ہیں- فلاطینوس کے ہاں بھی عقل، مادہ اور روح کو پیش نظر رکھا گیا ہے:

> ''فلاطینوس کے نظریے میں بھی وجود ذات محض کا سوا کسی کا نہیں ہے- اس کے خیال میں ذات محض سے پہلے عقل کا اشراق ہوا، پھر روح کا اور پھر مادے کا- روح مادے کی آلائش سے پاک ہوکر اپنے مصدر حقیقی سے اتحاد کرسکتی ہے- اس نظریے کو عرب نو اشراقیوں نے انفصال (جدا ہونا) اور انجذاب (جذب ہونا) کا نام دیا-'' [1]

عقلی قوت سے اسلام میں نئی فکر نے جنم لیا- واصل ابن عطا نے اعتزال اور عقلیت کو مرکزی حیثیت دے کر ایک نئے رجحان کی ابتداء کی- معتزلہ کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ انہوں نے ادریت، زرتشت، مسیحیت اور بدھ مت مذاہب کو واضح طور پر یہ بار آور کرایا کہ اسلام ایک جامع اور مکمل طور پر انسان کے متعلق اور دیگر شعبہ ہائے حیات وکائنات کے بارے میں باضابطہ نظریات کا حامل ہے- لیکن اس کے برعکس معتزلہ کے خدا کے بارے میں محیر العقول نظریات نے اسلام کی روح کو مجروح کردیا- خدا کے متعلق ان کے نظریات عجیب وغریب ہیں:

> ''معتزلہ تحریک کا ہر فرد یہ اعتقاد رکھتا تھا کہ خدا کو ان چھوٹے یا بڑے افعال و اعمال پر کوئی اختیار نہیں- خدا نے ان کو اس چیز کا مختار بنایا جس پر خدا کو خود کوئی اختیار نہیں- اس بیان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا موقف اور مقام وہی تھا جو انیسویں صدی کے موحدین کا، وہ خدا کی ابتدائی طاقت پر یقین رکھتے تھے-'' [2]

ابتداء میں اقبال وحدت الوجود نظریہ کے حامل تھے اور نفی ذات ان کا عقیدہ تھا ؎

دل ہر ذرہ میں پوشیدہ کسک ہے اس کی
نور یہ وہ ہے کہ ہر شئے میں جھلک ہے اس کی

بغرض تعلیم اقبال یورپ گئے تو وہاں انہوں نے مادی ترقی اور جدید رجحانات کا مشاہدہ کیا- ان کے علمی ذوق اور جستجو کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کی تباہ حالی نے انہیں مضطرب کردیا- اقبال نے مغرب ومشرق کے فلسفے کو وقت کی چھلنی میں چھانا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کو تقلید کے بھنور سے نکلنا ہے- اسلامی فکر اور نظریات میں یونانی اور عجمی نظریات نے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا- تصوف کے پردے میں غیر اسلامی نظریات کا داخل ہونا اور اس پر عمل کرنا ضروری سمجھا گیا کیونکہ ان نظریات کو ایمانی قوت سے تعبیر کیا گیا- ہندوستان کے مسلمان ہر لحاظ سے انحطاط کا شکار ہوچکے تھے- اسلامی افکار سے تعلق نہ ہونے کے برابر تھا- مسلمان ایک برف کی سل ہوکر رہ گئے تھے- جذبۂ ایمانی دلوں سے نکل چکا تھا، ان میں نہ حوصلہ باقی رہا اور نہ جرأت باقی رہی، روح مردہ ہوچکی تھی، جیسے بستر مرگ پر پڑا انسان ناامیدی کی حالت میں اپنی زندگی کی سانسیں گن رہا ہو- مایوسی اور محرومی اس انتہا کو پہنچ چکی تھی کہ غلامی نے ذہن اور فطری صلاحیتوں کو مسلوب کرلیا تھا-

---

۱- اقبال کا علم کلام، ص ۸۲

۲- اسلامی ثقافت اقبال کی نظر میں، ص ۴۶

مغربی افکار سے مسلمانوں کی تہذیب وتمدن بری طرح متاثر ہوئی- مسلمانوں نے مذہب کے ساتھ خود کو بھی فراموش کر دیا، تاریخ کے آئینے میں مسلمان قرون اولیٰ میں اپنی مثال آپ قائم کر گئے تھے لیکن آج کا مسلمان سیاسی و معاشرتی، ذہنی و معاشی اعتبار سے دیگر اقوام کے مقابلے میں پست اور کم ہمت قوم کہلائی - یہ ایک ایسا انحطاط تھا کہ مسلمان سر اٹھانے کے قابل نہ رہے، گو کہ ان کی حالت سدھارنے اور اسلامی عظمت کو پھر سے جدید تعلیم کی روشنی میں مختلف تحریکیں فعال رہیں لیکن خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوئے-

ان حالات کے پیش نظر ایک ایسے انقلاب کی ضرورت تھی جو جدید سائنس کے تقاضوں کو پورا کر سکے اور مسلم معاشرے کی ازسرنو تطبیق کر سکے- اقبال کے نزدیک مغربی تمدن مسلمانوں کے لئے سودمند ثابت نہیں ہوسکتا- البتہ سائنس کی ایجادات اور جدید تعلیم سے ضرور استفادہ کیا جاسکتا ہے- سائنس کی ابتداء اور اس کے علم کے مطابق قرون اولیٰ کے سائنس دانوں کا اعتراف اہل مغرب نے کیا ہے- بقول اقبال سائنس نے اپنی اساس کو پالیا، اس کی ترقی اور نشوونما کا راستہ کھل گیا- سائنس مسلمانوں کا عطیہ اور تحفہ ہے- مولانا سید سلیمان ندوی کو خط میں اپنے دلی کیفیات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میں سچ کہتا ہوں کہ میرے دل میں ممالک اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے- ذاتی لحاظ سے خداوند کریم سے میرا دل مطمئن ہے- یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر اور راہ اختیار نہ کرلے-'' [۱]

یہ خط ۲۴ اپریل ۱۹۲۶ء کو لکھا گا- سید سلیمان ندوی اقبال کو اسلام کا سپاہی تسلیم کرنے کے ساتھ ایک قابل فلسفہ دان بھی سمجھتے تھے- تائید و اعتراف میں علامہ کے تعزیتی مضمون سے ظاہر ہے:

> ''اقبال صرف شاعر نہ تھا، وہ حکیم تھا، وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چین، بلکہ وہ حکیم جو سرا سر کلام الٰہی کے محرم اور رموز شریعت کے آشنا تھے- وہ نئے فلسفے کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھاتا تھا یعنی بادۂ انگور نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا پیالہ تیار کرتا تھا-'' [۲]
>
> معارف، مئی ۱۹۳۸ء-

سید سلیمان ندوی نے اقبال کے افکار و خیالات کو انہی کی کتابوں سے اجاگر کیا ہے- ندوی کا یہ اقتباس تاریخی دستاویز سے کم نہیں، انہوں نے اقبال شناسی کا صحیح طور پر حق ادا کیا ہے، ان کے کارناموں اور کوششوں کو سراہا ہے، سید سلیمان ندوی ''معارف'' ہی میں لکھتے ہیں:

> ''وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا- آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہوگئی اور ایسا عارف فلسفی، عاشق رسول شاعر، فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروان ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو اور اس کے ذہن کا ہر ترانہ ''بانگ درا''، اس کی جان حزیں کی ہر آواز ''زبور عجم'' اور

۱- مکاتیب سر محمد اقبال، ص ۱۳

۲- معارف، ص ۵۳

اس کے دل کی ہر فریاد "پیام مشرق"، اس کے شعر کا ہر پر پرواز "بال جبریل" تھا- اس کی فانی عمر گو ختم ہوگئی لیکن ان کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر انشاءاللہ باقی رہے گا-"[1] معارف، مئی ۱۹۳۸ء-

یہ تھا وہ اعتراف جس کے ہر لفظ سے عقیدت ٹپک رہی ہے- اقبال مسلمانوں کے لئے ایک مسیحا بن کر ابھرے اور مسلمانوں کے موجودہ مرض کی تشخیص کی اور پھر اس کے علاج میں خود کو وقف کر دیا- اگر آج بھی مسلمان اقبال کے افکار کو مشعل راہ بنا لیں تو انہیں اسلامی نظریات جدیدیت کے آئینے میں نظر آئیں گے- یہ تیقن ہے کہ مسلمان اپنی گم گشتہ منزل کا سراغ پالیں گے- اقبال نے تصوف کو عجمی تصورات اور نوافلاطونیت سے پاک کر کے قرآن مجید کی روشنی میں اور حضورؐ کی سیرت کو پیش نظر رکھ کر تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کی بنیاد رکھی ہے- ان تمام موضوعات ونظریات کو موضوع بحث بنایا ہے، جس سے اسلام میں فرقے اور فتنوں نے سر اٹھایا تھا- اقبال نے اپنے تحقیقی مقالہ "فلسفۂ عجم" میں تمام نکات وضاحت سے بیان کر دیئے ہیں- اسلام کی حقیقی روح کو پھر سے مسلمانوں میں زندہ کر دیا- اقبال نے "فلسفۂ عجم" میں یونانی تفکر اور نظریات کے بارے میں لکھا ہے:

"عربوں کی فتوحات سے جو سیاسی انقلاب رونما ہوا وہ آبائی اور سامی اقوام کے باہمی عقل واثر کی ابتداء کا باعث تھا اور ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ایرانی کی سطح زندگی پر اگرچہ زیادہ تر سامی رنگ چڑھا جاتا ہے لیکن وہ خاموشی کے ساتھ اسلام کو اپنی آریائی عادت فکر میں تبدیل کر لیتا ہے- مغرب میں یونانیوں کے سنجیدہ ذہن نے ایک اور سامی مذہب مسیحیت کی شرح وتفسیر کی دونوں جگہ اس شرح وتفسیر کے نتائج میں ایک عجیب وغریب مشابہت پائی جاتی ہے-"[2]

مغربی تصوف اور ایرانی تصوف میں جو فرق ہمیں ملتا ہے وہ یہ کہ مغرب کے تصوف میں وہ کشش نہیں ہے- مغربی تصوف کو بے مغزی کا مجموعہ کہا گیا ہے جبکہ ایرانی تصوف کے بارے میں سعید نفیسی رقم طراز ہیں:

"ایرانی تصوف میں حظ ولذت اور مغز کی فراوانی ہے- ایرانی تصوف میں شعر، موسیقی، رقص، سماع صرف جائز ہی نہیں بلکہ اتنے پسندیدہ ہیں کہ بعض اوقات ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے عوام کو اکسایا بھی گیا ہے-"[3]

علامہ اقبال کے نزدیک ایرانی تصوف اور ایرانی شاعری نے تصوف کے رجحان اور اسلامی زندگی پر اپنے اثرات مرتسم کئے ہیں- وہ ہماری اسلامی اور قومی فکر سے مماثلت نہیں رکھتے - اسلام کا ان نظریات اور رجحانات سے کوئی تعلق نہیں- اقبال نے صوفیوں کے خیالات کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام جہد عمل، ذوق عمل، غور وفکر اور تحقیق کی دعوت دیتا ہے جبکہ اہل تصوف کی تعلیم اس کے برعکس ہے- وہ توکل کا درس دیتے ہیں کہ جانوروں کی طرح روزی کے پیچھے مت بھاگو کیونکہ تم اشرف المخلوقات ہو، جو تمہارے نصیب میں ہے مل جائے گا- ایرانی شاعری میں اس طرح کے بہت سے مضامین قلمبند ہوئے جس سے قوم کے اندر سستی، کاہلی، غلامی اور پست ہمتی جیسی بیماریاں لاحق ہوگئیں مثلاً صوفیوں کے نظریات یہ ہیں- مرجاؤ،

۱- بحوالہ- مکاتیب سر محمد اقبال، ص ۱۶

۲- فلسفۂ عجم، ص ۳۴

۳- ایرانی تصوف، ص ۱۵۱

مرنے سے پہلے-اقبال کہتے ہیں ہرگز نہ مرو-صوفیوں کے نزدیک تگ و دو فضول ہے اللہ پر بھروسہ کئے بیٹھے رہو-اقبال کا کہنا یہ ہے کہ جہد مسلسل میں رہو، کوشش کرتے رہو-خود بینی کو صوفی حضرات نے شرک خفی کا نام دیا ہے جبکہ اقبال یہ کہتے ہیں کہ انسان صرف اپنے آپ کو دیکھے-صوفی کہتے ہیں کہ ہم طالب ہیں اور خدا مطلوب لیکن اقبال اس کے برعکس نظریہ رکھتے ہیں، کہتے ہیں کہ طالب رب ذوالجلال ہے اور ہم مطلوب ہیں-علامہ اقبال اور فلسفۂ تصوف کے بارے میں مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''صوفیوں نے ایک سینہ زوری یہ کی کہ جا و بیجا اور عربی فارسی کے اس لٹریچر کی جو فلسفۂ تصوف سے دور کا تعلق بھی نہ رکھتا تھا، صوفیانہ تعبیریں کر کے اسے سرتا پا تصوف ثابت کرنے کی کوششیں کرتے رہے-ان کی یہ بے محل کوششیں بعض صورتوں میں بے سود اور بے ضرر ثابت ہوئیں لیکن بعض صورتوں میں نہایت خطرناک اور ضرر رساں نتائج کی حامل بن گئیں-'' [۱]

اقبال نے پہلے ہی اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ تحریک تصوف پر جامع تاریخ لکھوں گا-ان کے نزدیک تصوف پر حملہ کرنا مراد نہیں بلکہ تصوف کی صحیح آگاہی مقصود تھی-اسلامی اور غیر اسلامی نکات کی نشاندہی تجزیہ کے بغیر ممکن نہیں-اقبال نے ابن عربی کو عجمی تصوف کی رو سے ہدف تنقید بنایا-انہوں نے اسلام میں ان باتوں کو رواج دیا جن سے مذہب اسلام کا کوئی تعلق نہیں-اقبال کی تنقید کا موضوع وحدت الوجود نظریہ ہے، اس کو وہ مسئلہ تنزلات ستہ کی تکمیل بتاتے ہیں-اقبال نے غیر اسلامی نظریے کے فروغ میں ان صوفیوں کا ذکر کیا ہے، جنہوں نے شاعری میں پست اور مردہ مضامین سے لوگوں کے دل کمزور کر دیئے:

> ''اقبال انسانی انا کے ارتقاء کے قائل ہیں تا حدے کہ انائے انسانی ایسے مقام تک پہنچ جائے کہ انائے مطلق سے ہم کلام ہو جائے-عجمی صوفیاء کی طرح وہ تکمیل ذات اسے نہیں کہتے کہ انسانی انا ایک قطرۂ حقیر کی طرح انائے مطلق کی وحدت کے بحرِ بے پایاں میں جذب ہو جائے بلکہ اسے کہتے ہیں کہ اپنے اندر جہاں تک ہو سکتا ہے صفات ربانی پیدا کرے، تسخیر کائنات کا فریضہ سرانجام دے اور تخلیق میں خدا کا ہم باز ہو-'' [۲]

''اسرار خودی'' کے پہلے ایڈیشن میں اقبال نے شعری پیرائے میں حافظ شیرازی پر جو تنقید کی تھی وہ اپنی جگہ درست ہے-ان کے نزدیک قوم و ملک کے لئے یہ نظریات مضر ہی نہیں مہلک بھی ہیں-ان نظریات سے ویسے بھی لوگ اپنے آپ کو آسودہ ذہن تصور کرنے لگے تھے اس لئے اقبال نے قوم کو ماضی کا سبق یاد دلایا اور ان صوفیائے کرام کا تذکرہ کیا جو خالصتاً قرآن، حدیث اور سیرت طیبہ کو نمونہ بنا کر خالص اسلامی نظریات کی مثال قائم کر گئے-بعد کے صوفیاء نے علمی فلسفیانہ طرز کو جب اسلام میں داخل کیا تو لوگ اپنے مسلک اور مذہب سے دور ہوتے گئے-اقبال کے وہ شعر ملاحظہ کیجئے جو انہوں نے حافظ کے نظریات پر تنقیدی اعتبار سے کہے ہیں ؎

ہوشیار از حافظ صہبا گسار جامش از زہر اجل سرمایہ دار
رہن ساقی خرقۂ پرہیز او مے علاج ہول رستا خیز او

۱- نقوش، ص ۱۶۵

۲- شعر اقبال، ص ۳۱۲

نیست غیر از بادہ در بازار او | از دو جام آشفتہ شد دستار او
چو جرس صد نالہ رسوا کشید | عیش ہم در منزل جاناں ندید
آں فقیہہ ملت مے خوارگاں | آں امام امت بیچارگاں
گوسفند است و نوا آموختہ است | عشوہ و ناز و ادا آموختہ است

تصوف پر اقبال کی تنقید ان اصولوں پر دیکھی جا سکتی ہے- اقبال یورپ جانے سے پہلے وحدت الوجود کے قائل تھے- اقبال کی تربیت ان کے والد شیخ نور محمد نے کی تھی، والد صوفی بزرگ تھے- اقبال کی تربیت جس ماحول میں ہوئی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ذہن مذہب سے قریب ہوتا گیا- ان کی فکر میں اخلاقی قدریں اور روحانیت دل و دماغ میں جاگزیں ہوگئیں- تاریخ اسلام کے مطالعہ سے ذہن میں مذہب سے وارفتگی پیدا ہوگئی- صحابہ کرامؓ کی طرز زندگی اور ان کے کارناموں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ مذہبی فکر کو اپنا مقصد حیات بنالیا- وہ ان مجاہدوں کو یاد کرتے ہیں- جن میں جہد عمل اور ایمانی جذبہ ایسی قوت لئے ہوئے تھا کہ عیسائی اور یہودی انگشت بدنداں تھے- لیکن آج کا مسلمان غفلت کی آغوش میں پڑا اپنے باقی دنوں کو شمار کر رہا ہے- اسی لئے اقبال تصوف کے خلاف نہیں بلکہ موجودہ تصوف پر تنقید کرتے ہیں- مثنوی ''اسرار خودی'' میں وہ افلاطون کے نظریۂ اعیان سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں- افلاطون کے نظریہ سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اس کے ہاں وہ شعوری ابلاغ اور تعمیر خودی کا جذبہ مفقود ہے کیونکہ یہ مادیت کے پرستار تھے اور یہ مادیت میں خدا کو تلاش کر رہے تھے- ان کے نزدیک خدا اور مادی دنیا باہم ہونا چاہیئے- فلسفۂ یونان میں سیاسی، سماجی اور مذہبی رجحانات سے لاتعلق ہو کر انفرادی قوت کا احساس ملتا ہے- اس وقت کے تصوف میں عقل کو اہمیت اور فوقیت حاصل رہی- فیثا غورث کے زمانے میں متصوفانہ فکر کا آغاز ہوا، اس نے صوفیانہ طرز احساس کو وجدانی کیفیت سے تعبیر کیا ہے- یہودیت اور فیثا غورث کے میلان سے جو مذہبی تصور ظہور پذیر ہوا، وہ ترک دنیا کا تھا- اقبال باطنی طور پر صوفی تھے- اکثر لوگوں نے اقبال کے نظریہ تصوف کو غلط رنگ سے پیش کیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے:

> ''جس ہیئت میں تصوف آج اسلام میں رائج ہے اور جس کا مظاہرہ اور مشاہدہ عام طور سے خانقاہوں اور سجادہ نشینوں میں ہوتا ہے- وہ اصل اور صحیح تصوف نہیں ہے، جس کی بنیاد آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب میں پڑی تھی، جس کی تلقین و تدریس بزرگان دین اور اولیائے کرام کرتے رہے- جب اسلام اطراف و اکناف میں پھیلا اور مختلف مذاہب کے لوگ مشرف با اسلام ہونا شروع ہوئے تو وہ اپنے ساتھ اپنے قدیم فلسفے کے اثرات بھی لائے، جس کا فکری اور لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں فلسفہ و حکمت یونان و ایران و ہندوستان کے اثرات پیدا ہونے شروع ہوئے-'' [1]

یونان اور ایران کے فلسفیانہ نظریات سے اسلامی تعلیمات میں جو اضافہ ہوا، وہ وحدت الوجود کا نظریہ تھا- ہندوؤں کے ہاں بھی وحدت الوجود کا نظریہ پایا جاتا ہے- اقبال مغرب سے بیزار تو ہیں لیکن کہیں کہیں ان کے نظریات سے استفادہ کیا ہے- لیکن مشرقی شعراء سے، خاص کر جنھوں نے تصوف کو غلط رنگ سے پیش کیا جسے عجمی تصوف کی روح کہا جاتا ہے، ایرانی شعراء انہوں نے دل کی طرف توجہ دی اور اس میں ایسی گل آفرینی دکھائی کہ حسن و جمال ایک نقطہ میں آکر سمٹ گیا- عوام اس شاعری سے بہت زیادہ محظوظ ہوئے- ان افکار و خیالات کی روشنی میں لوگ عمل سے دور ہوتے گئے- ان صوفیائے کرام کی تعلیم میں ترک خودی اور خودکشی

۱- اقبال پر ۱۵ مقالات، ص ۱۵۵

کی تعلیم دی گئی- یہی وہ خطرناک اور مضر افکار تھے جس سے لوگوں میں جہد عمل اور ذوق عمل کا جذبہ مفقود ہوگیا، اپنی نجات کا سامان خانقاہوں میں تلاش کرنے لگے- اقبال نے اس تصوف پر کاری ضرب لگائی:

''تصوف سے اگر اخلاص فی العمل مراد ہے اور یہی مفہوم قرون اولیٰ میں اس کا لیا جاتا ہے تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہوسکتا لیکن جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظام عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے-''[۱]

دراصل عجمی تصوف اور اسلامی تصوف میں فرق پایا جاتا ہے- عجمی تصوف سے دل فریبی اور حسن و جمال کی کیفیت، جس میں خود سے بے خبری پائی جاتی ہے جبکہ اسلامی تصوف سے دل میں نور اور طاقت پیدا ہوتی ہے- ابن تیمیہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے عجمی تصوف اور یونانی فلسفہ کے خلاف آواز بلند کی:

''ابن تیمیہ نے صوفی مابعد الطبیعات کے ''اتحاد'' اور ''حلول'' کے نظریات کو ہدف تنقید بنایا ہے- حلول کا نظریہ مابعد کے صوفیوں سے منسوب ہے اور یہی سبب ہے کہ بعض سرکردہ صوفیائے کرام نے اس نظریہ کو رد کر دیا تھا مثلاً جنیدؒ نے فرمایا: ''قدیم'' اور ''حادث'' میں امتیاز کرنا ''توحید'' کو مستلزم ہے- مگر ابن العربی نے اس موقف کو نہیں مانا اور کہا کہ جنید اور ان کے ساتھی ''توحید'' کی حقیقی ماہیت کا ادراک کئے بغیر دنیا سے سدھار گئے-''[۲]

اقبال بھی ابن تیمیہ کی تقلید میں صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں- وہ مغربی فلاسفر اور صوفیاء کے مختلف نظریات دیکھ کر کف افسوس ملتے ہیں- اسلامی ممالک میں صوفیاء نے وحدت الوجود کو رائج کیا اور تعریفیں کیں- علامہ اقبال نے اس نظریہ کے متعلق واشگاف طور پر کہہ دیا تھا کہ یہ خاص کر مسلمانوں کے لئے زہر قاتل ہے اور اس کے اثرات قوم پر مضر ثابت ہوں گے، اس لئے علامہ نے تنقید کرتے ہوئے یہ کہا:

''تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے جس نے ''لمعات'' میں ''فصوص الحکم'' محی الدین ابن عربی کی تعلیمات کو نظم کیا ہے- جہاں تک مجھے علم ہے فصوص میں سوائے الحاد اور زندقہ کے اور کچھ نہیں-''[۳]

اقبال کے یہ دو شعر دیکھئے جو تصوف میں ہیں ؎

حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے — انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے
کثرت میں ہوگیا ہے وحدت کا راز مخفی — جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

وحدت اور کثرت دراصل اس حقیقت کو کہا گیا جسے رب العالمین کہتے ہیں- وحدت پر غور کریں تو خدا ہے اور کثرت پر نظر

۱- اقبال نامہ- حصہ دوم، ص ۴۵

۲- اسلامی ثقافت اقبال کی نظر میں، ص ۸۰

۳- نقش اقبال، ص ۴۵

ڈالیں تو کائنات کے مناظر ہیں- اقبال نے جن امور پر تنقید کی بنیاد رکھی ہے وہ خالصتاً اسلامی نقطۂ نظر ہے-''تنزلات ستہ افلاطونیت جدیدہ'' یہ پلوٹائنس کے افکار وخیالات کا عربی ترجمہ ہے- ان خیالات کی ترویج سے مسلمانوں میں اسلامی فلسفہ کے اندر داخل ہوا- صوفیائے کرام نے ان نظریات کو اسلامی رنگ میں پیش کیا- وحدت الوجود اسی کا حصہ ہے- اقبال کی تنقید نظریہ پر ہے نہ کہ شخصیت پر- وہ تصوف کو دل وجان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں:

> ''فلسفیانہ اور مؤرخانہ اعتبار سے مجھے بعض ایسے مسائل سے اختلاف ہے جو حقیقت میں فلسفے کے مسائل ہیں مگر جن کو عام طور پر تصوف کے مسائل سمجھا جاتا ہے- تصوف کے مقاصد سے مجھے کیونکر اختلاف ہوسکتا ہے- کوئی مسلمان ہے جو ان لوگوں کو برا سمجھے جن کا نصب العین محبت رسول اللہؐ ہے اور جو اس ذریعہ سے ذات باری سے تعلق پیدا کر کے اپنے اور دوسروں کے ایمان کی پختگی کا باعث ہوتے ہیں- اگر میں تمام صوفیاء کا مخالف ہوتا تو مثنوی میں ان کی حکایات ومعقولات سے استدلال نہ کرتا-'' [1]

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اقبال کا دل صوفی تھا اور وہ صوفیائے کرام کا احترام دل سے کرتے تھے- اس مثال میں دو بزرگ ہستیاں جو ہندوستان میں آرام فرما رہی ہیں، پیش کی جاسکتی ہیں- ایک تو مجدد الف ثانیؒ اور دوسرے محبوب الٰہی نظام الدین اولیاؒ، جس عقیدت کا اظہار انہوں نے نظم میں کیا ہے، ملاحظہ کیجئے-

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا ۔۔۔ بڑی جناب تری، فیض عام ہے تیرا
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی ۔۔۔ مسیح وخضر سے اونچا مقام ہے تیرا
نہاں ہے تیری محبت میں رنگ محبوبی ۔۔۔ بڑی ہے شان، بڑا احترام ہے تیرا
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

(التجائے مسافر) بانگ درا

اقبال جمود کے قائل نہیں، وہ اسلام کو زندہ رُود سے تعبیر کرتے ہیں- اسلام عمل کی تعلیم دیتا ہے تاکہ انسان میں اسپرٹ پیدا ہو، متحرک رہے کیونکہ جمود تنزلی کا پیش خیمہ ہے اور عمل خدا تک پہنچنے کا راستہ ہے- اس سے پہلے خود کا ادراک ہونا لازمی ہے- اقبال کے ہاں نفی خودی نہیں، اثبات خودی کی تعلیم ہے- انہوں نے واضح طور پر اپنے مقالات میں اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ اسلام کو سب سے زیادہ نقصان محی الدین ابن عربی اور شنکر اچاریہ کے نظریات وحدت الوجود نے پہنچایا ہے- اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوؤں کے فلاسفر اور مفکروں نے ذہن کو متاثر کیا لیکن ہمارے مسلم اور صوفی شعراء نے دل کی کیفیات ہی بدل کر رکھ دیں- ایمان جو قوی حیثیت رکھتا تھا، کمزور پڑتا گیا، اخلاق برباد ہوکر رہ گئے تھے:

> ''ہندو حکما نے مسئلہ وحدت الوجود کے اثبات میں دماغ کو مخاطب کیا مگر ایرانی شعراء نے اس مسئلہ کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا- یعنی انہوں نے دل کو اپنی آماجگاہ بنایا اور ان کی حسین وجمیل نکتہ آفرینیوں کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلہ

۱- مقالات اقبال، ص ۱۶۴

نے عوام تک پہنچ کر قریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوق عمل سے محروم کر دیا-'' [۱]

غرض مسلمانوں کو مغربی مفکرین کے نظریات اور نوافلاطونیت نے جو نقصان پہنچایا اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا- اس کے برعکس ہندو مفکرین نے ہمہ اوست کے نظریہ سے مسلمانوں کو گمراہ کیا- ایرانی شعراء نے شعر کی لطافت میں نیند کی گولی رکھ کر عوام کو کھلانا شروع کی، جس سے لوگوں میں کم ہمتی، اپنی ذات میں فنا ہو جانا، تارک الدنیا ہو جانا، یعنی خانقاہی نظام کے تابع رہنا- اسی میں دنیوی اور آخرت کی فلاح ہے، یہی وہ رجحانات تھے جو اسلام میں داخل ہو کر انسانی قلب و دماغ کو متاثر کر رہے تھے- اقبال نے قرآن سے روشنی حاصل کی اور یہ بار آور کرایا کہ قرآن مجید اور حضورؐ کی سیرت طیبہ پر چل کر ہی اپنا مقصود حاصل کر سکتے ہو، انسان اللہ کا نائب ہے اور نائب کا کام نیابت الٰہی ہے، احکام کی بجا آوری میں انسان اپنے اندر تقویت محسوس کرتا ہے، بے عمل انسان ذہنی اور جسمانی طور پر کمزور ہوتا ہے ؎

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوق جمال
عجم کا حسن طبیعت، عرب کا سوز دروں

اقبال نے ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے عنوان سے چھ خطبے دیئے تھے، جنہیں سید نذیر نیازی نے اردو ترجمہ معہ مقدمہ حواشی اور تصریحات کے شائع کیا ہے- اقبال نے اپنے چوتھے خطبے میں خودی، جبر و قدر، حیات بعد الموت پر تفصیلی بحث کی ہے:

> ''بایں ہمہ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اسلامی فلسفہ کی تاریخ میں شعور انسانی کی وحدت کا مسئلہ جسے گویا اس کی شخصیت کا مرکزی نقطہ تصور کرنا چاہئے، کبھی زیر بحث نہیں آیا- متکلمین کا خیال تھا کہ روح یا تو مادے کی ایک بڑی ہی لطیف شکل ہے یا محض عرض، اور اس لئے جسم کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے لہٰذا قیامت کے دن اس کی پھر سے تخلیق ہوگی- حکمائے اسلام، یونانی فلسفہ کے زیر اثر تھے، رہے دوسرے مذاہب فکر سو اس سلسلے میں قابل غور بات یہ ہے کہ جیسے جیسے دنیائے اسلام میں وسعت پیدا ہوئی اس میں مختلف العقیدہ ملتیں شامل ہوتی گئیں مثلاً یہودی، زرتشتی، نسطوری، لیکن ان ملتوں کے ذہنی مطمع نظر کی تشکیل میں چونکہ ایک ایسی ثقافت نے حصہ لیا تھا جو اپنی ابتداء اور نشوونما دونوں لحاظ سے مجوسی لا حاصل تھی-'' [۲]

اقبال سے پہلے دو کتابیں اسلامی انقلاب کے لحاظ سے اہمیت رکھتی ہیں، ''مکتوبات امام ربانی'' حضرت مجدد الف ثانی سرہندیؒ، مکتوبات کی تین جلدیں ہیں، اور دوسری کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ہے-

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے وحدت الشہود کے نظریہ کو بنیاد بنا کر اسلامی فکر کو اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں پر استوار کیا- ان کی تصنیف میں اسلام کے معاشرتی و سماجی تصورات کو موضوع بحث بنایا ہے، جدید اسلامی تصوف کی روشنی میں جو انقلاب رونما ہوا، اس سے بھٹکے ہوئے انسان راہ راست پر آ گئے- شاہ صاحب کے عملی اقدام سے لوگوں میں اخلاقی و روحانی تبدیلی آنا شروع ہو گئی- مکتوبات امام ربانی میں بھی لادینی عناصر کی نشاندہی کی گئی ہے- امام احمد سرہندیؒ نے سُکر کی تقلید پر چلنے والوں کو بھٹکنے سے تعبیر کیا

۱- مقالات اقبال، ص ۱۵۶

۲- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ۱۴۳

ہے:

''مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت ان اکابرارباب فکر کی تقلید میں سیدھے
رستے سے بھٹک گئی ہے اور گمراہی اور نقصان کے کوچہ میں جا پڑی ہے اور انہوں نے
اپنے دین کو برباد کرلیا ہے۔'' [1]

اسلامی احیاء اور تصوف میں مکتوبات کی اہمیت مسلم ہے۔ اسلامی فکر، جس میں متصوفانہ اور سیاسی افکار کی روشنی میں جدید اسلامی تصوف کی داغ بیل ڈالی، اس طرح یہ دونوں بزرگ ہستیاں نئے اسلامی معاشرے کے داعی ہوئے۔ ان کی اصطلاحوں سے تصوف کا حقیقی روپ دھندلا گیا تھا، واضح ہوگیا۔ اقبال کی تصنیف ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' ان دو کتابوں کی وہ کڑی ہے جسے اسلامی فکر کی تاریخ میں وہ مقام ملا ہے جس کے پڑھنے سے لوگوں کے دلوں میں دین سے محبت اور معاشرتی اصلاح کا خیال ذہن میں کروٹ لینے لگا۔ اقبال نے یہ کام نثر اور نظم سے بہ احسن لیا ہے:

''ان خطبات کو مرتب کرتے ہوئے اقبال کے پیش نظر فکر انسانی کی دو بڑی
روائتیں یا دو بڑی دنیائیں تھیں۔ مغربی فکر کی دنیا اور مشرقی فکر کی دنیا۔ ان ہر دو دنیاؤں
کے فکری تار و پود کا استفسار کرتے ہوئے ان کے پیش نظر ان دونوں کے قدیم و جدید
مسائل بھی تھے۔ وہ مسلمان صوفیا اور مفکروں کے افکار کے شارح ہی نہیں ناقد بھی
ہیں۔'' [2]

اقبال نے جہاں مغربی مفکرین اور صوفیائے اسلام پر تنقیدیں کی ہیں، وہاں اپنے خیالات اور نظریات کی ترسیل بھی کی ہے۔ فلسفۂ خودی کو وہ شعروں میں بیان کرتے ہیں ؎

خودی ہے زندہ تو ہے فقر میں شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں نایاب
خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیاں و حریر [3]

خودی کی یہ ہے منزل اولیں مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر طلسم زمان و مکاں توڑ کر

علامہ اقبال کی تنقید تصوف پر اشعار میں ملاحظہ کیجیے ؎

یہ حکمت ملکوتی، یہ علم لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور

۱۔ مکتوبات امام ربانی۔ جلد اول، ص ۱۲۶

۲۔ اقبال عہد آفریں، ص ۱۳۳

۳۔ ضرب کلیم، ص ۷۵

تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار
شریک شورش پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
عجب نہیں کہ پریشاں ہے گفتگو میری
فروغ صبح پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں[۱]

(تصوف) ضرب کلیم

جگن ناتھ آزاد نے اپنی کتاب ''اقبال اور اس کا عہد'' میں فلسفۂ تصوف کو ''ویدانت'' سے تعبیر کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ:

''یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی تصوف کیا ہے؟ کیونکہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اس کے ابتدائی زمانے میں کہیں بھی ''تصوف'' یا ''صوفی'' کی اصطلاحیں نظر نہیں آتیں۔ قرآن اور حدیث ''تصوف'' کے لفظ تک سے آشنا نہیں۔ یہ لفظ دوسری صدی ہجری میں عربی زبان میں داخل ہوا اور پھر ویسے بھی تصوف یا ویدانت کا ایک خاص ہندوستانی نظریۂ حیات ہے۔ شری راج گوپال اچاریہ نے یہ اپنے رسالے موسوم بہ ویدانت میں اسے ہندوستان کے تمدن کی بنیاد قرار دیا ہے۔''[۲]

اسلامی تصوف کیا ہے؟ کے جواب میں صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ نبی آخر الزماں ؐ کے بعد جو حضرات اپنے ذاتی فکر و تدبر سے منتہا پر پہنچے، تزکیۂ نفس سے باطن پر جو تجلیات ظہور پذیر ہوئیں، انہیں واردات قلبی کہا جاتا ہے، اس کے لئے روحانی تجربوں کا ہونا ضروری ہے، روحانیت کی شرط اول مومن ہونا ہے:

''درحقیقت تصوف ایک مکتب فکر کی حیثیت رکھتا ہے، اسے وجدان، واردات روحانی اور اشراق بھی کہا جاتا ہے۔ ابن سینا کے نزدیک علم کے تین ذرائع حواس، عقل اور تخیل ہیں۔ جب یہ تینوں اپنے عروج پر پہنچتے ہیں تو الہام جنم لیتا ہے۔ ابن سینا کا یہ نکتہ کس حد تک درست ہے، اس کی بابت تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے البتہ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ جب عقل و وحی کے پرستاروں کے مابین جنگ نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ بالآخر دونوں گروہ نڈھال ہو گئے تو علم باطن یا علم اشراق نے جنم لیا اور یوں تصوف ایک مکتب فکر کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس دور کے عظیم مفکر امام غزالی کو بھی بالآخر تصوف کے دامن میں پناہ لینا پڑی۔''[۳]

اسلامی تہذیب اور ثقافت عجمیت کی رو میں اتنا آگے بڑھ گئے، ان کے تمام رجحان کو اسلامی تصوف کا حصہ سمجھنے لگے۔ عجمی

۱۔ ضرب کلیم، ص ۲۹

۲۔ اقبال اور اس کا عہد، ص ۶۷

۳۔ اسلامی فکر و ثقافت، ص ۱۱۶

فلسفہ نے مسلمانوں کے ذہن اور روح کو متاثر کیا اور ان کی رگ و پے میں فارسی شعراء، جن میں عراقی اور حافظ شیرازی پیش پیش ہیں، لذت شوق کی محرومی شامل ہو گئی۔ ایمانی جذبہ جسے مسلمانوں کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا، سرد پڑ چکا تھا۔ تصوف کے اس غلط رجحان سے قوم کا دل و دماغ مفلوج ہو کر رہ گیا، ان میں وہ حرارت اور جہد عمل کی خو باقی نہیں رہی، عجم کے غیر اسلامی تصوف کو ذریعۂ نجات سمجھ کر خود سے بے پرواہ ہو گئے۔ ان کی یہ بے پرواہی قوم و ملت کے زوال کی آئینہ دار ہے۔ علامہ اقبال نے ''ساقی نامے'' میں عجمی تصوف پر اظہار خیال کرتے ہوئے عجمی تصوف کی قلعی کھول دی ہے

تمدن، تصوف، شریعت، کلام بتان عجم کے پجاری تمام
وہ صوفی کہ تھا خدمت حق میں مرد محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا یہ سالک مقامات میں کھو گیا

یعنی عجم کی شاعری نے ایسا سحر کیا کہ تمام اسلامی ممالک اس سحر کے اسیر ہو گئے، ان نظریات اور خیالات کو حاصل کلام اور حاصل زیست سمجھنے لگے۔ اس عمل سے مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا وہ اپنی جگہ ہے سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اسلامی نظریات میں شامل ہو کر دین کا حصہ سمجھنے لگے۔ رائج کردہ نظریات کی روشنی میں بے عملی اور بے ذوقی کی زندگی گزارنے ہی میں اپنی عافیت سمجھنے پر مجبور ہو گئے۔ خانقاہی تصور نے مسلمانوں کے ذہنوں کو خدا سے دور خودی سے محروم کر دیا۔ اقبال نے اپنے شعر میں ان صوفیائے کرام کا بطور عقیدت ذکر کیا ہے، جنہوں نے اسلام کی روح کو پیش نظر رکھ کر پیغمبر اسلام کی تعلیمات کو اپنے عمل سے لوگوں میں بیداری، حمیت و غیرت اور انسانیت کے شعور کو فروغ دیا۔ اقبال نے انہی صوفیائے کرام کی تعلیم کو سراہا ہے جن میں خودی کا تصور متحرک کیفیت لئے ہوئے ہے

ازل سے ہے کشمکش میں اسیر ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

اقبال نے دل کو مرکزی حیثیت دی ہے۔ دل ایک ایسا سرچشمہ ہے جس میں انسان اپنی خودی کا ادراک کرتا ہے۔ یہی خودی ایک قوت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اقبال نے نظریۂ خودی کو پیش کر کے اس بات پر زور دیا ہے کہ اے انسان تیری خودی تجھ پر آشکار ہو جائے اور تو شر اور خیر میں تمیز کر سکے

یہ ہے مقصد گردش روزگار کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

''اقبال کی رائے میں خودی کی نشو ونما اور استحکام کے لئے حریت، فقر، عشق اور حوصلہ مندی لازمی عناصر ہیں، ان کے برعکس محرکات سے تعمیر خودی کے عمل میں ضعف پیدا ہوتا ہے، ان کے یہاں خیر اور شر کا معیار بھی یہی ہے، ہر وہ شئے یا عمل جو خودی کے فروغ میں ممدوح ہو خیر اور خوب ہے اور وہ شئے یا عمل جو اسے صدمہ پہنچائے یا اس کی راہوں کو مسدود کرے شر، ناخوب اور غیر مستحسن ہے۔'' [۱]

اقبال کے ہاں خودی کا استحکام اور ذوق عمل پر جو تلقین ہمیں ملتی ہے، اس پیغام میں اللہ کی وحدانیت اور سرشاری عشق رسولؐ پر ایمان رکھنا، یہی زندگی کی روحانی بنیاد ہے، جس میں کائنات کو زمان و مکان کے تصور سے واضح کیا ہے ع

''سمندر ہے اک بوند پانی میں بند''

۱۔ اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں، ص ۱۵۸

اقبال کے نزدیک اکائی کا تصور، حقیقت مطلقہ میں ہے اور اس کی مختلف صورتیں ہیں- ایسا نہیں ہے کہ اقبال کلیتاً عجمی تصوف کے خلاف ہیں- نہ انہوں نے اپنی تحریروں میں اس امر کا ذکر کیا ہے- ان کی نظر میں زیادہ تر صوفیاء نے دین اسلام کی روح کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے معتقدین کو تعلیم اسلامی سے بہرہ مند کیا ہے- اقبال کو عجمی تصوف کے چند امور پر اختلاف ہے مثلاً ذوق عمل سے قوم کا محروم ہو جانا، جذبۂ اجتہاد کا مفقود ہو جانا، تن آسانی کو شعار بنالینا، زندگی میں تڑپ اور رمق کا نہ پایا جانا- یہ وہ چیزیں ہیں جو عجمی تصوف سے ظہور پذیر ہوئیں- ان عوامل سے مسلمانوں میں نامرادی اور مایوسی کا آ جانا فطری تھا- ان کیفیات کے پیش نظر عوام کا جذبۂ حریت اور تہذیب اسلامی سے دور ہو جانا لازمی تھا- چند شعراء نے اپنے شعروں میں وحدت الوجود کے نظریہ کو متعارف کرایا، جو اس وقت کے مسلمانوں کے لئے مضر تھا- ان اشعار کی روشنی میں اس وقت کے مسلمانوں کی کیفیت یہ تھی کہ دل مردہ ہو چکے تھے- جسمانی لحاظ سے زندہ تھے مگر مردنی چھائی ہوئی تھی- دل میں کوئی تڑپ، سوز، فکر غم عقبیٰ یعنی ان چیزوں سے لاپرواہ ہو گئے تھے- دوسرے یہ کہ اسلام کی وہ تعلیم جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی اور دیگر مقامات پر اپنے اصحاب کو اسلامی تعلیم سے آگاہ کیا- عجمی تصوف اسلامی تعلیم سے مختلف نظریہ کا حامل ہے- دراصل اسلام سے یہ تصادم ہی اسلام میں غلط رجحانات کا باعث بنا- شعرائے کرام نے اسلامی فکر اور نظریہ سے ہٹ کر ایسی شاعری کی بنیاد رکھی جن کا اسلامی اصولوں سے کوئی تعلق نہیں- عجمی تصوف میں دوئی کا جو رجحان پروان چڑھ رہا تھا، اسلام کی روح سے متصادم نظر آتا ہے- دوئی کا تصور اسلام کے منافی ہے- حضورؐ کی تعلیمات میں دوئی کا تصور قطعی طور پر نہیں ہے:

> ''اقبال کو اس مرد کامل کی بھی تلاش تھی جو جوہر عشق کا کامل ترین مصور ہو اور ہر معنی میں کامل ترین انسان ہو- رسول پاکؐ کی ذات گرامی میں اقبال کو ہر معنی میں انسانیت کی معراج نظر آئی- اقبال نے یہ بھی دیکھا کہ جن لوگوں نے رسول پاکؐ کی سنت پر عمل کیا ہے اور ان کی ذات سے عقیدت استوار رکھ کر زندگی بسر کی ہے، ان سے امت مسلمہ کو بہت فائدے پہنچے ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہر وہ فتنہ جو ملت اسلامیہ کے لئے مہلک ثابت ہو سکتا ہے اس کا علاج ہی یہی ہے کہ مسلمان رسول پاکؐ کے قول و فعل سے استشہاد کریں-'' [1]

اقبال نے عجمی لے کا ذکر کر کے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ اس لے سے مسلمانوں میں اضمحلال، افسردگی اور غیر متحرک کا ہونا پایا گیا- انہوں نے ان کیفیات کو محسوس کرتے ہوئے عجمی لے کو تنقید کا نشانہ بنایا- اقبال کے نزدیک خانقاہی نظام غلامی کے مترادف ہے جہاں انسان کی خودی اور انا مجروح ہوتی ہے- ایرانی شاعری کے بارے میں اقبال کے یہ دو شعر ملاحظہ کیجئے ~

ہے شعر عجم گرچہ طربناک و دل آویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیر خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغ سحر خیز

اقبال نے اپنے ان اشعار سے قوم میں ایک نئی فکر کا احساس دلایا اور انہیں ان کی خودی کا ادراک دیا، عجمی لے تمہارے لئے سودمند نہیں، اس لے میں کئی اسلامی مملکتیں زوال پذیر ہو گئیں، اس عجمی لے سے گریز کرو، یہ وہ زہر ہے جس کا تریاق نہیں-

---

۱- شعر اقبال، ص ۲۲۸

اقبال نے اپنے نظریات اور خیالات سے قوم میں اسلامی جذبہ اجاگر کیا، عجمی لے کو افسردگی سے تعبیر کیا ؎

تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم
اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لے
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تیری لے

اقبال نے ''اسلامی ثقافت کی روح'' جو پانچواں خطبہ ہے، اس میں انہوں نے مفصل بحث کرتے ہوئے اسلامی روح کا تعین کیا ہے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ:

> ''اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یوں نظر آئے گا جیسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطہ کی ہے۔ بہ اعتبار اپنے سرچشمۂ وحی کے آپ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے لیکن بہ اعتبار اس کی روح کے دنیائے جدید سے۔ یہ آپ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم و حکمت کے دو تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رخ کے عین مطابق تھے۔ اسلام میں نبوت چونکہ اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی لہذا اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا، اس کے شعور ذات کی تکمیل ہو گی تو یونہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے۔'' [۱]

اگر ہم تاریخ کو تاریخ کے آئینے میں دیکھیں تو بہت سے علم جن کا انکشاف بعد میں ہوا مثلاً علم ریاضی، علم ہیئت، فلسفہ، علوم مابعد الطبیعات، علم طب، علم الکلام، علم نعت، تصوف، علم تاریخ، علم حدیث، فقہ، علم و حکمت کے یہ گنج ہائے گرانمایہ آج بھی روشنی کا مینار سمجھے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے حضورؐ کو دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطہ سے تعبیر کیا ہے۔ مسلمانوں نے خاص طور پر تصوف کے مسئلے میں پیچیدہ صورت پیدا کر دی جس سے ان کی زندگی میں جمود اور تہذیب و ثقافت میں تضاد آ گیا۔ اس کی پہلی وجہ مغربی مفکرین اور یونانی فلسفہ ہے، جن کے نظریات سے اسلام کو نقصان پہنچا۔ عجمی تصوف سے مسلمانوں کے عقیدے میں شگاف پڑ گیا۔ اقبال کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ آج بھی قرآن مجید کے احکام اور رسول کریمؐ کی سیرت پر چل کر اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ عجمی صوفیاء کے علاوہ دیگر صوفیائے کرام نے جو دین کی خدمت کی ہے ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ''کشف المحجوب'' تصوف پر حضرت داتا گنج بخشؒ نے معرکتہ الآرا کتاب تحریر فرمائی ہے۔ اس کتاب میں ان صوفیائے کرام کا تذکرہ ہے جنہوں نے اسلامی روح کو تصوف میں عملی طور سے پیش کیا ہے۔ اقبال کو ان صوفیائے کرام سے بے پناہ عقیدت اور عشق تھا۔

یونانی فلسفہ کے متعلق اتنا کہا جا سکتا ہے کہ عباسی دور میں اسکندریہ اور دمشق کے ذریعہ مسلمانوں میں منتقل ہوا۔ یعنی ایک فلسفہ وہ جو فلسفہ مشائین کہلاتا ہے۔ جسے ارسطو نے وضع کیا تھا اور دوسرا فلسفہ اشراقین، اس میں صوفیاء نے وحدت الوجود کو مرکز مان کر مراقبہ اور وجدان پر زور دیا ہے۔ فلسفہ کے یہ دو دبستان نظر آتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو ''کشف المحجوب'' کے صوفیائے کرام جن کا ذکر داتا صاحب نے کیا ہے۔ ان صوفیائے کرام کا تعلق ان دونوں دبستانوں سے نہیں ہے۔ یہ وہ صوفیائے کرام ہیں جنہوں نے

۱۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ۱۹۳۰ء

تابعین تبع تابعین سے کسب فیض کیا ہے اس لئے گمراہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم اگر آج بھی اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں کو اپنالیں تو صحیح راستے پر آسکتے ہیں، اس کی واحد صورت حضور پاکؐ کی سیرت ہے جو رہنمائی کے لئے کافی ہے:

''مسلمانوں کے اس جذبے سے کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کی ہو بہو پیروی کریں اور قرآن مجید کے احکام پر سختی سے کاربند ہوں جو اثرات پیدا ہو سکتے ہیں، ہمارے اس دعوے کی نفی نہیں ہوتی کہ اسلام میں قوت متحرکہ بدرجہ اتم موجود ہے کیونکہ مسلمانوں نے جب تک ذہنی جمود کو اختیار نہیں کیا تھا، اسلام اپنے آغاز سے تقریباً چھ سو سال بعد تک ہر سمت میں زبردست قوت محرکہ کا مظاہرہ کرتا رہا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے نمونے اور قرآن کریم کے احکام نے اس دور میں توسیع وترقی کے زبردست اثرات مرتب کئے جو مسلمانوں کی قوت محرکہ کے ضامن بنے رہے۔'' [۱]

اللہ کا وہ بندہ جو انسان کامل کی صفات رکھتا ہے، وہ احکام خداوندی کا پابند ہوتا ہے، اس کی زندگی اللہ کے قانون کے مطابق ہوتی ہے، اس کے دل میں طمع، بخل اور حسد نام کی چیزیں نہیں ہوتیں، وہ صرف اللہ کے آئین پر نظر رکھتا ہے ؎

اے حلقۂ درویشاں وہ مرد خدا کیسا ہو جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستاخیز
جو ذکر کی گرمی سے شعلے کی طرح روشن جو فکر کی سرعت میں بجلی سے زیادہ تیز [۲]

اقبال کے تصور خودی سے پہلے صوفیائے کرام کے یہاں ''عرفان نفس'' کا تصور تحریر اور تعلیم میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اسلام کا سرچشمہ توحید ہے، نظریۂ افلاطون اور ویدانت کا تصور وحدت الوجود اسلام میں داخل ہونا شروع ہوا، اس طرح اسلام کی وہ ٹھوس بنیادیں جو مستحکم تھیں، غلط نظریات کی وجہ سے ناقابل تلافی نقصان ہوا۔ یہ وہی اسلام تھا جس نے عرب تا عجم اور تمام یورپین ممالک کو زیر نگیں ہی نہیں کیا، اسلام کی عظمت کا سکہ دلوں میں بٹھایا۔ آج کا مسلمان جو زوال پذیر ہے اس کی وجہ بیان کرنے سے پہلے ان فلسفیانہ نکات کا اظہار ضروری ہے جو غیر اسلامی نقطۂ نگاہ کے حامل ہیں، اس میں مغربی مفکرین اور عجمی شاعری اور شنکر اچاریہ کے نظریات سے اسلام اور مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا وہ تاریخ میں رقم ہے، ان نظریات کی روشنی میں مسلمانوں میں بے عملی، ترک دنیا، ذوق عمل سے محرومی ان عوامل سے امت کا زوال ہونا شروع ہوا:

''جس طرح شنکر اچاریہ نے گیتا کی فعالیت کو انفعالیت میں تبدیل کر دیا تھا، ابن عربی نے قرآن حکیم کی روح عمل کو نو افلاطونیت کے زیر اثر نادانستہ نقصان پہنچایا۔ پھر عجمی جادو بیانوں کے شاعرانہ سحر نے وہ مراحل قلیل ترین مدت میں طے کر لئے جنہیں ہندی پنڈتوں کی منطقیانہ موشگافیوں نے طویل تگ و دو کے بعد طے کیا تھا۔ فلسفہ نے شعر کا پیکر اختیار کرتے ہی دماغوں سے گزر کر براہ راست دلوں کو متاثر کیا اور انجام کار ترک دنیا، بے عملی، انتشار، غلامی، ہلاکت، غرضیکہ یکے بعد دیگرے زوال

۱۔ اسلام کی قوت محرکہ اور مسلمانوں کا ذہنی جمود، ص ۳۴

۲۔ بال جبریل، ص ۴۲

امت کے تمام سامان از خود (حیاتیاتی اور میکانی انداز سے) پیدا ہوتے چلے گئے۔''[۱]

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں
بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست

ایران کی قدیم تہذیب اور یونانی علم وحکمت کے مسلمانوں پر جو اثرات مرتب ہوئے اسے منفی اثرات کہا جاسکتا ہے۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ مسلمان حکما نے یونانی فلسفے کو اہمیت دیتے ہوئے قرآنی تعلیمات کو نظر انداز کر دیا۔ یونانی نظریات میں عقل اور منطق سے کام لیا جاتا تھا۔ یونانی اور ایرانی فکر وفلسفہ نے اسلام میں غیر اسلامی نظریات سے مسلمانوں میں بے عملی کا رجحان تیزی سے بڑھتا گیا۔ یونانیوں میں فلسفۂ حیات کے نظریہ کے زیر اثر افلاطون کی فکر کو بڑا دخل ہے۔ اس کے علاوہ نو افلاطونیت کو محرک وحدت الوجود کی ایک شاخ کہا گیا۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ ذات جو سب سے قدیم ہے، عقل عامہ اس کا ظہور ہے اور عقل عامہ ہی اس کا عکس ہے۔ اس نظریہ میں انسان کے کردار وافعال کی کوئی اہمیت نہیں۔ نو افلاطونی نظریات کے حامل فلسفیوں نے انسانی قدروں اور اس کی عظمت کے بارے میں کوئی باضابطہ نظام نہیں دیا۔ اہل یونان اور اہل روما نے انسانیت کو جس طرح پامال کیا ہے، وہ اخلاقی اعتبار سے درست نہیں۔ افلاطونی نظریات میں اخلاقی جدوجہد کی انتہا یہ ہے کہ انسان دنیا کی ہر چیز سے لاپرواہ اور بے نیاز ہو جائے۔ افلاطون نے ثنویت کا نظریہ پیش کر کے حقیقت کو مادہ سے تعبیر کیا ہے۔ دوسری جگہ خیال یا پھر آئیڈیا کی بات کرتا ہے۔ ارسطو نے اس نظریہ کی مخالفت کی اور اسے اکائی کی حیثیت سے پیش کیا۔ ارسطو نے وحدانی طاقت کا نظریہ پیش کیا۔ لیکن ڈارون نے نظریۂ ارتقا پیش کر کے فکر کا رخ موڑ دیا۔ ان تمام نظریات کی روشنی میں اقبال نے اسلامی فکر اور اسلامی قانون کی بات کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ:

''اس وقت ملکی اور نسلی قومیت کی لہر یورپ سے ایشیاء میں آ رہی ہے اور میرے نزدیک انسان کے لئے یہ ایک بہت بڑی لعنت ہے۔ اس واسطے بنی نوع انسان کے مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس وقت اسلام کے اصلی حقائق اور اس کے حقیقی پیش نہاد پر زور دینا بہت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں خالص اسلامی نقطۂ خیال کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہوں۔''[۲]

علامہ اقبال مسلمانوں کو اسلام کی تعلیمات سے باخبر کرنا چاہتے ہیں کیونکہ اب تک جتنے بھی مغربی مفکرین اور فلاسفر گزرے ہیں ان تمام کے نظریات اسلام کی تعلیمات سے مماثلت رکھتے ہیں۔ اس کا اظہار اقبال نے اپنے کئی خطبوں میں کیا ہے۔ ڈی کارٹ اور مل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ یورپ کے بڑے فلسفی کہلاتے ہیں۔ اقبال نے ڈی کارٹ کے نظریات کو یہ کہہ کر واضح کیا ہے کہ امام غزالی کی کتاب ''احیاء العلوم'' میں پہلے سے موجود ہیں۔ جان اسٹوارٹ مل کی فکر کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ امام فخر الدین رازیؒ نے منطق پر پہلے اعتراض کیا تھا۔ غرض مغربی مفکرین کے اصول جو آج ہمیں فلسفہ کی صورت میں نظر آتے ہیں، اقبال نے ان نظریات کا تحقیقی جائزہ لیتے ہوئے اس کا اظہار یوں کیا ہے:

''جان اسٹوارٹ مل نے منطق کی شکل اول پر جو اعتراض کیا ہے، بعینہٖ وہی اعتراض امام فخر الدین رازی نے بھی کیا تھا اور مل کے فلسفہ کے تمام بنیادی اصول شیخ بو

۱۔ اقبال ریویو ص ۲۰

۲۔ خطوط اقبال ص ۱۶۵

علی سینا کی مشہور کتاب ''شفاء'' میں موجود ہیں- غرض یہ کہ تمام وہ اصول جن پر علوم
جدیدہ کی بنیاد ہے، مسلمانوں کے فیض کا نتیجہ ہیں بلکہ میرا دعویٰ ہے کہ نہ صرف علوم
جدیدہ کے لحاظ سے بلکہ انسان کی زندگی کا کوئی پہلو اور اچھا پہلو ایسا نہیں ہے جن پر
اسلام نے بے انتہا روح پرور اثر نہ ڈالا ہو-'' [۱]

اسلام کی روح اور اس کے نظریات پر اقبال نے اپنے مقالات میں واضح طور پر ان نکات کی نشاندہی کی ہے کہ صرف اور صرف اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو اسلامی تمدن اور اسلامی سیرت کے اعلیٰ نمونے پیش کر کے انسان کو انسان سے ایسے ملا دیتا ہے، جسے بھائی چارہ کی فضا کہا جاتا ہے، یہی اسلام کا مقصود و مطلوب ہے- قرآن پہلے اس کی وضاحت کر چکا ہے- تمام مومن آپس میں بھائی ہیں-

اقبال اسلام کو تمام مذاہب سے اعلیٰ اور بالا سمجھتے تھے- اسلام میں رنگ و نسل کی تفریق نہیں- ان کے نزدیک وطن پرستی بت پرستی کے مترادف ہے- اسلام انسانی حقوق کی بات کرتا ہے، ان حقوق کی روشنی میں اسلامی احکامات واضح ہو جاتے ہیں مثلاً والدین کے حقوق، شوہر کے حقوق، بیوی کے حقوق، اولاد کے حقوق، مسلمان کا مسلمان پر حق، ملازم، خادم کے حقوق، یتیم و مسکین کے حقوق، غریب و محتاج کے حقوق، پڑوسیوں کے حقوق، حیوانات کے حقوق، غیر مسلم کے حقوق، مہمانوں کے حقوق، یہ وہ حقوق ہیں جو ہمیں اسلامی تعلیمات سے ملتے ہیں اس لئے اقبال اسلامی روایات کو دیگر مذاہب سے بہتر سمجھتے ہیں- ان کا کہنا ہے کہ:

''اسلام کی روایات ہمیشہ وسیع تر انسانیت کے حقوق کی علمبردار رہی ہیں، نہ کہ
مخصوص گروہوں کی-'' [۲]

اقبال اہل اسلام سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ مذہب اسلام کی بنیادی تعلیم سے کبھی رخ نہ موڑنا، اپنے اندر وہ خوبیاں پیدا کرو، وہ سیرت اختیار کرو، جو مسلمان کا خاصا ہے- مسلمان کی شناخت کے لئے صحابہ کرامؓ کی طرز زندگی ہمارے لئے نمونہ ہے اسی لئے اقبال اسلامی نقطۂ نظر سے آج کے مسلمان کو ماضی کے مسلمان کا حوالہ دیتے ہیں- اس تمدن کو یاد کرتے ہیں جس میں ایک تہذیب اور اخلاق تھا- لیکن آج وہ چیزیں ناپید ہیں- اقبال پھر سے پیغام دیتے ہیں ؎

ہوس نے کر دیا ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

اقبال کے دل کی تڑپ اور بے چینی کا اندازہ ان کے کلام سے لگایا جا سکتا ہے، وہ اپنے پیغام میں معراج آدمیت کی بات کرتے ہیں ع

''آدمیت احترام آدمی''

اقبال نے ''ضرب کلیم'' میں ''احکام الٰہی'' کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے، اپنے اسلامی نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے ؎

پابندی تقدیر کہ پابندی احکام
یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مرد خرد مند
اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر

۱- مقالات اقبال، ص ۲۴۰

۲- نقش اقبال، ص ۹۷

ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خور سند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

(احکام الٰہی) [1] ضرب کلیم

غیر اسلامی نظریات اور موجودہ مغربی تہذیب کی تقلید سے اقبال نے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ تصوف میں عجمی خیالات کے خلاف اقبال ابن تیمیہ کی تقلید کرتے ہیں۔ اسلام میں کسی اور نظریات کے شامل کرنے یا انہیں اسلام کا جز وتسلیم کرنے میں اقبال قطعی طور پر مخالف ہیں۔ جو چیز اسلام کے منافی ہے، اس کو اسلام نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اسلام ایک صاف وشفاف مذہب ہے۔ عجمی تصوف نے اسے گنجلک کر دیا۔ ان نظریات کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام کی تعلیم قرآن حکیم اور سیرت رسولؐ میں تلاش کی جائے کیونکہ قرآن ایک ایسا آئین ہے جس میں انسان کی رہنمائی بھی ہے اور تمام اصول بھی ہیں اسی لئے اسے ضابطۂ حیات کہا گیا ہے۔ عجمی تصوف کے خلاف اقبال نے دو شعر میں وضاحت کر دی ہے ؎

رمز و ایماں اس زمانے کے لئے موزوں نہیں — اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن
قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے — خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

(خانقاہ) [2] بال جبریل

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اقبال نے تمام زندگی مغربی تہذیب اور مادی فلسفہ کے خلاف آواز اٹھائی۔ اپنے اشعار اور نثر میں متواتر تکذیب کرتے رہے۔ ان کی یہ تنقیدیں تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں تفصیل سے بیان ہوئی ہیں۔ اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں مادی فلسفہ سے انکار کیا ہے، اسے ایک فریب، دھوکہ اور اسلام کے لئے مضر خیال کیا ہے۔ اقبال کا ایمان اس قدر پختہ تھا کہ یورپ کی چکا چوند چمک بھی ان کو متزلزل نہ کر سکی۔ انہوں نے یونانی حکمت کا پردہ چاک کر کے یہ واضح کیا ہے کہ اسلامی ثقافت ہی تمام علوم کا منبع ہے۔ قرآن مجید میں جو آفاقیت اور عملی نقطۂ نظر ہمیں ملتا ہے، وہ نہ یونانی فلسفہ میں ہے اور نہ عجمی تصوف میں۔ خطبات کے متعلق یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے جو اسلامی روح کا آئینہ دار ہے:

> ''اقبال نے بتایا ہے کہ ان خطبوں میں ان کا یہی ارادہ ہے کہ وہ اسلام کے بعض بنیادی تصورات پر فلسفیانہ بحث کریں، اس امید پر کہ یہ کوشش اور اسلام کو انسانیت کے نام ایک پیغام کے طور پر سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگی۔'' [3]

اقبال نے دیباچہ میں قرآن پاک کے رجحان پر اپنے پختہ ایمان ہونے کا جو ثبوت دیا ہے، ملاحظہ کیجئے:

> ''قرآن پاک کا رجحان زیادہ تر اس طرف ہے کہ فکر کی بجائے عمل پر زور دیا جائے۔'' [4]

اقبال نے سچے مومن کی جو صفات بتائی ہیں وہ ان کے سچے مومن ہونے کی دلیل ہے۔ اقبال اسلامی نقطۂ نگاہ کی روشنی

۱۔ ضرب کلیم، ص ۶۲

۲۔ بال جبریل، ص ۲۱۴

۳۔ فکر اسلامی کی تشکیل نو، ص ۱۴

۴۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، از

میں مومن کے مقام کو ظاہر کرتے ہیں ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن　　گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت　　یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
فطرت کا سرود و ازلی اس کے شب و روز　　آہنگ میں یکتا صفت سورۂ رحمان

مغربی تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

اقبال کی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' جو ''ارمغان حجاز'' کے دوسرے حصہ اردو میں ہے، اس نظم سے علامہ اقبال کا اسلامی نظریہ واضح ہوتا ہے۔ ''شیطان'' ایک علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے، اس نظم کے بارے میں یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''اقبال نے ایک شیطانی پارلیمنٹ کا نقشہ کھینچا اور دکھایا ہے کہ اس میں دنیا کے ابلیسی نظام کے ممتاز نمائندے شریک ہوتے ہیں اور ان رجحانات، تحریکات اور سیاسی نظریات کا جائزہ لیتے ہیں جو ان کی راہ میں رکاوٹ اور ان کے مسائل و مقاصد کے لئے سنگ گراں ہیں۔ اس میں ابلیس کے مشیر اپنی اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں اور پھر صدر جلسہ ان سب رایوں کو دیکھ کر ان پر تبصرہ کرتا اور اپنے وسیع تجربات اور جہاں بینی کی روشنی میں اپنی آخری رائے دیتا ہے۔'' [۱]

پہلا مشیر اپنے نظام کے بارے میں جب یہ کہتا ہے، ہم نے عوام کے سامنے مغربی اصلاحات، جسے مکر و فریب کہا جاتا ہے، فلسفہ میں رکھ کر مسلمانوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا اور ان کی اسلامی فکر میں ایک تغیر پیدا کر دیا، یعنی انہیں اسلامی طرز سے ہٹا دیا، پہلا مشیر صدر مجلس کو اپنی رائے دیتے ہوئے کہتا ہے ؎

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام
پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام
یہ ہماری سعی پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

دوسرا مشیر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے ؎

خیر ہے سلطانیِ جمہور کا غوغا کہ شر؟
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر!

تیسرا مشیر مزید وضاحت کرتے ہوئے رائے کا اظہار کرتا ہے ؎

روح سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب
ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب

۱۔ نقوش اقبال، ص ۱۴۲

وہ کلیم بے تجلی! وہ مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

چوتھا مشیر ؎

توڑ اس کا رومتہ الکبریٰ کے ایوانوں میں دیکھ
آل سیزر کو دکھایا ہم نے پھر سیزر کا خواب

پانچواں مشیر ؎

اے ترے سوز نفس سے کار عالم استوار
تو نے جب چاہا کیا ہر پردگی کو آشکار
میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

اب صدر مجلس یعنی ابلیس اپنے مشیروں سے مخاطب ہو کر اپنے نظام کی افادیت کے بارے میں وضاحت سے بتاتا ہے ؎

ہے مرے دست تصرف میں جہان رنگ و بو — کیا زمیں کیا مہر و مہ کیا آسمان تو بتو
جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے — یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر — جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں — ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

(ابلیس کی مجلس شوریٰ) [1] ارمغان حجاز

ڈاکٹر فرمان فتح پوری ابلیس کی مجلس شوریٰ کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''اس میں اقبال نے علامتی انداز میں حکومت کے مختلف نظاموں یعنی سرمایہ داری، جمہوریت، اشتراکیت، فاشزم اور اسلامی نظام حیات پر بحث کی ہے۔ خود ابلیس اور اس کے مشیروں کے ذریعے، یہ راز فاش کیا گیا ہے کہ عصر حاضر کے سارے مروجہ نظام ابلیسیت ہی کے پیدا کردہ ہیں اور در پردہ اسی کے فتنوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ابلیس کے کار جہاں بانی کو ان سے کوئی خطرہ نہیں۔ اشتراکیت بھی ملوکیت ہی کا دوسرا نام ہے اس لئے وہ بھی ابلیسی نظام کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ ہاں ملت اسلامیہ جس نظام زندگی کو بروئے کار لانے کی تیاری کر رہی ہے وہ ضرور ابلیسیت کے لئے مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔'' [2]

۱۔ ارمغان حجاز، ص ۲۱۵

۲۔ اقبال سب کے لئے، ص ۴۴۶

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے — جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو

ابلیس کو نہ تو عیسائی، یہودی، نصاریٰ یا پھر اہل ہنود سے کوئی خطرہ لاحق نہیں اور اگر ہے تو امت مسلمہ سے ہے، کیونکہ اپنے مشیروں کو باآور کراتا ہے کہ اس امت کے پاس قرآن جیسی دولت ہے- گو کہ اس وقت انہوں نے قرآن کو جز دان کیا ہوا ہے، اس وقت یہ قرآن پر عمل پیرا نہیں لیکن یہ ممکنات میں سے ہے کہ کسی وقت بھی ان میں سے کوئی ایسا مسلمان ابھرے گا جو ان کے قلب کو گرمادے گا- اگر یہ امت مسلمہ بیدار ہوگئی تو یہ ہمارے لئے خطرے کا موجب ہوگی کیونکہ میں دین محمدیؐ سے واقف ہوں اس لئے اے مشیروں تم پر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ یہ میری طرح ایک مکمل نظام رکھتے ہیں، جسے دین محمدیؐ کا نام دیا گیا ہے:

> ''لیکن زمانے کے انقلابات اور مقتضیات سے مجھے خطرہ ہے کہ وہ کہیں اس امت کی بیداری کا سامان نہ بن جائیں اور وہ پھر سے دین محمدیؐ کی طرف بازگشت نہ کرنے لگے- دین محمدیؐ اور شرع اسلامی کی ہمہ گیری اور کارسازی کا تمہیں اندازہ نہیں- یہ آئین شریعت، خاندانی نظام، مرد و زن کے حقوق کی حفاظت و صیانت اور صالح معاشرہ کی تعمیر کرتی ہے- یہ دین عزت و حرمت، امانت و عفت، مروت، شجاعت، کرم و سخاوت اور تقویٰ و طہارت کا دین ہے، یہ دنیا سے باطل کی ہر غلامی اور انسانوں کے ساتھ ہر ناانصافی کو مٹا کر رکھ دیتا ہے-'' [1]

اقبال نے اپنی نظموں کے ذریعہ مسلمانوں کو باخبر کیا ہے کہ اگر ابلیسی نظام یعنی مغربی تحریکیں کتنا ہی زور پکڑ لیں یا مستحکم ہو جائیں لیکن ان کی بنیادیں کھوکھلی ہی رہیں گی- اقبال اپنے تازہ خیالات سے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں مسلمانوں کے اندر وہی جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں جو قرون اولیٰ کا امتیاز تھا، جس سے قیصر و کسریٰ لرزہ براندام تھے- ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں مسلمانوں کو متنبہ کیا جارہا ہے کہ یہ امت مسلمہ کے خلاف اپنے ایوانوں میں مشاورت کرتے رہتے ہیں، اس لئے تمہیں چاہیئے کہ ''اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو'' اور مکمل طور پر دین میں داخل ہو جاؤ کیونکہ مسلمان اس کرۂ ارض پر ایک ایسی قوت ہے، اس کے سامنے تمام طاقتیں مصنوعی ہیں- اقبال کا یہ کہنا کہ اپنی قوت کا ادراک اپنی خودی سے کیا جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے کہ جب تم اللہ اور رسولؐ کی پیروی اختیار کرلو گے (وعتصمو بحبل الله جميعاً ولا تفرقو) القرآن- پھر تم ہر میدان اور ہر محاذ پر کامیاب و کامران رہو گے-

اقبال اور مغربی مفکرین کے تقابلی جائزے سے یہ بھی بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام ہی ایک ہمہ گیر اور آفاق گیر مذہب ہے، جس میں ہر موضوع اور ہر انسان کے لئے روشنی ہے- جگن ناتھ آزاد، اقبال کی عظمت کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اقبال شاعر تو یقیناً بہت بڑے ہیں، اتنے بڑے کہ آج تک اردو کا کوئی شاعر ان کی بلندی تک نہ پہنچ سکا لیکن اقبال مفکر بھی چھوٹے نہیں ہیں- ان کا اپنا ایک انداز فکر ہے- یہ الگ بات ہے کہ ہمارے بعض نقاد اس انداز فکر سے متفق نہیں ہیں لیکن ایک سوال یہ بھی ہے کہ ان کی نثری تصانیف پر جس میں انہوں نے وضاحت سے اپنا نظام فکر پیش کیا ہے، کھل کر بحث ہوئی بھی کہاں ہے- اقبال نے اگر مشرقی اور مغربی مفکرین کے خیالات کو اپنایا ہے تو اسی حد تک جس حد تک وہ انہیں قابل قبول تھے، اس

۱- نقوش اقبال، ص ۱۴۹

حد کے بعد انہوں نے اپنا راستہ الگ اختیار کیا۔'' [1]

افکار و خیالات کی روشنی میں اقبال مشاہیر کی اس صف میں نظر آتے ہیں جو صحیح معنیٰ میں انقلابی پیغامبر ہیں۔ اقبال کی فکر اور آفاقیت کو کسی ایک رخ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اقبال کا بنیادی طرز اور فکر اسلامی رہا ہے اور یہ اسلامی فکر انہیں اپنے گھر، اپنے والدین سے ورثے میں ملی ہے۔ والد اور استاد کی دعاؤں سے اقبال نے وہ کارنامہ انجام دیا جسے مسلمان فراموش نہیں کر سکتے۔ ان افکار کی پیروی کرتے ہوئے ہمارے شعراء نے تقلید کرتے ہوئے اقبال کی فکر کو آگے بڑھایا ہے۔ ان میں برصغیر کے نامور شعراء نے اس بات کا ثبوت دیا ہے، جن میں ہندو اور مسلمان شعراء دونوں کا اعتراف ہے کہ اسلامی فکر کو جس تیزی سے اقبال نے پھیلایا کسی اور سے ممکن نہ تھا۔

راسخ عرفانی کا یہ اعتراف اپنے اندر کسی قدر وزن رکھتا ہے، ملاحظہ کیجئے ؎

گلشن شعر و سخن میں ہے نمو اقبال کی ۔۔۔ غنچے غنچے پتے پتے میں ہے بو اقبال کی
درد ملت میں مسلسل برشگال اشک غم ۔۔۔ آنکھ رہتی تھی ہمیشہ باوضو اقبال کی
اللہ اللہ وسعت پرواز شہباز خیال ۔۔۔ کس جگہ پہنچی نگاہ آرزو اقبال کی
اہل ایماں کو بالآخر مل گئی اقلیم پاک ۔۔۔ بار ور ہو کر رہی ہے جستجو اقبال کی

ہند و پاکستان و کابل پر نہیں منحصر
دہر میں شہرت ہے راسخ چار سو اقبال کی

(راسخ عرفانی) [2]

سحر انصاری کے فکر انگیز اشعار اقبال کے لئے ہدیہ تحسین ؎

نشاط جاوداں تک ہے نہ رنج رائیگاں تک ہے ۔۔۔ یہ سب بے اختیاری، اختیار جسم و جاں تک ہے
ذرا زنجیر پا چپ ہو نگہباں چونک پڑتے ہیں ۔۔۔ فغاں کیسی، یہاں تو پرسشِ ضبط فغاں تک ہے
سنے گونگوں سے کوئی لذت تقریر کے معنی ۔۔۔ سکوت اچھا فقط محرومی لفظ و بیاں تک ہے
ہے اب یہ فکر لاحق سب خرد مندان دنیا کو ۔۔۔ وہ دیوانہ کہاں تک ہے، یہ سودائی کہاں تک ہے

سحر انصاری [3]

مصطفیٰ زیدی نے اپنے مجموعے ''شہر آذر'' میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ:

''میری بالکل ابتدائی نظموں پر، جن کو میں نے اس مجموعے میں شامل نہیں کیا، جوش ملیح آبادی کی گرم آہنگی کا بڑا نمایاں اثر تھا۔ ان ساری چیزوں کو میں مشق سمجھتا ہوں اور مشق پر ندامت کی کوئی ضرورت نہیں لیکن میری اپنی شاعری، جس نے رفتہ رفتہ اپنا مزاج سمجھنے کی کوشش کی ہے، ان ابتدائی چیزوں سے بہت مختلف ہے۔ ان نظموں میں ''دیکھنے'' سے زیادہ ''سوچنے'' اور ''چھونے'' سے زیادہ محسوس کرنے کا رجحان نظر

۱- اقبال اور مغربی مفکرین، ص ۹۰

۲- ادبی دنیا، ص ۸

۳- افکار- نذر اقبال، ص ۱۳۵

آتا ہے۔ مجھے مادی اور غیر مادی چیزوں میں ان کی ہیئت اتنی عزیز نہیں جتنی کہ ان کی ماورائیت اور ماہیئت عزیز ہیں۔'' [۱]

اس اقتباس میں اعتراف جوش کا کیا ہے۔ ذیل کی نظم ''بہ نام وطن'' میں فکر اقبال کی کارفرما ہے۔ ''شکوہ''، ''جواب شکوہ'' کا آہنگ اور اشعار ذہن میں رکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ مصطفیٰ زیدی نے خود سے اظہار کئے بغیر اقبال سے استفادہ کیا ہے ؎

کون ہے آج طلبگار نیاز و تکریم
وہی ہر عہد کا جبروت وہی کل کے لیئم
وہی عیار گھرانے، وہی فرزانہ حکیم
وہی تم، لائق صد تذکرۂ وصد تقدیم
تم وہی دشمن احیائے صدا ہو کہ نہیں
پس زنداں یہ تمہیں جلوہ نما ہو کہ نہیں

مندرجہ بالا بند ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' طرز پر ہے۔ مسدس ہیئت کے علاوہ فکری اور صوتی آہنگ بھی اقبال جیسا ہے۔ دوسرا بند ملاحظہ کیجئے ؎

صبح کاشی کا ترنم مری آواز میں ہے
سندھ کی شام کا آہنگ مرے ساز میں ہے
کوہساروں کی صلابت مرے اعجاز میں ہے
بال جبریل کی آہٹ مری پرواز میں ہے
یہ جبیں کون سی چوکھٹ پہ جھکے گی بولو
کس قفس سے مری پرواز رکے گی بولو
(بہ نام وطن) [۲]

ایسا نہیں کہ مصطفیٰ زیدی نے اقبال کا اثر قبول نہیں کیا۔ یہ نظم ۲۱ بند پر مشتمل ہے، صرف دو بند سے اندازہ ہو جاتا ہے بلکہ ایک ہی مصرعہ کافی ہے، شاہد مضمون کے لئے ؎

''بال جبریل کی آہٹ مری پرواز میں ہے''

ان کی دوسری نظم ''میلاد'' ملاحظہ کیجئے جس میں موجودہ صوفیاء اور کمزور ایمان رکھنے والوں کو اجاگر کیا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے زیدی نے اقبال کا تتبع کیا ہے، ملاحظہ کیجئے ؎

اب سرنگوں ہے کتنے بزرگان فن کی بات
اب پیش محکمات گریزاں ہیں ظلیات
اب محض سنگ میل ہیں کل کے تبرکات

۱۔ شہر آذر، کلیات مصطفیٰ زیدی، ص ۱۰

۲۔ شہر آذر، کلیات مصطفیٰ زیدی، ص ۱۵

مدت سے اب نہ کوئی عجوبہ نہ معجزات
دندان شکن حقیقت عریاں کی دھوم ہے

(میلاد) [1]

مذہبی نقطۂ نگاہ کے پیش نظر حفیظ جالندھری نے ''شاہنامہ اسلام'' لکھ کر جو دینی خدمت انجام دی ہے، اسے اقبال کے فکری اثرات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کیونکہ اقبال کی شاعری کا مطمع نظر قرآنی تعلیمات پر ہے۔ حفیظ نے اپنے شاہنامہ کا آغاز ''حمد'' اور ''نعت'' سے کیا ہے ؎

اسی کے نام سے آغاز ہے اس شاہنامے کا
ہمیشہ جس کے سر پر سر جھکا رہتا ہے خامے کا
وہ جس نے ایک حرف کن سے پیدا کر دیا عالم
کشاکش کی صدائے ہا و ہو سے بھر دیا عالم
اسی کے نور سے پر نور ہیں شمس و قمر تارے
وہی ثابت ہے جس کے گرد پھرتے ہیں یہ سیارے
بشر کو فطرت اسلام پر پیدا کیا جس نے
محمدؐ مصطفیٰ کے نام پر شیدا کیا جس نے

(حمد) [2]

نعت کے چند شعر ملاحظہ کیجئے ؎

محمدؐ مصطفیٰ، محبوب داور، سرور عالم
وہ جس کے دم سے مسجود ملائک بن گیا آدم
کیا ساجد کو شیدا جس مسجود حقیقی پر
جھکایا عبد کو درگاہ معبود حقیقی پر
دلائے حق پرستوں کو حقوق زندگی جس نے
کیا باطل کو غرق موجۂ شرمندگی جس نے
ثنا خواں جس کا قرآں ہے ثنا ہے جس کی قرآں میں
اسی پر میرا ایماں ہے وہی ہے میرے ایماں میں

(نعت) [3]

اقبال کا جتنا اثر حفیظ نے قبول کیا ہے ''شاہنامۂ اسلام'' اس ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

اقبال کے مذہبی رنگ کو رحمان کیانی نے کس عقیدت سے اپنایا ہے، ان کی شاعری اس بات کا آئینہ دار ہے۔ رحمان کیانی کی شاعری اول تا آخر اقبال کے تتبع میں ہے۔ ان کا ہر مصرعہ اور ہر نظم اقبال ہی کے انداز پر ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب ''سیف و

۱۔ شہر آذر، کلیات مصطفیٰ زیدی، ص ۲۷

۲۔ شاہنامہ اسلام۔ جلد اول، ص ۸

۳۔ شاہنامہ اسلام۔ جلد اول، ص ۹

قلم'' میں جو نعت ''نبی الملاحم'' کے عنوان سے کہی ہے، مسدس کی ہیئت میں یہ نعت اس لئے جداگانہ ہے کہ خود رحمان کیانی نے اس کا اظہار اپنے ایک بند میں کر دیا ہے، ملاحظہ کیجئے ؎

نعت رسولؐ کا یہ طریقہ عجب نہیں سمجھیں عوام داخل حد ادب نہیں
لیکن یہ طرز خاص مرا بے سبب نہیں شیوہ سپاہیوں کا نوائے طرب نہیں
رائج ہزار ڈھنگ ہوں ذکر حبیبؐ کے
شاہیں سے مانگیے نہ چلن عندلیب کے[1]

مندرجہ بالا بند میں الفاظ کا زیر و بم، فکری آہنگ اور لب و لہجہ اقبال ہی کی دین ہے۔ ڈاکٹر ممتاز حسن نے مقدمہ میں اس بات کا اظہار کر دیا ہے کہ رحمان کیانی کی شاعری اور اقبال کی شاعری کا آہنگ ایک ہی ہے:

''رحمٰن کیانی کی شاعری میں جابجا پیام اقبال کی آواز کی بازگشت سنائی دیتی ہے، گویا ان کی شاعری کلام اقبال کے عملی اور حرکی پہلو کی تفسیر ہے۔ وہ اقبال کی طرح اسلام کے ماضی سے غیرت، فتوت، ہمت اور جہابانی کی مثالوں کو ڈھونڈھ کر لاتے ہیں۔ اسلام اور امت مسلمہ کو دنیا میں دوبارہ اسی بلند مقام پر فائز دیکھنا چاہتے ہیں جہاں وہ پہلے تھی۔''[2]

اقبال نے اپنے کلام میں تضمین سے کام لیا ہے، اسی طرح رحمان نے بھی اس طرز کو اپناتے ہوئے نہایت عمدہ تضمینیں باندھی ہیں، ان کے اس رجحان سے بھی تقلیدی علامت ظاہر ہوتی ہے۔

رحمان کیانی کی چند نظمیں ملاحظہ کیجئے ؎

اس شخص کے اک خواب کی تعبیر ہے جو خود
''رکھتا تھا نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند''
مانگے گی آب و تاب میں حدت ذرا نہیں
''پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں''

رحمٰن کیانی کا یہ بند ملاحظہ کیجئے جس میں اقبال کے شعر پر اپنے شعر کی بنیاد رکھی ہے ؎

المنۃ للّٰہ مگر وقت پڑا جب
اور تم نے دکھائے فن پرواز کے کرتب
اقبال کے شاہیں کا ہر انداز ہر اک ڈھب
لوگوں نے کہا جھوم کے معلوم ہوا اب
''ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن''[3]

۱۔ سیف و قلم، ص ۳۵
۲۔ سیف و قلم، ص ۱۴
۳۔ سیف و قلم، ص ۱۳۲

رحمٰن کیانی کی شاعری میں قنوطیت اور بے مقصدیت کہیں نام کو نہیں۔ بنیادی طور پر یہ ایک سپاہی ہیں۔ ان کا طرز کلام اور شاعری ایک مجاہد کی آواز ہے، جو دلوں کو گرماتی بھی ہے اور اپنے دین کے جذبے کو اجاگر بھی کرتی ہے۔ مسلمانوں کی غیرت کو جھنجھوڑتے ہوئے تنقیدی رجحان ملاحظہ کیجئے ؎

پڑھتے نہیں ہیں بھول کے اللہ کی کتاب ہوتے نہیں ہیں چشمۂ زمزم سے فیضیاب
مغرب کے میکدوں کی چڑھاتے ہوئے شراب اس درجہ ہو چکے ہیں مسلمان اب خراب

سڑکوں پہ ناچتی ہیں کنیزیں بتولؓ کی
اور تالیاں بجاتی ہے امت رسولؐ کی[1]

چند شعراء کا کلام بطور نمونہ، جن میں اقبال کا مذہبی رنگ پایا جاتا ہے ؎

تو برگزیدہ تریں فرد نوع آدم ہے
ہو جس قدر بھی ثنا گستری تری کم ہے
بقدر شوق جو دم بھر سکے ترا خالد
مجال و حوصلہ اس میں کہاں، کہاں دم ہے

عبدالعزیز خالد

دونوں عالم کے لئے رحمت یزداں تو ہے
شافع محشر ہے تو ہادی دوراں تو ہے
سر بہ سر لطف ہے محبوبؐ خدا کا حافظ
یہ کرم ان کا ہے جو حافظ قرآں تو ہے

حافظ لدھیانوی

وہ ہادی جہاں جسے کہیے جہان خیر
نسبت سے اس کی میرا وطن ہے نشان خیر
تائب نگاہ رحمت عالم سے بن گیا
ہر مصرعہ ثنائے نبیؐ ترجمان خیر

حفیظ تائب

آئینہ دار نور سراپا تمہی تو ہو
پردہ خدا نے رکھ لیا، جلوہ تمہی تو ہو
ہے سر بسجدہ شاذ خدا کے حضور میں
اس سر میں جو بسا ہے وہ سودا تمہی تو ہو

شاذ تمکنت

خیر البشر لقب ترا، خیر الانام تو
ایماں ہے جو مرا، وہ خدا کا کلام تو

۱۔ سیف و قلم، ص ۹۸

تو دانش اعتبار، بصیرت مقام تو
تو ذہن، تو نظر، کہ ترا نام مصطفٰے

فضا ابن فیضی

کرم تھا کون سا مجھ پر جو انتہا کا نہ تھا
دل و نظر کو سلیقہ ہی التجا کا نہ تھا
ہزار انجم و مہتاب ہوں مگر محسنؔ
کوئی جواب کہیں اس چراغ پا کا نہ تھا

محسنؔ احسان

اے ساقی الطاف خو، اللہ ہو اللہ ہو
لانا ذرا جام و سبو، اللہ ہو اللہ ہو
تیرا صباؔ بھرتا ہے دم، اس پر رہے تیرا کرم
کہتا پھرے یہ چار سو، اللہ ہو اللہ ہو

صباؔ اکبرآبادی

تسکیں اتارتا ہے دلوں میں خدا کا نام
خوشبو بکھیرتا ہے گلوں میں خدا کا نام
آتا ہے مثل حرف بشارت دم سحر
باد سحر کے ساتھ گھروں میں خدا کا نام

منیرؔ نیازی

اقبال کے دینی افکار میں بنیادی حیثیت اجتماعی رجحانات اور دیگر پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر رکھی گئی ہے کیونکہ اقبال نے اپنا مذہبی نقطہ واضح کر دیا ہے۔ ان کی فکر قرآن اور حدیث میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ اقبال کے افکار اور اقوال جن خطوط میں بکھرے پڑے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک قرآن مسلمانوں کے لئے کتنی بڑی نعمت ہے، چند اقوال ملاحظہ کیجئے:

''قرآن اس لئے نازل ہوا ہے کہ وہ انسان میں خدا سے ربط قلبی کا اعلیٰ شعور پیدا کر دے تاکہ انسان اس ربط کی بدولت مشیت ایزدی سے ہم آہنگی پیدا کر سکے۔''

(روزگار فقیر، جلد اول، ص ۱۷۹)

''قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔''

(اقبال نامہ، حصہ اول، ص ۴۹)

''میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا، میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے، روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا۔''

(اقبال نامہ، حصہ اول، ص ۳۱۹)

''جن لوگوں کے عقائد وعمل کا ماخذ کتاب وسنت ہے، اقبال ان کے قدموں پر ٹوپی کیا سر رکھنے کو تیار ہے اور ان کی صحبت کے ایک لحظہ کو دنیا کی تمام عزت و آبرو پر ترجیح دیتا ہے۔''

(انوار اقبال، ص ۱۸۶)

''ہمارے ملی اتحاد کا انحصار اس بات پر ہے کہ مذہبی اصول پر ہماری گرفت مضبوط ہو، جونہی یہ گرفت ڈھیلی پڑی ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ شاید ہمارا وہی انجام ہو جو یہودیوں کا ہوا۔''

(شذرات فکر اقبال، ص ۸۵)

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

اقبال

اقبال کی شاعری انہی تمام افکار و خیالات اور نظریات کی ترجمان ہے۔ یہی وہ مذہبی رجحانات ہیں جن کے ابلاغ سے شعراء نے خصوصی توجہ دی اور کامل تتبع کیا۔ اقبال کی مذہبی فکر کو شعراء کے نعتیہ کلام میں دیکھا جا سکتا ہے۔

برصغیر کے مسلمانوں میں جب مغربی تہذیب اور نظریات، اس کے علاوہ عجمی تصوف سے غیر اسلامی رسومات اور نئی نئی باتیں شامل ہونے لگیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ علامہ اقبال نے قرآن اور حدیث کی روشنی میں اپنے خطبات اور شاعری میں غیر اسلامی نظریات کی نشاندہی کی۔ اقبال کے ہاں نفی خودی کا رجحان نہیں بلکہ اثبات خودی کا ہے۔ عجمی تصوف میں نفی خودی کا پرچار ملتا ہے۔ اقبال نے خودی کو وضاحت سے بیان کرتے ہوئے اپنے اسلامی نظریہ کو اجاگر کیا۔ اقبال کے خطبات ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ''، اسلامی نقطۂ نگاہ کے پیش نظر ایک اہم کتاب تصور کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اقبال نے ''اسرار خودی'' اور ''رموز بے خودی'' میں اسلامی نکات اور فلسفۂ خودی کی نہایت عمدہ وضاحت کی ہے۔ مثنوی میں جگہ جگہ قرآن اور حدیث سے استفادہ کیا گیا ہے۔ قرآن اور حدیث کے حوالے جابجا مثنوی میں نظر آتے ہیں۔ اقبال کا ذہن خالص اسلامی ذہن تھا اور وہ مسلمانوں میں قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا جذبہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ موجودہ مسلمانوں میں وہ جذبہ نظر نہیں آتا۔ پہلے کے مسلمان میں سعی و عمل تھا لیکن آج کا مسلمان ذوق عمل سے محروم ہے۔ ان وجوہات کے پیش نظر اقبال نے شاعری میں اسلامی فکر کو فروغ دیا۔ ان کی مذہبی شاعری سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دیگر مذاہب کے مطالعے کے بعد اسلامی نظریات کو اس لحاظ سے اہمیت دیتے ہیں کہ اس میں انسانیت کے وقار کے ساتھ انسانی مسائل کا حل دین اسلام میں موجود ہے۔ انسان کی کامیابی کا راز اقبال نے عشق میں تلاش کیا ہے ؎

عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات
عشق سے نور حیات عشق سے نار حیات

اقبال نے ''بال جبریل''، ''زبور عجم'' اور ''اسرار خودی'' میں عشق کی جو وضاحت کی ہے اس سے مسلمانوں میں مذہبی رجحان تیز تر ہو گیا:

''اقبال کے نزدیک عشق ایک ایسا جذبہ ہے، ایک ایسی دھن ہے، ایک ایسا سودا ہے جو انسان کو جملہ آلائشوں سے پاک کر کے اس کی خودی کو جلا دیتا ہے۔ عشق طالب

ومطلوب میں انفرادیت کو ابھارتا ہے۔ مطلوب کی انفرادیت سے متاثر ہو کر طالب
ایک بے مثال شخصیت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ کوشش اس کی خودی کو مستحکم
کرتی ہے۔" [۱]

اقبال نے خودی کو موضوع بحث بنا کر صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ سائنس اور فلسفے پر بھی گہری نظر رکھی۔ ایک طرف وہ قرآن سے روشنی حاصل کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ فلسفیوں کے نظریات کو رد و قبول بھی کرتے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ افلاطون کے نظریات اور افکار کو فلاطینوس نے جدید پیرائے میں ترجمانی کی ہے اور نو افلاطونیت کی اساس فلاطینوس نے ہی رکھی تھی۔ فلو نے توریت اور فلسفۂ یونان کو تطبیق کر کے ایک نظریہ کے حامل ہونے پر کوشش کی۔ اقبال نے "اسرار خودی" میں کائنات کے موضوع پر وضاحت سے لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات تخلیق ہی اس لئے کی ہے کہ انسان اسے تسخیر کرے:

"یہ ایک دلچسپ آفاقی فکر ہے جس میں مادے یا کائنات کی اس لئے تخلیق
ہوئی کہ خود اس کو تسخیر کر کے اپنی فعالیت کا ثبوت دے۔ اس فلسفے کے مطابق کائنات،
انسانی محسوسات سے خودی کی گہرائیوں سے ابھرتی ہے۔ یہ نہ انسان کی دشمن ہے اور نہ
ہی دنیائے دوں ہے بلکہ یہ ایک مہم ہے جو انسان کے اخلاقی مقصد پورا کرنے کے لئے
ضروری ہے۔" [۲]

فطرت کو خرد کے روبرو کر تسخیر مقام رنگ و بو کر
بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات علم مقام صفات، عشق تماشائے ذات

اقبال کے نزدیک اسلامی ملت کا تصور جغرافیائی حدود کی حد بندی نہیں بلکہ لامحدود تصور کا اظہار ہے اور اس میں نسل و قومیت کے فرق کو مٹاتا ہے۔ نسلی قومیت کا جو تصور یورپ میں رائج ہے وہ ایشیاء میں بھی منتقل ہو رہا ہے۔ علامہ اقبال اسے لعنت سے تعبیر کرتے ہیں۔ سید محمد سعید الدین جعفری کو مکاتیب کے ذریعہ اسلامی نظریہ سے آگاہ کیا:

"سعید الدین: کیا پین اسلام ازم ایک پولیٹیکل یا قومی تحریک نہیں ہے؟"

علامہ اقبال کا جواب ملاحظہ کیجئے:

"ہرگز نہیں بلکہ اسلام ایک قوم ہے نوع انسانی کے اتحاد کی طرف یہ ایک سوشل
نظام ہے جو حریت اور مساوات کے ستونوں پر کھڑا ہے۔ میں جو کچھ اسلام کے متعلق
لکھتا ہوں اس سے میری غرض محض خدمت بنی نوع انسانی ہے اور کچھ نہیں۔" [۳]

اقبال نے اسلامی تناظر میں انسانی وقار کو اعلیٰ درجہ دینے کی جو سعی کی ہے وہ روئے زمین کے تمام انسانوں کو متحد دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ایسی دوستی کے خواہاں ہیں جو حقوق العباد کے تقاضے پورے کرتا ہو۔ وہ ایسے فلسفے کو تسلیم نہیں کرتے جو انسانوں کو

۱۔ اقبال کا فلسفۂ خودی، ص ۱۱۰

۲۔ طواسین اقبال۔ جلد اول، ص ۱۰۸

۳۔ مکالمات اقبال، ص ۳۴۷

آپس میں تقسیم کرتا ہو- اقبال کا کہنا یہ ہے کہ:

''میرے نزدیک عملی نقطۂ خیال سے صرف اسلام ہی انسان دوستی کے نصب العین کو حاصل کرنے کا ایک کارگر ذریعہ ہے، باقی ذرائع محض فلسفہ ہیں، خوشنما ضرور ہیں مگر نا قابلِ عمل-'' [1]

علامہ اقبال کے ان اسلامی نظریات کی روشنی میں یہ بات تیقن سے کہی جاسکتی ہے کہ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو منظم طریقے پر مساوات اور دوستی کی تعلیم دیتا ہے- علامہ اقبال نے اسلامی ملت میں مسلمان کے کردار اور افعال پر زور دیتے ہوئے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ مسلمان دنیا کے لئے سراپا شفقت ہے مگر اس اخلاقی انقلاب کو حاصل کرنے کے لئے بھی یہی ضروری ہے کہ میں دنیا کی تمام مذہبی تحریکوں کو ادب اور احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہوں-'' [2]

علامہ اقبال سے جب یہ سوال پوچھا گیا کہ زمانۂ حال میں اسلام کا مطالعہ کیسے کیا جائے اور کس کے ذریعے سے کیا جائے؟

یہ سوال اتنا اہم ہے کہ اس سے اقبال کی تمام اسلامی فکر اور مطالعہ ظاہر ہوتا ہے- اقبال نے اس بات کا اعادہ خود بھی کیا تھا کہ ''یہ محض خاندانی تربیت اور ماحول کا اثر ہی نہیں بلکہ بیس سال کے نہایت آزادانہ غور و فکر کا نتیجہ ہے-''

اقبال کے غور و فکر کرنے کے بعد جو چیز سامنے آئی وہ مسلمانوں کے لئے بھی اور اسلام کو صحیح طور پر سمجھنے کی ترغیب ملتی ہے- اسلام کو جدید پیرائے میں جو اجتہاد اقبال کے ہاں ملتا ہے، اسے خالص بصیرت کا نام دیا جاسکتا ہے- انہوں نے اپنے عمیق مطالعے سے جو اخذ کیا وہ مشورتاً مسلمانوں کو اس سے آگاہ کر دیا:

''مجموعی زمانۂ حال کے مسلمانوں کو امام ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا مطالعہ کرنا چاہیے اور حکماء میں ابن رشدؒ، غزالیؒ اور رومیؒ کا مفسرین میں معتزلی نقطۂ نظر سے زمخشری، اشعری نقطۂ نظر سے رازی اور زبان و محاورہ کے اعتبار سے بیضاوی سے استفادہ کرنا چاہئے-'' [3]

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کا ذہن اسلامی نقطۂ نگاہ کا حامل ہے- وہ صرف اسلام کے نظریات میں کسی فلسفے کے قائل نہیں ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے ۔۔۔ مسلمان نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' اسلام کو پھر سے زندہ کرنے کی ایک ایسی سعی ہے- اس کتاب کو پڑھنا اور سمجھنا نہایت ضروری ہے- اقبال نے اس کتاب میں اسلامی تخیل کو صحیح طور پر پیش کیا ہے- چند صوفیاء نے اسلام کی روح کو سمجھنے میں غلطی کی ہے- اسلام میں غیر اسلامی فکر سے جو بدعتیں داخل ہوئیں اسے اقبال نے محسوس کیا کیونکہ یہ مذہبی فکر رکھتے تھے اور مذہب کو سب سے زیادہ

۱- مکالمات اقبال، ص ۳۴۷

۲- مکالمات اقبال، ص ۳۴۸

۳- مکالمات اقبال، ص ۳۴۹

اہمیت دیتے تھے لیکن موجودہ دور میں سائنس نے جو انکشافات کیے ہیں، مذہب اپنے دائرے میں وہ تمام علوم پہلے سے ظاہر کر چکا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ سائنس ایک محدود فکر رکھتی ہے جبکہ مذہب لامحدود ہے۔ مذہب علم اور وجدان کی بات کرتا ہے، جس میں غور و فکر کرنا نہایت ضروری ہے۔ اسلام حرکی نظام کا قائل ہے۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ قرآن فکر کی دعوت دیتا ہے یعنی مشاہدۂ فطرت میں مصروف عمل رہے۔ ان خطبات کا یہی مقصد ہے کہ انسان معاشرتی لحاظ سے اس قدر تذبذب کا شکار ہو گیا ہے، اسے نئی روشنی درکار ہے۔ علامہ اقبال نے ان خطبات کے ذریعے اسلامی روح اور جدید سائنس کی روشنی میں وہ تمام پہلو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جس میں آج کا انسان مسائل میں جکڑا ہوا ہے:

> ''ان خطبات میں اقبال نے اسلام کے مابعد الطبیعیاتی افکار، اسلامی نظام صلوٰۃ و عبادت، اسلام کی معاشرتی اور تمدنی ماہیئت اور مسلمانوں کی مذہبی واردات کو جدید سائنسی علوم بالخصوص طبیعیات و حیاتیات اور جدید نفسیات کی زبان میں بیان کرنے کی ایک بھرپور اور کامیاب کوشش کی ہے، محدود معنوں میں اسے ہم اسلامی تصوف کی تشکیل نو کی کوشش بھی کہہ سکتے تھے۔'' [1]

اقبال خدمات اسلامی اور تہذیب اسلامی کا محقق ہی نہیں مبلغ بھی ہے۔ انہوں نے قرآن میں غور و فکر کا جو انداز اپنایا ہے وہ بہت کم علمائے کرام میں دیکھا گیا۔ ان کے نزدیک قرآن وہ آئین ہے جو ہدایت ہی ہدایت ہے۔ معاشرتی اور معاشی بدحالی کا علاج قرآن تجویز کرتا ہے۔ اقبال نے اپنے کلام میں بار ہا اس طرف توجہ مبذول کرائی ہے کہ قرآن کی تعلیم سے اپنے عمل کی رفتار کو تیز کر سکتے ہیں۔ قرآن فلاح کا راستہ دکھاتا ہے۔ اقبال نے قرآنی آیات کو اور مفہوم کو اپنے اشعار میں اس طرح پیش کیا ہے کہ روح وجد میں آ جاتی ہے، اسی مناسبت سے چند شعر ملاحظہ کیجئے ؎

نقش قرآں تا دریں عالم است ۔۔۔ نقش ہائے کاہن و پا پا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ۔۔۔ ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغام مرگ ۔۔۔ دستگیر بندۂ بے ساز برگ
ہیچ خیر از مردک زرکش مجو ۔۔۔ لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا

بندۂ مومن ز آیات خدا ست ۔۔۔ ہر جہاں اندر بر او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش ۔۔۔ می دہد قرآں جہانے دیگرش

جس طرح اقبال نے قرآن کے مطالب کو فلسفے سے علیحدہ کر کے دلوں میں حرارت پیدا کی ہے، اگر آج بھی مسلمان اسلام کے اصولوں پر عمل پیرا ہو جائیں تو پوری دنیا زیر نگیں ہو سکتی ہے۔ لیکن اس وقت کا مسلمان جزوی اختلافات میں الجھا ہوا ہے لیکن اقبال نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ آج کے مسلمان میں قرون اولیٰ کے مسلمان کی خوبیاں دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب سیرت طیبہؐ کو اپنا لیں۔ عشق مصطفےٰؐ سے تمام قفل خود بہ خود کھل جائیں گے۔

۱۔ اقبال عہد آفریں، ص ۱۴۰

اقبال عشق مصطفیؐ میں سرشار رہتے تھے- ''ذکر اقبال'' میں لکھا ہے کہ جب اقبال قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتے تھے تو ان کا قرآن دھوپ میں رکھ کر سکھایا جاتا تھا- پڑھنے کے دوران اس قدر گریہ وزاری کرتے تھے- اور یہ بھی لکھا ہے کہ جب حضورؐ کا نام کوئی شخص لے لیتا تو آپ زرد پڑ جایا کرتے تھے- پاس ادب کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ جہاں کسی نے اسم محمدؐ پکارا، علامہ کی آنکھ سے آنسو جاری ہوگئے- یہ کیفیت تادم زیست رہی- صوفیائے کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق کا اظہار نعتیہ کلام کی صورت میں کیا ہے- نعتیہ کلام کی پہلی مثال حسان بن ثابتؓ، جو صحابی رسولؐ ہیں، حضورؐ کی شان میں نہایت عمدہ قصیدے اور نعتیں لکھی ہیں، شیخ سعدیؒ کا نعتیہ کلام جو عشق رسولؐ کی اعلیٰ مثال ہے ؎

بلغ العلیٰ بکمالہ کشف الدجیٰ بجمالہ

حسنت جمیع و خصالہ صلو علیہ وآلہ

اسی طرح مولانا رومؒ نے سرکار دو عالمؐ کی مدحت میں گل ہائے عقیدت نعت کی صورت میں پیش کیا ؎

من و جهک المنیز و یا سید البشر

ابوسعید ابوالخیر، جامی، عطار وغیرہ نے سوز عشق کے بے پناہ جذبے سے حضورؐ کی شان میں نعتیں لکھیں-

اقبال بھی عاشق رسولؐ ہے، ایسا عشق جس کا لفظ لفظ سوز اور گداز سے لبریز ہے- ایک سچا عاشق جب نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہے تو پورا خلوص سمٹ کر جو دل میں پنہاں ہوتا ہے قلم کی نوک پر آجاتا ہے- اس عشق و مستی کی کیفیت دو اشعار میں دیکھئے ؎

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا
نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ

''اقبال خود مسلمان ہے اور اس تمام ''عالم ہست'' کو اسلام ہی کے پرتو میں دیکھنا چاہتا ہے- اس کا نظریہ ہے کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کے ذریعہ دنیا کی نجات ہوسکتی ہے اور وہ تہذیب حاضرہ کی کشمکش سے اندازہ لگا لیتا ہے کہ یہ مادی تہذیب جلد فنا ہو جائے گی اور دنیا ''مذہب اسلام'' کو ''آمنا'' اور ''صدقنا'' کہتے ہوئے اپنے بے قرار دل میں جگہ دے گی- اس کا ایمان ہے کہ انسانیت، صداقت اور حقیقت کا سہل ترین راستہ اسلام ہی ہے-'' [1]

''ارمغان حجاز'' جو علامہ کی آخری تصنیف ہے، عشق اور عقیدت میں ڈوبی ہوئی ہے- آدھا حصہ فارسی میں اور آدھا اردو میں ہے- نظم ''ابلیس مجلس شوریٰ'' ہی مسلمانوں کے لئے ایک عبرت اور ایک سبق ہے- اس کے علاوہ مسلمانوں کی حالت اور ان کی طرز زندگی، معاشرت، سماجیات اور انفرادی و اجتماعی حیثیت سے اپنے پیغام میں جو نصب العین دیا ہے وہ قرآن و حدیث سے مملو ہے- ان کا تمام تر زور ''خودی'' پر رہا- وہ اس کے بیدار کرنے میں قرآن سے مدد لیتے ہیں- اسرار و رموز اس بات کے آئینہ دار ہیں کہ قرآنی آیات کو کس خوبی سے برتا ہے- زندگی کے تغیر اور تبدل کا راز خودی کی بیداری میں ہے- زندگی کے تمام شعبہ جات میں خودی کا ہی عمل دخل ہے- جس نے اپنی خودی کا ادراک کرلیا، وہ عرفان ذات سے عرفان حق کی لذت سے آشنا ہوگیا- تمام قوتوں کا

۱- نقوش- اقبال نمبر (۲)، ص ۴۶۹

اظہار قرآن میں موجود ہے، بس قرآن کو سینے سے لگانے کی دیر ہے، یہی اقبال کا اسلامی نظریہ ہے ؂

گر تو ی خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن

ردو قبول:

اقبال نے اظہار خیال کے لئے جو سانچے اختیار کئے تھے وہ کلاسیکی شاعری کے مروجہ اصول تھے جس میں انہوں نے رومیؒ کے شعری آہنگ کو اپناتے ہوئے اپنے خاص اسلوب اور لسانی شعور کے پیش نظر شاعری کے کینوس کو وسیع تر کر دیا اس کے باوجود اقبال کو جس حد تک بین الاقوامی سطح پر قبول کیا ہے، اس لحاظ سے رد کا تناسب نہ ہونے کے برابر ہے۔ عالمی سطح پر اقبال کو قبولیت کا درجہ حاصل ہے، اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں جو آفاقیت نظر آتی ہے وہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ بیشتر ممالک میں اقبال کو پسند کیا جاتا ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ ایران میں تو اقبال درسی کتابوں میں شامل کر لئے گئے۔ جاپان، فرانس، انڈونیشیا، مصر، جرمنی، برطانیہ، اٹلی، امریکہ، چیکوسلواکیہ اور دیگر ممالک میں اقبال پر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ ان مقالات اور تراجم سے اس بات کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ اقبال کی عالمی سطح پر تحسین معنی خیز بھی ہے اور حیرت و تعجب کا باعث بھی۔ ڈاکٹر نکلسن وہ پہلا شخص ہے جس نے مثنوی ''اسرار و رموز'' کو ترجمہ کر کے مغرب میں اقبال کو متعارف کرایا۔ اس ترجمہ کے فوراً بعد دو مضمون لکھے گئے، جن میں پہلا پروفیسر ڈکنسن اور دوسرا ای۔ ایم فارسٹر کا ہے۔ ان مضامین میں اقبال کے نظریات کو نطشے سے ماخوذ بتایا گیا ہے۔ اس کی وضاحت اقبال نے نکلسن کو طویل خط لکھ کر یہ یقین دلایا ہے کہ یہ نظریۂ خودی نطشے سے نہیں رومی سے ماخوذ ہے۔ اقبال نے اسی خط میں الگزینڈر کا بھی ذکر کیا ہے، اقبال نے اس خط میں تفصیلی بحث کرتے ہوئے یہ باور کرایا ہے کہ ڈکنسن نے جو تنقیدی نکات پیش کئے ہیں، یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اقبال اس کی وضاحت کریں، اقبال نامہ حصہ اول میں اس خط کو دیکھا جا سکتا ہے، یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''میرے خیال میں مسٹر ڈکنسن کا ذہن ابھی تک یورپ والوں کے اس قدیم عقیدے سے آزاد نہیں ہوا کہ اسلام سفاکی اور خونریزی کا درس دیتا ہے۔ دراصل خدا کی ارضی بادشاہت صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص نہیں بلکہ تمام انسان اس میں داخل ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ نسل اور قومیت کے بتوں کی پرستش ترک کر دیں اور ایک دوسرے کی شخصیت تسلیم کر لیں۔''[1]

اقبال کے اس طویل خط سے، جو جواب کی صورت میں تھا، یہ واضح کیا گیا کہ مغرب ابھی اسلامی روح سے واقف نہیں، ڈکنسن پر واضح کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں:

> ''اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدے کا جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگ گراں ہے، نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔''[2]

اسلامی نقطۂ نگاہ کو واضح کرتے ہوئے اقبال نے اپنے مخالفین کو موافقت کی صف میں لا کھڑا کیا۔ یہ اقبال کا فنی اور اخلاقی

۱۔ اقبال نامہ۔ حصہ اول، ص ۴۶۹

۲۔ اقبال نامہ۔ حصہ اول، ص ۴۶۸

اعجاز تھا کہیں بھی اور کسی بھی مقام پر اقبال نے اختلاف کی بنیاد پر جذبات سے کام نہیں لیا، جو سحر انگیزی ان کے کلام کا امتیازی وصف ہے، وہاں ان کے اخلاق کی داد دیئے بغیر کوئی بھی قاری نہیں رہ سکتا۔

اقبال نے اپنے نظریۂ اخلاق کی بنیاد حضور اکرمؐ کے بتائے ہوئے اصولوں پر رکھی ہے۔حضورؐ سے بہتر اخلاق کس کا ہو سکتا ہے، اسی لئے انہوں نے اپنے شعروں میں اور نثر میں اس بات پر زور دیا کہ ہمارے درمیان قرآن اور حضورؐ کی سیرت موجود ہے، یہ ہمارے لئے بہترین نمونہ ہیں۔''آثار اقبال'' کا مندرجہ ذیل اقتباس اس بات کا آئینہ دار ہے:

> ''میرے نزدیک انسانوں کو دماغی اور قلبی تربیت کے لئے نہایت ضروری ہے کہ ان کے عقیدے کی رو سے زندگی کا جو نمونہ بہترین ہو، وہ ہر وقت ان کے سامنے رہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے لئے اسی وجہ سے ضروری ہے کہ وہ اسوۂ رسولؐ کو مدنظر رکھیں تا کہ جذبۂ تقلید اور جذبۂ عمل قائم رہے۔ دنیا میں نبوت کا سب سے بڑا کام تکمیل اخلاق ہے۔'' [۱]

یہی وجہ ہے کہ اقبال کی زبان اور کلام میں جو اثر آفرینی ہے وہ حضورؐ سے بے پناہ عقیدت کا ثمر ہے۔ اس کی پہلی مثال کلیم الدین احمد ہیں جنہوں نے اقبال پر بے لاگ تنقید کی ہے۔ انہوں نے اختلاف اور اعتراف میں ایک توازن رکھا ہے۔تنقید میں ملی جلی اس کیفیت کو ملاحظہ کیجئے:

> ''اقبال شاعر تھے، اچھے شاعر تھے اور وہ زیادہ اچھے شاعر ہو سکتے تھے اگر وہ شاعر ہونے پر قناعت کرتے اور پیغمبر بننے پر مصر نہ ہوتے۔ اس پیغمبری نے ان کی شاعری پر ایک کاری ضرب لگائی۔ لیکن اس کاری ضرب کے بعد بھی ان کی شاعری باقی رہی اور یہ ان کی شعری جانداری کا ثبوت ہے۔'' [۲]

کلیم الدین احمد کی اس تحریر میں اقرار بھی ہے اور انکار بھی۔ ان کی تنقیدی بصیرت سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اقبال پر تنقید کرنے کے لئے انہیں بہت احتیاط سے قلم کو جنبش دینی پڑتی ہے کیونکہ اقبال اپنے ناقد کو فیل بے مہار نہیں چھوڑتے۔ اقبال کو رد کرنے والا یا اختلاف کو بنیاد بنا کر انہیں کسی بھی سطح پر شرمندہ نہیں کر سکتا۔ اگر ہم اقبال کے مخالفین جنہوں نے رد کا سہارا لے کر خود کو نمایاں کرنا چاہا، ان میں فراق گورکھپوری، ڈاکٹر سچد انند سنہا، ڈاکٹر صادق، باقر مہدی، سیماب اکبرآبادی، مجنوں گورکھپوری، کلیم الدین احمد، سید عبداللطیف وغیرہ میں چند نام اور لئے جا سکتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی اتنا بڑا مخالف سامنے نہیں آیا جو اقبال کو کلیتاً رد کیا ہو البتہ اعترافات اس قدر ہیں، اس پر کئی تحقیقی مقالے لکھے جا سکتے ہیں۔ اقبالیات کے نامور محققین جگن ناتھ آزاد، سید وقار عظیم اور ڈاکٹر سلیم اختر نے گراں قدر اضافہ کیا ہے:

> ''اقبال پر اس نئے زاویے اور نئے اپروچ کے ساتھ کام کرنے والوں میں ڈاکٹر سلیم اختر کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں اس وقت بعض ادیب اور نقاد ایسے ہیں جو اگرچہ متنوع موضوعات پر کام کر رہے ہیں لیکن ان کے بارے میں یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ انہوں نے اقبالیات ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا

۱۔ اقبال کا نظریۂ اخلاق، ص ۱۹۹

۲۔ اقبال ایک مطالعہ، ص ۷

ہے۔سلیم اختر کا شمار انہی ادیبوں میں ہے۔'' [۱]

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے دیباچہ میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ:

''اقبالیات پر سلیم اختر کا کام ہر اعتبار سے ایک نئے انداز فکر کا حامل ہے۔یہ کام سلیم اختر کے اپنے شعوری تجربے کا نتیجہ ہے۔'' [۲]

یہ اعتراف کس قدر اہم ہے کہ ایک نقاد دوسرے نقاد کو خراج تحسین پیش کرے اور دونوں اقبالیات کے ماہر ہیں۔جگن ناتھ اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فکر اقبال کی مکمل تصویر اس وقت تک ہمارے سامنے نہیں آسکتی جب تک ہم اس خود ساختہ محدود دائرے سے باہر نہیں آتے۔اس سلسلے میں یہ عرض کروں گا کہ فکر اقبال کے مکمل تجزیے کے لئے ہمیں اور دور جانا پڑے گا۔اقبال ایک وسیع النظر عالم اور فلسفی تھے اور انہوں نے تحصیل علم کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پر عمل کیا: ''اطلبو العلم ولو کان بالصین۔'' '' [۳]

جگن ناتھ کی یہ عقیدت اقبال کے ساتھ اعتراف کی ایک شکل ہے۔یہاں مذہبی اعتبار سے اقبال کا اعتراف نہیں کیا گیا بلکہ بشری تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے خود کو ایک اچھا انسان ثابت کیا ہے اسی لئے اقبال اور اسلام کا کہنا اپنی جگہ درست ہے کہ مذہب اسلام میں رنگ ونسل، ذات پات کا کوئی رجحان نہیں۔صرف اور صرف ''انسان۔'' اللہ تعالیٰ بھی انسان سے مخاطب ہے۔

سید سلیمان ندوی اور اقبال کے مابین جو خط وکتابت تھی ان تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال ان کا کس قدر احترام کیا کرتے تھے۔علامہ شبلی کے بعد انہیں ''استاذ الکل'' سمجھتے تھے۔''رموز بے خودی'' پر جو ریویو سلیمان ندوی نے ''معارف'' میں شائع کرایا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اعتراضات کو اخلاقی اسلوب دے کر موافقت کا طرز اپنایا ہے۔تنقیدی نقطۂ نگاہ سے بھی یہ ایک دستاویز سے کم نہیں۔''اسرار خودی'' کو سید سلیمان ندوی نے جو قبولیت کا درجہ دیا ہے یقیناً وہ سند سے کم نہیں:

''محمد علی کی زبان سے اس کے متعدد ابواب سننے کا موقع ملا۔انہوں نے اس ذوق اور وجد کے ساتھ اس کے اشعار سنائے کہ میں سراپا اثر ہوگیا۔شاعر نے جو کچھ کہا تھا اس کو ایک بہتر مفسر کی زبان سے سن کر خود بخود اس کے اسرار وحکم کے عقدے وا ہونے لگے۔'' [۴]

سید سلیمان ندوی نے ''رموز بے خودی'' پر جو تنقید کی وہ غیر جانبداری کا ایک کھلا ثبوت ہے۔ان کی تحریر میں وہ حلاوت ہے، جیسے وہ جراح کی حیثیت سے زخم کو کرید کر صاف کرتے ہیں اور پھر مرہم رکھ دیتے ہیں جس سے تکلیف زائل ہو جاتی ہے، اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''زبان کے لحاظ سے میں ڈاکٹر اقبال کو ان شعراء میں گنتا ہوں جو معنوی محاسن

۱۔ اقبال اور ہمارے فکری رویے، ص ۱۴

۲۔ اقبال اور ہمارے فکری رویے، ص ۱۴

۳۔ اقبال اور مغربی مفکرین، ص ۸

۴۔ اقبال اور مغربی مفکرین، ص ۳۵۱

اور باطنی خوبیوں کے مقابلے میں الفاظ اور محاوروں کی ظاہری صحت کی پروانہیں
کرتے، لیکن حق یہ ہے کہ اس لغزش مستانہ پر ہزاروں سنجیدہ اور متعین رفتاریں قربان
ہیں۔'' [۱]

مغرب و مشرق کے تقابلی جائزے سے بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ اقبال شناسی کے رجحان میں جس تیزی سے اضافہ ہورہا ہے، وہ دراصل اقبال کے نئے گوشوں کی دریافت ہے۔ دو زبانوں میں ان کی شاعری نے جو انقلاب اور تحرک پیدا کیا، اس کی وضاحت میں صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اردو شاعری برصغیر کے لئے مخصوص ہوکر رہ گئی جبکہ فارسی شعراء میں نظیریؔ، صائبؔ، قاآنیؔ، بیدلؔ، سعدیؔ شیرازی، عرفیؔ، انوریؔ، حافظؔ صف اول میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان شعراء کی صف میں اقبالؔ کو جگہ مل جانا کس قدر خوش آئند بات ہے۔ یہی وہ شاعری کا اعجاز ہے کہ اقبال شہرت کے اس بلند اور اعلیٰ مقام پر پہنچ گئے جو دیگر شعراء برسوں کی ریاضت کے بعد حاصل کرتے ہیں۔ اقبال کی مقبولیت میں عجز و انکسار اور بذلہ سنجی کا زیادہ ہاتھ ہے اسی وجہ سے اقبال کی علمی اور ذہنی استعداد کے پیش نظر ایران کے شعراء نے ان پر عقیدت کے پھول برسائے۔ ان کی یہ عقیدت شعری پیکروں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ترکی کا مشہور زمانہ شاعر ''عاکف''، جس نے اقبال کے کلام کو ترکی میں ترجمہ کرکے نہایت اہم خدمت انجام دی ہے، اس کے علاوہ ڈاکٹر عبدالقادر قرہ خان، ڈاکٹر تارلان، ان کا تعلق بھی ترکی سے ہے اور اقبال شناسی میں خاصا کام کیا ہے، لیکن ایک نام ایسا بھی ہے جو ڈاکٹر عبدالوہاب عزام کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے اقبال کے کلام کو عربی میں تراجم کی صورت میں پیش کیا لیکن پروفیسر حسن الاعظمی نے اقبال کی نگارشات اور افکار کو عربی میں مکمل طور پر ترجمہ کرکے منتقل کیا۔ دیگر ممالک میں بھی اقبال کے افکار پر نہایت تیزی سے تحقیقی اور تراجم پر کام ہورہا ہے۔ یہ بھی اقبال کے ''قبول'' کی ایک صورت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

پروفیسر سلیم اختر کا کہنا ہے کہ:

''ان چند اہم ممالک میں اقبال شناسی کی روایت کے اس تذکرہ کا یہ مطلب
نہیں کہ اقبال صرف ان ہی ممالک میں معروف ہیں بلکہ یہ کہنے میں مبالغہ نہ ہوگا کہ
آج کی تمام مہذب دنیا اقبال کے نام اور افکار سے واقفیت رکھتی ہے۔'' [۲]

اقبال شناسی میں سلیم اختر کی کتاب ''اقبال اور ہمارے فکری رویے'' اور ''اقبال ممدوح عالم'' نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کتابوں میں ملکی اور بین الاقوامی محققین، مترجمین اور اقبال سے محبت کرنے والے دنیا کے ہر خطے میں ملیں گے۔ یہ تو اقبال کے معروف ہونے کا ایک رخ ہے اور دوسرا رخ یہ کہ ان کے فقر نے انہیں بادشاہ بنادیا اور وہ بھی اقلیم سخن کا بادشاہ۔ انہیں اپنے فقر پر فخر ہے۔ ان کے اشعار سے ان کی عملی زندگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اقبال نے فردا کے آئینے میں اپنے بارے میں پیشن گوئی ایک شعر میں کچھ اس طرح کی تھی ؎

اگر مقصود کل میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے
مرے ہنگامہ ہائے نو بہ نو کی انتہا کیا ہے

دوسرا شعر ملاحظہ کیجئے جو اسی کیفیت کا حامل ہے ؎

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتداء کیا ہے ۔۔۔ کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

۱۔ اقبال اور مغربی مفکرین، ص ۳۵۱

۲۔ اقبال اور ہمارے فکری روّیے، ص ۱۹۴

علامہ اقبال کے اعترافات میں جن شعراء نے خراج تحسین عقیدت اور احترام کے ساتھ پیش کیا ہے اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال شاعری کے افق پر آفتاب اور ماہ تاب بن کر ابھرے ہیں۔ ان کا یہ غلبہ اس بات کی نشاندہی بھی کرتا ہے کہ انہوں نے شاعری کے کینوس کو اپنے طبعی میلان اور جودت طبع سے شاعری کے مزاج کو بدلنے کے ساتھ ساتھ اسلامی نظریات اور فلسفہ کو تجزیاتی نقطۂ نگاہ سے واضح کیا ہے۔ اپنے پیغام میں اسلامی روایات کو پیش نظر رکھا۔ مسلمانوں کے دلوں کو اپنی شاعری اور پیغام سے گرمانا شروع کیا اور اس سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنے میں اپنی تمام تر صلاحیت اور انتھک محنت سے اس قوم کے وقار میں اضافہ کیا۔ گو کہ اس کام میں اقبال کو مخالفتوں کا بھی سامنا رہا لیکن انہوں نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ وقت کے ساتھ ساتھ مخالفین کا زور بھی ٹوٹنا شروع ہوا۔ مخالفین نے بھی اقبال کی تائید میں منجملہ حیثیات سے بلکہ کھلے دل سے ان کی شاعری اور نظریات کا استقبال کیا۔ ادیب سہیل کی نظم ''وہ ماضی، حال، مستقبل'' عقیدت اور خلوص کا اعلیٰ نمونہ ہے ؎

حقیقت ہے
وہ دیدہ ور تھا، شاعر تھا، مفکر تھا
وہ دیدہ ور ہے، شاعر ہے، مفکر ہے
کئی دھاروں کا سنگم ہے
کئی رنگوں کا منبع ہے
ہر اک آئندہ ماہ و سال کے آنگن میں برگد ہے
جہاں ہر ذہن میں ادراک کی کونپل جنم لے گی
جہاں ہر نسل کو احساس کی خوشبو بہم ہوگی
وہ آئینہ در آئینہ
وہ ماضی، حال، مستقبل
اسے جس دور کے سر پر سجا دیں
ایک طرہ ہے
وہ نباض زمانہ ہے
وہ لمحوں کا پیمبر
مرتبے میں ایک سورج ہے!

(وہ ماضی، حال، مستقبل) [۱]

اس میں کسی شک کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ اقبال بہ اعتبار زمانہ اس انداز سے چھائے ہوئے ہیں کہ کوئی بھی ان کے افکار عالیہ اور شعری خوشبو سے محروم نہیں رہ سکتا۔ اقبال کی شاعری اور فکر کی روشنی میں نئے نئے زاویے اور نئے موضوعات ہنوز دریافت ہوں گے۔ ان کی شاعری کے تمام رنگ اپنی جگہ اتنے گہرے اور خوشنما ہیں کہ آنکھوں کو خیرہ اور ذہن کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں ؎

کیا طائر خیال تھا وہ مرد حق شناس
پیدا دلوں میں جذبۂ ایثار کر گیا

۱۔ افکار۔ نذر اقبال، ص ۵۰

نغمہ خودی کا چھیڑ کے اقبال دوستو
سوئے ہوئے شعور کو بیدار کر گیا

(مرد حق شناس) [1]

''مثنوی اسرارِ خودی'' اقبال کا وہ کارنامہ ہے جس میں قوم کے لئے پیغام ہی پیغام ہے کیونکہ مسلمان عملی طور پر ناکارہ ہو چکے تھے اس لئے ترقی کا راز صرف اور صرف اقبال کے نزدیک قوت عمل ہے اور یہ احساس خودی سے پیدا ہوتا ہے۔ اقبال قوت عمل کو اسلامی شریعت اور قانون الٰہی کے تحت دیکھنا چاہتے ہیں ۔

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

اقبال کے اعتراف میں شعراء نے اقبال ہی کے مصرعہ کو طرح بنا کر طبع آزمائی کی۔ یہ بھی اقبال کی مقبولیت کا ایک اظہار ہے۔ شیر افضل جعفری کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے: ''بڑا بے ادب ہوں، سزا چاہتا ہوں'' ۔

پتنگوں کے، بلبل کے، شمعوں کے، گل کے
فسانے کا عنواں ہوا چاہتا ہوں
دھواں دھار میں ڈال کر آج ناؤ
خضرؑ پیر کا آسرا چاہتا ہوں
اچھلتی، مچلتی، ابلتی ندی میں
غزل چھیڑ کر جھومنا چاہتا ہوں
اجل سے کہو جل پری بن کے آئے
کہ میں اس کا منہ چومنا چاہتا ہوں

(شیر افضل جعفری) [2]

اسی زمین میں محشرؔ بدایونی نے بھی چند شعر کہے ہیں۔ اگر بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو ان اشعار میں عقیدت و تحسین کے ساتھ ایک ایسا اعتراف بھی پنہاں ہے جسے شعراء نے ظاہر و باطن قبول کیا ہے۔ اقبال کی عظمت کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی نظریہ کے محرک رخ کو اپناتے ہوئے لوگوں کے ذہن بیدار ہی نہیں کئے بلکہ فکری اجتہاد سے اک نئی شمع روشن کی ۔

اسی لو پہ ضرب ہوا چاہتا ہوں
میں اپنی سکت جاننا چاہتا ہوں
کوئی چاہے طول سفر یا نہ چاہے
مگر میں تو بے انتہا چاہتا ہوں
یہ جذبہ بھی اب میرا شب کو گراں ہے
جگانا نہیں، جاگنا چاہتا ہوں

۱۔ افکار۔ نذرِ اقبال، ص ۵۸

۲۔ افکار۔ نذرِ اقبال، ص ۱۳۱

طلب میری کچھ بھی نہیں اور محشر
فقط راہ اپنی جدا چاہتا ہوں

(محشر بدایونی) [۱]

محسن بھوپالی کے چند شعر ملاحظہ کیجیے: ''لرزتا ہوں آواز اذاں سے''

ابھی زخم ہنر مہکا نہیں ہے
ابھی گزرے نہیں ہیں کرب جاں سے
ہے محسنؔ پھر وہی گرد مسافت
بہت نادم ہیں سعی رائیگاں سے

(محسن بھوپالی) [۲]

سید انوار ظہوری نے ''اقبال-درویش فقر مست'' کے عنوان سے جو نظم کہی ہے، اس میں درویش خدا مست کے اوصاف دکھائے ہیں ؂

تھا جو سر شت، حریت فکر کا رسول
اس مرد آگہی کو غلامی نہ تھی قبول
فطرت کو قید کر نہ سکے مغربی اصول

(سید انوار ظہوری) [۳]

احمد رئیس کی نظم ''پیام اقبال'' میں افکار اقبال کی جھلک دیکھیے ؂

جہاں میں آیا
وہ اسم اعظم کا نور لے کر
اٹھائے پرچم
خدائے عالم
بزرگ و برتر کی عظمتوں کا
وہ رب کعبہ کی رفعتوں کا
بصیرتوں کا-بصارتوں کا
پیامبر تھا
وہ ارض مشرق کا مرد دانا
وہ مرد اول
کہ جس نے پہلے پہل

۱- افکار-نذر اقبال، ص۱۳۲

۲- افکار-نذر اقبال، ص۱۳۴

۳- افکار-نذر اقبال، ص۱۵۱

اداس وملول انساں کو پیار بخشا
یقیں، عمل، اتحاد کی روشنی عطا کی
سسکتی مخلوق کو زباں دی
اور اپنے خالق سے
گفتگو کا شعور بخشا
وہ بولتا تھا
تو اس کے لفظوں کے چاند
دھرتی اجالتے تھے
وہ سوچتا تھا تو سینکڑوں عہد
اس کے سینے میں جاگتے تھے

(پیام اقبال) [1]

ماہ طلعت کی نظم ''تاریک راتوں کا چاند'' ملاحظہ کیجئے، جس میں خراج تحسین کے ساتھ اعتراف اقبال بھی ہے ؎

اسے محبت جوان آنکھوں سے تھی،
کہ ان میں جدائی کی شب کو صبح کرنے کا حوصلہ ہے
وہ راز داں تھا جواں دلوں کا
کہ ان کی دھڑکن میں منزلوں کا نشاں چھپا ہے
جوان ذہنوں کا وہ محب تھا،
کہ ان کی مٹی سے پھوٹتے ہیں
وہ معجزہ ہائے فن، کہ جن کو
ہمیشگی کی دعا ملی ہے
وہ جاگتا تھا طویل راتوں میں
اجلے اجلے دنوں کی خاطر
وہ اپنے اشکوں سے شعر بنتا
وہ اپنے غم سے کشید کرتا، شراب عرفاں
تمام آئندگاں کی خاطر

(تاریک راتوں کا چاند) [2]

افتخار فخر کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے جو عقیدت میں کہے گئے ہیں ؎

کیسے میں تری فکر کی تصویر بناؤں کیا سامنے سورج کے چراغ اپنا جلاؤں

۱- افکار-نذر اقبال، ص ۵۲

۲- افکار-نذر اقبال، ص ۵۴

الفاظ میں کس طرح سے معنی کو سماؤں ۔۔۔ کس طرح ترے لہجے کی جھنکار سناؤں
سو رنگ ہیں کیا رنگ ترا سامنے لاؤں ۔۔۔ تو خود میں زمانہ تھا زمانے کو بتاؤں

(قطرہ اور سمندر) [۱]

اقبال کی شخصیت اور کلام سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جن حضرات نے جس بنیاد پر بھی انہیں رد کیا ہے، وہ تحریریں اور اعتراضات اہمیت کی حامل نہیں- البتہ اعتراف اور قبول میں جو اکثریت ہمیں ملتی ہے وہ غیر متعصب اور غیر جانبدار حضرات ہیں- جن حضرات نے اقبال کے افکار اور کلام کو بہ احسن قبول کیا ہے، وہ بین الاقوامی سطح پر ہے کیونکہ غیر ملکی زبانوں میں کلام اقبال کے تراجم، تقاریر، مقالات اور کتب ثبوت کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں- اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایت کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر رقمطراز ہیں:

> ''اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایت کے پیش نظر کلام اقبال میں آفاقیت کا مسئلہ اپنے حل کے لئے کسی نظریاتی بحث سے ہٹ کر اب عملی صداقت کا روپ دھار چکا ہے-'' [۲]

خرم سلیم نے اپنے خیالات ''اقبال کے حضور'' نظم کی صورت میں ادا کئے ہیں ؎

ادب کے گلشن کی آبیاری میں، اس کا حصہ تو ہے نمایاں
''عقاب''، ''شاہین'' کا تخیل ہے سنگ میل کی اک نئی جہت کا
وہ فلسفی اور قومی شاعر،
کہ جس کی سوچوں، مشاہدوں سے
ہماری قسمت بدل گئی ہے
یہ زندگی بھی سنبھل گئی ہے
''خودی'' کے سانچے میں ڈھل گئی ہے

(اقبال کے حضور) [۳]

قومی اور بین الاقوامی لحاظ سے اقبال شناسی میں جو اضافہ ہوا ہے، اس سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اقبال کے افکار و خیالات نے مسلم اور غیر مسلم دونوں کو متاثر کیا ہے- اس اعتراف میں مغربی جرمنی کی ایک اہم شخصیت این میری شمل ہیں جنہوں نے ''جاوید نامہ'' کا ترکی زبان میں منظوم ترجمہ کر کے اقبال شناسی کا جو ثبوت فراہم کیا ہے، وہ اپنی جگہ مسلم ہے- مغرب میں یوں تو ڈکنسن اور فاسٹر کا نام بھی اقبال کے عقیدتمندوں میں لیا جاتا ہے، لیکن ہربرٹ ریڈ نے اقبال کے بارے میں جو تنقیدی معیار قائم کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک نفسیاتی نقاد تھا جس نے اقبال کے مذہبی رجحانات کو تصوف کے آئینے میں دیکھا- عظمت اقبال کا یہ اعتراف یقیناً قابل توجہ ہے- مراکش کے پروفیسر ایس آئی فہد نے اقبال کو مشرق و مغرب کا انسانی علمبردار کہا ہے:

> ''اقبال ایک ہمہ گیر شہری ہیں، آپ کی ہمدردیاں اتنی وسیع ہیں کہ ان میں تمام

۱- افکار- نذر اقبال، ص ۵۸

۲- اقبال اور ہمارے فکری روّیے، ص ۱۴۸

۳- افکار- نذر اقبال، ص ۵۶

دنیا کے انسان بلا امتیاز نسل و ملک سما جاتے ہیں- آپ عظمت انسانی کے علمبردار ہیں اس لئے اقبال کو مشرق و مغرب میں یکجا عزت حاصل ہے-'' [۱]

اقبال کی شاعری میں یہی وہ نکتہ کارفرما ہے جسے خود اقبال نے محسوس کر کے برصغیر کے ان شعراء سے علیحدگی اختیار کی اور روایتی شاعری سے گریز کرتے ہوئے اپنے فکر کی بنیاد آفاقیت پر رکھی اور ''انسان'' کو موضوع شاعری بنا کر ''خودی'' کا ادراک عطا کیا اور یہ ادراک جو فکری ماخذ ہے خالصتاً قرآن مجید سے ہے-

ایران میں اقبال پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے، اسے اعتراف کی ایک صورت ہی کہا جا سکتا ہے- ایران کے جہاں نامور شاعر اپنی مخصوص جگہ بنانے میں کامیاب ہو چکے ہوں، وہاں برصغیر کے کسی شاعر کا جگہ بنانا نہایت مشکل کام تھا- یہ اقبال ہی تھے جنہوں نے اپنے نظریات کو آفاقیت کا جامہ پہنایا اور تمام عالم کو اپنی شاعری سے متاثر ہی نہیں کیا بلکہ اپنی طرف توجہ مبذول کرائی- اقبال کی شہرت میں دراصل رسائل و جرائد نے بھی خاصا کردار ادا کیا ہے- ان رسائل میں ''نقوش''، ''نیرنگ خیال''، ''ماہ نو''، ''نگار''، ''معارف''، ''اقبال ریویو''، ''صحیفہ''، ''رسالہ اردو''، ''رسالہ فکر و نظر''، ''ماہنامہ سب رس''، برصغیر کے معتبر رسائل جنہوں نے اقبال نمبر نکال کر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اقبال حقیقتاً ایک عظیم شاعر ہے- ان رسائل میں لکھنے والے حضرات از خود اپنی ذات میں ایک انجمن کی حیثیت رکھتے ہیں- یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے جس فراخدلی سے اقبال کے کام کو اور ان کی شاعری کو سراہا ہے، دراصل یہ ان لکھنے والوں کی دیانت پر دال ہے-

اگر ہم ایران کے صرف اس مجلّہ کا یہاں ذکر کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ایران میں اقبال شناسی اور اقبال پر غور و فکر کے دروازے وا ہونے شروع ہوئے تو کچھ بے جا نہ ہوگا- ایران کا وہ پہلا مجلّہ ''محیط''، سید محیط طباطبائی نے اپنی ادارت میں ۱۹۴۵ء میں اقبال نمبر نکالا- اس کے علاوہ ایرانی شعراء نے منظوم پیرائے میں اقبال کی عظمت اور عقیدت کا جو اعتراف کیا ہے- بہر کیف اقبال کے ابھی بہت سے گوشے ایسے ہیں جو دریافت ہونا باقی ہیں-

عالمی ادب میں اقبال نے اپنا جو مقام بنایا ہے اس کی خاص وجہ افکار و خیالات کا ہمہ گیر تاثر ہے جو اردو نظم پر اثرات کی صورت میں مرتب ہوئے ہیں- اقبال نے صرف اردو شعراء ہی کو متاثر نہیں کیا ہے بلکہ دنیا کے ہر خطے میں اقبال شناس موجود ہیں- ان کی مقبولیت میں طبعی میلان کا بھی حصہ ہے- یوں تو اقبال کا کلام دیگر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے- اقبال منجملہ حیثیت سے ایک ایسی نابغۂ روزگار شخصیت بن گئی ہے- نہ جانے کتنے لوگوں کو اقبال نے محقق بنا دیا- اقبالیات پر کام کرنے والے اہم نام جو ادب میں ستون کی حیثیت رکھتے ہیں، اپنے تلامذوں کی مدد سے گراں قدر اضافہ کیا ہے- پروفیسر وقار عظیم، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر سلیم اختر وغیرہ نے اپنی نگرانی میں اور از خود بے شمار مقالے تحریر کئے اور جامعات کی سطح پر ایم- اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے تحریر کروائے- تحقیقی کام کی روشنی میں اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کا اعتراف آئندہ بھی ہوتا رہے گا:

''اقبال اب محض ایک ایسا علمی موضوع نہیں رہ گیا ہے جس کو ہمارے عالم جذبات اور دنیائے عمل سے کوئی سروکار نہ ہو بلکہ وہ بڑی حد تک دنیا کی ایک عظیم انسانی آبادی کے مقدر پر اثر انداز ہو چکا ہے اور یہ اثر روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ اب اس کے دائرۂ اثر سے بظاہر، یورپ اور امریکہ کے حکماء بھی دلچسپی اور

۱- اقبال اور ہمارے فکری رویے، ص ۱۴۶

تشویش کے ساتھ اس پر غور کرنے لگے ہیں۔" [1]

جس طرح یورپ کے نامور شعراء نے اپنا ایک منفرد مقام بنایا ہے جس میں شیلے، کیٹس، نطشے، برگساں، ڈیکارٹ، کروچے، گوئٹے، ملٹن وغیرہ نے اپنی شاعری سے متاثر کیا ہے، وہاں اقبال کی شاعری کا پایہ ان شعراء سے کسی بھی لحاظ سے کم نہیں ہے۔

۱۔ تفہیم اقبال، ص ۱۱۰

کتابیات

۱- آغا، وزیر، ڈاکٹر نظم جدید کی کروٹیں، ادارہ ادبی دنیا، لاہور

۲- آغا، وزیر، ڈاکٹر اردو شاعری کا مزاج، مکتبۂ عالیہ، لاہور ۱۹۷۸ء

۳- آزاد، جگن ناتھ اقبال اور اس کا عہد، الادب، لاہور ۱۹۷۷ء

۴- آزاد، جگن، ناتھ اقبال اور مغربی مفکرین، مکتبۂ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۷ء

۵- اقبال، محمد، ڈاکٹر بانگ درا، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۲۴ء

۶- احمد، ساحل اقبال اور غزل، سفینۂ ادب، لاہور، ۱۹۸۶ء

۷- اختر، سلیم، ڈاکٹر اقبال شعاع صد رنگ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۸ء

۸- اقبال، محمد، ڈاکٹر کلیات اقبال، فضلی اینڈ سنز، کراچی ۱۹۹۹ء

۹- اکبرآبادی، سیماب کار امروز، قصر الادب، آگرہ ۱۹۳۴ء

۱۰- امجد، ساجد، ڈاکٹر اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، غضنفر اکیڈمی، کراچی ۱۹۸۹ء

۱۱- اعظمی، کیفی آخر شب، مکتبۂ دانیال، کراچی ۱۹۷۷ء

۱۲- اعظمی، کیفی آوارہ سجدے، مکتبۂ دانیال، کراچ ۱۹۷۷ء

۱۳- اورینوی، اختر اقبال، رام نرائن لال پبلسیلر الہ آباد ۱۹۴۲ء

۱۴- اختر الایمان سر و ساماں، رخشندہ کتاب گھر، بمبئی ۱۹۸۳ء

۱۵- اختر جان نثار کلیات جاں نثار اختر، المسلم پبلشرز، کراچی ۱۹۸۲ء

۱۶- انصاری، اسلوب احمد اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں، غالب اکیڈمی، نئی دہلی ۱۹۹۴ء

۱۷- انصاری، اسلم اقبال عہد آفریں، کاروان ادب، ملتان ۱۹۸۷ء

۱۸- اریب، اسد، ڈاکٹر بچوں کا ادب تاریخ و تنقید، کاروان ادب، ملتان ۱۹۸۲ء

۱۹- افادی، مہدی انتخاب افادات مہدی، اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی ۱۹۶۰ء

۲۰- اشفاق، رفیع الدین سید اردو میں نعتیہ شاعری، اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی ۱۹۷۶ء

۲۱- اقبال، محمد، ڈاکٹر مثنوی، اسرار و رموز، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۴۰ء

۲۲- اختر سلیم، ڈاکٹر اقبال اور ہمارے فکری رویے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۵ء

۲۳- احمد، فروغ، پروفیسر تفہیم اقبال، اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی ۱۹۸۵ء

۲۴- اقبال، محمد، ڈاکٹر فلسفۂ عجم، نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۸۴ء

۲۵- اقبال، محمد، ڈاکٹر ضرب کلیم، طبع سوم، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۴۴ء

۲۶- اقبال، محمد، ڈاکٹر بال جبریل، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۳۵ء

۲۷- اقبال، محمد، ڈاکٹر ارمغان حجاز، شیخ مبارک علی تاجر کتب، لاہور ۱۹۳۸ء

۲۸- برنی، محمد، الیاس مناظر قدرت، علی گڑھ ۱۹۲۵ء

۲۹- بخش، داتا گنج کشف المحجوب، مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی ۱۹۷۷ء

۳۰- بجنوری، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، محاسن کلام غالب، فخری پرنٹنگ پریس، کراچی ۱۹۶۹ء

۳۱- تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، تیرھویں جلد، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۷۱ء

۳۲- تبسم، کاشمیری، ڈاکٹر نئے شعری تجزیے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۷۸ء

۳۳- تبسم، کاشمیری، ڈاکٹر جدید اردو شاعری میں علامت نگاری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۷۵ء

۳۴- تبسم، صوفی غلام مصطفیٰ انجمن، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور ۱۹۶۱ء

۳۵- تونسوی، طاہر اقبال اور مشاہیر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۷۸ء

۳۶- تاثیر، دین محمد آتشکدہ، انشاء پریس

۳۷- جاوید، اقبال، ڈاکٹر زندہ رود، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۸۹ء

۳۸- جالبی، جمیل، ڈاکٹر تاریخ ادب اردو، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۸۴ء

۳۹- جعفری، علی سردار ترقی پسند ادب، مکتبۂ پاکستان، لاہور ۱۹۵۶ء

۴۰- جعفری، علی سردار نئی دنیا کو سلام اور جمہور، کتب پبلیشرز لمیٹڈ، بمبئی ۱۹۴۷ء

۴۱- جعفری، علی سردار پتھر کی دیوار، مکتبۂ شاہراہ، دہلی ۱۹۵۳ء

۴۲- جبلپوری، ظریف تلافی مافات، کاشانۂ اردو، کراچی ۱۹۶۱ء

۴۳- جاوید، یونس حلقۂ ارباب ذوق، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۸۴ء

۴۴- جالبی، جمیل، ڈاکٹر کلیات میراجی، اردو مرکز، لندن ۱۹۸۸ء

۴۵- جالبی، جمیل، ڈاکٹر ن-م-راشد، ایک مطالعہ مکتبۂ اسلوب، کراچی ۱۹۸۶ء

۴۶- جالبی، جمیل، ڈاکٹر میراجی ایک مطالعہ سنگ میل پبلیشرز، لاہور ۱۹۹۰ء

۴۷- جالندھری، حفیظ، ابوالاثر شاہنامۂ اسلام (حصہ اول)، نیوتاج آفس پوسٹ دہلی

۴۸- جائسی، کبیراحمد ایرانی تصوف، ادارۂ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۱۹۹۳ء

۴۹- جمعہ، محمد لطفی، تاریخ فلاسفہ الاسلام، مسعود پبلشنگ ہاؤس، کراچی ۱۹۶۴ء

۵۰- جلالپوری، علی عباس اقبال کاعلم کلام، تخلیقات، لاہور ۱۹۹۹ء

۵۱- چکبست، برج، نرائن پنڈت، کلیات چکبست، ساکار پبلشرز، بمبئی ۱۹۸۱ء

۵۲- حالی، الطاف حسین مقدمہ شعروشاعری، لالہ رام نرائن لال، بکسیلر الہ آباد ۱۹۳۱ء

۵۳- حسین، سید اعجاز، ڈاکٹر مختصر تاریخ ادب اردو، اردو اکیڈمی، سندھ ۱۹۷۱ء

۵۴- حسین، الطاف حسین مسدس حالی، تاج کمپنی، کراچی

۵۵- حالی، الطاف حسین دیوان حالی، کتب خانہ علم وادب، دہلی ۱۹۴۵ء

۵۶- خاں، ظفرعلی، مولانا نگارستان، مکتبۂ کارواں، کچہری روڈ، لاہور ۱۹۶۳ء

۵۷- خاں، ظفرعلی، مولانا خیالاستان، مکتبۂ کارواں، کچہری روڈ، لاہور

۵۸- خان، عظمت اللہ سریلے بول، اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی ۱۹۵۹ء

۵۹- خان، یوسف حسین، ڈاکٹر، فرانسیسی ادب، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۶۲ء

۶۰- خان، یوسف حسین، ڈاکٹر، روح اقبال، آئینہ ادب، لاہور ۱۹۷۷ء

۶۱- خالد، عبدالعزیز حدیث خواب، ماوراء پبلشرز، راولپنڈی ۱۹۷۴ء

۶۲- خالد، تصدق حسین، ڈاکٹر، سرودنو، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۰ء

۶۳- خان، احمد رضا مولانا حدائق بخشش، مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی

۶۴- خان، محمد نیاز الدین خان، مکاتیب اقبال، بزم اقبال، کلب روڈ، لاہور ۱۹۵۴ء

۶۵- دانش، احسان نفیر فطرت، مکتبۂ دانش فرنگ، لاہور

۶۶- دہلوی، اختر انصاری، پروفیسر، حالی اور نیا تنقیدی شعور، اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی ۱۹۶۱ء

۶۷- دانش، احسان چراغاں، مکتبۂ دانش فرنگ، لاہور ۱۹۴۴ء

۶۸- درانی، عطش اسلامی فکر وثقافت، مکتبۂ عالیہ، لاہور ۱۹۸۰ء

۶۹- ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، اقبال ایک مطالعہ، اقبال اکادمی، پاکستان ۱۹۸۷ء

۷۰- ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۸ء

۷۱- ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، اکبر اور اقبال، حبیب پرنٹر، لاہور ۱۹۷۷ء

۷۲- رضوی، وقار احمد، ڈاکٹر تاریخ جدید اردو غزل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور

۷۳- رضوی، حسن اقبال کے فکری آئینے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۰ء

۷۴- راشد، ن-م ماوراء، مکتبۂ اردو، لاہور

۷۵- راشد-ن-م ایران میں اجنبی، المثال نیپئر روڈ، لاہور ۱۹۶۹ء

۷۶- رضوی، سید شفقت مکاتیب سر محمد اقبال، ادارۂ تحقیقات افکار و تحریکات، کراچی ۱۹۹۲ء

۷۷- راشد، سعید، پروفیسر مکالمات اقبال، بک کارنر، پبلشرز، جہلم

۷۸- رئیس، قمر، ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۸۹ء

۷۹- زیدی، مصطفیٰ کلیات مصطفیٰ زیدی، ماورا پبلشرز، لاہور

۸۰- زور، محی الدین قادری، ڈاکٹر، دکنی ادب کی تاریخ، اردو اکیڈمی، سندھ ۱۹۶۰ء

۸۱- زیدی، اسرار عدم شخصیت فن، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۸۲ء

۸۲- زیدی، خوشحال، ڈاکٹر اردو میں بچوں کا ادب، اردو اکیڈمی، دہلی ۱۹۸۹ء

۸۳- سالک، عبدالمجید ذکر اقبال، بزم اقبال، کلب روڈ، لاہور ۱۹۵۵ء

۸۴- سالک، احسان الٰہی اقبال پر ۱۵ مقالات، عزیز پبلشرز، لاہور ۱۹۷۷ء

۸۵- سرہندی، مجدد الف ثانی مکتوبات امام ربانی، مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی ۱۹۷۱ء

۸۶- سکسینہ، رام بابو، ڈاکٹر تاریخ ادب اردو، علمی کتاب خانہ، لاہور ۱۹۸۱ء

۸۷- سروری، عبدالقادر جدید اردو شاعری، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۶۷ء

۸۸- سندیلوی، شجاعت علی، ڈاکٹر، تعارف تاریخ اردو، لکھنؤ ۱۹۶۳ء

۸۹- سید، جابر علی، پروفیسر اقبال کا فنی ارتقاء، بزم اقبال ۱۹۷۸ء

۹۰- سدید، انور، ڈاکٹر اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، پاکستان ۱۹۸۵ء

۹۱- سیفی، محمد اسلم حیات و کلیات اسماعیل، مکتبۂ عالیہ، لاہور ۱۹۳۹ء

۹۲- شیرانی، اختر، شہرود آئینۂ ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء

۹۳- شور، منظور حسین، پروفیسر، ذہن وضمیر، ای، آئی پبلیکیشنز، کراچی ۱۹۹۱ء
۹۴- شور، منظور حسین، پروفیسر، صلیب انقلاب، ای، آئی پبلیکیشنز، کراچی ۱۹۸۵ء
۹۵- شور، منظور حسین، پروفیسر، نبض دوراں، مکتبۂ افکار، کراچی ۱۹۵۹ء
۹۶- صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر، لکھنؤ کا دبستان شاعری، مکتبۂ علم وفن ٹیامحل، کراچی ۱۹۶۵ء
۹۷- صفیہ بانو، ڈاکٹر انجمن پنجاب تاریخ وخدمات، کفایت اکیڈمی، کراچی ۱۹۷۸ء
۹۸- صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر، آج کا اردو ادب، قمر کتاب گھر، کراچی ۱۹۸۲ء
۹۹- صدیقی، مختار منزل شب، سویرا آرٹ پریس، لاہور ۱۹۵۵ء
۱۰۰- صدیقی، ناز ساحر شخص اور شاعر، مکتبۂ اردو ادب، لاہور
۱۰۱- صدیقی، مظہر الدین اسلامی ثقافت اقبال کی نظر میں، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور
۱۰۲- ضامن، علی ضامن ساغر نظامی فن اور شخصیت، ساغر نظامی میموریل اکیڈمی، نئی دہلی ۱۹۸۵ء
۱۰۳- طارق، عبدالرحمٰن اشارات اقبال، کتاب منزل، لاہور ۱۹۵۱ء
۱۰۴- عتیق اللہ، ڈاکٹر آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظم، اردو اکادمی، دہلی ۱۹۹۰ء
۱۰۵- عبدالحکیم، خلیفہ، ڈاکٹر فکر اقبال، بزم اقبال، لاہور
۱۰۶- عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، کلام نیرنگ، مکتبہ اسلوب، کراچی ۱۹۸۳ء
۱۰۷- عبداللہ، سید، ڈاکٹر، چند نئے اور پرانے شاعر، اردو مرکز، لاہور ۱۹۶۵ء
۱۰۸- عبدالشکور دور جدید کے چند منتخب ہندو شعراء، کتاب خانہ دانش محل ۱۹۴۳ء
۱۰۹- عزیز احمد، آل احمد سرور انتخاب جدید، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۵۸ء
۱۱۰- عابد، علی عابد، سید شعر اقبال، بزم اقبال، لاہور ۱۹۵۹ء
۱۱۱- عزیز احمد اقبال نئی تشکیل، گلوب پبلشرز، لاہور ۱۹۶۸ء
۱۱۲- عظیم، سید وقار، پروفیسر، اقبال معاصرین کی نظر میں، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۷۳ء
۱۱۳- عبدالمتین، عارف امکانات، ٹیکنیکل پبلشرز، لاہور ۱۹۸۸ء
۱۱۴- عبادت، بریلوی، ڈاکٹر جدید شاعری، اردو دنیا، کراچی ۱۹۶۱ء
۱۱۵- عبدالمغنی، ڈاکٹر اقبال کا نظام فن، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور ۱۹۸۵ء
۱۱۶- عبادت، بریلوی، ڈاکٹر اقبال احوال وافکار، مکتبۂ عالیہ، لاہور ۱۹۷۷ء

۱۱۷- عابد علی عابد، سید اسلوب، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۷۱ء

۱۱۸- عبدالمغنی، ڈاکٹر اقبال اور عالمی ادب، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور ۱۹۹۰ء

۱۱۹- عدم، عبدالحمید رنگ و آہنگ، مقبول اکیڈمی، لاہور ۱۹۶۰ء

۱۲۰- عابد علی عابد، سید میں کبھی غزل نہ کہتا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۳ء

۱۲۱- عبداللہ، سید، ڈاکٹر مطالعہ اقبال کے چند نئے رخ، بزم اقبال، لاہور ۱۹۸۴ء

۱۲۲- عبدالحق، مولوی، ڈاکٹر، اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، انجمن پریس، کراچی ۱۹۷۷ء

۱۲۳- عطاء اللہ، شیخ اقبال نامہ، حصہ اول شیخ محمد اشرف تاجر کتب، لاہور

۱۲۴- فیض، احمد فیض دست صبا، مکتبۂ کارواں، کچہری روڈ، لاہور ۱۹۶۸ء

۱۲۵- فیض، احمد فیض زنداں نامہ، مکتبۂ کارواں، کچہری روڈ، لاہور ۱۹۵۶ء

۱۲۶- فیض، احمد فیض نقش فریادی، مکتبۂ کارواں، کچہری روڈ، لاہور

۱۲۷- فاروقی، محمد طاہر خیابان اقبال، یونیورسٹی بک ایجنسی، پشاور ۱۹۶۶ء

۱۲۸- فتح پوری، فرمان، ڈاکٹر اقبال سب کے لئے، اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی ۱۹۷۸ء

۱۲۹- فقیر، وحیدالدین، سید روزگار فقیر، اسلامی پبلشنگ کمپنی، لاہور ۱۹۵۰ء

۱۳۰- فاروق، ایس، ایم، عمر طواسین اقبال (جلد اول)، اقبال اکادمی، پاکستان، لاہور ۱۹۸۷ء

۱۳۱- قاسمی، احمد ندیم ندیم کی نظمیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۱ء

۱۳۲- قریشی، محمد عبداللہ روح مکاتیب اقبال، زریں آرٹ پریس، لاہور ۱۹۷۷ء

۱۳۳- قدیرالدین، جسٹس اسلام کی قوت محرکہ اور مسلمانوں کا ذہنی جمود، شیخ شوکت علی

۱۳۴- کیفی، حنیف، ڈاکٹر اردو میں نظم معریٰ اور آزاد نظم، الوقار پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۵ء

۱۳۵- کیانی، رحمٰن سیف و قلم، ایوان اردو تیموریہ، کراچی ۱۹۷۱ء

۱۳۶- کاظمی، روشن اختر، ڈاکٹر اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقاء، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۸۴ء

۱۳۷- کاروانی، آصف جاہ، ڈاکٹر، اقبال کا فلسفۂ خودی، اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی ۱۹۷۱ء

۱۳۸- گلاؤٹھوی، ناطق، مولانا، دیوان ناطق، مطبع انصاری آرٹس، مومن پورہ، ناگپور، ۱۹۷۶ء

۱۳۹- گورکھپوری، فراق روح کائنات، مکتبۂ اردو ادب، لاہور

۱۴۰- گورکھپوری، مجنوں نکات مجنوں، مکتبۂ عزم و عمل، کراچی ۱۹۶۶ء

۱۴۱- لدھیانوی ساحر، گاتا جائے بنجارہ، سنگ میل پبلشرز، لاہور

۱۴۲- لدھیانوی ساحر، تلخیاں، سنگ میل پبلشرز، لاہور ۱۹۵۹ء

۱۴۳- محمود شیرانی، حافظ، پنجاب میں اردو، کتاب نما، لاہور ۱۹۶۳ء

۱۴۴- محروم، تلوک چند، گنج معانی، میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز، لاہور ۱۹۳۲ء

۱۴۵- محمود الرحمٰن، جنگ آزادی کے اردو شعراء، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء

۱۴۶- محمد حسن، ڈاکٹر، ادبی تنقید، لکھنؤ ۱۹۵۴ء

۱۴۷- مائیکل ہارٹ، سو عظیم آدمی، تخلیقات، لاہور ۱۹۹۸ء

۱۴۸- محی الدین، مخدوم، مخدوم اور کلام مخدوم، مکتبۂ دانیال، کراچی ۱۹۷۲ء

۱۴۹- محی الدین، مخدوم، گل تر، مکتبۂ صبا، حیدرآباد، دکن ۱۹۶۱ء

۱۵۰- ملیح آبادی، جوش، عرش وفرش، ۱۹۴۴ء

۱۵۱- ملیح آبادی، جوش، شعلہ وشبنم، مکتبۂ جامعہ، دہلی ۱۹۳۶ء

۱۵۲- ملیح آبادی، جوش، سیف وسبو، نیا ادارۂ مکتبہ اردو، لاہور ۱۹۴۷ء

۱۵۳- مدنی، عزیز حامد، چشم نگراں، بیان پبلیکیشن، وکٹوریہ روڈ، کراچی ۱۹۶۲ء

۱۵۴- محمد حسن، ڈاکٹر، شناسا چہرے، غضنفر اکیڈمی، پاکستان، کراچی ۱۹۸۷ء

۱۵۵- معین الرحمٰن، سید ڈاکٹر، غالب اور انقلاب ستاون، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۷۴ء

۱۵۶- معینی، عبدالواحد سید، مقالات اقبال، شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری، لاہور ۱۹۶۳ء

۱۵۷- معینی، عبدالواحد سید، نقش اقبال، آئینۂ ادب، لاہور ۱۹۶۹ء

۱۵۸- معین، زہرا، عرفان اقبال، تخلیق مرکز شاہ عالم مارکیٹ، لاہور ۱۹۷۷ء

۱۵۹- محمد عثمان، پروفیسر، فکر اسلامی کی تشکیل نو، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۷ء

۱۶۰- مجاز، اسرار الحق، آہنگ، نیا ادارہ، لاہور ۱۹۴۳ء

۱۶۱- ندوی، عبدالسلام، ڈاکٹر، اقبال کامل، اعظم گڑھ، لاہور ۱۹۴۸ء

۱۶۲- نارنگ، گوپی چند، اقبال کا فن، ایجوکیشنل پبلشنگ بک ہاؤس، دہلی ۱۹۸۳ء

۱۶۳- ندوی، سید سلیمان، مولانا، حیات شبلی، مکتبۂ عالیہ، لاہور

۱۶۴- نقوی، منظر عباس، پروفیسر، اسلوبیاتی مطالعے، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۸۹ء

۱۶۵-نظر، قیوم — قلب ونظر کے سلسلے، — سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور — ۱۹۸۷ء

۱۶۶- ندوی، سید ابوالحسن علی، مولانا، — نقوش اقبال، — مجلس نشریات اسلام، کراچی — ۱۹۷۶ء

۱۶۷- نظیر اکبر آبادی — کلیات نظیر، — منشی نولکشور، کانپور — ۱۸۸۳ء

۱۶۸-نذیر، نیازی، سید — تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، — بزم اقبال، لاہور — ۱۹۵۷ء

۱۶۹- نعمانی، شبلی، علامہ — شعر العجم (جلد پنجم)، — مطبع معارف، اعظم گڑھ — ۱۹۲۱ء

۱۷۰- نعمانی، شبلی، علامہ — سیرۃ النبیؐ (جلد اول)، — ناشران قرآن لمیٹڈ — ۱۳۶۴ء

۱۷۱-نعمانی، شبلی، علامہ — کلیات شبلی، — معارف پریس، اعظم گڑھ — ۱۹۴۰ء

۱۷۲-نعمانی، شبلی، علامہ — المامون، — سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور — ۱۹۷۵ء

۱۷۳-ہمدانی، احمد — نئی شاعری کے ستون، — سیپ پبلی کیشنز، کراچی — ۲۰۰۰ء

۱۷۴-ہاشمی، رفیع الدین — اقبال کی طویل نظمیں، — گلوب پبلشرز، لاہور — ۱۹۷۰ء

۱۷۵-ہاشمی، رفیع الدین — خطوط اقبال، — مکتبۂ خیابان ادب، لاہور — ۱۹۷۶ء

۱۷۶-ہاشمی، نورالحسن، ڈاکٹر — دہلی کا دبستان شاعری، — انجمن ترقی دہلی — ۱۹۴۹ء

۱۷۷- یوسفی، خورشید احمد — پنجاب کے قدیم اردو شعراء، — مقتدرہ قومی زبان — ۱۹۹۲ء

رسائل

۱-	اقبال نمبر	رسالہ اردو،......انجمن اردو پاکستان	۱۹۳۸ء
۲-	پاکستان ٹائمز میگزین ستمبر		۱۹۸۱ء
۳-	اقبال ریویو	مجلہ اقبال اکادمی، پاکستان	۱۹۶۲ء
۴-	نگار	جنوری، فروری	۱۹۴۱ء
۵-	نگار	اگست	۱۹۶۷ء
۶-	افکار	دسمبر	۱۹۷۷ء
۷-	افکار	جوش نمبر......مکتبۂ افکار، کراچی	
۸-	ساقی	جوش نمبر...... کراچی	۱۹۶۳ء
۹-	ماہنامہ	طلوع افکار، شمارہ ۱-۲۲، کراچی	
۱۰-	نگار	نومبر، دسمبر	۱۹۷۷ء
۱۱-	صحیفہ	جنوری، مارچ......مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۸۵ء
۱۲-	سوغات	جدید نظم نمبر-۸-۷، منگھو پیر روڈ، کراچی	
۱۳-	ادبی دنیا	خاص نمبر ۱۱، شمارہ یازدہم	
۱۴-	ادبی دنیا	اشاعت خاص	۱۹۵۱ء
۱۵-	صحیفہ	ستمبر، دسمبر	۱۹۸۱ء
۱۶-	نقوش	شمارہ-۱۱۴، جولائی	۱۹۷۰ء
۱۷-	نگار	مارچ، اپریل	۱۹۶۹ء
۱۸-	صحیفہ	شمارہ-۵۴، جنوری	۱۹۷۱ء
۱۹-	شاعر	شمارہ-۲، فروری	۱۹۶۱ء
۲۰-	اوراق	شمارہ خاص-۲، جولائی	۱۹۶۸ء

۲۱-	نگار	سالنامہ،جدید شاعری نمبر، جولائی،اگست	۱۹۶۵ء
۲۲-	دلگداز	ستمبر	۱۹۸۹ء
۲۳-	ماہنامہ اسلوب	جولائی	۱۹۸۵ء
۲۴-	نگار	شمارہ-۴،جلد ۵۸،اکتوبر	۱۹۵۰ء
۲۵-	ہم قلم	شمارہ-۵،جلدا،جنوری	۱۹۶۱ء
۲۶-	صحیفہ	جنوری،مارچ	۱۹۸۹ء
۲۷-	فنون	شمارہ-۴،۵،فروری،مارچ	۱۹۶۶ء
۲۸-	نگار	سالنامہ،اکبرالہ آبادی نمبر	۱۹۶۹ء
۲۹-	افکار	حفیظ نمبر،کراچی	۱۹۶۳ء
۳۰-	نگار	شمارہ-۲	۱۹۷۰ء
۳۱-	افکار	نذراقبال،کراچی	
۳۲-	نیرنگ خیال	جنوری،فروری	۱۹۷۱ء
۳۳-	ادبی دنیا	خاص نمبر،شمارہ،ہفتم	
۳۴-	حالی نمبر	علامہ اقبال گورنمنٹ کالج،کراچی	
۳۵-	سیپ	کراچی	
۳۶-	جام نو	شمارہ خصوصی،کراچی	
۳۷-	نگار	سرسید نمبر،نومبر،دسمبر	۱۹۷۰ء
۳۸-	نقوش	اقبال نمبر(۲)،شمارہ-۱۲۳،دسمبر	۱۹۷۷ء
۳۹-	معارف	مئی	۱۹۳۸ء
۴۰-	ادبی دنیا	شمارہ-۳۲،اگست-لاہور	۱۹۷۰ء
۴۱-	افکار	نذراقبال،مکتبۂ افکار،کراچی	
۴۲-	نگار	اکتوبر،نومبر	۱۹۹۰ء